

مَعَالِيقُ

سُرُتِ الدُّنْيَا فِي تَهْنِئَةِ مُدَارِجِ  
تَهْنِئَةِ عِلْمِ سَمِيعِ

مَعَالِيقُ

Organic Studies Publisher



# مَعَارِفُ الْقُرْآنِ

جلد  
۲

سورۃ آل عمران و سورۃ نساء  
پارہ ۳، رکوع ۹ تا پارہ ۶، رکوع ۴

حضرت لانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ  
مفتی اعظم پاکستان

مکتبہ معارف القرآن کلچی





بقلم مہدیہ مسعود (رجسٹرڈ وائس)

## حکومت پاکستان کا پی آرٹس رجسٹریشن نمبر ۲۷۲

عرضِ ناشر: اگرچہ معارف القرآن کی تصحیح کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن  
کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد بندی میں سہواً غلطی  
ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم  
مطلع فرمائیں۔  
ادارۃ المعارف کراچی ۱۴  
اعطاء دارالعلوم کراچی پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰  
فون: ۵۰۳۲۰۲۰، ۵۰۴۹۷۳۳

باہتمام : محمد شعیب نقویؒ

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ - اپریل ۲۰۰۸ء

مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر : ادارۃ المعارف کراچیؒ

فون : 5049733 - 5032020

ای میل : i\_maarif@cyber.net.pk

ملنے کے پتے:

✽ ادارۃ المعارف کراچیؒ

فون: 5049733 - 5032020

✽ مکتبہ معارف القرآن کراچیؒ

فون: 5031565 - 5031566



## دیباچہ طبع اول

اللہ تعالیٰ کا ہزاراں ہزار شکر ہے کہ ”معارف القرآن“ کی جلد اول جس میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی تفسیر بہ مکمل شائع ہو چکی ہے، اور بحمد اللہ توقع سے زائد مقبولیت کے آثار محسوس کئے گئے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ جلد دوم طبع کی جا رہی ہے، جس میں سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کی مکمل تفسیر ہے، تفسیر کی خصوصیات وہی ہیں جن کا ذکر پہلی جلد کے شروع میں کیا گیا ہے، البتہ جلد دوم میں بعض نئی چیزوں کا التزام کیا گیا ہے جو انشاء اللہ فائدے کے لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوگا۔

ایک تو یہ کہ زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا پورا لے لیا گیا ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے یہ کہ ”خلاصہ تفسیر“ میں اس کا التزام کیا گیا ہے کہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی تفسیر ”بیان القرآن“ میں جو شروع میں خلاصہ تفسیر مختصر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کو پورا کا پورا لیا گیا ہے، البتہ اس خلاصہ میں جو جو مشکل الفاظ تھے اُن کی تشریح اپنی عبارت میں کر دی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اس خلاصہ تفسیر میں حضرتؒ نے یہ التزام کیا ہے کہ ترجمہ قرآن کے ساتھ ہی کچھ الفاظ تفسیر کے بڑھا کر مختصر جامع تفسیر اس طرح لکھی ہے کہ اصل ترجمہ کے اوپر خط کھینچ کر ممتاز کر دیا ہے، اور تفسیری نوٹ کو بغیر خط کے بین القوسین لکھا ہے۔

اس طرح سے اس خلاصہ تفسیر میں پورا ترجمہ حضرت حکیم الامتؒ کا بھی آگیا، اور ضروری تفسیر بھی، اس التزام کے ساتھ ناظرین ”معارف القرآن“ کے لئے دو مستند ترجمے مستقل سامنے آجائیں گے، ایک زیر متن ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ کا، دوسرا خلاصہ تفسیر کے ضمن میں حضرت حکیم الامتؒ قدس سرہ کا باقی خصوصیات تفسیر وہی ہیں جو پہلی جلد میں ملحوظ رہی ہیں، واللہ المستعان وعلیہ التکلیل

بند محمد شفیع

دارالعلوم کراچی نمبر ۱۲

شعبان ۱۳۸۹ھ

لے دوسرے ایڈیشن میں جلد اول کو بھی ان امور کے مطابق کیا گیا ہے، اس لئے یہ جلد دوم کی خصوصیات نہیں رہیں۔ اب ”معارف القرآن“ کی تمام جلدوں کا ایک ہی طرز ہے۔ (مصحح)



# فہرست مضامین "معارف القرآن" جلد دوم (سورہ آل عمران و نساء)

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۹	آیات ہنا تک دعا ذکر یا ربہ سے سمیع الدعاء تک خلاصہ تفسیر اور معارف مسائل	۳۹	آیت فان ما جوک سے بصیر العباد تک خلاصہ تفسیر	۱۳	آیات الم سے ہوا العزیز الحکیم تک ترجمہ و ربط آیات
۶۱	آیت فادۃ الملائکۃ سے من الصلحین تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۴۰	آیات ان الذین یکفرون سے من ناصرین تک خلاصہ تفسیر	۱۴	ان آیات کا خلاصہ تفسیر
۶۲	آیات قال رب سے والابکار تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۴۱	آیات الم تر الی الذین سے لایظلمون تک خلاصہ تفسیر	۱۶	ان آیات کے معارف و مسائل
۶۳	حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اور اس کی حکمت	۴۲	آیات قل اللہم سے بغیر حساب تک خلاصہ تفسیر	۱۷	توحید کی طرف دعوت تمام انبیاء کا وظیفہ رہا ہے
۶۴	آیات و اذ قالت الملائکۃ سے مع الاعین تک خلاصہ تفسیر اور معارف مسائل	۴۳	معارف و مسائل	۱۸	آیت ہوالذی انزل سے اولوالالباب تک ترجمہ و ربط آیات
۶۵	آیت ذلک من انباء الغیب یختصمون تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۴۴	اس آیت کا شان نزول اور غزوہ خندق کا واقعہ جو چیزیں عادۃ بُری سمجھی جاتی ہیں انجام کے اعتبار سے وہ بھی بُری نہیں	۱۹	خلاصہ تفسیر
۶۶	آیات اذ قالت الملائکۃ سے من الصلحین تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۴۵	اس آیت کی مخصوص فضیلت	۲۰	اس آیت کے متعلق معارف و مسائل
۶۷	نزل عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دلیل آیت قالت رب انی یتوکل علی ولد سے کن فیکون تک خلاصہ تفسیر	۴۶	آیات لایتخذ المؤمنون سے روف بالعباد تک خلاصہ تفسیر	۲۱	آیات ربنا لاتزغ قلوبنا سے لایخلف المیعاد تک خلاصہ تفسیر
۶۸	آیات و یعلمہ الکتاب والحکمۃ سے صراط مستقیم تک خلاصہ تفسیر اور معارف مسائل	۴۷	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۲۲	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
۶۹	آیات فلما احس عیسیٰ سے مع الشہدین تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۴۸	کفار کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں ؟	۲۳	آیات ان الذین سے وئیں المہادی تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۷۰	فائدہ ہمتہ	۴۹	آیات قل ان کنتم تحبون اللہ سے لایحب الکفرین تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۲۴	آیت قد کان لکم آیت سے لا ولی الا بھار تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۷۱	آیات و مکروا و مکرا اللہ سے فیہ تختلفون تک خلاصہ تفسیر	۵۰	آیات ان اللہ اصطفیٰ ادم سے سمیع علیہم تک ترجمہ و خلاصہ تفسیر	۲۵	آیات زین للناس سے والمستغفرین بالاسرار تک خلاصہ تفسیر
۷۲	ان آیات کے اہم الفاظ کی تشریح آیت مذکورہ میں حضرت عیسیٰ سے اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے	۵۱	انبیاء سابقین کا تذکرہ برائے تسلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	۲۶	معارف و مسائل
۷۳	اسرائیل کی موجودہ حکومت سے اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا	۵۲	آیات اذ قالت امرأت عمران سے من الشیطن الرجیم تک خلاصہ تفسیر	۲۷	دنیا کی محبت فطری ہے مگر اس میں غلو جہلک ہے
۷۴	مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام	۵۳	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۲۸	آیات شہد اللہ سے سریع الحساب تک خلاصہ تفسیر
		۵۴	آیت فتقبلہا ربھا سے بغیر حساب تک خلاصہ تفسیر	۲۹	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
		۵۵		۳۰	آیت شہد اللہ کے فضائل
		۵۶		۳۱	دین اور اسلام کے الفاظ کی تشریح
		۵۷		۳۲	اس زمانہ میں نجات اسلام میں منحصر ہے
		۵۸		۳۳	غیر مسلم کے اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ بھی مقبول نہیں



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۱۲۲	حج بیت اللہ کا فرض ہونا	۹۹	میشاق سے کیا مراد ہے؟ اور یہ کہاں ہوا؟		آیت فاما الذین کفروا سے والذکر
۱۲۳	آیات قل یا اهل الکتاب سے الیٰ	۱۰۰	تمام انبیاء سے ایمان کے مطالبے کا فائدہ	۸۲	الحکیم تک خلاصہ تفسیر معارف مسائل
۱۲۴	صراط مستقیم تک خلاصہ تفسیر	۱۰۱	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عامہ		مصائب دنیا کفار کے لئے کفارہ نہیں
۱۲۵	آیات یا ایہا الذین امنوا سے لعلمکم	۱۰۲	آیت ومن یتخ الخ خلاصہ تفسیر		ہوتے، مؤمن کے لئے کفارہ ہو کر مفید
۱۲۶	تھہدون تک خلاصہ تفسیر	۱۰۳	معارف و مسائل		ہوتے ہیں
۱۲۷	مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے دو اصول	۱۰۴	اسلام کی تعریف اور اس کا مدار نجات ہونا	۸۳	آیات ان مثل عیسیٰ سے بالمفسدین
۱۲۸	تقویٰ اور باہمی اتفاق	۱۰۵	آیات کیف یجہدی اللہ سے من نصیر	۸۴	تک خلاصہ تفسیر اور معارف مسائل
۱۲۹	حق تقویٰ کیا ہے؟	۱۰۶	تک خلاصہ تفسیر		قیاس کی حجت
۱۳۰	مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا دوسرا	۱۰۷	ان آیات کے معارف و مسائل	۸۵	مباہلہ کی تعریف
۱۳۱	اصول باہمی اتفاق	۱۰۸	ایک شبہ کا ازالہ		واقعہ مباہلہ اور ردِّ روافض
۱۳۲	پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف اسلام	۱۰۹	آیت لن تنالوا البر الا ربطت آیات		آیات قل یا اهل الکتاب سے مسلمون تک
۱۳۳	ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، نسبی اور	۱۱۰	مع تشریح الفاظ	۸۶	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۱۳۴	وطن وحدت سے یہ کام نہیں ہو سکتا	۱۱۱	آیت مذکورہ کا خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل		تبلیغ و دعوت کے اہم اصول
۱۳۵	مسلمانوں کا باہمی اتحاد اللہ تعالیٰ	۱۱۲	آیت مذکورہ اور صحابہ کرام کا جذبہ عمل	۸۷	آیات یا اهل الکتاب لم تحاجون سے
۱۳۶	کی اطاعت پر موقوف ہے۔	۱۱۳	اس آیت میں لفظ پر تمام صدقات	۸۸	ولی المؤمنین تک خلاصہ تفسیر
۱۳۷	آیات ولکن منکم ائمة عظیمہ تک	۱۱۴	واجبہ اور نفلیہ کو شامل ہے	۸۹	آیات و ذلت طائفہ سے وانتم تعلمون
۱۳۸	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۱۱۵	صدقہ کرنے میں اعتدال چاہیے	۹۰	تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۱۳۹	مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح	۱۱۶	مال محبوب سے کیا مراد ہے؟		آیت و قالت طائفہ سے ذوالفضل
۱۴۰	دو چیزوں پر موقوف ہے	۱۱۷	فالتوسمان اور حاجت سے زائد		العظیم تک خلاصہ تفسیر
۱۴۱	اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب	۱۱۸	چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی	۹۱	آیت ومن اهل الکتاب سے وہم
۱۴۲	منکر نہیں ہوتی، اس پر تکبر جائز نہیں	۱۱۹	ثواب سے خالی نہیں		یعلمون تک خلاصہ تفسیر
۱۴۳	ضروری تنبیہ	۱۲۰	آیات کل الطعام سے من المشرکین	۹۲	معارف و مسائل
۱۴۴	آیات یوم تبیض وجوہ سے الامور	۱۲۱	تک خلاصہ تفسیر		کسی غیر مسلم کے اچھے و صبا کی مدح کرنا درست ہے
۱۴۵	تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۱۲۲	ان آیات کے متعلق فوائد و معارف		آیات بلی من اوفی سے عذاب الیم
۱۴۶	چہرے کی سیاہی اور سفیدی سے	۱۲۳	آیت ان اول بیت الخ کا خلاصہ تفسیر	۹۳	تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۱۴۷	کیا مراد ہے؟	۱۲۴	اور معارف و مسائل		عہد کی تعریف اور اس کے خلاف
۱۴۸	سیاہ چہرے والے اور سفید چہرے	۱۲۵	فضائل بیت اللہ مع تاریخ تعمیر		کرنے والے پر چند وعیدیں
۱۴۹	والے کون لوگ ہیں؟	۱۲۶	بیت اللہ کی برکات	۹۴	آیات وان منہم سے مسلمون تک
۱۵۰	چند اہم فوائد	۱۲۷	آیت فیہ ایت بیئت کا خلاصہ تفسیر	۹۵	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۱۵۱	آدمی سزا اپنے ہی گناہوں کی پاتا ہے	۱۲۸	اور معارف و مسائل		عصمت انبیاء کی ایک دلیل
۱۵۲	آیت کنتم خیر ائمة الخ کا خلاصہ تفسیر اور	۱۲۹	بیت اللہ کی تین خصوصیات	۹۶	آیات واذا اخذ اللہ سے لہ مسلمون
۱۵۳	معارف و مسائل	۱۳۰	مقام ابراہیمؑ	۹۷	تک خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۱۵۴	امت محمدؐ کا خیر الائم ہونا اور اس کی چند وجوہ		داخل بیت اللہ کا مامون ہونا		اللہ تعالیٰ کے تین عہد



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۱۰	ان کی خطاؤں پر غفور و درگزر کا بیٹھا معاملہ	۱۵۰	رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ سے	۱۵۰	آیت لن یضرکم الہم کا خلاصہ تفسیر اور
۲۱۲	صحابہ کرام کے متعلق عام مسلمانوں کے لئے	۱۵۱	الگ کر کے بیان کر نیکی حکمت	۱۵۱	معارف و مسائل
۲۱۳	ایک سبق	۱۸۳	آیات الذین ینفقون سے للمتقین تک	۱۵۲	آیت ضربت علیہم الذلۃ الہم کا خلاصہ
۲۱۳	آیات یا ایہا الذین امنوا سے تحذرون	۱۸۴	خلاصہ تفسیر	۱۵۲	تفسیر اور معارف و مسائل
۲۱۳	تک ربط آیات و خلاصہ تفسیر	۱۸۵	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۱۵۲	یہود پر ذلت و غضب کا مطلب
۲۱۵	آیت فہما رحمۃ من اللہ الہم	۱۸۸	انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ضروری	۱۵۳	موجودہ امرائیلی حکومت سے شبہ و جواب
۲۱۶	ربط آیات و خلاصہ تفسیر	۱۹۱	نہیں کہ مال ہی خرچ کیا جائے	۱۵۳	آیات لیسوا سوار سے یظلمون تک
۲۱۸	آیت مذکورہ کے متعلق معارف و مسائل	۱۹۳	تنگی اور فراخی کے ذکر میں ایک اور حکمت	۱۵۴	خلاصہ تفسیر
۲۱۹	مرشد و مربی کی خاص صفات	۱۹۵	آیات ولا تہنوا سے متظرون تک	۱۵۴	آیات یا ایہا الذین سے محیط تک
۲۲۱	لفظ امر اور شوری کی تحقیق	۱۹۶	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۱۵۶	خلاصہ تفسیر
۲۲۲	مشورہ کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟	۱۹۹	آیات و ما محمد سے التا کرین تک خلاصہ تفسیر	۱۶۱	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
۲۲۵	رسول کریم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا درجہ	۲۰۰	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۱۶۱	مسلمانوں کی فتح و کامیابی اور تمام
۲۲۶	حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے ؟	۲۰۱	آیات و کاین من نبی سے المحنین تک	۱۶۱	مشکلات میں آسانی کا راز صبر اور تقویٰ
۲۲۷	مشورہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو	۲۰۲	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۱۶۱	کی دو صفتوں میں مضمر ہے
۲۲۸	فیصلہ کی کیا صورت ہوگی	۲۰۳	کسی نیک عمل پر ناز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ ہر حال	۱۶۱	آیات واذ غدت سے تشکرون تک
۲۲۹	ایک اشکال اور اس کا جواب	۲۰۴	میں اللہ سے مغفرت اور عمل پر قائم رہنے	۱۶۲	خلاصہ تفسیر
۲۳۰	ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد	۲۰۵	کی دعا کرتے رہنا چاہیئے	۱۶۳	ان آیات کے معارف و مسائل
۲۳۱	اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا	۲۰۶	آیات یا ایہا الذین امنوا سے النضرین	۱۶۳	اور غزوہ احد کا پس منظر
۲۳۲	آیات ان ینصرکم اللہ سے المحنین تک	۲۰۷	تک خلاصہ تفسیر	۱۶۴	نبی علیہ السلام کی جنگی ترتیب غیروں کی نظریں
۲۳۳	خلاصہ تفسیر	۲۰۸	آیات منلقی فی قلوب الذین سے	۱۶۵	جنگ کا آغاز
۲۳۴	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۲۰۹	علی المؤمنین تک خلاصہ تفسیر	۱۶۵	احد کے واقعہ سے چند سبق
۲۳۵	مال غنیمت سے چوری گناہ عظیم ہے	۲۱۰	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۱۶۵	بدر کی اہمیت اور اس کا محل وقوع
۲۳۶	کسی نبی سے ایسے گناہ کا احتمال نہیں	۲۱۱	اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرام کا	۱۶۵	آیات اذ تقول للمؤمنین سے غفور
۲۳۷	اموال اوقاف اور سرکاری خزانے	۲۱۲	مقام بلند اور اس کی رعایتیں	۱۶۵	رحیم تک خلاصہ تفسیر
۲۳۸	میں بحکم غلول ہے	۲۱۳	بعض صحابہ کرام کے ارادہ دنیا کا مطلب	۱۶۵	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
۲۳۹	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باوجود	۲۱۴	آیات اذ تصعدون سے غفور حلیم تک	۱۶۵	فرشتوں کی مدد بھیجے کی حکمت اور اصل مقصد
۲۴۰	پوری انسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے	۲۱۵	ربط آیات ، خلاصہ تفسیر	۱۶۵	اور تعداد ملا لگیں مختلف عد بیان کر نیکی حکمت
۲۴۱	واقعہ احد میں مسلمانوں کو عارضی شکست اور	۲۱۶	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۱۶۵	غزوہ احد میں حضور کی کفار کے لئے
۲۴۲	زخم و قتل کے مصائب پیش آنے کے	۲۱۷	احد مصائب ہزار نہیں بلکہ آرائش تھے اور جو	۱۶۵	بدر دعا پر صبر و تحمل کی تعلیم
۲۴۳	بعض اسباب اور حکمتیں	۲۱۸	غرض بعض صحابہ کرام سے ہوئی وہ معاف کر دی گئی	۱۶۵	آیات یا ایہا الذین امنوا سے للکافرین
۲۴۴	اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خاص	۲۱۹	واقعہ احد میں مسلمانوں پر مصائب کے اسباب کیا تھے ؟	۱۶۵	تک ، خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۲۴۵	فضائل و درجات	۲۲۰	ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب ہو جاتا ہے	۱۶۵	آیات واطیعوا اللہ سے للمتقین تک
۲۴۶	آیات الذین استجابوا سے مؤمنین تک	۲۲۱	اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرام کا مقام بلند اور	۱۶۵	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۳۹	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۲۵۸	آیات ان فی خلق السموات و الارض	۲۳۹	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
۲۴۰	ربط آیات اور شان نزول	۲۵۹	خلاصہ تفسیر	۲۴۰	ربط آیات اور شان نزول
۲۴۱	کسی کام کیلئے صرف جدوجہد اور جان نثاری	۲۶۱	معارف مسائل آیت کا شان نزول	۲۴۱	کسی کام کیلئے صرف جدوجہد اور جان نثاری
۲۴۲	کافی نہیں جب تک اخلاص نہ ہو	۲۶۲	خلق السموات و الارض سے کیا مراد ہے؟	۲۴۲	کافی نہیں جب تک اخلاص نہ ہو
۲۴۳	حکم رسول و حقیقت حکم خدا ہے	۲۶۳	اختلاف لیل نہار کی مختلف صورتیں	۲۴۳	حکم رسول و حقیقت حکم خدا ہے
۲۴۴	احسان کی تعریف	۲۶۴	لفظ آیات کی تحقیق	۲۴۴	احسان کی تعریف
۲۴۵	تقویٰ کی تعریف	۲۶۵	عقل و الہ صرف ہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر	۲۴۵	تقویٰ کی تعریف
۲۴۶	خوف خدا سے کیا مراد ہے؟	۲۶۶	ایمان لاتے ہیں اور حال میں اس کا ذکر کرتے ہیں	۲۴۶	خوف خدا سے کیا مراد ہے؟
۲۴۷	آیات ولایحزک الذین سے بھین تک	۲۶۷	آیات فاستجاب لہم سے المحاب تک	۲۴۷	آیات ولایحزک الذین سے بھین تک
۲۴۸	خلاصہ تفسیر	۲۶۸	خلاصہ تفسیر	۲۴۸	خلاصہ تفسیر
۲۴۹	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۲۶۹	معارف و مسائل	۲۴۹	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
۲۵۰	کفار کی دنیوی عیش و عشرت بھی	۲۷۰	ہجرت اور شہادت سے سب گناہ معاف	۲۵۰	کفار کی دنیوی عیش و عشرت بھی
۲۵۱	درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے	۲۷۱	ہو جاتے ہیں، مگر قرض وغیرہ حقوق العباد	۲۵۱	درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے
۲۵۲	آیت ما کان اللہ الہ کا خلاصہ تفسیر	۲۷۲	کی معافی کا وعدہ نہیں	۲۵۲	آیت ما کان اللہ الہ کا خلاصہ تفسیر
۲۵۳	اور معارف و مسائل	۲۷۳	آیت یا ایہا الذین امنوا اصبروا الہ کا	۲۵۳	اور معارف و مسائل
۲۵۴	مؤمن و منافق میں امتیاز وحی کے	۲۷۴	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل	۲۵۴	مؤمن و منافق میں امتیاز وحی کے
۲۵۵	بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت	۲۷۵	رباط یعنی اسلامی سرحد کی حفاظت کا انتظام	۲۵۵	بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت
۲۵۶	امور غیب پر کسی کو مطلع کر دیا جائے تو	۲۷۶	نماز باجماعت کی پابندی ایک نماز کے	۲۵۶	امور غیب پر کسی کو مطلع کر دیا جائے تو
۲۵۷	وہ علم غیب نہیں	۲۷۷	بعد دوسری کے انتظار میں رہنا بھی باطل	۲۵۷	وہ علم غیب نہیں
۲۵۸	آیات ولایحسبن الذین سے الامور تک	۲۷۸	فی سبیل اللہ ہے	۲۵۸	آیات ولایحسبن الذین سے الامور تک
۲۵۹	ربط آیات و خلاصہ تفسیر	۲۷۹	اس آیت کے متعلق ایک فائدہ	۲۵۹	ربط آیات و خلاصہ تفسیر
۲۶۰	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل	۲۸۰	سُورَةُ نِسَاء	۲۶۰	ان آیات کے متعلق معارف و مسائل
۲۶۱	بخل کی تعریف اور اس پر پیر کی تفصیل	۲۸۱	آیات یا ایہا الناس اتقوا سے حوٰی	۲۶۱	بخل کی تعریف اور اس پر پیر کی تفصیل
۲۶۲	کفر و معصیت پر دل سے راضی ہونا	۲۸۲	کبیرا تک کا ترجمہ و ربط آیات	۲۶۲	کفر و معصیت پر دل سے راضی ہونا
۲۶۳	بھی ایسا ہی عظیم گناہ ہے	۲۸۳	خلاصہ تفسیر	۲۶۳	بھی ایسا ہی عظیم گناہ ہے
۲۶۴	فکر آخرت سارے غموں کا علاج	۲۸۴	معارف و مسائل	۲۶۴	فکر آخرت سارے غموں کا علاج
۲۶۵	اور شبہات کا جواب ہے	۲۸۵	صلہ رحمی کے معنی اور اس کے فضائل	۲۶۵	اور شبہات کا جواب ہے
۲۶۶	اہل حق کو اہل باطل سے ایذا نہیں پہنچانا ایک قدرتی	۲۸۶	یتیموں کے حقوق اور ان کے اموال کی حفاظت	۲۶۶	اہل حق کو اہل باطل سے ایذا نہیں پہنچانا ایک قدرتی
۲۶۷	امر ہے، اور سب کا علاج صبر و تقویٰ ہے	۲۸۷	آیت و ان خفتم تا لا تقولوا، خلاصہ تفسیر	۲۶۷	امر ہے، اور سب کا علاج صبر و تقویٰ ہے
۲۶۸	آیات و اذاخذ اللہ سے شئی قدریر تک	۲۸۸	معارف و مسائل	۲۶۸	آیات و اذاخذ اللہ سے شئی قدریر تک
۲۶۹	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل	۲۸۹	یتیم لڑکیوں کی حق تلفی کا انسداد	۲۶۹	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل
۲۷۰	علم دین کو چھپانا حرام اور بغیر عمل کئے اس	۲۹۰	نکاح نابالغ کا مسئلہ	۲۷۰	علم دین کو چھپانا حرام اور بغیر عمل کئے اس
۲۷۱	پر مدح و تعریف کا انتظار و اہتمام مذموم ہے	۲۹۱		۲۷۱	پر مدح و تعریف کا انتظار و اہتمام مذموم ہے
۲۷۲		۲۹۲		۲۷۲	
۲۷۳		۲۹۳		۲۷۳	
۲۷۴		۲۹۴		۲۷۴	
۲۷۵		۲۹۵		۲۷۵	
۲۷۶		۲۹۶		۲۷۶	
۲۷۷		۲۹۷		۲۷۷	
۲۷۸		۲۹۸		۲۷۸	
۲۷۹		۲۹۹		۲۷۹	
۲۸۰		۳۰۰		۲۸۰	
۲۸۱		۳۰۱		۲۸۱	
۲۸۲		۳۰۲		۲۸۲	
۲۸۳		۳۰۳		۲۸۳	
۲۸۴		۳۰۴		۲۸۴	
۲۸۵		۳۰۵		۲۸۵	
۲۸۶		۳۰۶		۲۸۶	
۲۸۷		۳۰۷		۲۸۷	
۲۸۸		۳۰۸		۲۸۸	
۲۸۹		۳۰۹		۲۸۹	
۲۹۰		۳۱۰		۲۹۰	
۲۹۱		۳۱۱		۲۹۱	
۲۹۲		۳۱۲		۲۹۲	
۲۹۳		۳۱۳		۲۹۳	
۲۹۴		۳۱۴		۲۹۴	
۲۹۵		۳۱۵		۲۹۵	
۲۹۶		۳۱۶		۲۹۶	
۲۹۷		۳۱۷		۲۹۷	
۲۹۸		۳۱۸		۲۹۸	
۲۹۹		۳۱۹		۲۹۹	
۳۰۰		۳۲۰		۳۰۰	
۳۰۱		۳۲۱		۳۰۱	
۳۰۲		۳۲۲		۳۰۲	
۳۰۳		۳۲۳		۳۰۳	
۳۰۴		۳۲۴		۳۰۴	
۳۰۵		۳۲۵		۳۰۵	
۳۰۶		۳۲۶		۳۰۶	
۳۰۷		۳۲۷		۳۰۷	
۳۰۸		۳۲۸		۳۰۸	
۳۰۹		۳۲۹		۳۰۹	
۳۱۰		۳۳۰		۳۱۰	
۳۱۱		۳۳۱		۳۱۱	
۳۱۲		۳۳۲		۳۱۲	
۳۱۳		۳۳۳		۳۱۳	
۳۱۴		۳۳۴		۳۱۴	
۳۱۵		۳۳۵		۳۱۵	
۳۱۶		۳۳۶		۳۱۶	
۳۱۷		۳۳۷		۳۱۷	
۳۱۸		۳۳۸		۳۱۸	
۳۱۹		۳۳۹		۳۱۹	
۳۲۰		۳۴۰		۳۲۰	
۳۲۱		۳۴۱		۳۲۱	
۳۲۲		۳۴۲		۳۲۲	
۳۲۳		۳۴۳		۳۲۳	
۳۲۴		۳۴۴		۳۲۴	
۳۲۵		۳۴۵		۳۲۵	
۳۲۶		۳۴۶		۳۲۶	
۳۲۷		۳۴۷		۳۲۷	
۳۲۸		۳۴۸		۳۲۸	
۳۲۹		۳۴۹		۳۲۹	
۳۳۰		۳۵۰		۳۳۰	
۳۳۱		۳۵۱		۳۳۱	
۳۳۲		۳۵۲		۳۳۲	
۳۳۳		۳۵۳		۳۳۳	
۳۳۴		۳۵۴		۳۳۴	
۳۳۵		۳۵۵		۳۳۵	
۳۳۶		۳۵۶		۳۳۶	
۳۳۷		۳۵۷		۳۳۷	
۳۳۸		۳۵۸		۳۳۸	
۳۳۹		۳۵۹		۳۳۹	
۳۴۰		۳۶۰		۳۴۰	
۳۴۱		۳۶۱		۳۴۱	
۳۴۲		۳۶۲		۳۴۲	
۳۴۳		۳۶۳		۳۴۳	
۳۴۴		۳۶۴		۳۴۴	
۳۴۵		۳۶۵		۳۴۵	
۳۴۶		۳۶۶		۳۴۶	
۳۴۷		۳۶۷		۳۴۷	
۳۴۸		۳۶۸		۳۴۸	
۳۴۹		۳۶۹		۳۴۹	
۳۵۰		۳۷۰		۳۵۰	
۳۵۱		۳۷۱		۳۵۱	
۳۵۲		۳۷۲		۳۵۲	
۳۵۳		۳۷۳		۳۵۳	
۳۵۴		۳۷۴		۳۵۴	
۳۵۵		۳۷۵		۳۵۵	
۳۵۶		۳۷۶		۳۵۶	
۳۵۷		۳۷۷		۳۵۷	
۳۵۸		۳۷۸		۳۵۸	
۳۵۹		۳۷۹		۳۵۹	
۳۶۰		۳۸۰		۳۶۰	
۳۶۱		۳۸۱		۳۶۱	
۳۶۲		۳۸۲		۳۶۲	
۳۶۳		۳۸۳		۳۶۳	
۳۶۴		۳۸۴		۳۶۴	
۳۶۵		۳۸۵		۳۶۵	
۳۶۶		۳۸۶		۳۶۶	
۳۶۷		۳۸۷		۳۶۷	
۳۶۸		۳۸۸		۳۶۸	
۳۶۹		۳۸۹		۳۶۹	
۳۷۰		۳۹۰		۳۷۰	
۳۷۱		۳۹۱		۳۷۱	
۳۷۲		۳۹۲		۳۷۲	
۳۷۳		۳۹۳		۳۷۳	
۳۷۴		۳۹۴		۳۷۴	
۳۷۵		۳۹۵		۳۷۵	
۳۷۶		۳۹۶		۳۷۶	
۳۷۷		۳۹۷		۳۷۷	
۳۷۸		۳۹۸		۳۷۸	
۳۷۹		۳۹۹		۳۷۹	
۳۸۰		۴۰۰		۳۸۰	
۳۸۱		۴۰۱		۳۸۱	
۳۸۲		۴۰۲		۳۸۲	
۳۸۳		۴۰۳		۳۸۳	
۳۸۴		۴۰۴		۳۸۴	
۳۸۵		۴۰۵		۳۸۵	
۳۸۶		۴۰۶		۳۸۶	
۳۸۷		۴۰۷		۳۸۷	
۳۸۸		۴۰۸		۳۸۸	
۳۸۹		۴۰۹		۳۸۹	
۳۹۰		۴۱۰		۳۹۰	
۳۹۱		۴۱۱		۳۹۱	
۳۹۲		۴۱۲		۳۹۲	
۳۹۳		۴۱۳		۳۹۳	
۳۹۴		۴۱۴		۳۹۴	
۳۹۵		۴۱۵		۳۹۵	
۳۹۶		۴۱۶		۳۹۶	
۳۹۷		۴۱۷		۳۹۷	
۳۹۸		۴۱۸		۳۹۸	
۳۹۹		۴۱۹		۳۹۹	
۴۰۰		۴۲۰		۴۰۰	



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۳۵۶	محررات کی کئی قسمیں	۳۳۲	مکمل احکام میراث	۳۱۲	میراث کے مقررہ حصے اللہ کی جانب سے طے شدہ ہیں
"	اول محربات نسبتہ	"	مسلمان کافر کا وارث نہیں بن سکتا	"	وراثت ایک جبری ملک ہے اس میں مالک ہونے والے کی رضامندی شرط نہیں
"	دوم محربات رضاعیہ	۳۳۳	قاتل کی میراث	"	محرور الارث رشتہ داروں کی دلداری ضروری ہے
"	سوم محربات بالمصاہرہ	"	پیٹ میں جو بچہ ہے اس کی میراث معتدہ کی میراث	"	اللہ سے ڈرتے ہوئے میراث تقسیم کریں
"	چہارم وہ عورتیں جو شوہر والیاں ہیں	"	مسئلہ شوہر کے مرض موت میں خود سے خلع کرنے والی عورت وارث نہیں ہوگی	"	یتیم کا مال ظلماً کھانا پیٹ میں انگارے بھرنا ہے
۳۵۷	معارف و مسائل	"	مسئلہ عصبات کی میراث	۳۱۴	آیت یوسفکم اللہ تاجکما خلاصہ تفسیر
۳۵۹	رضاعت کے سلسلہ کے چند مسائل	"	مسئلہ عصبات اگر نہ ہوں تو بچا ہوا مال اصحاب فرائض پر رد کیا جائے گا	"	معارف و مسائل
۳۶۶	حرمت متعہ	"	مسئلہ ذوی الارحام کو میراث کب پہنچتی ہے	"	حقوق مقدمہ علی الميراث
۳۶۹	آیت ومن لم یستطع تارحیما	۳۳۴	آیات والقی یا تین تارحیما	"	اولاد کا حصہ
"	ترجمہ و ربط آیات	"	خلاصہ تفسیر، ربط آیات	"	لڑکیوں کو حصہ دینے کی اہمیت
۳۷۰	خلاصہ تفسیر	"	معارف و مسائل	"	والدین کا حصہ
۳۷۱	معارف و مسائل	"	آیات یا ایھا الذین تالیسیرا	"	آیت ولکم نصف تا اودین
۳۷۳	آیات یرید اللہ تاضعیفاً	"	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل	"	خلاصہ تفسیر ربط آیات
۳۷۴	ربط آیات و خلاصہ تفسیر	"	آیات یا ایھا الذین تالیسیرا	"	معارف و مسائل
۳۷۵	معارف و مسائل	"	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل	"	شوہر اور بیوی کا حصہ
۳۷۶	آیات یا ایھا الذین تالیسیرا	"	جس طرح باطل طریقہ سے غیر کامال کھانا جائز نہیں خود اپنا مال بھی باطل طریق سے خرچ کرنا جائز نہیں	"	مسئلہ بیوی کا مہر بھی دین ہے
۳۷۷	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل	"	تشریح و تفصیل	"	آیت وان کان رجل تا حلیم
"	جس طرح باطل طریقہ سے غیر کامال کھانا جائز نہیں خود اپنا مال بھی باطل طریق سے خرچ کرنا جائز نہیں	"	کسب معاش کے ذرائع میں تجارت اور محنت سب سے افضل ہے	"	خلاصہ تفسیر اور معارف و مسائل
"	تشریح و تفصیل	"	پاکیزہ کمائی کے خاص شرائط	"	کلامہ کی میراث
۳۷۸	کسب معاش کے ذرائع میں تجارت اور محنت سب سے افضل ہے	"	دوسرے کامال حلال ہونے کیلئے تجارت اور تراخی کی دو شرطیں	"	بہن بھائی کا حصہ
۳۷۹	پاکیزہ کمائی کے خاص شرائط	"	شرط تراخی کی حقیقت	"	وصیت کے مسائل
"	دوسرے کامال حلال ہونے کیلئے تجارت اور تراخی کی دو شرطیں	"	آیت ان تجتنبوا تا کریماً	"	غیر مضار کی تفسیر
۳۸۰	شرط تراخی کی حقیقت	"	خلاصہ تفسیر	"	مقررہ حصوں کے مطابق تقسیم کرنے کی تاکید
۳۸۲	آیت ان تجتنبوا تا کریماً	"	معارف و مسائل	"	آیات تلک حدود اللہ تا مہین
"	خلاصہ تفسیر	"	گناہوں کی دو قسمیں	"	معارف و مسائل
۳۸۳	معارف و مسائل	"	اعمال صالحہ صغائر کا کفار ہو جاتے ہیں	"	



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۴۳۰	اشراک فی التصرف	۴۱۱	قراہت داروں کے ساتھ حسن سلوک	۳۸۳	کبیرہ گناہ صرف توبہ سے معاف ہوتے ہیں
"	عبادت میں شریک ٹھہرانا	"	کی تاکید	۳۸۴	گناہ کی دو قسمیں، صغائر و کبائر
"	اپنی مدح سرائی اور عیوب سے	"	یتیم اور مسکین کا حق	۳۸۵	گناہ کبیرہ
"	پاک ہونے کا دعویٰ جائز نہیں	"	پڑوسی کا حق	۳۸۷	آیات ولا تتمنوا تا شہیدا
۴۳۱	آیات الم تر تا نصیرا	۴۱۲	ہمنشین کا حق	۳۸۸	خلاصہ تفسیر
"	خلاصہ تفسیر	"	راہگیر کا حق	۳۸۹	معارف و مسائل
۴۳۲	المحبت والطاغت سے کیا مراد ہے	۴۱۳	غلام، باندی اور ملازموں کا حق	"	امور اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کی
"	مذکورہ آیات کا شان نزول	"	حقوق میں کوتاہی دہی لوگ کرتے	"	تتمنا کرنا
"	نفسانی خواہشات بعض اوقات	۴۱۴	ہیں جن کے دلوں میں تکبر ہو	۳۹۳	عقد موالات سے میراث پہنچنے کا حکم
۴۳۳	آدمی کو دین سے محروم کر دیتی ہیں	"	کبر، بخل، ریا کے متعلق چند	"	آیات الرجال قوامون تا خیرا
"	اللہ کی لعنت دنیا و آخرت میں	۴۱۵	احادیث	۳۹۴	خلاصہ تفسیر
۴۳۴	رسوائی کا سبب ہے	۴۱۸	آیات وماذا علیہم تا حدیثا	۳۹۵	معارف و مسائل
"	اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ	"	خلاصہ تفسیر	"	مردوں کی افضلیت کے بیان کیلئے
"	ہیں؟	۴۱۹	معارف و مسائل	۳۹۷	قرآن حکیم کا عجیب اسلوب
۴۳۶	لعنت کے احکام	۴۲۲	آیت یا ایھا الذین امنوا تا غفورا	"	مرد اور عورت کے مختلف اعمال
۴۳۷	لعنت کے متعلق چند مسائل	"	شان نزول	"	تقسیم کار کے اصول پر مبنی
"	آیات ام لهم تا سعیرا	"	خلاصہ تفسیر	۳۹۸	صالح بیوی
"	خلاصہ تفسیر	۴۲۳	شراب کی حرمت کے تدریجی احکام	"	نافرمان بیوی اور اسکی اصلاح
۴۳۹	معارف و مسائل	"	یتیم کا حکم ایک انعام ہے جو اس	۳۹۹	کا طریقہ
"	یہودیوں کے حسد کرنے پر شدید	۴۲۴	امت کی خصوصیت ہے	"	خلاصہ مضمون
"	مذمت	"	آیات الم تر تا قلیلا	"	جھگڑا اگر طویل پکڑ جائے تو دونوں
"	حسد کی تعریف، حکم اور اس کی	"	خلاصہ تفسیر	۴۰۲	طرف سے برادری کے حکم سے صلح
"	مضرتوں کا بیان	"	ان آیات کے معارف و مسائل	"	کرائی جائے
۴۴۰	آیات ان الذین کفرو تا ظلیلا	۴۲۷	اور ربط آیات	۴۰۳	حکم کے سلسلہ میں "خلاصہ"
"	خلاصہ تفسیر	"	آیت یا ایھا الذین اتوا الکتاب	"	دوسرے نزاعات میں بھی حکم کے
۴۴۱	معارف و مسائل	"	تا مفعولا	۴۰۵	ذریعہ مصالحت کرائی جائے
"	ازواج مطہرہ کی تفسیر	"	خلاصہ تفسیر	۴۰۶	آیات واعبدوا اللہ تا قرینا
۴۴۲	آیات ان اللہ یا مکرما تا دیلا	۴۲۸	معارف و مسائل	۴۰۷	خلاصہ تفسیر
۴۴۳	خلاصہ تفسیر	"	آیات ان اللہ لا یغفر تا مبینا	۴۰۹	معارف و مسائل
۴۴۴	معارف و مسائل	۴۲۹	خلاصہ تفسیر	"	حقوق کے بیان سے پہلے توحید کا
"	شان نزول	"	شرک کی تعریف اور اس کی چند	"	ذکر کیوں؟
۴۴۶	ادائے امانت کی تاکید	۴۳۰	صورتیں	"	توحید کے بعد والدین کے حقوق
"	خیانت نفاق کی علامت ہے	"	علم میں شریک ٹھہرانا	"	کا ذکر



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۲۴۷	امانت کی قسمیں	۲۴۳	آیات ولوا انما کتبنا مستقیماً	۲۴۷	شیطان کی تدبیر ضعیف ہے
۲۴۸	حکومت کے مناصب اللہ کی	۲۴۳	خلاصہ تفسیر	۲۴۸	آیات الم تر تا شہیداً
۲۴۹	امانتیں ہیں	۲۴۴	معارف و مسائل	۲۴۹	خلاصہ تفسیر
۲۵۰	کسی منصب پر غیر اہل کو بٹھانے والا	۲۴۵	شان نزول	۲۵۰	ان آیات کے معارف و مسائل
۲۵۱	ملعون ہے	۲۴۵	آیات ومن یطع اللہ تا علیہا	۲۵۱	شان نزول
۲۵۲	عدل و انصاف امن عالم کا	۲۴۶	خلاصہ تفسیر	۲۵۲	حکم جہاد نازل ہونے پر مسلمانوں
۲۵۳	ضامن ہے	۲۴۶	معارف و مسائل	۲۵۳	کی طرف سے التواریخ حکم کی تمنا کس
۲۵۴	علاقائی اور صوبائی بنیادوں پر	۲۴۷	جنت کے درجات اعمال کے	۲۵۴	وجہ سے ہوئی
۲۵۵	حکومت کے مناصب سپرد کرنا	۲۴۷	اعتبار سے ہوں گے	۲۵۵	اصلاح ملک سے اصلاح نفس
۲۵۶	اصولی غلطی ہے	۲۴۸	شان نزول	۲۵۶	مقدم ہے
۲۵۷	دستور مملکت کے چند زیری اصول	۲۴۸	جنت میں ملاقات کی چند صورتیں	۲۵۷	دنیا اور آخرت کی نعمتوں میں فرق
۲۵۸	اولو الامر کون لوگ ہیں؟	۲۴۹	قرب کی شرط محبت ہے	۲۵۸	ایک عبرتناک واقعہ
۲۵۹	حکم اور اطاعت کی تین عملی صورتیں	۲۴۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی	۲۵۹	پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے
۲۶۰	خلاف شرع کاموں میں امیر کی	۲۵۰	رفاقت کسی رنگ نسل پر موقوف نہیں	۲۶۰	خلاف نہیں
۲۶۱	اطاعت جائز نہیں	۲۵۰	درجات کی تفصیل	۲۶۱	انسان کو نعمت محض اللہ کے فضل
۲۶۲	عادل آدمی اللہ کا محبوب ترین	۲۵۱	صدیقین و شہداء و صالحین کی	۲۶۲	سے ملتی ہے
۲۶۳	بندہ ہے	۲۵۱	تعریف	۲۶۳	مصیبت انسان کے شامت اعمال
۲۶۴	اجتہاد اور قیاس کا ثبوت	۲۵۲	آیات یا ایھا الذین امنوا اتقوا	۲۶۴	کامیاب ہے
۲۶۵	آیات الم تر تا حیما	۲۵۲	خلاصہ تفسیر	۲۶۵	آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے
۲۶۶	خلاصہ تفسیر	۲۵۳	معارف و مسائل	۲۶۶	عام ہے
۲۶۷	شان نزول	۲۵۴	فوائد بہتہ	۲۶۷	آیت من یطع الرسول تا حفیظاً
۲۶۸	معارف و مسائل	۲۵۵	آیات وما لکم تا ضعیفاً	۲۶۸	خلاصہ تفسیر
۲۶۹	آیت فلا وربک تا تسلیم	۲۵۶	خلاصہ تفسیر	۲۶۹	آیات ویقولون تا کثیراً
۲۷۰	خلاصہ تفسیر	۲۵۷	معارف و مسائل	۲۷۰	خلاصہ تفسیر
۲۷۱	معارف و مسائل	۲۵۸	منظوم کی فریاد رسی اسلام کا ایک	۲۷۱	معارف و مسائل
۲۷۲	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے	۲۵۹	اہم فریضہ ہے	۲۷۲	پیشوا کے لئے ایک اہم ہدایت
۲۷۳	فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا کفر ہے	۲۶۰	اللہ تعالیٰ سے دُعا تمام مصائب	۲۷۳	تدبیر و تدبیر آن
۲۷۴	اختلافات میں آپ کو حکم بنانا آپ	۲۶۱	کا بہترین علاج ہے	۲۷۴	قرآن و سنت کی تفسیر و تشریح پر
۲۷۵	کے عہد کے ساتھ مخصوص نہیں	۲۶۲	جنگ تو سب کرتے ہیں مگر اس سے	۲۷۵	کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری
۲۷۶	چند اہم مسائل	۲۶۳	مؤمن اور کافر کے مقاصد الگ	۲۷۶	نہیں ہے لیکن اس کیلئے شرائط ہیں
۲۷۷	ایک اہم فائدہ	۲۶۴	الگ ہیں	۲۷۷	قیاس کا ثبوت



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۳۴	چند مسائل	۵۰۶	آیات فحاکم فی المنافقین تامیناً	۴۹۰	اختلاف کثیر کی تشریح
"	اتما انزلنا الیک تا علیاً	۵۰۷	خلاصہ تفسیر	"	آیت واذا جاءهم تا الا قلیلاً
۵۳۶	خلاصہ تفسیر	"	تین مختلف گروہوں کا بیان اور ان کے احکام	"	خلاصہ تفسیر
۵۳۸	معارف و مسائل و ربط آیات	"	ان آیات کے معارف و مسائل	۴۹۱	معارف و مسائل
"	آیات کاشان نزول	۵۰۹	ہجرت کی مختلف صورتیں اور احکام	"	شان نزول
۵۳۲	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا	۵۱۱	آیات و ماکان لمومن تا علیاً	۴۹۲	بے تحقیق باتوں کا اڑانا گناہ اور فتنہ ہے
۵۳۳	توبہ کی حقیقت	۵۱۲	خلاصہ تفسیر	"	اولوا الامر کون لوگ ہیں ؟
"	اپنے گناہ کا الزام دوسرے پر لگانا	۵۱۳	معارف و مسائل و ربط آیات	"	مسائل جدیدہ میں قیاس و اجتہاد
"	دو گئے عذاب کا سبب ہے	۵۱۴	قتل کی تین قسمیں اور ان کا شرعی حکم	۴۹۳	اور عوام کے لئے تقلیدائے کا ثبوت
"	قرآن و سنت کی حقیقت	۵۱۵	کفارہ قتل کے متعلق چند مسائل	"	رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی استنباط و استدلال کے مکلف تھے
۵۳۴	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم ساری مخلوقات سے زائد ہے	۵۱۶	آیات یا ایھا الذین امنوا تا حیما	"	فوائد مہتمہ
"	آیات لآخر فی کثیر تا معیناً	۵۱۷	خلاصہ تفسیر	"	اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا فائدہ دینا
"	ترجمہ و خلاصہ تفسیر	۵۱۸	معارف و مسائل و ربط آیات	۴۹۴	علم یقینی کا نہیں
۵۳۵	ان آیات کے معارف و مسائل	"	مسلمان سمجھنے کے لئے علامات اسلام	"	آیت فقاتل تا اشد تکلیف
"	باہمی مشوروں اور مجلسوں کے آداب	"	کافی ہیں باطن کی تفتیش کرنا جائز نہیں	"	خلاصہ تفسیر
۵۳۶	صلح کرانے کی فضیلت	۵۲۰	واقعہ کی تحقیق کئے بغیر فیصلہ کرنا جائز نہیں	۴۹۵	معارف و مسائل
"	اجماع امت حجت ہے	۵۲۱	اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب	"	شان نزول
۵۳۷	آیات ان اللہ لا یغفر تا حیما	۵۲۲	جہاد سے متعلق چند احکام	"	قرآنی احکام کا حسن اسلوب
۵۳۸	ترجمہ و خلاصہ تفسیر	۵۲۳	فرض کفایہ کی تعریف	۴۹۶	آیات من یشفع شفاعۃ تا حدیثاً
۵۳۹	معارف و مسائل و ربط آیات	۵۲۴	آیات ان الذین توفقم تا غفوراً رحیماً	"	خلاصہ تفسیر
۵۴۰	شرک اور کفر کی سزا کا دائمی ہونا	۵۲۵	خلاصہ تفسیر	"	سفارش کی حقیقت اور اس کے اقسام و احکام
"	ظلم کی تین قسمیں	۵۲۶	ان آیات کے معارف و مسائل	۴۹۷	سفارش پر کچھ معاوضہ لینا رشوت ہے اور حرام ہے
"	شرک کی حقیقت	"	ہجرت کی تعریف	"	سلام اور اسلام
۵۴۱	آیات والذین امنوا تا محیطاً	۵۲۷	ہجرت کے فضائل	"	لفظ تحیہ کی تشریح اور اس کا تاریخی پہلو
۵۴۲	ترجمہ و خلاصہ تفسیر	۵۲۸	ہجرت کی برکات	"	اسلامی سلام تمام دوسری اقوام کے سلام سے بہتر ہے
۵۴۳	ان آیات کے معارف و مسائل	۵۲۹	آیات واذا ضربتم تا علیماً حکیماً	"	
"	مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان	۵۳۰	خلاصہ تفسیر	"	
"	مفاخرانہ گفتگو	۵۳۱	معارف و مسائل و ربط آیات	"	
۵۴۴	اللہ کے نزدیک مقبولیت کا ایک معیار	۵۳۲	سفر اور قصر کے احکام	"	



صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۶۰۷	خلاصہ تفسیر	۵۷۹	آیات بشر المنفقین تاسبیلاً	۵۵۵	قوموں کی گمراہی کا سبب اخلاص یا
۶۰۸	معارف و مسائل	۵۸۰	خلاصہ تفسیر		صوت عمل کا فقدان ہے
۶۰۹	آیات انا و حینا ایک تائیداً	۵۸۲	عزت اللہی سے طلب کرنی چاہیے	۵۵۷	آیات و یستفتونک فی النساء تا علیہا
۶۱۰	خلاصہ تفسیر		تفسیر بالرائے کر نوالے کی مجلس میں	۵۵۸	خلاصہ تفسیر
۶۱۱	معارف و مسائل	۵۸۳	شرکت جائز نہیں	۵۶۱	معارف و مسائل
۶۱۳	آیات یا ایھا الناس تا علیہا	۵۸۵	بروں کی صحبت سے تنہائی بھلی		ازدواجی زندگی سے متعلق چند
۶۱۴	خلاصہ تفسیر	۵۸۶	کفر پر راضی ہونا کفر ہے		قرآنی ہدایات
۶۱۵	آیت یا اھل الکتاب لا تظلموا تا وکیلاً	۵۸۷	آیات ان المنفقین یخونون تا میثلاً		زوجین کے جھگڑے میں دوسروں
۶۱۶	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل		خلاصہ تفسیر	۵۶۲	کا داخل بلا ضرورت مناسب نہیں
۶۱۷	و کلمۃ کی تشریح	۵۸۸	معارف و مسائل	۵۶۳	امور غیر اختیار پر مواخذہ نہیں
۶۱۸	و روح مذہ کی تشریح		آیات ان المنفقین تا علیہا		اس آیت سے تعدد از زوج کے خلاف
۶۱۹	لطیفہ	۵۸۹	خلاصہ تفسیر	۵۶۴	استدلال قطعاً غلط ہے
۶۲۰	ولا تقولواثلثۃ کی تشریح	۵۹۰	معارف و مسائل	۵۶۵	آیات ولیدنا فی السموات تا بصیراً
۶۲۱	دین میں غلو حرام ہے	۵۹۱	آیات لا یحب اللہ تارحیماً	۵۶۶	خلاصہ تفسیر
۶۲۲	فوائد مہتمہ		خلاصہ تفسیر	۵۶۷	معارف و مسائل و فوائد مہتمہ
۶۲۳	حُب دنیا کی حدود	۵۹۳	معارف و مسائل		آیت یا ایھا الذین تا خیراً
۶۲۴	سنت اور بدعت کی حدود		اسلام مدار نجات ہے کسی مخالف	۵۶۸	خلاصہ تفسیر
۶۲۵	علماء و مشائخ کی تعظیم و اتباع میں	۵۹۴	مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی		دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور آسمانی
۶۲۶	راہ اعتدال	۵۹۵	آیات یسئلک اھل الکتاب تا علیہا		کتابیں بھیجے گا اصل مقصد عدل و
۶۲۷	آیات لن یتنکف المسیح تا ولا نصیراً	۵۹۶	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل		انصاف کا قیام ہے اسی سے دنیا
۶۲۸	خلاصہ تفسیر	۵۹۸	آیات فبما نقضہم تا شہیداً		کا امن و امان قائم رہ سکتا ہے
۶۲۹	معارف و مسائل	۵۹۹	خلاصہ تفسیر		عدل و انصاف پر قائم رہنا صرف
۶۳۰	اللہ کا بندہ ہونا اعلیٰ درجہ کی	۶۰۱	معارف و مسائل	۵۷۲	حکومت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان
۶۳۱	شرافت اور عزت ہے		یہود کو اشتباہ کس طرح پیش آیا		اس کا مکلف ہے
۶۳۲	آیات یا ایھا الناس تا مستقیماً		آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام		امن عالم کی ضمانت صرف عقیدہ
۶۳۳	خلاصہ تفسیر و معارف و مسائل	۶۰۵	کے نزول کا عقیدہ قطعی اور اجماعی ہے	۵۷۳	آخرت اور خوف خدا سے سکتا ہے
۶۳۴	برہان سے کیا مراد ہے ؟		جس کا منکر کافر ہے		عدل و انصاف کے قیام میں رکاوٹ
۶۳۵	آیت یستفتونک تا علیہم	۶۰۶	آیات فبظلم من الذین تا ایماً	۵۷۴	بغنے والے اسباب
۶۳۶	خلاصہ تفسیر	۶۰۷	خلاصہ تفسیر	۵۷۵	آیات یا ایھا الذین امنوا تا سبیلاً
۶۳۷	معارف و مسائل	۶۰۸	معارف و مسائل		خلاصہ تفسیر
۶۳۸	فوائد مہتمہ		آیت لکن الراشون تا عظیماً	۵۷۶	فوائد مہتمہ و معارف و مسائل



# سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ

سُورَةُ آلِ عِمْرَانَ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَتَانِ آيَةٌ وَعِشْرُونَ رُكُوعًا

سورۃ آل عمران مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں دو سو آیتیں اور بیس رکوع ہیں،

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے،

الَمْ ۱ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۲ نَزَّلَ عَلَيْكَ

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ ہے سب کا نگہاٹنے والا، اتاری تجھ پر

الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَ

کتاب بھی تصدیق کرتی ہے اگلی کتابوں کی اور اُنارا توریت اور

الْإِنْجِيلَ ۳ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ ۴

انجیل کو اس کتاب سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اُنارے فیصلے،

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۵

بیشک جو منکر ہوئے اللہ کی آیتوں سے اُن کے واسطے سخت عذاب ہے،

وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انتِقَامٍ ۶ إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَى عَلَيْهِ شَيْءٌ ۷

اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا، اللہ پر چھپی نہیں کوئی چیز

فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۸ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ

زمین میں اور نہ آسمان میں، وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے



فِي الْآرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ

ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہے، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا زبردست ہے

الْحَكِيمُ ①

حکمت والا۔

رابط آیات

یہ قرآن کریم کی تیسری سورت آل عمران کا پہلا رکوع ہے، پہلی سورت یعنی فاتحہ جو پورے قرآن کا خلاصہ ہے اس کے آخر میں صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کی گئی تھی، اس کے بعد سورۃ بقرہ اَلْمَدَّةُ ذَالِکَ اُنْکِشَب سے شروع کر کے گویا اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ سورۃ فاتحہ میں جو سیدھے راستہ کی دعا کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے قبول کر کے یہ قرآن بھیج دیا جو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے، پھر سورۃ بقرہ میں اکثر احکام شرعیہ کا اجمالی اور تفصیلی بیان آیا، جس کے ضمن میں جا بجا کفار کی مخالفت اور ان سے مقابلہ کا بھی ذکر آیا، آخر میں اس کو فَاَنْصُرْنَا عَلٰی الْکَافِرِیْنَ کے جملہ دعائیہ پر ختم کیا گیا تھا، جس کا حاصل تھا کفار پر غلبہ پانے کی دعا، اس کی مناسبت سے سورۃ آل عمران میں عام طور پر کفار کے ساتھ معاملہ اور ہاتھ اور زبان سے ان کے مقابلہ میں جہاد کا بیان ہے، جو گویا فَاَنْصُرْنَا عَلٰی الْکَافِرِیْنَ کی تشریح و تفصیل ہے۔

## خلاصہ تفسیر

سورۃ آل عمران کی ابتدائی پانچ آیتوں میں اس مقصدِ عظیم کا ذکر ہے، جس کی وجہ سے کفر و اسلام اور کافر و مؤمن کی تقسیم اور باہمی مقابلہ شروع ہوتا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کی توحید ہے، اس کے ماننے والے مؤمن اور نہ ماننے والے کافر و غیر مسلم کہلاتے ہیں، اس رکوع کی پہلی آیت میں توحید کی عقلی دلیل مذکور ہے، اور دوسری آیت میں نقلی دلیل بیان فرمائی گئی ہے اس کے بعد کی آیت میں کفار کے کچھ مشبہات کا جواب ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہے، اَلْمَدَّةُ اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ، اس میں لفظ اَلْمَدَّةُ تو متشابہاتِ متراہنہ میں سے ہے، جس کے معنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک راز ہے، جسکی تفصیل اس رکوع کی آخری آیتوں میں آتی ہے، اس کے بعد اَللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ میں مضمون توحید کو ایک دعوے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابلِ معبود بنانے کے نہیں۔



اس کے بعد لفظ **الْحَقُّ الْقَيُّومُ** سے توحید کی عقل و دلیل بیان کی گئی، جس کی تشریح یہ ہے کہ عبارت نام ہے اپنے آپ کو کسی کے سامنے انتہائی عاجز و ذلیل کر کے پیش کرنے کا، اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس کی عبارت کی جائے وہ عزت و جبروت کے انتہائی مقام کا مالک اور ہر اعتبار سے کامل ہو، اور یہ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے، اپنے وجود اور اس کی بقا میں دوسرے کی محتاج ہو اس کا عزت و جبروت میں کیا مقام ہو سکتا ہے، اس لئے بالکل واضح ہو گیا کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں نہ خود اپنے وجود کی مالک ہیں اور نہ ہی اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں وہ خواہ پتھر کے تراشیدہ بت ہوں یا پانی اور درخت ہوں یا فرشتے اور پیغمبر ہوں ان میں کوئی بھی لائق عبارت نہیں، لائق عبارت وہی ذات ہو سکتی ہے جو ہمیشہ سے زندہ و موجود ہے اور ہمیشہ زندہ و قائم رہے گی اور وہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات ہے، اس کے سوا کوئی عبارت کے لائق نہیں۔

اس کے بعد دوسری آیت میں توحید کی نقلی دلیل بیان فرمائی گئی، ارشاد ہے، **نَزَّلَ عَالِيكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ، وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنجِيلَ مِّن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ**

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی توحید کا مضمون جو قرآن نے بیان کیا ہے یہ کچھ قرآن کی یا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہیں، بلکہ اس سے پہلے بھی تورات و انجیل وغیرہ کتابیں اور انبیاء اللہ تعالیٰ نے بھیجے ہیں، ان سب کا یہی دعویٰ اور یہی کلمہ تھا، قرآن مجید نے آکر ان سب کی تصدیق کی ہے، کوئی نیا دعویٰ پیش نہیں کیا، جس کے سمجھنے یا ماننے میں لوگوں کو کوئی الجھن ہو۔

آخری دو آیتوں میں توحید کی دلیل کا تکملہ حق تعالیٰ کی صفات علم و قدرت کے بیان سے کیا گیا ہے، کہ جو ذات علم محیط ازل کی مالک ہے، اور جس کی قدرت ہر شے پر حادی ہے، وہی اس کی مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، ناقص علم اور محدود قدرت والے کو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے :-

اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں، اور وہ زندہ (جادید) ہیں، سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس قرآن بھیجا ہے، واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں اور (اسی طرح) بھیجا تھا توریت اور انجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے اور اسی سے قرآن کا ہدایت ہونا بھی لازم آگیا، کیونکہ ہدایت، کا مصدق بھی



ہدایت ہے) اور اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کی تصدیق کے واسطے) بھیجے معجزات، بیشک جو لوگ مست کر ہیں اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے (جو توحید پر دلالت کرتی ہیں) ان کے لئے سزا سخت ہے، اور اللہ تعالیٰ غلبہ (اور قدرت) والے ہیں (کہ بدلہ لے سکتے ہیں اور) بدلہ لینے والے (بھی) ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے (نہ کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں (پس ان کا علم بھی نہایت کامل ہے) وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمھاری صورت (مشکل) بنانا ہے جس طرح چاہتا ہے (کسی کی کیسی صورت اور کسی کی کیسی صورت، پس ان کی قدرت بھی کامل ہے، حیات اور قیومیت اور علم اور قدرت جو اہمات صفات سے ہیں ان میں کامل طور سے بلا شریک موجود ہیں جس سے ثابت ہوا کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں، جس (اس ذات پاک) کے (اور) وہ غلبہ والے ہیں (مستکر توحید سے انتقام لے سکتے ہیں لیکن) حکمت والے (بھی) ہیں (کہ بمصلحت دنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے)

## معارف و مسائل

توحید کی طرف دعوت | دوسری آیت میں جو نقلی دلیل توحید کی پیش کی گئی ہے، تشریح اس کی یہ ہے  
تعام انبیاء کا وظیفہ رہا ہے کہ جس بات پر بہت سے انسان متفق ہوں، خصوصاً جبکہ وہ مختلف ملکوں کے باشندے اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، اور درمیان میں سینکڑوں ہزاروں برس کا فاصلہ، اور ایک کی بات دوسرے تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں، اس کے باوجود جو اٹھتا ہے وہی ایک بات کہتا ہے جو پہلے لوگوں نے کہی تھی، اور سب کے سب ایک ہی بات اور ایک ہی عقیدہ کے پابند ہوتے ہیں تو فطرت اس کے مقبول کرنے پر مجبور ہوتی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا وجود اور اس کی توحید کا مضمون انسانوں میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے کر آئے اور ان کے بعد ان کی اولاد میں تو مسلسل اس بات کا چلنا کچھ بعید نہ تھا، لیکن زمانہ دراز گزر جانے اور اولاد آدم کے وہ تمام طریقے بدل جانے کے بعد پھر حضرت نوح علیہ السلام آتے ہیں، اس چیز کی دعوت دیتے ہیں جس کی طرف آدم علیہ السلام نے لوگوں کو بلایا تھا، اُن کے زمانہ دراز گزرنے کے بعد ابراہیم، اسمعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ملک عراق و شام میں پیدا ہوتے ہیں، اور ٹھیک وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے سلسلہ کے انبیاء آتے ہیں، اور سب کے سب وہی ایک کلمہ توحید بولتے ہیں، اور وہی دعوت دیتے ہیں، ان پر زمانہ دراز گزر جانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام وہی دعوت لے کر اٹھتے ہیں، اور آخر میں سید الانبیاء سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم



وہی دعوت لیکر تشریف لاتے ہیں۔

اب اگر ایک خالی الذہن انسان جسکو اسلام اور توحید کی دعوت سے کوئی بغض اور ریس نہ ہو سادگی کے ساتھ ذرا اس سلسلہ پر نظر ڈالے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں میں، مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے، اور سب کے سب یہی کہتے اور بتلاتے چلے آئے، اکثر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا، زمانہ تصنیف و تالیف اور کتابت کا بھی نہ تھا، کہ ایک پیغمبر کو دوسرے پیغمبر کی کتابیں اور تحریریں مل جاتی ہوں، اُن کو دیکھ کر وہ اس دعوت کو اپنا لیتے ہوں، بلکہ انہی میں ہر ایک دوسرے سے بہت قرون کے بعد پیدا ہوتا ہے، اس کو اسباب دنیا کے تحت پچھلے انبیاء کی کوئی خبر نہیں ہوتی، البتہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی پا کر ان سب کے حالات و کیفیات سے مطلع ہوتا ہے، اور خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے اس کو اس دعوت کے لئے کھڑا کیا جاتا ہے۔

اب کوئی آدمی ذرا سا انصاف کے ساتھ غور کرے کہ اگر ایک لاکھ چوبیس ہزار انسان مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں ایک ہی بات کو بیان کریں تو قطع نظر اس سے کہ بیان کرنے والے ثقہ اور معتبر لوگ ہیں یا نہیں، اتنی عظیم الشان جماعت کا ایک ہی بات پر متفق ہونا ایک انسان کے لئے اس بات کی تصدیق کے واسطے کافی ہو جاتا ہے، اور جب انبیاء علیہم السلام کی ذاتی خصوصیات اور ان کے صدق و عدل کے انتہائی بلند معیار پر نظر ڈالی جائے تو ایک انسان یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کا کلمہ صحیح اور ان کی دعوت حق اور فلاح دنیا و آخرت ہے۔

شروع کی دو آیتوں میں جو مضمون توحید کا ارشاد فرمایا گیا اس کے متعلق حدیث کی روایات میں ہے کہ بعض نصاریٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے مذہبی گفتگو جاری ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ جل شانہ کی توحید کے ثبوت میں یہی دو دلیلیں باذن خداوندی پیش فرمائی، جن سے نصاریٰ لاجواب ہوئے۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیتوں میں بھی اسی مضمون توحید کی تکمیل ہے، تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم محیط کا بیان ہے، جس سے کسی جہان کا کوئی ذرہ چھپا ہوا نہیں اور چوتھی آیت میں اس کی قدرت کاملہ اور قادر مطلق ہونے کا بیان ہے کہ اس نے انسان کو بطین مادر کی تین اندھیریوں میں کیسی حکمت بالغہ کے ساتھ بنایا، اور انکی صورتوں اور رنگوں میں وہ صنعتکاری فرمائی کہ اربوں انسانوں میں ایک کی صورت دوسرے سے



ایسی نہیں ملتی کہ امتسیاز نہ رہے، اس علم محیط اور قدرت کاملہ کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، اس کے سوا سب کے سب علم و قدرت میں یہ مقام نہیں رکھتے، اس لئے وہ لائق عبادت نہیں۔

اس طرح توحید کے اثبات کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی چار اہم صفات ان چار آیتوں میں آگئیں، پہلی اور دوسری آیت میں صفات حیات اذلی وابدی اور قیومیت کا بیان ہوا، تیسری سے چھٹی آیت تک علم محیط اور قدرت کاملہ مطلقہ کا اس سے ثابت ہوا کہ جو ذات ان چار صفات کی جامع ہو وہی عبادت کے لائق ہے۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی

أَمْ الْكِتَابِ وَالْآخِرُ مُتَشَابِهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ

واضح ہیں وہ اصل میں کتاب کی اور دوسری میں متشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں ہو جن کے دلوں

زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ

میں بھی جو وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی مگر اسی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم

تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ

کرنے کی وجہ سے اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے اور مضبوط علم والے

فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذْكُرُ

کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے اتاری ہیں اور سمجھانے سے

إِلَّا أُولَٰئِكَ الْبَابُ ④

وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے

**رابط آیات** | پچھلی چار آیتوں میں توحید باری تعالیٰ کا اثبات تھا، اس آیت میں توحید کے خلاف بعض شبہات کا جواب ہے، واقعہ اس کا یہ ہے کہ ایک دفعہ بخران کے کچھ نصاریٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور مذہبی گفتگو شروع کی، آپ نے نصاریٰ کے عقیدہ تثلیث کی تردید بڑی تفصیل سے فرما کر توحید باری تعالیٰ کو ثابت کیا، آپ نے اپنے دعوے پر اللہ تعالیٰ کی صفات حیات وائمه، قدرت کاملہ،



علم محیط اور قدرت تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے یکتا اور منفرد ہونے سے استدلال کیا، اور یہ سب مقدمات نصاریٰ کو تسلیم کرنا پڑے، جب توحید ثابت ہو گئی تو اسی سے تثلیث کے عقیدہ کا بطلان بھی ثابت ہو گیا، ان لوگوں نے قرآن کے ان الفاظ پر اپنے کچھ شبہات پیش کئے جن میں عیسیٰ علیہ السلام کا روح اللہ یا کلمۃ اللہ ہونا مذکور ہے کہ ان الفاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریکت الہیت ثابت ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان شبہات کو ختم کر دیا، کہ یہ کلمات متشابہات ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان ایک راز ہیں، جن کی حقیقت برعوام مطلع نہیں ہو سکتے، عوام کے لئے ان الفاظ کی تحقیق میں پڑنا بھی روا نہیں، ان پر اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ جو کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے، مزید تفتیش اور کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

## خلاصہ تفسیر

وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو، جس میں کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ متشابہ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی اُن کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں، (اس) کتاب (یعنی قرآن) کا (یعنی جن کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو بھی ظاہر المعنی کے موافق بنایا جاتا ہے) اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں (یعنی ان کا مطلب خفی ہے، خواہ مجمل ہونے کی وجہ سے خواہ کسی نص ظاہر المراد کے ساتھ معارض ہونے کی وجہ سے) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے، (دین میں) شور مچ ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد) کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مطلب حاصل کریں) حالانکہ اس کا صحیح مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا دیا اگر وہ خود قرآن یا حدیث کے ذریعہ سے صراحۃً یا اشارۃً بتلا دیں، جیسے لفظ صلوٰۃ کی مراد صراحۃً معلوم ہو گئی، اور استواء علی العرش وغیرہ کی تاویل بعض کی رائے پر قواعد کلیہ سے معلوم ہو گئی، تو بس اسی قدر دوسروں کو بھی خبر ہو سکتی ہے، زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا، جیسے مقطعات قرآنہ کے الف لام میم وغیرہ کے معنی کسی کو معلوم نہیں ہوئے، اور بعض کی رائے پر استواء علی العرش کے معنی بھی معلوم نہیں ہوئے، اور (اسی واسطے) جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار اور فہیم ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین



رکھتے ہیں سب راہیں ظاہر المعنی بھی خفی المعنی بھی، ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں، پس ان کے جو کچھ معنی اور مراد واقع میں ہوں وہ حق ہیں، اور فصاحت کی بات کو، وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہل عقل ہیں (یعنی عقل کا مقتضا بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو مضر اور فضول قصہ میں نہ لگے)۔

## معارف و مسائل

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آیات محکمات اور متشابہات کا ذکر فرما کر ایک عام اصول اور ضابطے کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جس کے سمجھ لینے کے بعد بہت سے شبہات اور نزاعات ختم ہو سکتے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں، ایک قسم کو محکمات کہتے ہیں اور دوسری کو متشابہات۔

محکمات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر اور بین ہو جو قواعد عربیہ کو اچھی طرح جاننے والا ہو، اور جن آیات کی تفسیر اور معانی ایسے شخص پر ظاہر نہ ہوں ان کو متشابہات کہتے ہیں، (منظری ج ۲)

پہلی قسم کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے ام الكتاب کہا، جن کا مطلب یہ ہے کہ ساری تعلیمات کا اصل اصول یہی آیات ہوتی ہیں جن کے معانی اور مغایم اشتباہ والتباس سے پاک ہوتے ہیں۔

اور دوسری قسم کی آیات میں چونکہ متکلم کی مراد مبہم اور غیر متعین ہوتی ہے اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہئے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے، اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات محکمات کے مخالف نہ ہو، اور کوئی ایسی تاویل اور توجیہ صحیح نہ سمجھی جائے گی، جو اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہو، مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کر دی کہ "إِنَّهُ هُوَ الْاَعْبَدُ اُنْعَمْنَا عَلَیْهِ" (۵۹: ۲۳) ایسے ہی دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "إِنَّ مَثَلَ عِیسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ" (۵۹: ۲۴)

ان آیات اور انہی کی مثل دوسری بہت سی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کی مخلوق ہیں، لہذا انصاری کا ان کے بارے میں الوہیت اور انبیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔

اب اگر کوئی شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے صرف کلمۃ اللہ



اور روح منہ وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنی لینے لگے جو محکمت قرآنیم اور متواتر بیانات کے منافی ہوں تو یہ اس کی کج روی اور ہٹ دھرمی ہو جائے گی۔

کیونکہ متشابہات کی صحیح مراد صرف اللہ ہی کو معلوم ہے، وہی اپنے کرم و احسان سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے، لہذا ایسے متشابہات سے اپنی رائے کے مطابق کھینچ کر کوئی معنی نکالنا صحیح نہیں ہے۔

قَامَا الَّذِيْنَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ سلیم الفطرت ہوتے ہیں، وہ متشابہات کے بارے میں زیادہ تحقیق و تفتیش نہیں کرتے، بلکہ اجمالاً ایسی آیات پر ایمان لے آتے ہیں کہ یہ بھی اللہ کا برحق کلام ہے، اگرچہ اس نے کسی صلیحت کی وجہ سے ہم کو ان کے معانی پر مطلع نہیں فرمایا، درحقیقت یہی طریقہ سلامتی اور احتیاط کا ہے، اس کے برخلاف بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ محکمت سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کی کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق معانی نکال کر لوگوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن و حدیث میں سخت وعید آئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جب آپ ایسے لوگوں کو دیکھیں جو متشابہات کی تفتیش میں لگے ہوئے ہیں تو آپ ان سے دو بھاگیں، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے (قرآن) میں کیا ہے (بخاری ج ۲) ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے، اول یہ کہ مال بہت بھل جائے جس کی وجہ سے باہمی حسد میں مبتلا ہو جائیں اور کشت خون کرنے لگیں، دوسری یہ کہ کتاب اللہ سامنے کھل جائے (یعنی ترجمہ کے ذریعہ ہر عامی اور جاہل بھی اس کے سمجھنے کا مدعی ہو جائے) اور اس میں جو باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں یعنی متشابہات انکے معنی سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں حالانکہ ان کا مطلب اللہ ہی جانتا ہے، تیسری یہ کہ ان کا علم بڑھ جائے تو اُسے ضائع کر دیں اور غلام کو بڑھانے کی جھوٹوڑ دیں۔ (ابن کثیر بحوالہ طبرانی)

وَالَّذِيْنَ يَخْتَلِفُ فِي الْعِلْمِ يُقَوُّوْنَ اَمْتَابَهُ، اسخون فی العلم سے کون لوگ مراد ہیں؟

اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، جو قرآن و سنت کی اسی تعبیر و تشریح کو صحیح سمجھتے ہیں جو صحابہ کرام و سلف صالحین اور اجماع امت سے منقول ہوا اور قرآنی تعلیمات کا محور اور مرکز محکمت کو مانتے ہیں، اور متشابہات



کے جو معافیٰ ان کے فہم و اوراک سے باہر ہیں اپنی کوتاہ نظری اور قصور علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خدا کے سپرد کرتے ہیں، وہ اپنے کمالِ علمی اور قوتِ ایمانی پر مغرور نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل و عنایت کے طلبگار رہتے ہیں، ان کی طبیعتیں فتنہ پسند نہیں ہوتیں کہ متشابہات ہی کے پیچھے لگی رہیں، وہ محکّمات اور متشابہات سب کو حق سمجھتے ہیں، کیونکہ انھیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں، البتہ ایک قسم یعنی محکّمات کے معافیٰ ہمارے لئے معلوم کرنے مفید اور ضروری تھے، تو اللہ تعالیٰ نے وہ پوشیدہ نہیں رکھے، بلکہ کھول کھول کر بیان کر دیئے، اور دوسری قسم یعنی متشابہات کے معافیٰ اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے بیان نہیں فرمائے، لہذا ان کا معلوم کرنا بھی ہمارے لئے ضروری نہیں، ایسی آیات پر ایمان اجمالاً لے آنا ہی کافی ہے، (مظہری ملخصاً)

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ

لے رب نہ پھیر ہمارے دلوں کو جب تو ہم کو ہدایت کر چکا اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس

لَدُنْكَ رَحْمَةً ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۹﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ

سے رحمت تو ہی ہے سب کچھ دینے والا ، اے رب ہمارے تو

جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ

جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کچھ شبہ نہیں، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا

الْبَيْعَاتِ ﴿۱۰﴾

اپنا وعدہ

**ربط آیات** پچھلی آیت میں حق پرستوں کے ایک کمال کا ذکر تھا کہ وہ باوجود علمی کمال رکھنے کے اس پر مغرور نہیں تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کرتے تھے، اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ اُن کے دوسرے کمال کو بیان فرما رہے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے، بعد اس کے کہ آپ ہم کو (حق کی نظر) ہدایت کر چکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمائیے (وہ رحمت یہ ہے کہ راہِ مستقیم پر قائم رہیں) بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمایاں والے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم یہ دعا کبھی سے بچنے کی اور حق پر قائم رہنے کی کسی دنیاوی غرض سے نہیں مانگتے، بلکہ



محض آخرت کی نجات کے واسطے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدانِ حشر میں) جمع کرنے والے ہیں اس دن میں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں (یعنی قیامت کے دن میں اور شک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف نہیں کرتے وعدہ کو (اس لئے قیامت کا آنا ضرور ہے اور اس واسطے ہم کو اس کی فکر ہے)

## معارف و مسائل

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت اللہ ہی کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے دل کو نیکی کی جانب مائل کر دیتے ہیں، اور جس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اس کے دل کو سیدھے راستے سے پھیر لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”کوئی دل ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو، وہ جب تک چاہتے ہیں اس کو حق پر قائم رکھتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں اس کو حق سے پھیر دیتے ہیں۔“

وہ قادر مطلق ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس لئے جن لوگوں کو دین پر قائم رہنے کی فکر ہوتی ہے، وہ ہمیشہ اپنے اللہ سے استقامت کی دعا مانگتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ استقامت کی دعا مانگا کرتے تھے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے ”يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلَى دِينِكَ“ یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ (منظہری، ج ۲)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

بیشک جو لوگ کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد

مِنَ اللَّهِ شَيْعًا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝۱۰ كَذَابٍ

اللہ کے سامنے کجھ اور وہی ہیں ایندھن دوزخ کے جیسے دستور

فِرْعَوْنَ ۚ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَآخَذَهُمْ

فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو پھر کڑا ان کو

اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِلَّذِينَ

اللہ نے ان کے گناہوں پر اور اللہ کا عذاب سخت ہے کہہ دے کائناتوں



كَفَرُوا وَاسْتَغْلَبُوا وَتَحَسَّرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ

کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور ہائے جاؤ گے دوزخ کی طرف اور کیا بُرا

الْبِهَادُ ⑪

ٹھکانا ہے

## خُلاصۂ تفسیر

بایقین جو لوگ کفر کرتے ہیں ہرگز ان کے کام نہیں آسکتے، اُن کے مال (دولت) اور  
 نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی ایسے لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے (ان لوگوں  
 کا معاملہ ایسا ہے) جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے کافر لوگوں کا  
 (وہ معاملہ یہ تھا) کہ انھوں نے ہماری آیتوں کو (یعنی اخبار و احکام کو) جھوٹا بتلایا، اس پر اللہ  
 تعالیٰ نے ان پر دار و گیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب اور اللہ تعالیٰ رک دار و گیر بڑی  
 سخت ہے، کیونکہ ان کی شان یہ ہے کہ وہ سخت سزا دینے والے ہیں (اسی طرح معاملہ ہوگا کہ  
 انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی، سو ان کو بھی ایسی ہی سزا ہوگی اور) ان کفر کرنے والے  
 لوگوں سے (یوں بھی فرما دیجئے کہ) تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ دار و گیر صرف آخرت میں ہوگی، بلکہ یہاں  
 اور وہاں دونوں جگہ ہوگی، چنانچہ دنیا میں (عنقریب تم) مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کئے  
 جاؤ گے، اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے اور (جہنم) ہے بُرا ٹھکانا۔

## معارف و مسائل

قُلْ لِّكُنْ يٰۤاَيُّهَا كَفَرُوْا وَاسْتَغْلَبُوْا، ممکن ہے کوئی اس آیت سے یہ شبہ کرے کہ آیت  
 سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مغلوب ہوں گے، حالانکہ سب کفار دنیا کے مغلوب نہیں ہیں لیکن  
 یہ شبہ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ یہاں کفار سے مراد تمام دنیا بھر کے کفار نہیں ہیں، بلکہ اس  
 وقت کے مشرکین اور یہود مراد ہیں، چنانچہ مشرکین کو قتل و قید اور یہود کو قتل و قید کے ساتھ  
 جزیہ اور جلا وطنی کے ذریعہ مغلوب کیا گیا تھا۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ فِیۡ فِتْنَتِیۡنِ الثَّقَاتِ فِیۡمَا تُقَاتِل فِیۡ سَبِیْلِ

ابھی گزر چکا ہے تمھارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں میں جن میں مقابلہ ہوا، ایک فوج ہے جو لڑتی ہے اللہ کی



اللّٰهُ وَآخِرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأَى الْعَيْنِ

راہ میں اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں یہ ان کو اپنے سے دو چہ صریح آنکھوں سے ،

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِہٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً

اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جسکو چاہے ، اسی میں عبرت ہے دیکھنے

لِاُولٰٓئِی الْاَبْصَارِ ۝۱۳

والوں کو

رابط آیات | پچھلی آیات میں کفار کے مغلوب ہونے کی خبر دی گئی تھی اب اس آیت سے اس کی ایک مثال بطور دلیل کے بیان فرماتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

بیشک تمہارے (استدلال کے) لئے بڑا نمونہ ہے دو گروہوں (کا واقعہ) میں جو کہ باہم بدر کی لڑائی میں، ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تھے، ایک گروہ تو (یعنی مسلمان) اللہ کی راہ میں لڑتے تھے اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے اور کافر اس قدر زیادہ تھے کہ یہ کافر اپنے (گروہ) کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کتنی جتنے (زیادہ) ہیں (اور دیکھنا بھی کچھ وہم و خیال کا نہیں بلکہ) کھلی آنکھوں دیکھنا جس کے واقعی ہونے میں شبہ نہیں تھا، لیکن کفار کا وجود اس قدر زیادہ عدد ہونے کے پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا اور (غالب اور مغلوب کرنا محض قبضۂ خداوندی میں ہے) اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیدیتے ہیں (سو) بلا شک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے (اور نمونہ) ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

## معارف و مسائل

اس آیت میں جنگ بدر کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، جس میں کفار تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس ساٹھ سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے، دوسری طرف مسلمان مجاہدین



میں سو سے کچھ اوپر تھے، جن کے پاس کُل ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں، اور تماشہ یہ تھا کہ ہر ایک فریق کو حریف مقابل اپنے سے دو گنا نظر آتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کفار کے دل مسلمانوں کی کمزرت کا تصور کر کے مرعوب ہو رہے تھے، اور مسلمان اپنے سے دو گنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے، اور کامل توکل و استقلال سے خدا کے وعدہ "إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ قِطَانٌ صَابِرٌ يُغْلِبُوا يَاسِينَ" (۸۱: ۶۶) پر اعتماد کر کے فتح و نصرت کی امید رکھتے تھے، اگر ان کی پوری تعداد جو تین گنی تھی منکشف ہو جاتی تو ممکن تھا خوف طاری ہو جاتا، اور یہ سریقین کا دو گنی تعداد دیکھنا بعض احوال میں تھا، ورنہ بعض احوال وہ تھے جب ہر ایک کو دوسرے فریق کی جمعیت کم محسوس ہوئی، جیسا کہ سورة انفال میں آئے گا۔

بہر حال ایک قلیل اور بے سرو سامان جماعت کو ایسی مضبوط جمعیت کے مقابلے میں ان پیشینگوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں اس طرح کامیاب کرنا، آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرتناک واقعہ ہے (فوائد علامہ عثمانی)

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَ

فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں اور بیٹے اور

الْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ

خزانے جمع کئے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے

الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

نشان لگائے ہوئے اور مولیشی اور کھیتی یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں

وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَحْسَنُ الْمَوَاقِفِ ۝ قُلْ أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ

اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانا کہہ دے کیا باتوں میں ہم کو اس سے

ذَلِكَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا

بہتر پر ہمیز گاروں کے لئے اپنے رب کے ان باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَنْزَاجٌ مَّطَهَرَةٌ وَرِضْوَانٌ

ہیں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور عورتیں ہیں ستھری اور رضا مندی

مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِالْعِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا

اللہ کی اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے



إِنَّا أَمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۷ الصَّادِقِينَ

ہم ایمان لائے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب اور صبر کرنے والے ہیں

وَالصَّادِقِينَ وَالْقَنِتَّةِينَ وَالْمُسْتَفِيقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ

اور سچے اور حکم بجالانے والے اور خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے

بِالْأَسْحَارِ ۝۱۸

پچھلی رات میں

## خلاصہ تفسیر

**رَبِّطِ آیات** پہلی آیتوں میں کفار و مشرکین کی مخالفت اور ان کے مقابلہ میں جہاد کا ذکر تھا، اور ان آیات میں اسلام و ایمان کی مخالفت اور تمام بد اعمالیوں کی اصل منشاء کو بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ حُبِ دنیا ہے، کوئی جاہ و مال کے لالچ میں حق کی مخالفت اختیار کرتا ہے، کوئی نفسانی خواہشات کی وجہ سے اور کوئی اپنی آبائی رسوم کی محبت کے سبب حق کے مقابلہ پر کھڑا ہو جاتا ہے، اور ان ساری چیزوں کا خلاصہ ہے حُبِ دنیا، مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے۔

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبتِ مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوتیں بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوتے (یاد دہرے)، مولشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی (کی چیز) تو اللہ ہی کے پاس ہے (جو بعد موت کے کام آدے گی جس کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے) آپ (ان لوگوں سے یہ) فرما دیجئے کہ تم کو ایسی چیزیں ملادوں جو (بدرجہا) بہتر ہوں (مذکورہ) چیزوں سے (سوسنوں) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے باغ ہیں (یعنی بہشت) جن کی پائین میں ہنریں جاری ہیں ان (بہشتوں) میں، ہمیشہ ہمیشہ کوریں گے، (اور ان کے لئے) ایسی بیبیاں ہیں جو (ہر طرح) صاف ستھری کی ہوئی ہیں اور (ان کے لئے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے (بجھالتے) ہیں، بندوں (کے حال) کو (اس لئے) ڈرنے والوں کو یہ نعمتیں دیں گے، آگے ان ڈرنے والوں کی بعض



تفصیلی صفات ذکر کی جاتی ہیں، (یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے، اور ہم کو عذاب و دوزخ سے بچالیں (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راستباز ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے فروتنی کرنے والے ہیں، اور (نیک کاموں میں مال کے) خرچ کرنے والے ہیں، اور اخیر شب میں (اٹھ اٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

## معارف و مسائل

دنیا کی محبت فطری ہے | حدیث میں ارشاد ہے: «حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ» یعنی دنیا مگر اس میں غلو مہلک ہے | کی محبت ہر برائی کا سرچشمہ ہے | پہلی آیت میں دنیا کی چند اہم مرغوب چیزوں کا نام لے کر بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوش نما بنا دی گئی ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھٹلا بیٹھتے ہیں، جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر انسانی رغبت و محبت کا مرکز ہیں جن میں سب سے پہلے عورت کو اور اس کے بعد اولاد کو بیان کیا گیا ہے، کیونکہ دنیا میں انسان جتنی چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے ان سب کا اصلی سبب عورت یا اولاد کی ضرورت ہوتی ہے اس کے بعد سونے چاندی اور مویشی اور کھیتی کا ذکر ہے، کہ یہ دوسرے نمبر میں انسان کی رغبت و محبت کا مرکز ہوتے ہیں۔

خلاصہ و مطلب آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دلوں میں ڈال دی ہے، جس میں ہزاروں حکمتیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اگر انسان طبعی طور پر ان چیزوں کی طرف مائل اور ان سے محبت کرنے والا نہ ہوتا تو دنیا کا سارا نظام درہم و برہم ہو جاتا، کسی کو کیا غرض تھی کہ کھیتی کرنے کی مشقت اٹھاتا، یا مزدور می صنعت کی محنت برداشت کرتا، یا تجارت میں اپنا روپیہ اور محنت صرف کرتا، دنیا کی آبادی اور بقا اس میں مضمر تھی کہ لوگوں کی طبائع میں ان چیزوں کی محبت پیدا کر دی جائے جس سے وہ خود بخود ان چیزوں کے ہیا کرنے اور باقی رکھنے کی فکر میں پڑ جائیں، صبح اٹھ کر مزدور اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ کچھ پیسے کمائے، مالدار اس فکر میں گھر سے نکلتا ہے کہ پیسے خرچ کر کے کوئی مزدور لائے جس سے اپنا کام نکالے، تاجر بہتر سے بہتر سامان ہیا کر کے گاہک کے انتظار میں بیٹھتا ہے کہ پیسے حاصل کرے، گاہک سو کوششیں کر کے پیسے لیکر بازار پہنچتا ہے کہ اپنی ضرورت کا سامان خریدے، غور کیا جائے تو سب کو دنیا کی انھیں مرغوبات کی محبت نے اپنے اپنے



گھر سے نکالا، اور دنیا کے تمدنی نظام کو نہایت مضبوط و مستحکم اصول پر قائم کر دیا ہے۔

دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر دنیوی نعمتوں سے رغبت و محبت انسان کے دل میں نہ ہو تو اس کو اخروی نعمتوں کا نہ ذائقہ معلوم ہو گا نہ اُن میں رغبت ہوگی، تو پھر اس کو کیا ضرورت کہ وہ نیک اعمال کی کوشش کر کے جنت حاصل کرے، اور بُرے اعمال سے پرہیز کر کے دوزخ سے بچے؟  
تیسری حکمت اور وہی اس جگہ زیادہ قابلِ نظر ہے یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں پیدا کر کے انسان کا امتحان لیا جائے کہ کون ان چیزوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آخرت کو بھٹلا بیٹھتا ہے، اور کون ہے جو ان چیزوں کی اصل حقیقت اور ان کے آئی فانی ہونے پر مطلع ہو کر ان کی فکر بقدر ضرورت کرے، اور ان کو آخرت کی درستی کے کام میں لگائے، قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام میں خود اس تزمین کی یہی حکمت بتلائی گئی ہے، ارشاد ہے:

”یعنی ہم نے بنایا جو زمین پر ہیں زمین کی  
زیست، تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان  
میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے“

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ  
زِينَةً لِّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ  
أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸: ۷)

اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ دنیا کی ان مرغوب چیزوں کو انسان کے لئے مزین کر دینا بھی ایک فعل حسدِ اوندی ہے، جو بہت سی حکمتوں پر مبنی ہے، اور بعض آیات جن میں اس قسم کی تزمین کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَهْوَاءَهُمْ (۸: ۴۸)، ان میں ایسی چیزوں کی تزمین مراد ہے جو شرعاً اور عقلاً بُری ہیں، یا تزمین کا وہ درجہ مراد ہے جو حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے بُرا ہے، در نہ مباحات کو مزین کر دینا مطلقاً بُرا نہیں، بلکہ اس میں بہت سے فوائد بھی ہیں، اسی لئے بعض آیات میں اس تزمین کو صراحۃً حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جیسے ابھی بیان کیا گیا ہے۔

خُلَاَصاً کلام یہ ہے کہ دنیا کی لذت اور مرغوب چیزوں کو حق تعالیٰ نے اپنے فضل و حکمت سے انسان کے لئے مزین فرما کر ان کی محبت اس کے دل میں ڈال دی، جس میں بہت سی حکمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان کا امتحان لیا جائے کہ ان سرسری اور ظاہری مرغوبات اور اس کی چند روزہ لذت میں مبتلا ہونے کے بعد وہ اپنے اور ان سب چیزوں کے رب اور خالق و مالک کو یاد رکھتا ہے، اور ان چیزوں کو اس کی معرفت اور محبت کا ذریعہ بناتا ہے یا انہی کی محبت میں الجھ کر اصلی مالک و خالق کو اور آخرت میں اس کے سامنے پیشی اور حساب و کتاب کو بھٹلا بیٹھتا ہے، پہلا آدمی وہ ہے جس نے دنیا سے بھی فائدہ اٹھایا



اور آخرت میں بھی کامیاب رہا، دنیا کی مرغوبات اس کے لئے سنگِ راہ بننے کے بجائے سنگِ میل بن کر فلاحِ آخرت کا ذریعہ بن گئیں اور دوسرا شخص وہ ہے جس کے لئے یہی چیزیں حیاتِ آخرت کی بربادی اور دائمی عذاب کا سبب بن گئیں، اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ چیزیں دنیا میں بھی اس کے لئے عذاب ہی بن جاتی ہیں، قرآن کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا  
أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ  
لِيُعَذِّبَهُمْ بِمَا فِي الْخُلُوعِ  
الْأُنْيَا۔ (۵۵: ۹)

”یعنی آپ ان کافروں کے مال اور اولاد سے  
متعجب نہ ہوں کیونکہ ان نافرمانوں کو مالِ اولاد  
دینے سے کچھ ان کا بھلا نہیں ہوا، بلکہ یہ موال  
اولادِ آخرت میں تو ان کے لئے عذاب بنیں گے

ہی دنیا میں بھی رات دن کی فکروں اور مشاغل کے باعث عذاب ہی بن جاتے ہیں۔“

الغرض دنیا کی جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے انسان کے لئے مزین اور مرغوب بنا دیا ہے شریعت کے مطابق اعتدال کے ساتھ ان کی طلب اور ضرورت کے موافق ان کو جمع کرنا دنیا و آخرت کی فلاح ہے، اور ناجائز طریقوں پر ان کا استعمال یا جائز طریقوں میں اتنا غلو اور اہٹماک جس کے سبب آخرت سے غفلت ہو جائے باعثِ ہلاکت ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی کیا اچھی مثال بیان فرمائی ہے۔

آب اندر زیر کشتی پستی است  
آب در کشتی ہلاکت کشتی است

یعنی دنیا کا ساز و سامان پانی کے مانند ہے، اور اس میں انسان کا قلب ایک کشتی کی طرح ہے، پانی جب تک کشتی کے نیچے اور ارد گرد ہے تو کشتی کے لئے مفید اور معین اور اس کے مقصد و وجود کو پورا کرنے والا ہے، اور اگر پانی کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو یہی کشتی کی غرقابی اور ہلاکت کا سامان ہو جاتا ہے، اسی طرح دنیا کے مال و متاع جب تک انسان کے دل میں غلبہ نہ پالیں، اس کے لئے دین و دنیا میں معین و مددگار ہیں، اور جس وقت اس کے دل پر چھا جائیں تو دل کی ہلاکت ہیں، اسی لئے آیت متذکرہ میں چند خاص مرغوبات دنیا کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ذَلِكَ مَتَاعُ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

چیزیں دنیوی زندگی میں صرف کام چلانے کے لئے ہیں، دل لگانے کے لئے نہیں، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا، یعنی وہ ٹھکانا جہاں ہمیشہ رہنا ہے، اور جس کی نعمتیں اور لذتیں نہ فنا ہونے والی ہیں نہ کم یا ضعیف ہوتے والی۔



دوسری آیت میں اسی مضمون کی مزید توضیح کرنے کے لئے فرمایا:

قُلْ أَتُكْفِرُكُمْ بِغَيْرِ مَن ذَلِكُمْ لِّلَّذِينَ يَبْنِي الْقَوَاعِدَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ مَطْهُرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ مَّا لِعِبَادِهِ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ آپ ان لوگوں سے جو دنیا کی ناقص اور فانی نعمتوں میں مست ہو گئے ہیں فرمادیجئے کہ میں تمہیں ان سے بہتر نعمتوں کا پتہ دیتا ہوں، جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں اور اس کے فرمانبرداروں کو ملیں گی وہ نعمتیں سرسبز باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ہر قسم کی گندگی سے پاک و مناسبت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، پچھلی آیت میں دنیا کی چند بڑی نعمتوں کو شمار کیا گیا تھا کہ لوگ ان کی محبت میں مست ہیں، یعنی عورتیں، اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیر اور عمدہ کھوڑے اور مویشی اور کھیتی، ان کے مقابلے میں آخرت کی نعمتوں میں بظاہر تین چیزوں کا بیان آیا، اول جنت کے سرسبز باغات، دوسرے پاک صاف عورتیں، تیسرے رضائے خداوند کی باقی چیزوں میں سے اولاد کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ دنیا میں تو انسان اولاد کی محبت اس لئے کرتا ہے کہ اولاد سے اس کو اپنے کاموں میں مدد ملتی ہے، اور اس کے بعد اس سے اس کا نام زندہ رہتا ہے، آخرت میں نہ اس کو کسی کی مدد کی ضرورت رہے گی، نہ یہ فنا ہو گا، کہ اپنے بعد کے لئے کسی دلی یا وارث کی تلاش ہو، اس کے علاوہ دنیا میں جس کی اولاد ہے وہ سب اس کو جنت میں مل جائے گی، اور جس کی اولاد دنیا میں نہیں ہے اس کو اول تو آخرت میں اولاد کی خواہش ہی نہیں ہو گی، اور کسی کو خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ بھی دیدیں گے، حجام ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی جنتی کو اولاد کی خواہش ہو گی تو بچہ کا حمل پھر ولادت، پھر اس کا بڑا ہو جانا یہ سب تھوڑی دیر میں ہو جائے گا، اور اس کا مقصد پورا کر دیا جائے گا۔

اسی طرح جنت میں سونے چاندی کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ دنیا میں تو سونا چاندی اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے بدلہ میں دنیا کا سامان خریدا جاتا ہے، اور ہر ضرورت کی چیز اسی کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے، آخرت میں نہ کسی خرید و فروخت کی ضرورت رہے گی، نہ کسی چیز کا معاوضہ دینے کی ضرورت، بلکہ جس چیز کو جنتی کا دل چاہے گا، وہ فوراً مہیا کر دی جائے گی اس کے علاوہ جنت میں خود بھی سونے چاندی کی کمی نہیں، کیونکہ روایات سے ثابت ہے کہ جنت کے بعض محلات ایسے ہوں گے جن کی ایک اینٹ سونے کی اور دوسری چاندی کی ہو گی، بہر حال آخرت کے لحاظ سے وہ کوئی قابل ذکر چیز نہیں سمجھی گئی۔



اسی طرح گھوڑوں کا کام دنیا میں تو یہ ہے کہ اُن پر سواری کر کے مسافت سفر قطع کی جائے وہاں نہ سفر کی ضرورت نہ کسی سواری کی، البتہ احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ اہل جنت کو جمعہ کے روز عمدہ گھوڑے سواری کے لئے پیش کئے جائیں گے، جن پر سوار ہو کر اہل جنت اپنے اعزاء و احباب سے ملاقات کے لئے جایا کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہاں گھوڑے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے، جس کا ذکر کیا جائے، اسی طرح مویشی جو کھیتی کا کام دیتے ہیں یا دودھ کا، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے جنت میں بغیر ان مویشی کے واسطے کے خود عطا فرمادی ہیں۔

یہی حال کھیتی کا ہے کہ دنیا میں تو کھیتی کی مشقت مختلف اجناس کے پیدا کرنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے جنت میں یہ ساری اجناس خود بخود ہتیا ہوں گی، وہاں کسی کو کھیتی کی ضرورت ہی کیا ہوگی، اور کسی کو خواہ مخواہ کھیتی ہی سے محبت ہو تو اس کے لئے یہ بھی ہو جائے گا، جیسا کہ طرانی کی بعض روایات حدیث میں ہے کہ اہل جنت میں سے ایک شخص کھیتی کی تمنا کرے گا تو سارا کھیتی کا سامان جمع کر دیا جائے گا، پھر کھیتی کا بونا، لگانا، پکنا اور کاٹنا یہ سب چند منٹ میں ہو کر سامنے آجائے گا، اس لئے نعمائے آخرت میں صرف جنت اور جنت کی حوروں کا ذکر کر دینا کافی سمجھا گیا، کیونکہ اہل جنت کے لئے قرآن کریم میں یہ وعدہ بھی ہے کہ وَفِيهَا مَا تَشْتَهُیْهِ الْاَنْفُسُ (۲۳:۷۱)، یعنی ان کو ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ خواہش کریں گے، اس جامع اعلان کے بعد کسی خاص نعمت کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن ان میں سے چند مخصوص نعمتوں کا ذکر کر دیا گیا جو ہر جنتی کو بے مانگے ملیں گی، یعنی جنت کے سرسبز باغات اور حسین جبل عورتیں اور ان جامع نعمتوں کے بعد ایک سب سے بڑی نعمت کا ذکر کیا گیا، جس کا عام طور پر انسان کو تصور بھی نہیں ہوتا، اور وہ اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا و خوشنودی ہے، جس کے بعد ناراضی کا خطرہ نہیں رہتا، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب سب اہل جنت جنت پہنچ کر مسرور و مطمئن ہو چکیں گے، اور کوئی تمنا نہ رہے گی جو پوری نہ کر دی گئی ہو تو اس وقت حق تعالیٰ خود ان اہل جنت کو خطاب فرمائیں گے کہ اب تم راضی اور مطمئن ہو، کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں، وہ عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار آپ نے اتنی نعمتیں عطا فرمادی ہیں کہ اس کے بعد اور کسی چیز کی کیا ضرورت رہ سکتی ہے، حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب میں تم کو ان سب نعمتوں سے بالاتر ایک اور نعمت دیتا ہوں، وہ یہ کہ تم سب کو میری رضا اور قرب دائمی طور پر حاصل ہے، اب ناراضی کا کوئی خطرہ نہیں، اس لئے نعمائے جنت کے سلب ہو جانے کا یا کم ہو جانے کا بھی خطرہ نہیں۔



انہی دو آیتوں کا خلاصہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی  
ملعون ہے بجز ان چیزوں کے جن کو اللہ تعالیٰ  
کی رضا جوئی کا ذریعہ بنالیا جاتے، اور ایک  
روایت میں یہ ہے کہ بجز ذکر اللہ کے اور اس چیز

الَّذِي نَبَا مَلْعُونَةٌ وَمَلْعُونٌ مَا فِيهَا  
إِلَّا مَا أَتَى بِهِ وَجْهَ اللَّهِ وَفِي  
رَوَايَةٍ إِلَّا ذِكْرُ اللَّهِ وَمَا وَالَاهُ  
أَوْ عَالِمًا أَوْ مُتَعَلِّمًا۔

کے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور بحسبِ عالم اور طالبِ علم کے ۛ

یہ حدیث ابن ماجہ اور طبرانی نے بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل فرمائی ہے۔

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی

قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝۱۹

وہی حاکم انصاف کا ہے کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے نہ بدست ہے حکمت والا۔ بیشک

الَّذِينَ عِنْدَ اللَّهِ الْأَسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أوتُوا

دین جو ہے اللہ کے یہاں سو یہی مسلمانی کھرداری اور مخالف نہیں ہوتے کتاب

الْكِتَابِ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ

والے مگر جب ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد اور حسد سے

وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعٌ الْحِسَابِ ۝۲۰

اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا تو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

## خلاصہ تفسیر

سابقہ آیات میں توحید کا بیان ہوا ہے، مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں  
رَبِّطِ آيَاتِ | بھی توحید خداوندی کا مضمون ایک خاص انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ

اس پر تین شہادتوں کا ذکر ہے، ایک خود اللہ جل شانہ کی شہادت دوسرے اس کے فرشتوں

کی، تیسرے اہل علم کی، اللہ جل شانہ کی شہادت تو بطور مجاز ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ جل شانہ

کی ذات و صفات اور اس کے تمام مظاہر و مصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں

ہر گیارہ کہ از زمین روید ؛ و حدہ لا شریک لہ گوید



اس کے علاوہ اس کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول اور کتابیں بھی اس کی توحید پر شاہد ہیں اور یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں تو گویا خود اس کی شہادت اس بات پر ہے کہ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔

دوسری شہادت فرشتوں کی ذکر کی گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مقرب اور اس کے نیکوئی امور کے اہلکار ہیں، وہ سب کچھ جان کر اور دیکھ کر شہادت دیتے ہیں کہ لائق عبادت اللہ تعالیٰ شأ کے سوا کوئی نہیں۔

تیسری شہادت اہل علم کی ہے کہ اہل علم سے مراد انبیاء علیہم السلام اور عام علماء اسلام ہیں، اسی لئے امام غزالیؒ اور ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ اس میں علماء کی بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شہادت کو اپنی اور اپنے فرشتوں کی شہادت کے ساتھ ذکر فرمایا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل علم سے مطلق وہ لوگ مراد ہوں جو علمی اصول پر صحیح نظر کر کے یا کائنات عالم میں غور و فکر کر کے حق جل و علا شائہ کی وحدانیت کا علم حاصل کر سکیں، اگرچہ وہ ضابطہ کے عالم نہ ہوں اور دوسری آیت میں اللہ کے نزدیک صرف دین اسلام کا مقبول ہونا اس کے سوا کسی دین مذہب کا مقبول نہ ہونا بیان کر کے مضمون توحید کی تکمیل فرمائی، اور اس سے اختلاف کرنے والوں کی تباہ حالی بیان فرمائی، مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:

گواہی دی ہے اللہ نے (کتاب سماویہ میں) اس (مضمون) کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، اور فرشتوں نے بھی (اپنے ذکر و تسبیح میں) اس کی گواہی دی ہے، کیونکہ ان کے اذکار توحید سے بھرے ہوئے ہیں، اور (دوسرے) اہل علم نے بھی (اپنی تقریرات و تحریرات میں) اس کی گواہی دی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں، بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور اس کے حق ہونے میں اہل اسلام کے ساتھ) اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (اس طرح سے کہ اسلام کو باطل کہا، تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو اسلام کے حق ہونے کی) دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے، (یعنی اسلام کے حق ہونے میں کوئی وجہ شبہ کی نہیں ہوئی، بلکہ ان میں مادہ دوسروں سے بڑا بننے کا ہے اور اسلام لانے میں یہ سرداری جو ان کو اب عوام پر حاصل ہے فوت ہوتی تھی، اس لئے اسلام کو قبول نہیں کیا، بلکہ آٹا اس کو باطل بتلانے لگے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا جیسا ان لوگوں نے کیا، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد



اس کا حساب لینے والے میں (اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے حساب کا انجام عذاب ہوگا)۔

## معارف و مسائل

آیت شہد اللہ الخ کے فضائل | یہ آیت شہادت ایک خاص شان رکھتی ہے، امام تفسیر بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ یہود کے دو بڑے عالم ملک شام سے مدینہ طیبہ میں وارد ہوئے، مدینہ کی بستی کو دیکھ کر آپس میں تذکرہ کرنے لگے کہ یہ بستی تو اس طرح کی ہے جس کے لئے توراة میں پیشینگوئی آئی ہے کہ اُس میں نبی آخر الزماں قیام پذیر ہوں گے، اس کے بعد ان کو اطلاع ملی کہ یہاں کوئی بزرگ ہیں جن کو لوگ نبی کہتے ہیں، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ پر نظر پڑتے ہی وہ تمام صفات سامنے آگئیں جو توراة میں آپ کے لئے بتلائی گئی تھیں، حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، پھر عرض کیا کہ آپ احمد ہیں، آپ نے فرمایا ہاں، میں محمد ہوں اور احمد ہوں، پھر عرض کیا کہ ہم آپ سے ایک سوال کرتے ہیں، اگر آپ اس کا صحیح جواب دیں تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپ نے فرمایا دریافت کرو، انھوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سب بڑی شہادت کونسی ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ آیت شہادت نازل ہوئی، آپ نے ان کو پڑھ کر سنا دیا یہ دونوں اسی وقت مسلمان ہو گئے۔

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی تو اس کے بعد فرمایا:

وَأَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ

”یعنی اے پروردگار! میں بھی اس پر شاہد ہوں“

یا رب (ابن کثیر)

اور امام اعظمؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس آیت کی تلاوت کے بعد یہ کہے کہ اَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ۔ تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرشتوں سے فرمائیں گے میرے بندے نے ایک عہد کیا ہے، اور میں عہد پورا کرنے والوں میں سے زیادہ ہوں، اس لئے میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو (ابن کثیر)

اور حضرت ابوالیوب انصاریؒ کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر نماز فرض کے بعد سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی اور آیت شہد اللہ (۱۸:۳) اور قل اللہ ملک المملک سے بغیر حساب (۲۴:۲۶، ۲۷) تک پڑھا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سب گناہ معاف فرمائیں گے اور جنت میں جگہ دیں گے اور اس کی ستر جہنم پوری فرمائیں گے، جن میں سے کم سے کم جانب



اس کی مغفرت ہے“ (روح المعانی بحوالہ دہلی)

دین اور اسلام کے الفاظ کی تشریح | عربی زبان میں لفظ دین کے چند معنی ہیں جس میں ایک معنی میں طریقہ اور روش، و شران کی اصطلاح میں لفظ دین ان اصول و احکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء میں مشترک ہیں اور لفظ ”شریعت“ یا ”منہاج“ یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ مذہب ”فروعی احکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں، و شران کریم کا ارشاد ہے:

شَرَّاعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا  
وَحَّيَّ بِهِ نُوْحًا (۱۳:۲۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین چنا  
فرمایا جس کی وصیت تم سے پہلے نوح علیہ السلام

کو اور در سکر انبیاء علیہم السلام کو کی گئی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے جامع کمالات اور تمام نقائص سے پاک ہونے اور اس کے سوا کسی کالائق عباد نہ ہونے پر دل سے ایمان اور زبان سے اقرار و زیارت اور اس میں حساب کتاب اور جزاء و سزا اور جنت و دوزخ پر دل سے ایمان لانا اور زبان سے اقرار کرنا، اس کے بھیجے ہوئے ہر نبی و رسول اور ان کے لئے ہوتے احکام پر اسی طرح ایمان لانا۔

اور لفظ ”اسلام“ کے اصلی معنی ہیں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا، اور اس کے تالچ سرمان ہونا، اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی و رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لئے ہوئے احکام میں ان کی سرانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے، اور ان کا دین دین اسلام تھا، اسی معنی کے لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: وَأَمْرٌ أَنْ أَكُونِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (سورۃ یونس ۷۲) اور اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو اور اپنی امت کو امت مسلمہ فرمایا: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ (۱۲:۱۲۸)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریں نے اسی معنی کے اعتبار سے کہا تھا: وَأَشْهَدُ بِأَنَا مُسْلِمُونَ (آل عمران ۵۲)

اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین و شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا، اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی



اور امت محمدیہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے، جبرئیل علیہ السلام کی ایک حدیث جو تمام کتب حدیث میں مشہور ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی یہی خاص تفسیر بیان فرمائی ہے، آیت مذکورہ کے لفظ "الاسلام" میں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے پہلے معنی لئے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین صرف دین اسلام ہے، یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان بنانا اور ہر زمانہ میں جو رسول آئے اور وہ جو کچھ احکام لائے اس پر ایمان لانا اور اس کی تعمیل کرنا اس میں دین محمدی کی اگرچہ تخصیص نہیں، لیکن عام قاعدہ کے ماتحت حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے کے بعد ان پر اور ان کے لئے ہوئے تمام احکام پر ایمان و عمل بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں دین مقبول وہ تھا جو نوح علیہ السلام لائے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں وہ جو ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ تھا جو الواح تورات اور موسوی تعلیمات کی صورت میں آیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا اسلام وہ جو انجیل اور عیسوی ارشادات کے رنگ میں نازل ہوا اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا اسلام وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے بتلاتے ہوئے نقشہ پر مرتب ہوا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر نبی کے زمانہ میں ان کا لایا ہوا دین ہی دین اسلام اور عند اللہ مقبول تھا جو بعد میں یکے بعد دیگرے منسوخ ہوتا چلا آیا، آخر میں خاتم الانبیاء کا دین دین اسلام کہلایا، جو قیامت تک باقی رہے گا، اور اگر اسلام کے دوسرے معنی لئے جائیں یعنی وہ شریعت جو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے تو آیت کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں صرف وہی اسلام مقبول ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہے، پچھلے ادیان کو بھی اگرچہ ان کے اوقات میں اسلام کہا جاتا تھا، مگر اب منسوخ ہو چکے ہیں، اور دونوں صورتوں میں نتیجہ کلام ایک ہی ہے، کہ ہر پیغمبر کے زمانہ میں اللہ کے نزدیک مقبول دین وہ اسلام ہے جو اس پیغمبر کی وحی اور تعلیمات کے مطابق ہو اس کے سوا دوسرا کوئی دین مقبول نہیں خواہ وہ پچھلی منسوخ شدہ شریعت ہی ہو، اگلے زمانہ کے لئے وہ اسلام کہلانے کی مستحق نہیں، شریعت ابراہیم علیہ السلام ان کے زمانہ میں اسلام تھی، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس شریعت کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں شریعت موسویہ کا اگر کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو وہ اب اسلام نہیں، ٹھیک اسی طرح خاتم الانبیاء



صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شرائع سابقہ کے جو احکام منسوخ ہو گئے وہ اب اسلام نہیں رہے، اس لئے جو امت قرآن کی مخاطب ہے اس کے لئے اسلام کے معنی عام لئے جائیں یا خاص، دونوں کا حاصل یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف دین اسلام کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق ہو اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے، اس کے سوا کوئی دین مقبول اور ذریعہ نجات نہیں، یہ مضمون قرآن مجید کی بے شمار آیات میں مختلف عنوانات سے آیا ہے، ایک آیت کے الفاظ میں اس طرح وارد ہے: **وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ** (۸۵:۳) "یعنی جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین اختیار کرے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا، اس کے تابع جو عمل کیا جائے گا وہ ضائع ہوگا۔"

اس زمانہ میں نجات اسلام میں منحصر ہے، ان آیات نے پوری وضاحت کے ساتھ اس ملحدانہ نظریہ غیر مسلم کے اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کا خاتمہ کر دیا جس میں اسلام کی رواداری کے نام پر کفر و اسلام کو ایک کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ قرار بھی مقبول نہیں

دیا گیا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب خواہ یہودیت و نصرانیت ہو یا بت پرستی ہر ایک ذریعہ نجات بن سکتا ہے، بشرطیکہ اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کا پابند ہو، اور یہ حقیقت اسلام کے اصول کو منہدم کرنا ہے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی کوئی حقیقت ہی نہیں، محض ایک خیالی چیز ہے جو کفر کے ہر جامہ میں بھی کھپ سکتا ہے، قرآن کریم کی ان آیات اور انہی جیسی بے شمار آیات نے کھول کر بتلادیا ہے کہ جس طرح اجالا اور اندھیرا ایک نہیں ہو سکتے اسی طرح یہ باہنایت نامعقول اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی نافرمانی اور بغاوت بھی ایسے ہی پسند ہو جیسے اطاعت و فرمانبرداری، جو شخص اصولِ اسلام میں سے کسی ایک چیز کا منکر ہے وہ بلاشبہ خدا تعالیٰ کا باغی اور اس کے رسولوں کا دشمن ہے، خواہ فروعی اعمال اور رسمی حشلاق میں وہ کتنا ہی اچھا نظر آئے، نجاتِ آخرت کا مدار سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نسرمان برداری پر ہے، جو اس سے محروم رہا اس کے کسی عمل کا اعتبار نہیں قرآن مجید میں ایسے ہی لوگوں کے اعمال کے متعلق ارشاد ہے:

فَلَا كُفْيُكُمْ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ | | | | |  
وَزُنًا (۱۸:۱۰۵) | | | | |  
یعنی ہم قیامت کے دن ان کے کسی عمل کا وزن قائم نہ کریں گے۔

اس آیت میں اور اس سے پچھلی آیات میں چونکہ دوسرے سخن اہل کتاب کی طرف ہے اس لئے آخرت میں ان کی بیوقوفی اور غلط کاری کو اس طرح بیان فرمایا ہے:



وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ اُولَئِكَ اَوْ تَوَالِي كِتَابٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا  
 بِمَنَّهُمْ ۚ یعنی اہل کتاب نے جو عاتق الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اسلام میں خلافت  
 اور جھگڑاؤں اور وہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو کوئی اس معاملہ میں اشتباہ رہ گیا بلکہ ان کو اپنی کتاب  
 تورات و انجیل سے اور دوسرے ذرائع سے پوری طرح اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی حقانیت کا علم ہو چکا تھا لیکن مسلمانوں سے حسد اور محبت جاہ و مال نے ان کو اس  
 اختلاف میں مبتلا کیا ہے ۱

آخر میں فرمایا ہے: وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْآيَاتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝  
 یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ جلد اس سے حساب لینے والے میں  
 اول تو مرنے کے بعد اس عالم کا امتحان داخلہ قبر کے اس عالم میں ہوگا جس کو ترجیح کہا جاتا ہے  
 اور پھر تفصیلی حساب قیامت میں اس حساب و کتاب کے وقت سب جھگڑوں کی حقیقت  
 کھل جائے گی، باطل پرستوں کو اپنی حقیقت واضح ہو جائے گی، اور پھر اس کی سزا سامنے  
 آجائے گی۔

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلْتُ رَبِّي وَجِبَتْ لِي وَاللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۚ

پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑاں تو کہہ دے میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر اور انھوں نے بھی کہ جو میرے

وَقُلْ لِلَّذِينَ اُولَئِكَ اَوْ تَوَالِي كِتَابٍ وَالْاُمَمِينَ ۚ اَسَلْتُكُمْ

اور کہہ دے کتاب والوں کو اور ان بڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو ۱

فَإِنْ اَسَلْتُمْ اَفْقَدَ اهْتَدَ ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

پھر اگر وہ تابع ہوتے تو انھوں نے راہ سیدھی پائی اور اگر منہ پھیریں تو تیرے ذمہ صرف

الْبَلَاغُ ۚ وَاللّٰهُ بِصِيرٍ بِالْعِبَادِ ۚ

پہنچا دینا ہے، اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے

## خلاصہ تفسیر

مشرکین اور منکرین اہل کتاب کی جھگڑوں کا جواب دیا گیا ہے ۱  
 ربط آیات | شروع سورت میں توحید کا اثبات اور تثلیث کا رد کیا گیا تھا، ان آیات میں  
 اسلام کے حق ہونے پر دلیل قائم ہونے کے بعد، پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے



دخواہ مخواہ کی) جتنیں نکالیں تو آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ رتم مانویانہ مانو) میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کرچکا اور جو میرے پیرو تھے وہ بھی (اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کرچکے، یہ کنا یہ ہے اس سے کہ ہم سب اسلام اختیار کرچکے جس میں اعتقاد الوہیت کے اعتبار سے قلب کا رخ خاص اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے، کیونکہ دوسرے مذاہب میں کچھ کچھ شرک ہو گیا تھا) اور اس جواب کے بعد دریافت فرمانے کے طور پر، کہتے اہل کتاب سے اور مشرکین (عرب سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہِ راست پر آجائیں گے اور اگر وہ لوگ (اس سے بدستور) روگردانی رکھیں سو آپ اس کا بھی غم نہ کیجئے، کیونکہ آپ کے ذمہ صرف (احکام خداوندی کا) پہنچا دینا ہے اور رائجے، اللہ تعالیٰ خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے، (اپنے) بندوں کو (آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہے)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيْنَ

جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو

بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ

ناحق اور قتل کرتے ہیں ان کو جو حکم کرتے ہیں انصاف کرنے کا لوگوں میں سے،

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝۲۱ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ

سو خوش خبری سنائے ان کو عذاب دردناک کی یہی ہیں جن کی محنت ضائع

أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَالُهُمْ مِّنْ نَّصِرَةٍ ۝۲۲

ہوئی دنیا میں اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار

## خلاصہ تفسیر

رابط آیات | شروع سورہ میں کلام کا زیادہ رخ نصاریٰ کی طرف تھا، پھر آیت بالا میں الَّذِينَ أَذْنُوْا الْكِتٰب کا عنوان نصاریٰ اور یہود دونوں کو شامل تھا، اب ان آیات میں یہود کے بعض خاص احوال کا بیان ہے، رَدِّحِ الْمَعَالِی میں پر روایت ابن ابی حاتم اس آیت کی تفسیر میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے تینتا لیس سال نبیوں کو ایک وقت میں قتل کیا، ان کی نصیحت کیلئے ایک سو ستر بزرگ کھڑے ہوئے، اسی دن ان کا بھی کام تمام کر دیا (بیان القرآن)



بیشک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ جیسے یہود کہ انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے تھے اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو (اور وہ قتل کرنا خود ان کے خیال میں بھی) ناحق (ہوتا ہے) اور (نیز قتل کرتے ہیں ایسے شخصوں کو جو) افعال و اخلاق کے اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں، سو ایسے لوگوں کو خبر سنا دیجئے ایک سزائے دردناک کی (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ مجموعہ افعال مذکورہ کے سبب اُن کے سب اعمال (صالحہ) غارت ہو گئے دنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی) اور سزائے وقت، ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جن کو ملا کچھ ایک حصہ کتاب کا ان کو بلاتے ہیں

إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ وہ کتاب ان میں حکم کرے پھر منہ پھیرتے ہیں بعضے ان میں سے

وَهُمْ مَعْصِيُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ

تسافل کر کے یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں وہ ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ ﴿۲۳﴾

إِلَّا آيَاتًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ

دوزخ کی مگر چند دن گنتی کے اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر

فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْتَهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ

پھر کیا حال ہوگا جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن کہ اس کے آنے میں کچھ شبہ نہیں اور پورا پائے گا ہر کوئی

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٤﴾

اپنا کیا، اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی

## خلاصہ تفسیر

راے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (سامی یعنی توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا، کہ اگر ہدایت کے طالب ہوتے تو وہ حصہ اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی تھا، اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے اُن کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان (مذہبی اختلافات کا) فیصلہ کرے پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رنجی کرتے ہوئے (اور) یہ (یہ اعتنائی) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں



کہتے ہیں (اور یہی ان کا اعتقاد ہے) کہ ہم کو صرف گنتی کے حقوڑے دنوں تک روزِخ کی آگ لگے گی  
 پھر مغفرت ہو جاوے گی) اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کی تراشی ہوئی باتوں نے (جیسے  
 اس تراشے ہوئے عقیدہ نے ان کو دھوکہ دیا کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، اس خاندانی بزرگی سے ہماری  
 نجات ضرور ہو جائے گی، اس کے نتیجہ میں وہ اور کتاب اللہ سے بے اعتنائی کرنے لگے) سو ان  
 احوال و افعال و اقوالِ کفریہ کے سبب، ان کا کیا (بُرا) حال ہو گا، جب کہ ہم ان کو اس تاریخ میں  
 جمع کر لیں گے جس کے آنے میں ذرا شبہ نہیں اور اس تاریخ میں (پورا پورا بدلہ مل جاوے گا  
 کہ بے جرم یا زیادہ از جرم سزا ہوگی)

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ

تو کہہ یا اللہ مالکِ سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت

الْمُلْكِ مِنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

جھین یوے جس سے چاہے اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے

بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۳۶ تَوَجَّهَ الْغِيلُ

تیرے ہاتھ ہے سب خوبی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے تو داخل کرنا ہے رات کو

فِي النَّارِ وَتَوَلَّى الْوَلِجُ النَّارَ فِي الْغَيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ

دن میں اور داخل کرے دن کو رات میں اور تو نکالے زندہ مردہ

الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ

سے اور نکالے مردہ زندہ سے اور تو رزق دے جس کو چاہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷

بے شمار

## خلاصہ تفسیر

ان آیات میں امتِ محمدیہ کو ایک دعا و مناجات کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے  
 کہ اس کے ضمن میں امتِ محمدیہ کے کفار پر غلبہ پانے کی طرف اشارہ بھی ہے، جیسا اس کے  
 شانِ نزول سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روم و فارس فتح ہو جانے کا  
 وعدہ فرمایا تو منافقین و یہود نے ہنسنا کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کما فی روح المعانی



عن الواحدی عن ابن عباسؓ وائسؓ۔

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:

راے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہتے کہ اے مالک تمام ملک کے آپ ملک (کا جتنا چاہیں) جس کو چاہیں دیدیتے ہیں اور جس (کے قبضہ) سے چاہیں ملک رکھیں لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں ہست کر دیتے ہیں آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلا مشابہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں، آپ (بعض موسموں میں) رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے دن بڑا ہونے لگتا ہے) اور (بعض موسموں میں) دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے رات بڑھنے لگتی ہے) اور آپ جان دار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے بیضہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جان دار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندے سے بیضہ) اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں۔

## معارف و مسائل

اس آیت کا شان نزول | بذرو احد میں مشرکین مکہ کی مسلسل شکست اور مسلمانوں کے خلاف اور غزوہ خندق کا واقعہ | ہر جہد و جدہ میں ناکامی کے ساتھ مسلمانوں کی مسلسل ترقی اور اسلام کی روز افزائی اشاعت نے قریش مکہ اور تمام غیر مسلموں میں ایک بوکھلاہٹ پیدا کر دی تھی جس سے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ ایک عام سازش کی صورت میں یہ ظاہر ہوا کہ مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ سب کا ایک متحدہ محاذ مسلمانوں کے خلاف بن گیا، اور سب نے مل کر مدینہ پر بیجا رگی حملہ اور فیصلہ کن جنگ کی ٹھکان لی، اور ان کا بے پناہ شکر اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے مٹا ڈالنے کا عزم لے کر مدینہ پر چڑھ آیا، جس کا نام قرآن میں غزوہ احزاب اور تاریخ میں غزوہ خندق ہے، کیونکہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے یہ طے فرمایا تھا کہ غنیم کے راستہ میں مدینہ سے باہر خندق کھودی جائے۔

بیہقی اور ابونعیم اور ابن خزیمہ کی روایت میں ہے کہ خندق کھودنے کا کام مجاہدین اسلام صحابہ کرامؓ کے سپرد ہوا تو چالیس چالیس ہاتھ لمبی خندق دس دس آدمیوں کے سپرد تھی، یہ خندق کئی میل لمبی اور خاصی گہری اور چوڑی تھی جس کو غنیم عبور نہ کر سکے، اور کھدائی کے لئے تکمیل جلد سے جلد کرنا تھی اس لئے جان نثار صحابہ کرامؓ بڑی محنت سے اس میں مشغول تھے



کہ قصائے حاجت اور کھانے وغیرہ کی ضروریات کے لئے یہاں سے ہٹنا مشکل ہو رہا تھا، مسلسل بھوکے رہ کر یہ کام انجام دیا جا رہا تھا، اور یقیناً کام ایسا تھا کہ آجکل کی جدید آلات والی پلش بھی ہوتی تو اس تھوڑے وقت میں اس کام کا پورا کرنا آسان نہ ہوتا، مگر یہاں ایمانی طاقت کام کر رہی تھی جس نے باسانی تکمیل کرا دی۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک فرد کی حیثیت سے اس کھدائی کے کام میں شریک تھے، اتفاقاً خندق کے ایک حصہ میں پتھر کی بڑی چٹان نکل آئی، جن حضرات کے حصہ میں خندق کا یہ ٹکڑا تھا وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے عاجز ہو گئے، تو حضرت سلمان فارسیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ اب حضورؐ کا کیا حکم ہے؟ آپ اسی وقت موقع پر تشریف لائے اور کدال آہنی خود دست مبارک میں لے کر ایک ضرب لگائی تو اس چٹان کے ٹکڑے ہو گئے، اور ایک آگ کا شعلہ برآمد ہوا جس سے دور تک اس کی روشنی پھیل گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حیرۃ ملک فارس کے محلات و عمارت دکھلائی گئیں، پھر دوسری ضرب لگائی، اور پھر ایک شعلہ برآمد ہوا تو فرمایا کہ اس کی روشنی میں مجھے رومیوں کے سرخ سرخ محلات و عمارت دکھلائی گئیں، پھر تیسری ضرب لگائی اور روشنی پھیلی تو فرمایا کہ اس میں مجھے صنعا رہمن کے عظیم محلات دکھلائے گئے، اور فرمایا کہ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ میری امت ان تمام ممالک پر غالب آئے گی۔

منافقین مدینہ نے یہ سنا تو ان کو ہستہزار و تمسخر کا موقع ہاتھ آیا، مسلمانوں کا مذاق اڑایا، کہ دیکھو ان لوگوں کو جو حریف مقابل کے خوف سے خندق کھودنے میں اس طرح مشغول ہیں کہ ان کو اپنی ضروریات کا بھی ہوش نہیں، اپنی جانوں کی حفاظت ان کو مشکل ہو رہی ہے، ملک فارس دروم اور یمن کی فتوحات کے خواب دیکھ رہے ہیں حق تعالیٰ نے ان بے خبر ظالموں کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی: **قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ**

جس میں مناجات و دعا کے پیرایہ میں قوموں کے عروج و زوال اور ملکوں کے انقلاب میں حق جل و علا شانہ کی قدرت کاملہ کا بیان ایک نہایت بلیغ انداز سے کیا گیا ہے، اور فارس و روم کی فتوحات کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا، اس میں دنیا کے انقلابات سے بے خبر قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ سے ناواقف



قوم فوج اور عاد و ثمود کے واقعات سے غافل اور جاہل، دشمنان اسلام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تم ظاہری شان و شوکت کے پرستار یہ نہیں جانتے کہ دنیا کی ساری طاقتیں اور حکومتیں سب ایک ذات پاک کے قبضہ قدرت میں ہیں، عزت و ذلت اسی کے ہاتھ ہے، وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ غریبوں اور فقیروں کو تخت و تاج کا مالک بنائے، اور بڑے بڑے بادشاہوں سے حکومت و دولت چھین لے، اس کے لئے کچھ مشکل نہیں کہ آج کے خندق کھودنے والے فقیروں کو کل شام و عراق اور یمن کی حکومت عطا فرمائے۔

ذره ذره دہر کا پابستہ تقدیر ہے

زندگی کے خواب کی جامی ہی تعبیر ہے

جو چیزیں عادتہ بُری سمجھی جاتی ہیں | آیت کے اخیر میں فرمایا يَتَذَكَّرُ الْخَيْرُ، یعنی آپ کے ہاتھ میں ہے انجام کے اعتبار سے وہ بھی بُری نہیں ہر بھلائی، شروع آیت میں چونکہ حکومت دینے اور واپس لینے کا نیز عزت اور ذلت دونوں کا ذکر تھا، اس لئے بظاہر مقتضائے مقام یہ تھا کہ اس جگہ بھی يَتَذَكَّرُ الْخَيْرُ کہا جاتا، یعنی ہر بھلائی اور برائی آپ کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس آیت میں اس جگہ صرف لفظ "خیر" لا کر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جس چیز کو کوئی شخص یا کوئی قوم برائی یا مصیبت سمجھتی ہے اور وہ اس خاص قوم کے لئے گویا تکلیف و مصیبت ہوتی ہے، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مجموعہ عالم کے اعتبار سے وہ بُرائی نہیں ہوتی، قوموں کے عروج و نزول اور اس میں مصائب کے بعد فوائد کی تاریخ پر نظر ڈالی جا تو عربی کے مشہور شاعر متنبی کا یہ مصرعہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے کہ

مَصَائِبُ قَوْمٍ عِنْدَ قَوْمٍ قَوَائِدُ

ہیں ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں

مجموعہ عالم کے مصالح و فوائد پر نظر کرنے والا کسی نہ کسی درجہ میں اس حقیقت کو پاسکتا ہے کہ اس میں جتنی چیزیں خراب اور بُری سمجھی جاتی ہیں، وہ اپنی ذات میں چاہے بُری سمجھی جائیں مگر پورے عالم کو اگر ایک جسم فرض کر لیا جائے تو وہ اس کے چہرہ کے خال اور بال ہیں، خال اور بال اگر بدن سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں، لیکن ایک حسین چہرہ کا جز ہونے کی حالت میں یہی چیزیں رونق حسن ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم بُرا کہتے ہیں اور بُرا سمجھتے ہیں ان کی بُرائی جزوی ہے اور خالق کائنات اور رب العالمین کی نسبت اور مجموعہ عالم کی مصلحت کے اعتبار سے کوئی چیز شر یا خراب نہیں، کسی نے خوب کہا ہے



نہیں ہے چیز نکئی کوئی زمانے میں

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس لئے اس آیت کے ختم میں صرف لفظ "خیر" پر اکتفاء کر کے فرمایا گیا یَسِّرُ لَكَ الْخَيْرَ کیونکہ خالق کائنات کی حکمت اور حکومت اور مجموعہ عالم کی مصلحت کے لحاظ سے ہر چیز خیر ہی خیر ہے، یہاں تک پہلی آیت کا مضمون ختم ہوا، جس میں تمام عالم عناصر کی طاقتوں اور دنیا کی سب حکومتوں کا حق تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہونا بیان فرمایا ہے۔

دوسری آیت میں آسمانی طاقتوں اور فلکیات پر حق جل و علا شانہ کی قدرت کا مملہ کا احاطہ اس طرح بیان فرمایا ہے: تَوَلِّجُ النُّجُومَ فِي النُّجُومِ وَتَوَلِّجُ النُّجُومَ فِي النُّجُومِ، یعنی آپ جب چاہتے ہیں رات کے اجزاء دن میں داخل فرما کر دن کو بڑا کر دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں دن کے اجزاء رات میں داخل کر کے رات بڑی کر دیتے ہیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ رات اور دن کے بڑے چھوٹے ہونے کا مدار آفتاب کے طلوع و غروب اور اس کی حرکات پر ہے، اس لئے اس کا حاصل یہ ہوا کہ آسمان اور اس کے متعلق سب سے بڑا ستارہ شمس اور سب کے معروف ستارہ قمر سب آپ کے احاطہ قدرت میں ہیں، پھر عالم عناصر اور دنیا کی باقی طاقتوں میں کسی شک و شبہ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد عالم روحانیت پر حق جل و علا شانہ کا احاطہ قدرت اس طرح بیان فرمایا تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ یعنی آپ زندہ کو مردہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے بیضہ سے بچہ یا نطفہ سے انسان یا دانہ سے درخت کو نکال لیتے ہیں، اور مردہ کو زندہ سے نکال لیتے ہیں، جیسے جانور سے بیضہ اور انسان سے نطفہ یا درخت سے پھل اور دانہ خشک اور اگر زندہ اور مردہ کا مفہوم عام لیا جائے، تو عالم اور جاہل اور کامل و ناقص اور مومن و کافر سب کو شامل ہو جاتا ہے، جس سے حق جل و علا شانہ کی قدرت کاملہ اور اس کے تصرفات تمام عالم ارواح اور روحانیات پر واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ جب چاہیں تو کافر سے مومن یا جاہل سے عالم پیدا کر دیں اور جب چاہیں مومن سے کافر یا عالم سے جاہل پیدا کر دیں، آذر کے گھر میں خلیل اللہ پیدا ہو جائے، اور نوح علیہ السلام کے گھر میں ان کا بیٹا کافر رہ جائے، عالم کی اولاد جاہل رہ جائے اور جاہل کی اولاد عالم ہو جائے۔

اس تفصیل سے آپ نے معلوم کیا ہو گا کہ کیسی بلیغ ترتیب کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا تمام کائنات عالم پر محیط ہونا ترتیب وار بیان فرمایا گیا ہے کہ پہلے عالم عناصر اور اس کی قوتوں اور حکومتوں کا ذکر آیا ہے، پھر عالم افلاک اور اس کی قوتوں کا اور ان سب کے بعد



روح اور روحانیت کا ذکر آیا ہے جو درحقیقت سامعے عالم کی ساری قوتوں میں سب بالاتر قوت ہے، آخر آیت میں ارشاد فرمایا، وَكَرَزُومِنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یعنی آپ جسکو چاہیں بے شمار رزق عطا فرماویں جسکو کوئی مخلوق نہ معلوم کر سکے، اگرچہ خالق کے علم میں ذرہ ذرہ لکھا ہوا ہے۔

آیت مذکورہ کی معنی میں حضرت امام ابوحنیفہ نے اپنی سند کیسے اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی اور آل عمران کی تین آیتیں ایک آیت شہد اللہ انہ لا اله الا هو آخر کلام و نہی و تہنیتی آیت قل اللہم ملئ ملک الملک سے بغیر حساب تک پڑھا کرے تو میں اس کا سچا جنت میں بنا دوں گا، اور اس کو اپنے حظیرۃ القدس میں جسگہ دوں گا، اور ہر روز اس کی طرف ستر مرتبہ نظر رحمت کروں گا، اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا اور ہر حاسد اور دشمن سے پناہ دوں گا، اور ان پر اس کو غالب رکھوں گا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

نہ بنائیں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ

اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم

نَفْسَهُ وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۖ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝۳۸

اُن سے بچاؤ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

قُلْ إِنْ تَخْشَوْنَ مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُونَ مَا يَعْلَمُ اللَّهُ

تو کہہ اگر تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات یا اسے ظاہر کر دو گے جانتا ہے اس کو اللہ

وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ

اور اس کو معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ ہر چیز پر

شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝۳۹ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

قادر ہے جس دن موجود پائے گا ہر شخص جو کچھ کہ کی ہے اس نے نیکی اپنے

مُحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ

سامنے اور جو کچھ کہ کی ہے اس نے بُرائی آرزو کرے گا کہ مجھ میں اور اس میں بڑ جائے

أَمَلٌ بَعِيدٌ ۖ وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ ۖ وَاللَّهُ رَعُوفٌ

فرق دور کا اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے اور اللہ بہت مہربان ہے



## بِالْعِبَادِ ۴

بندوں پر

## خلاصہ تفسیر

**رابط آیات** | مذکورہ صدر آیات میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں اور اس ہدایت کی مخالفت کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ تعالیٰ سے دوستی و محبت کا علاقہ قطع ہو جائے گا، کافروں سے باطنی اور دلی دوستی تو مطلقاً حرام ہے، اور ظاہری دوستی معاملات کے درجہ میں اگرچہ جائز ہے، مگر بلا ضرورت وہ بھی پسند نہیں۔

مختصر تفسیر ان آیات کی یہ ہے:

مسلمانوں کو چاہئے کہ (ظاہر یا باطناً) کفار کو دوست نہ بنادیں مسلمانوں کی دوستی سے تجاوز کر کے (یہ تجاوز دو صورت سے ہوتا ہے، ایک یہ کہ مسلمانوں سے بالکل دوستی نہ رکھیں، دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی دوستی ہو اور کفار کے ساتھ بھی دونوں صورتیں ممانعت میں داخل ہیں) اور جو شخص ایسا کام کرے گا سو وہ اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں کیونکہ جن دو شخصوں میں باہم عداوت ہو ایک کی دوستی کر کے دوسرے سے دوستی کا دعویٰ قابل اعتماد نہیں ہو سکتا) مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تم اس سے کسی قسم کا رقومی اندیشہ رکھتے ہو (دباں دفع ضرر کی ضرورت ہے) اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراما ہے کہ اس کی ذات سے ڈر کر احکام کی مخالفت مت کرو) اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس وقت کی سزا کا خوف کرنا ضرور ہے) آپ دان سے فرما دیجئے کہ اگر تم (دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھو گے اپنا ما فی الضمیر یا اس کو (زبان و جوارح سے) ظاہر کر دو گے اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال میں) جانتے ہیں اور اسی کی کیا تخصیص ہے) وہ تو سب کچھ جانتے ہیں، جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے (کوئی چیز ان سے مخفی نہیں) اور (علم کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں (سو اگر تم کسی امر قبیح کا ارتکاب کر دو گے خواہ ظاہر یا باطناً تو وہ تم کو سزا دے سکے ہیں) جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اپنے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہو (پائے گا) اور اپنے بُرے کئے ہوئے کاموں کو (بھی پائے گا) اس روز اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی (تاکہ اپنے اعمال بد کا معاوضہ نہ کرنا پڑتا) اور (تم سے پھر مکر رہا جاتا ہے کہ) خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان)



سے ڈراتے ہیں (اور یہ ڈرانا اس وجہ سے ہے کہ) اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں (اپنے) بندوں کے حال، یہ (اس مہربانی سے یوں چاہتے ہیں کہ یہ سزا سے آخرت سے بچے رہیں، اور بچنے کا طریقہ ہے اعمالِ بد کا ترک کرنا، اور ترک کرنا عادتِ بد دن ڈرانے کے ہوتا نہیں، اس لئے ڈراتے ہیں، پس یہ ڈرانا عین شفقت و رحمت ہے)

## معارف و مسائل

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں جا بجا مختلف عنوانات کے ساتھ بکثرت آئی ہیں سورۃ ممتحنہ میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا  
عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ  
تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْعَوَدَةِ

یعنی اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے  
دشمن یعنی کافر کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو  
پیغام بھیج دو سستی کے

پھر اس کے آخر میں فرمایا:

وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ  
سَوَاءَ السَّبِيلِ

جس شخص نے ان سے دوستی کی تو وہ سیدھے  
رہستہ سے گمراہ ہو گیا

اور دوسری جگہ میں ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا  
الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ  
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ  
فَإِنَّهُ مِنْهُمْ (۵: ۵۱)

یعنی اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست  
نہ بناؤ، کیونکہ وہ آپس میں ہی ایک دوسرے  
کے دوست ہیں (مسلمانوں سے ان کو کوئی  
دوستی اور بہدردگی نہیں، تو جو ان سے دوستی  
کرے گا وہ انہی میں شمار ہوگا)

اور سورۃ مجادلہ میں ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ  
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ  
حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا  
آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ  
أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (۵۸: ۲۳)

یعنی آپ نہ پائیں گے کسی قوم کو جو یقین  
رکھتے ہوں اللہ پر اور آخرت کے دن پر کہ  
دوستی کریں ایسے لوگوں سے جو مخالف ہیں  
اللہ کے اور اس کے رسول کے خواہ وہ اپنے باپ  
دادا ہی ہوں یا اپنی اولاد یا اپنے بھائی یا  
اپنے خاندان والے



کفار کے ساتھ مسلمانوں کے یہ مضمون بہت سی آیات قرآنیہ میں مجمل اور مفصل مذکور ہے، جس میں تعلقات کیسے ہونے چاہئیں؟ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ موالات اور دوستی اور محبت سے شدت کے ساتھ رکھا گیا ہے، ان تصریحات کو دیکھ کر حقیقت حال سے ناواقف غیر مسلموں کو تو یہ مشہد ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب میں غیر مسلموں سے کسی قسم کی رداواری اور تعلق کی بلکہ حسن اخلاق کی بھی کوئی گنجائش نہیں اور دوسری طرف اس کے بالمقابل جب قرآن کی بہت سی آیات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عمل سے خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے تعامل سے غیر مسلموں کے ساتھ احسان و سلوک اور ہمدردی و غمخواری کے احکام اور ایسے ایسے واقعات ثابت ہوتے ہیں جن کی مثالیں دنیا کی اقوام میں ملنا مشکل ہیں تو ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی اس جگہ قرآن و سنت کے احکام و ارشادات میں باہم تعارض اور تصادم محسوس ہونے لگتا ہے، مگر یہ دونوں خیال قرآن کی حقیقی تعلیمات پر طائرانہ نظر اور ناقص تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں، اگر مختلف مقامات سے قرآن کی آیات کو جو اس معاملہ سے متعلق ہیں جمع کر کے غور کیا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لئے وجہ شکایت باقی رہتی ہے، نہ آیات دروایات میں کسی قسم کا تعارض باقی رہتا ہے، اس لئے اس مقام کی پوری تشریح کر دی جاتی ہے، جس سے موالات اور احسان و سلوک یا ہمدردی و غمخواری میں باہمی فرق اور ہر ایک کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی، اور یہ بھی کہ ان میں کونسا درجہ جائز ہے کونسا ناجائز، اور جونا جائز ہے اس کی وجہ کیا ہیں۔

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں میں تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ تعلق کا قلبی موالات یا دلی مودت و محبت ہے، یہ صرف مؤمنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مؤمن کے ساتھ مؤمن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

دوسرا درجہ مواسات کا ہے جس کے معنی ہیں ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ سورۃ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی جس میں ارشاد ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدِّينِ

لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ

وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

اَنْ تَبْرُوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ (۸: ۶)

یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور مکالا نہیں تم کو تمھارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ حسن اور انصاف کا سلوک کرو۔

تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ



بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس سے مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں، ایمان کے مشر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورۃ آل عمران کی آیت مذکورہ میں **إِلَّا أَنْ تَنْفَرُوا مِنْهُمْ نَفْسًا** سے یہی وجہ مدارات کا مراد ہے، یعنی کافروں سے موالیات جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالیات کی ہوتی ہے اس لئے اس کو موالیات سے مستثنیٰ قرار دیا گیا (بیان القرآن)

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور احسان و ہمدردی و نفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس کا مقصد جہان کی خاطر داری یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہو کر اس دنیا میں تشریف لائے، آپ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش خلقی کے معاملات کئے، اس کی نظیر دنیا میں ملنا مشکل ہے، مکہ میں قحط پڑا تو جن دشمنوں نے آپ کو اپنے وطن سے نکالا تھا، ان کی خود امداد فرمائی، پھر مکہ مکرمہ فتح ہو کر یہ سب دشمن آپ کے قابو میں آگئے تو سب کو یہ فرما کر آزاد کر دیا کہ **لَا تَرْجِبْ عَلَيْهِ كُمْ الْيَوْمَ**، یعنی آج تمہیں صرف معافی نہیں دی جاتی بلکہ تمہارے پچھلے مظالم اور تکالیف پر ہم کوئی ملامت بھی نہیں کرتے، خیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہر شخص نہیں کرتا، کفار نے آپ کو طرح طرح کی ایذا میں پہنچائیں، کبھی آپ کا ہاتھ انتقام کے لئے نہیں اٹھا، زبان مبارک سے بد و عاب بھی نہیں فرمائی، بنو نضیر جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو ان کو مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ عزت کا مقام تھا۔

ناروق اعظمؐ نے غیر مسلم محتاج ذمیوں کو مسلمانوں کی طرح بیت المال سے وظیفہ دینے



خلفائے راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں، یہ سب مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں تھیں، جس موالات سے منع کیا گیا وہ نہ تھی۔

اس تفصیل اور تشریح سے ایک طرف تو یہ معلوم ہو گیا کہ غیر مسلموں کے لئے اسلام میں کتنی رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم ہے، دوسری طرف جو ظاہری تعارض ترک موالات کی آیات سے محسوس ہوتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

اب ایک بات یہ باقی رہ گئی کہ قرآن نے کفار کی موالات اور قلبی دوستی و محبت کو اتنی شدت کے ساتھ کیوں روکا کہ وہ کسی حال میں کسی کافر کے ساتھ جائز نہیں رکھی، اس میں کیا حکمت ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں اس دنیا کے اندر انسان کا وجود عام جانوروں یا جنگل کے درختوں اور گھاس پھوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھولے پھلے پھر مر کر ختم ہو گئے بلکہ انسان کی زندگی اس جہان میں ایک مقصد زندگی ہے، اس کی زندگی کے تمام ادوار، اس کا کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، یہاں تک کہ جینا اور مرنے کا ایک مقصد کے گرد گھومتے ہیں، جب تک وہ اس مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سارے کام صحیح و درست ہیں اس کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں، داتاے روم نے خوب فرمایا ہے

زندگی از بہر ذکر و بندگی ست

بے عبادت زندگی شرمندگی ست

جو انسان اس مقصد سے ہٹ جائے وہ داتاے روم دہلی حقیقت کے نزدیک انسان نہیں ہے

آنچه می بینی خلاف آدم اند

نیستند آدم خلاف آدم اند

قرآن حکیم نے اسی مقصد کا اقرار انسان سے ان الفاظ میں لیا ہے:

قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ	”آپ کہتے کہ میری نماز اور میری قربانی اور
الْعَالَمِينَ ۝ (۱۶۲: ۶)	میری زندگی اور میری موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے“

اور جب انسان کی زندگی کا مقصد اللہ رب العالمین کی اطاعت و عبادت ٹھہرا تو دنیا کے کاروبار ریاست و سیاست اور عائلی اور منزلی تعلقات سب اس کے تابع ٹھہرے، تو جو انسان اس مقصد کے مخالف ہیں وہ انسان کے سب سے زیادہ دشمن ہیں، اور اس دشمنی میں چونکہ شیطان سب آگے ہے اس لئے قرآن حکیم نے فرمایا:

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوا	یعنی شیطان تمہارا دشمن ہے اس کی دشمنی کو
--	--



عَدُوًّا (۶:۳۵)

ہمیشہ یاد رکھو:

اسی طرح جو لوگ شیطانی وساوس کے پیرو اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ آئے ہوئے احکام خداوندی کے مخالف ہیں ان کے ساتھ ولی ہمدردی اور قلبی دوستی اس شخص کی ہو ہی نہیں سکتی جس کی زندگی ایک مقصد زندگی ہے، اور دوستی و دشمنی اور موافقت و مخالفت سب اس مقصد کے تابع ہیں۔

اسی مضمون کو صحیحین کی ایک حدیث میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَالْغَضَّ لِلّٰهِ	یعنی جس شخص نے اپنی دوستی اور دشمنی کو
فَقَدْ اَتَمَّ اِيْمَانَهُ	صرف اللہ کے لئے وقت کر دیا اس نے اپنا
(بخاری و مسلم)	ایمان مکمل کر لیا

معلوم ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جبکہ انسان اپنی محبت و دوستی اور دشمنی و نفرت کو اللہ تعالیٰ کے تابع بنا دے، اس لئے مومن کی قلبی موالات اور موذت صرف اسی کے لئے ہو سکتی ہے جو اس مقصد کا ساتھی اور اللہ جل شانہ کا تابع فرمان ہے، اس لئے قرآن حکیم کی مذکورہ آیتوں میں کافروں کے ساتھ ولی اور قلبی موالات اور دوستی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ انہی میں سے ہیں۔

آخر آیت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے، ایسا نہ ہو کہ چند روزہ اغراض و مقاصد کے خاطر موالاتِ کفار میں مبتلا ہو کر اللہ جل شانہ کو ناراض کر بیٹھو، اور چونکہ موالات کا تعلق دل سے ہے، اور دل کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص واقع میں تو کفار کی موالات و محبت میں مبتلا ہو مگر زباناً انکار کرے، اس لئے دوسری آیت میں فرمایا کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف و خبردار ہیں، یہ انکارِ حیلہ ان کے سامنے نہیں چل سکتا ہے

کارہا با خلق آری جملہ راست

با خدا تزویر و حیلہ کے راست

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تاکہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخٹے

لَكُمْ ذِكْرُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱﴾ قُلْ اَطِيعُوا

عمرہ تمہارے اور اللہ بخٹے والا مہربان ہے ، تو کہہ حکم مانو



اللّٰهُ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾

اللہ کا اور رسول کا پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت ہے نہیں کافروں سے

## خلاصہ تفسیر

**رَبط آیات** پہلی آیات میں توحید کا وجوب اور کفر کی مذمت مذکور تھی، آگے اعتقاد و رسالت اور اتباع رسول کا وجوب بیان فرماتے ہیں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح انکار توحید کفر ہے اسی طرح انکار رسالت بھی کفر ہے، ارشاد ہوتا ہے:

آپ (لوگوں سے) فرمادیجئے کہ اگر تم (بزعیم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو (کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لئے مبعوث ہوا ہوں جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمھارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسب وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا یا معاف کر لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایت فرمانے والے ہیں (اور آپ یہ بھی) فرمادیجئے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی (کہ اصل مقصود تو وہی ہے) اور (اطاعت کیا کرو) رسول کی (یعنی میری اطاعت اس حیثیت سے کہ زامزدوری ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میری معرفت اپنی اطاعت کے طریقے بتلائے ہیں) پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ (آپ کی اطاعت سے کہ ادنیٰ اس کا اعتقاد رسالت ہے) اعراض کریں (سو وہ لوگ سُن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے (اور اس صورت میں یہ لوگ کافر ہوں گے) سو ان کو اللہ سے دعوائے محبت کرنا یا ہوس مجبوبات رکھنا محض بے حقیقت ہے،

## معارف و مسائل

محبت ایک مخفی چیز ہے، کسی کو کسی سے محبت ہے یا نہیں، اور کم ہے یا زیادہ ہے، اس کا کوئی پیمانہ بجز ان کے نہیں کہ حالات اور معاملات سے اندازہ کیا جائے، محبت کے کچھ آثار اور علامات ہوتی ہیں ان سے پہچانا جائے، یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کے دعویدار اور مجبوبات کے متمنی تھے اللہ تعالیٰ ان کو ان آیات میں اپنی محبت کا معیار بتلایا ہے، یعنی اگر دنیا میں آج



کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ اس کو اتباع محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسوٹی پر آزما کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا، جو شخص اپنے دعویٰ میں جتنا سچا ہوگا اتنا ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا زیادہ اہتمام کرے گا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعلِ راہ بنائے گا، اور جتنا اپنے دعوے میں کمزور ہوگا اسی قدر آپ کی اطاعت میں سُستی اور کمزوری دیکھی جائے گی۔

ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا اس نے درحقیقت اللہ کا اتباع کیا، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ (تفسیر مظہری، ج ۲)

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ

بے شک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو

عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۲﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللَّهُ سَمِيعٌ

سائے جہان سے جو اولاد تھے ایک دوسرے کی اور اللہ سننے والا

عَلِيمٌ ﴿۳۳﴾

جاننے والا ہے۔

انبیاء سابقین کا تذکرہ ہرے | جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے اس لئے گریز کرتے تھے کہ ان کو آپ کی نبوت و رسالت ہی میں شبہ تھا، ان کی ہدایت کے لئے ان آیات میں کچھ نظائر انبیاء سابقین کے بیان فرمائے ہیں، جن سے یہ شبہات رفع ہو جائیں، ان انبیاء سابقین کے تذکرہ میں حضرت آدم، نوح، آل ابراہیم، آل عمران کا ذکر تو اجمال و اختصار کے ساتھ کر دیا گیا ہے، اس کے بعد دراصل ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کرنا ہے، اس پہلے اُن کی نانی اور والدہ کا بھی تفصیلی تذکرہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہدایت مفضل ذکر کیا گیا ہے جس کی حکمت و مصلحت کا بیان مسئلہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کے تحت آئے گا، غلا یہ ہے کہ اُمت محمدیہ کو آخر زمانہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کیساتھ کام کرنا ہے، اس لئے ان کی پہچان اور علامات کے بیان کرنیکا اہتمام قرآن میں سب انبیاء سے زیادہ کیا گیا ہے۔

خلاصہ تفسیر

بے شک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لئے) منتخب فرمایا ہے (حضرت) آدم (علیہ السلام)



اور حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بعضوں کو جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، اور تمام انبیاء بنی اسرائیل کہ اولاد یعقوب علیہ السلام کی ہیں، اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہ اولاد اسماعیل علیہ السلام سے ہیں، اور عمران کی اولاد میں سے بعضوں کو (اگر یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہیں، اور اگر یہ عمران حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، غرض ان حضرات کو نبوت کے لئے، تمام جہان کی مخلوقات پر (منتخب فرمایا ہے) بعضے ان میں بعضوں کی اولاد ہیں (جیسے آدم علیہ السلام کی اولاد سب ہیں، اسی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد سب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولاد عمران بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں خوب جاننے والے ہیں (کہ سب کے قول سننے میں سب کے احوال کو جانتے ہیں، پس جس کے اقوال و احوال مناسب شان نبوت کے دیکھے ان کو نبی بنا دیا)۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي

جب کہا عمران کی عورت نے کہ اے رب میں نے نذر کیا تیرے جو کچھ میرے پیٹ میں ہے

مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۶﴾ فَلَمَّا

سب آزاد رکھ کر تو مجھ سے قبول کر بیشک تو ہی ہے اصل سننے والا جاننے والا پھر جب اس

وَضَعَهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

کو جنما بولی اے رب میں نے تو اس کو لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ

وَضَعْتُ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ

اس نے جنما اور بیٹا نہ ہو جیسی وہ بیٹی اور میں نے اس کا نام رکھا مریم

وَإِنِّي أَعِزُّكَ هَٰبِكًا وَذَرِّيَّتًا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿۳۷﴾

اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطانِ مردود سے

## خلاصہ تفسیر

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ عمران (پدر مریم) کی بی بی نے (حالتِ حمل



میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر یعنی منّت (مالی ہے آپ کی عبادت) کے لئے اس بچے کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ (خانہ خدا کی خدمت کے واسطے) آزاد (فانی) رکھا جائے گا (اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی) سو آپ (اس کو) مجھ سے مستبول کر لیجئے، بیشک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ میری عرض کو سن رہے ہیں) اور میری نیت کو جان رہے ہیں) پھر جب ان بی بی نے لڑکی جنی (تو ان کو بچہ ہوا کہ یہ تو خدمت بیت المقدس کے لائق نہیں، یہ کام تو مردوں کا ہے، اس لئے حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو حمل لڑکی جنی (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں) حالانکہ خدا تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں (اس لڑکی کی شان) کو جو انھوں نے جنی اور کسی طرح بھی، وہ لڑکا (جو انھوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں (ہو سکتا تھا، بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات و برکات عجیب و غریب ہوں گے، یہ ارشاد خداوندی بطور جملہ معترضہ کے تھا، پھر ان بی بی کا قول ہے) اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ (اور حفاظت) میں دیتی ہوں شیطان مودوسے

## معارف و مسائل

انبیاء سابقین کی شریعت میں ایک طریقہ عبادت کا یہ بھی تھا کہ اپنی اولاد میں سے کسی بچے کو اللہ کے لئے مخصوص کر دیں کہ اس سے دنیا کی کوئی خدمت نہ لیں، حضرت مریم کی والدہ نے اسی قاعدہ کے مطابق اپنے حمل کے متعلق یہ منّت مان لی کہ اس کو خاص بیت المقدس کی خدمت کے لئے رکھوں گی، دنیا کے کام میں نہ لگاؤں گی، مگر جب حمل سے لڑکی پیدا ہوئی تو یہ خیال کر کے افسوس کیا کہ لڑکی تو یہ کام نہیں کر سکتی، مگر حق تعالیٰ نے ان کے اخلاص کی برکت سے اُس لڑکی ہی کو مستبول فرمایا، اور اس کی شان ساری دنیا کی لڑکیوں سے ممتاز کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ماں کو اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک گونہ ولایت حاصل ہے، کیونکہ اگر ماں بچے پر ولایت حاصل نہ ہوتی تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نذر نہ مانتیں، اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ ماں کو بھی حق ہے کہ اپنے بچے کا نام خود بخود کرے (جصاص)

فَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا

پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سیر کی



زَكَرِيَّا ۖ كَلَّمَادَخَلَ عَلَيْهِمَا زَكَرِيَّا الْيَحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا

زکریا کو جس وقت آتے اس کے پاس زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس

رِزْقًا ۖ قَالَ يَمْرِئُمُ آتِي لَكَ هَذَا قَالَتُ هُوَ مِنْ عِنْدِ

کچھ کھانا کہا اے مریم کہاں سے آیا تیرے پاس یہ کہنے لگی یہ اللہ کے پاس سے

اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۴

آتا ہے اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس۔

## خلاصہ تفسیر

ماہل یہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ان کو لے کر مسجد بیت المقدس میں گئیں اور وہاں کے مجاورین و عابدین سے جن میں حضرت زکریا علیہ السلام بھی تھے، جا کر کہا کہ اس لڑکی کو میں نے خاص خدا کے لئے مانا ہے، اس لئے میں اپنے پاس نہیں رکھ سکتی، سو اس کو لائی ہوں، آپ لوگ رکھئے۔

حضرت عمران اس مسجد امام تھے، اور حالتِ حل میں ان کی وفات ہو چکی تھی، اور سب زیادہ سچی ان کے لینے کے وہ تھے، لڑکی کے باپ بھی تھے اور مسجد بیت المقدس کے امام بھی، اس لئے بیت المقدس کے مجاورین و عابدین میں سے ہر شخص ان کو لینے اور پالنے کی خواہش رکھتا تھا، حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ترجیح کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ میرے گھر میں ان کی خالہ ہیں، اور وہ بمنزلہ ماں کے ہوتی ہے، اس لئے بعد ماں کے وہی رکھنے کی مستحق ہے، مگر اور لوگ اس ترجیح پر راضی اور متفق نہیں ہوئے، آخر قرعہ اندازی پر اتفاق قرار پایا، اور صورت قرعہ کی بھی عجیب و غریب خلافِ عادت ٹھہری، جس کا بیان آگے آئے گا، اس میں بھی حضرت زکریا علیہ السلام کامیاب ہوئے۔

چنانچہ حضرت مریم ان کو مل گئیں، اور انھوں نے بعض روایات کے مطابق ایک اٹا کو نوکر رکھ کر دودھ پلویا، اور بعض روایات میں ہے کہ دودھ پینے کی ان کو حاجت ہی نہیں ہوئی، غرض وہ خود اسٹھنے بیٹھنے لگیں، ان کو مسجد کے متعلق ایک عمدہ مکان میں لا کر رکھا، جب کہیں جاتے اس کو قفل لگا کر جاتے، پھر آکر کھول لیتے، اسی قصہ کا ذکر مختصر آگے

آتا ہے، یعنی پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بطریق احسن قبول فرمایا اور عمدہ طور پر ان کو نشروںمادیا، اور (حضرت زکریا علیہ السلام) کو ان کا سر پرست بنایا



جب بھی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) ان کے پاس (اسی) عمدہ مکان میں (جس میں اُن کو رکھا تھا) تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں (جب کہ مکان مقفل ہے) یا ہرے کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں، وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (جو خزانہ غیب ہے اس میں) سے آئیں، بیشک اللہ تعالیٰ جسکو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں (جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا)۔

هٰذَا لَكَ دَعَاؤُكَ يَا رَبِّهِ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ

وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے کہا اے رب میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے

دُرِّیَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیعُ الدُّعَا ۝۳۸

اولاد پاکیزہ بیشک تو سننے والا ہے دعا کا

## خلاصہ تفسیر

(حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی تربیت میں غیر معمولی نشانات قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دعا فرمائی، جن کا بیان یہ ہے)؛

اس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے میرے رب عنایت کیجئے مجھ کو خاص اپنے پاس سے کوئی اچھی اولاد بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

## معارف و مسائل

هٰذَا لَكَ دَعَاؤُكَ يَا رَبِّهِ ۚ حضرت زکریا علیہ السلام کے اس وقت تک اولاد نہ تھی اور زمانہ بڑھاپے کا آگیا تھا جس میں عادت اولاد نہیں ہو سکتی، اگرچہ خرق عادت کے طور پر قدرت خداوندی کا ان کو پورا اعتقاد تھا کہ وہ ذات اس بڑھاپے کے موقع میں بھی اولاد دے سکتی ہے، لیکن چونکہ اللہ کی ایسی عادت آپ نے مشاہدہ نہیں کی تھی کہ وہ بے موقع اور بے موسم چیزیں عطا کرتا ہے اس لئے آپ کو اولاد کے لئے دعا کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، لیکن اس وقت جب آپ نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو بے موسم میوے عطا فرمائے ہیں تو اب آپ کو بھی سوال کرنے کی جرأت ہوئی، کہ جو قادر مطلق بے موقع پھل عطا کر سکتا ہے وہ بے موقع اولاد



بھی عطا کرے گا۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اولاد کے لئے دعا کرنا انبیاء اور صالحین کی سنت ہے۔

ایک دوسری آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَقُولُ أَرْسَلْنَا رَسُولًا مِنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً طَيِّبَةً (۳۸:۱۳) یعنی جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیویاں اور اولاد عطا کی گئی اسی طرح یہ نعمت انبیاء سابقین کو بھی دی گئی تھی، اب اگر کوئی شخص کسی ذریعہ سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف فطرت کے خلاف عظیم بغاوت بلند کرے گا بلکہ انبیاء علیہم السلام کی ایک مشترک اور متفق علیہ سنت سے بھی محروم ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح اور اولاد کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ آپ نے اس شخص کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جو بیاہ شادی اور اولاد سے باز خود قدرت کے اعراض کرتا ہو، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

۱۔ اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي۔

۲۔ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔

۳۔ تَزَوَّجُوا الْوُدَّ وَالْوُدَّ قَائِي مَسَاكِينُ

بِكُمُ الْاُمَمَ۔

نکاح میری سنت ہے۔

جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔

تم خاندان سے دوستی رکھنے والی اور بہت جتنے والی سے

نکاح کرو کیونکہ تمہاری کثرت کی وجہ سے میں دوسری امتوں کو

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو اولاد اور بیوی کے حصول اور ان کے نیک صالح ہونے کے لئے اپنے اللہ سے دعائیں کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد باری ہے:

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ

لَنَا مِنْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً طَيِّبَةً

قُرْآنَ الْعَالَمِينَ (۲۵:۴۲)

”یعنی اللہ کے فرمانبردار لوگ ایسے ہیں جو

یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں بیوی بچے ایسے عطا

فرما جنہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور قلب

مسرور ہو“

حضرت حن بصریؒ نے فرمایا کہ یہاں آنکھوں کی ٹھنڈک سے مراد یہ ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول دیکھے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُمّ سلیم نے درخواست کی کہ آپ اپنے خادم انسؓ کے لئے کوئی دعا فرمائیں تو آپ نے اُن کے لئے یہ دعا کی:

”یعنی اے اللہ اس (انس) کے مال اور

اللَّهُمَّ اكْثِرْ مَالَهُ وَوَلَدَهُ



وَبَارِكْ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتَهُ ۔

اولاد کو زیادہ کر اور اس چیز میں برکت عطا کر  
جو کہ آپ نے اس کو عطا کی ہے ۛ

اسی دعا کا اثر تھا کہ حضرت انسؓ کی اولاد تنو کے قریب ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مالی  
وسعت بھی عطا فرمائی۔

فَإِنَّهُ السَّلَیْکَةُ وَهُوَ قَائِمٌ یُّصَلِّیٰ فِی الْمَحْرَابِ ۝

پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر

إِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُکَ بِبَیْحٰی مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ

کہ اللہ تجھ کو خوش خبری دیتا ہے بچی کی جو گواہی دے گا اللہ کے حکم کی اور

سَیِّدًا وَحَصْرًا وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۳۹

سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائے گا اور نبی ہوگا صالحین سے

## خلاصہ تفسیر

پس پکار کر کہا اس سے فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں  
کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں بچی (تام بیٹا عطا ہونے) کی جن کے احوال یہ ہوں گے  
کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور  
(دوسرے) مقتدرائے (دین) ہوں گے اور (تیسرے) اپنے نفس کو (لذات سے) بہت روکنے  
والے ہوں گے اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے اور (پانچویں) اعلیٰ درجہ کے شاکسہ ہوں گے۔

## معارف و مسائل

کَلِمَۃُ اللّٰهِ ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ محض اللہ تع  
کے حکم سے خلافت عادت بلا واسطہ باپ کے پیدا کئے گئے۔

حَصْرًا ۔ حضرت بچی علیہ السلام کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو  
لذات سے بہت روکنے والے تھے، اور لذات سے روکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا  
بھی داخل ہے، مثلاً اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا، اس صفت کو موقع مدح  
میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے، حالانکہ احادیث سے نکاح کی  
فضیلت ثابت ہے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت بچی علیہ السلام کی سی ہو



کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے، اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: **مِنْ اسْتِطَاعَ وَنُكْمِ الْبَاءَةِ**، یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور زوجیت کے حقوق ادا کر سکتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں (بیان ہستہ آن)

**قَالَ رَبِّ اَنۡیَ یَکُونُ لِیْ عُلْمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِی الْکِبَرُ وَاَمْرًاۤی عَاقِرٌ قَالَ کَذٰلِکَ اَللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝۴۰**

کہا اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اور

عورت میری بانجھ ہے فرمایا اس طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے

**قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً قَالَ اٰیَتُکَ الْاَکْمَامُ النَّاسُ**

کہا اے رب مقرر کر میرے لئے کچھ نشانی فرمایا نشانی تیرے لئے یہ ہے کہ نہ بات کرے گا تو لوگوں

**ثَلَاثَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمَزًا وَاذْکُرْ بِکَ کَثِیْرًا وَّ سَبِّحْ**

سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور تسبیح کر

**بِالْعَشِیِّ وَاِلَیْکَ اَبْکَرُ ۝۴۱**

شام اور صبح

## خلاصہ تفسیر

(حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے (جناب باری میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھ کو بڑھاپا پہنچا، اور میری بی بی بھی (بڑھاپے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہو جاوے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کرے کر دیتے ہیں، انھوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہو گیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمھاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز (ہاتھ یا سر وغیرہ کے) اشارہ کے (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے) اور (اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذکر اللہ پر قادر ہو گے سو) اپنے رب کو



(دل سے بھی) بکثرت یاد کجیو اور (زبان سے بھی) تسبیح و تقدیس کیجیو دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی،  
 رکھو کہ ذکر اللہ کی قدرت اس وقت بھی پوری رہے گی۔

## معارف و مسائل

حضرت زکریا علیہ السلام اَنِّیْ یَکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ۔ حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرت خداوندی  
 کی دعا اور اس کی حکمت کے معتقد بھی تھے اور نمونہ کا مکرر مشاہدہ بھی کر چکے تھے اور خود ہی درخواست  
 کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہو گیا تھا، پھر اس کہنے کے کیا معنی کہ کس طرح لڑکا ہوگا؟ بات  
 درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ مقصود  
 سوال سے کیفیت کا معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی کی جو حالت موجودہ ہے کہ دونوں  
 خوب بوڑھے ہیں، یہی حالت رہے گی یا کچھ اس میں تبدیلی کی جاوے گی، اللہ تعالیٰ نے جواب  
 میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے، اور اسی حالت میں تمہارے اولاد ہوگی، اب اس میں  
 کوئی اشکال نہ رہا (بیان القرآن)

قَالَ اٰیْتُكَ اِلَّا یَحْكُمَ النَّاسُ ثَلَاثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمَزًا، حضرت زکریا علیہ السلام کا نشانہ  
 معلوم کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ہمیں جلد ہی خوش ہوا اور بچے کے پیدا ہونے سے پہلے ہی شکر میں  
 مشغول ہوں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ نشانی عطا کی کہ آپ تین دن تک لوگوں سے سوئے  
 اشارے کے کوئی کلام نہیں کر سکیں گے۔

اس نشانی میں لطافت یہ ہے کہ نشانی کی درخواست سے جو اُن کا مقصود تھا کہ شکر  
 ادا کریں، نشانی ایسی تجویز کی گئی کہ بجز اس مقصود کے دوسرے کام ہی کے نہ رہیں گے، مثلاً  
 نشانیوں کی ایک نشانی ہوگئی، اور مقصود کا مقصود بدرجہ اتم حاصل ہو گیا، (بیان القرآن)  
 اِلَّا رَمَزًا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کلام کرنا متعذر ہو تو اشارہ قائم مقام کلام  
 کے سمجھا جائے گا، چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک گھجکی  
 باندی سے سوال کیا کہ ”اٰیْتِنِیْ اللّٰهُ“ اللہ کہاں ہے، تو اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا،  
 حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ باندی مسلمان ہے۔ (قرطبی)

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰکِ وَ طَهَّرَکِ

اور جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور مستحکم بنا دیا

وَ اصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَاءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر اے مریم بندگی کراپنے رب کی



## وَاسْجُدْ لِرَبِّكَ مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۴۴﴾

اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے

## خلاصہ تفسیر

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے، جبکہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے کہا اے مریم بلا شک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے، اور (تمام ناپسندیدہ افعال و اخلاق سے) پاک بنایا ہے اور (مقبول فرمانا کچھ ایک دو عورتوں کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس زمانہ کی) تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے، (اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ) اے مریم اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ (یعنی نماز ادا) کیا کرو اور (نماز میں) رکوع (بھی) کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

## معارف و مسائل

وَاصْطَفٰی بَعْضَ نِسَاۗءِ الْعٰلَمِیْنَ، سے مراد اس زمانے میں تمام جہان کی عورتیں ہیں، اس لئے حدیث میں مَسَيَّدَةٌ نِسَاۗءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ قَالِمَّةٌ کا ارشاد اس کے منافی نہیں، وَارْتَكِعِيْ مَعَ الرَّاكِعِیْنَ، یہاں اِرتکعی کے ساتھ مَعَ الرَّاكِعِیْنَ کی قید ذکر کی گئی، لیکن وَاسْجُدْ لِرَبِّكَ کے ساتھ مَعَ الشَّجَرِیْنَ کی قید ذکر نہیں کی گئی، اس سے بظاہر اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ رکوع کرنے میں لوگ عموماً اہتمام نہیں کرتے بلکہ معمولی سا جھک کر اٹھ جاتے ہیں، اس قسم کا رکوع قیام کے قریب زیادہ ہوتا ہے، اس لئے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے راکعین کی قید ذکر کر کے لوگوں کے لئے ایک نمونہ بتلا دیا کہ تمہارا رکوع کامل رکوع کرنے والوں جیسا ہونا چاہئے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاۡءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

یہ خبریں غیب کی ہیں جو تم بھیجتے ہیں تجھ کو اور تو نہ تھا ان کے پاس

اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ

جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون پرورش میں لے مریم کو اور تو نہ تھا

لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے



## خلاصہ تفسیر

یہ فقہے (جو اوپر مذکور ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے بوجہ اس کے کہ آپ کے پاس کوئی ذریعہ ظاہری ان کے معلوم کرنے کا نہ تھا) منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں جن کی وحی بھیجتے ہیں ہم آپ کے پاس اس کے ذریعہ سے آپ یہ خبریں معلوم کر کے اور دلوں کو بتلاتے ہیں) اور (ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت مریم علیہا السلام کے رکھنے میں اختلاف کر رہے تھے جن کا فیصلہ اخیر میں قرعہ پر قرار پایا تھا) آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے (اور صورت قرعہ بکھنے کی یہ قرار پائی تھی کہ جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف اٹھا بہ جائے وہ مستحق سمجھا جائے، سو قرعہ سے غرض اس امر کا طے کرنا تھا) کہ ان سب میں کون شخص حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت (پرورش) کرتے، (پس آپ نہ تو اس وقت موجود تھے) اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ وہ لوگ (قبل تر عداوت میں) باہم اختلاف کر رہے تھے (جس کے رفع کی ضرورت کے لئے یہ قرعہ قرار پایا، اور ان خبروں کے دریافت ہونے کے لئے دوسرے مسائل کا نہ ہونا بھی یقیناً معلوم ہے، پس ایسی حالت میں یہ غیبی آپ کی نبوت کی دلیل ہیں)۔

## معارف و مسائل

**مسئلہ:** شریعت محمدیہ میں حنفیہ کے مسلک پر قرعہ کا یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب شرع میں معلوم و متعین ہیں ان میں قرعہ ناجائز و داخل قمار ہے، مثلاً شئی مشترک میں جس کا نام نکل آئے وہ سب لے لے لیا جس بچے کے نسب میں اختلاف ہو، اس میں جس کا نام نکل آئے وہی باپ سمجھا جائے اور جن حقوق کے اسباب رائے کے سپرد ہوں ان میں قرعہ جائز ہے، مثلاً مشترک مکان کی تقسیم میں قرعہ سے زید کو شرقی حصہ و یدینا اور عمرو کو غربی حصہ و یدینا، یہ اس لئے جائز ہے کہ بلا شرعہ بھی ایسا کرنا اتفاق شریکین سے یا قضائے قاضی سے جائز تھا (بیان القرآن)

یا یوں کہتے کہ جہاں سب شریکوں کے حقوق مساویانہ ہوں وہاں کوئی ایک جہت ایک شخص کے لئے متعین کرنے کے واسطے قرعہ اندازی جائز ہے۔



اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يَبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۚ

جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی

اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيسٰی ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْرًا فِی الدُّنْيَا وَ

جس کا نام مسیح ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا مرتبہ والا دنیا میں اور

الْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبٰٓیْنَ ۝ وَیَكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ

آخرت میں اور اللہ کے مقربوں میں اور باتیں کرے گا لوگوں سے جب کہ ماں کی

وَکَهْلًا ۚ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

گود میں ہوگا اور جبکہ پوری عمر کا ہوگا اور نیک خصلتوں میں ہے

## خلاصہ تفسیر

اس وقت کو یاد کرو جبکہ فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی کہا کہ اے مریم بیشک اللہ تعالیٰ تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی جو بلا واسطہ باپ کے پیدا ہونے کے سبب کلمہ اللہ کہلاوے گا) اس کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ) باآبرو ہوں گے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) دنیا میں (بھی کہ ان کو نبوت عطا ہوگی) اور آخرت میں (بھی کہ اپنی امت کے مؤمنین کے باب میں مقبول الشفاعت ہوں گے) اور (جیسے ان میں نبوت و شفاعت کی صفت ہوگی جس کا تعلق دوسروں سے بھی ہے) اسی طرح ذاتی کمال کے ساتھ بھی موصوف ہوں گے) منجملہ مقربین (عند اللہ) ہوں گے اور (صاحب معجزہ بھی ہوں گے) آدمیوں سے (دونوں حالت میں یکساں) کلام کریں گے، گہوارہ میں (یعنی بالکل بچپن میں بھی) اور بڑی عمر میں (بھی دونوں کلاموں میں تفاوت نہ ہوگا) اور (اعلیٰ درجہ کے) شاکستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

## معارف و مسائل

نزدک عیسیٰ علیہ السلام کی ایک دلیل اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی بڑی عمر میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بتلائی ہے کہ وہ بچپن کے گہوارے میں جب کوئی بچہ کلام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس حالت میں بھی کلام کریں گے، جیسا

دوسری آیت میں مذکور ہے کہ جب لوگوں نے ابتداء ولادت کے بعد حضرت مریم پر تہمت



کی بنا پر لعن طعن کیا تو یہ نومولود بچے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بول اٹھے، اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ (۱۹: ۳۰) الخ اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جب وہ کھل یعنی ادھیڑ عمر کے ہوں گے، اس وقت بھی لوگوں سے کلام کریں گے یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بچپن کی حالت میں کلام کرنا تو ایک معجزہ اور نشانی تھی اس کا ذکر تو اس جگہ کرنا مناسب ہے مگر ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام کرنا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان میں کافر، عالم جاہل کیا ہی کرتا ہے، یہاں اس کو بطور وصف خاص ذکر کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو بیان القرآن کے خلاصہ تفسیر سے سمجھ میں آیا کہ مقصد اصل میں حالت بچپن ہی کے کلام کا بیان کرنا ہے، اس کے ساتھ بڑی عمر کے کلام کا ذکر اس غرض سے کیا گیا کہ ان کا بچپن کا کلام بھی ایسا نہیں ہوگا جیسے بچے ابتداء میں بولا کرتے ہیں بلکہ عاقلانہ، عالمانہ، فصیح و ملیح کلام ہوگا، جیسے ادھیڑ عمر کے آدمی کیا کرتے ہیں، اور اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ اور اس کی پوری تاریخ پر غور کیا جائے تو اس جگہ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا تذکرہ ایک مستقل فائدہ کے لئے ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اور قرآنی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے۔

روایات سے یہ ثابت ہے کہ ان کو اٹھانے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تقریباً تیس بیس سال کے درمیان تھی جو عین عنفوان شباب کا زمانہ تھا، ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کھل کہتے ہیں، وہ اس دنیا میں ان کی ہوتی ہی نہ تھی، اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام بھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں، اس لئے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہی ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنِّیْ یَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشْرٌ

بولی اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی بشر نے

قَالَ كَذٰلِكَ اَللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا

فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے جب ارادہ کرتا ہے کسی کام کا تو یہی

یَقُوْلُ لَهُ کُنْ فَاَیْكُوْنُ ﴿۱۹﴾

کہتا ہے اس کو کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے

## خلاصہ تفسیر

حضرت مریم علیہا السلام بولیں اے میرے پروردگار کس طرح ہوگا میرے بچے

عہ دیکھئے تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۹۱۔ لیکن محقق علماء کرام کی ایک تعداد کی رائے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھانے جانے کے وقت ان کی عمر اسی سال تھی۔ ملاحظہ فرمائیے۔ البحر الفصیح از مولانا بدیع عالم مدنی۔ محمد تقی عثمانی ۱۳۲۶ھ



حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے صحبت کے طور پر، ہاتھ نہیں لگایا (اور کوئی بچہ جائز طریق سے عادتاً بدون مرد کے پیدا نہیں ہوتا، تو معلوم نہیں کہ ویسے ہی محض قدرتِ خداوندی سے بچہ ہوگا یا مجھ کو نکاح کا حکم کیا جائے گا) اللہ تعالیٰ نے (جواب میں فرشتے کے واسطے سے) فرمایا ایسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے صرف ان کا چاہنا کافی ہے، کسی واسطے یا سبب خاص کی ان کو حاجت نہیں اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ (موجودی ہو جا، پس وہ چیز (موجود) ہو جاتی ہے پس جس چیز کو بلا اسباب و وسائط موجود ہونے کو کہہ دیا وہ اسی طرح ہو جاتی ہے)۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ ﴿٥١﴾

اور سکھادے گا اس کو کتاب اور تہہ کی باتیں اور توریت اور انجیل

وَرَسُولًا إِلَى بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِّنْ

اور کہہ گا اس کو پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف بیشک میں آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لے کر

رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ

تمہارے رب کی طرف سے کہ میں بنادیتا ہوں تم کو گھائے سے پرندے کی شکل

فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْكَلْمَةَ

پھر اس میں پھونک دیتا ہوں تو ہو جاتا ہے وہ آدنا جانور اللہ کے حکم سے اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو

وَالْأَبْرَصَ وَأُخِي الْمَوْثِي بِإِذْنِ اللَّهِ وَأَنْبِئُكُمْ بِمَا

اور کوڑھی کو اور چلاتا ہوں مرنے کو اللہ کے حکم سے اور بتادیتا ہوں تم کو جو

تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ لِي بِمُؤْتَمِرَاتٍ فِي ذَلِكَ

کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں اس میں نشان

لَايَةٍ لَّكُمْ إِنَّكُمْ مِّنْ مُّؤْمِنِينَ ﴿٥٢﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا

پوری ہے تم کو اگر تم یقین رکھتے ہو اور سچا بتاتا ہوں اپنے

بَلَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَلِأَحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي

سے پہل کتاب کو جو توریت ہے اور اس واسطے کہ حلال کر دوں تم کو بعضی وہ چیزیں



حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجَدُّكُمْ بِأَيِّهِ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ

جو حرام تھیں تم پر اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لیکر تمہارے رب کی سو اللہ سے ڈرو

وَالطَّيْعُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوا اللَّهَ

اور میرا کہا مانو بیشک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو یہی

صراطِ مُسْتَقِيمٌ ۝

راہِ سیدھی ہے

## خلاصہ تفسیر

اور اے مریم اس مولودِ مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی، اللہ ان کو تعلیم فرما دیں گے، (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل اور ان کو (تمام) بنی اسرائیل کی طرف سے پیغمبر بنا کر یہ مضمون دے کر بھیجیں گے کہ (اِنِّیْ قَدْ جَعَلْتُکُمْ اُمَّةً مُّسْتَقِیْمَةً) میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل نے کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک مار دیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ قویہ ہوا) اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادرِ زاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اور زندہ کر دیتا ہوں مردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دوسرا تسلسلہ معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کھا کر آ) تے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ جو تمہارا معجزہ ہوا) بلاشبہ ان (معجزاتِ مذکورہ) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی توراۃ کی اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعض ایسی چیزیں حلال کر دوں جو (شریعتِ موسیٰ علیہ السلام میں) تم پر حرام کر دی گئی تھیں (سو ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہوگی) اور (میرا یہ دعویٰ نسخِ بلا دلیل نہیں ہے بلکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحبِ نبوت کا قول دعویٰ نسخ میں حجت ہے) حاصل یہ کہ (جب میرا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہو چکا تو میری تعلیم کے موافق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کی مخالفتِ حکم) سے ڈرو اور (دین کے باب میں) میرا کہنا مانو اور خلاصہ میری دینی تعلیم کا یہ ہے کہ، بیشک اللہ تعالیٰ میرے بھی ہیں اور تمہارے بھی ہیں (یہ حاصل ہے تکمیلِ عقیدہ کا) سو تم لوگ اس (رب)



کی عبادت کرو (یہ حاصل ہوا تکمیل عمل کا) بس یہ ہے راہِ راست (دین کی جس میں عقائد و اعمال دونوں کی تکمیل ہو اسی سے نجات و وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے)

## معارف و مسائل

مسئلہ: پرندہ کی شکل بنانا تصویر تھا جو اس شریعت میں جائز تھا، ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہو گیا۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر بولا کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی

إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ

راہ میں کہا حواریوں نے ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے ہم یقین لائے اللہ پر

وَأَشْهَدُ بِأَنَا مُسْلِمُونَ ﴿٥٢﴾ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَ

اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا اے رب ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اناری اور

اتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٥٣﴾

ہم تابع ہوئے رسول کے سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں

## خلاصہ تفسیر

(غرض بشارتِ مذکورہ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شان سے پیدا ہوئے، اور بنی اسرائیل سے مضمون مذکورہ کی گفتگو ہوئی، اور معجزاتِ ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپ کی نبوت کے منکر رہے) سو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے انکار دیکھا اور انکار کے ساتھ درپے ایذا بھی، اور اتفاقاً کچھ لوگ ان کو ایسے ملے جو حواریین کہلاتے تھے، تو ان حواریین سے آپ نے فرمایا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (دین حق میں بمقابلہ مخالفین و منکرین کے) میرے مددگار ہو جاویں اللہ کے واسطے (جس سے دعوتِ دین میں مجھے کوئی ایذا نہ پہونچائے) حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے (دین کے) ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب دعوت آپ کے) ایمان لائے اور آپ اس بات کے گواہ رہتے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرمانبردار ہیں (پھر زیادتِ اہتمام و توثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے



ہمارے رب ہم ایمان لائے ان چیزوں (یعنی اُن احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی  
خستیار کی ہم نے (ان) رسول کی سو (ہمارا ایمان قبول فرما کر) ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے  
جو (مضامین مذکورہ کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی مومنین کا ملین کے زمرہ میں ہمارا بھی شمار فرمائیے)

## معارف و مسائل

قَالَ الْخَوَّارِيُّ لَفْظُ حَوَّارِي، خَوَّار سے ماخوذ ہے جس کے معنی لغت میں سفیدی کے ہیں  
اصطلاح میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخلص ساتھیوں کو ان کے اخلاص اور صفائی قلب  
کی وجہ سے یا ان کی سفید پوشاک کی وجہ سے حواری کا لقب دیا گیا ہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم کے ساتھیوں کو صحابی کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے۔  
بعض مفسرین نے حواریین کی تعداد بارہ بتلائی ہے، اور کبھی لفظ حواری مطلقاً مدح و تحاریر  
کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، اسی معنی سے ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ہر نبی کا کوئی حواری  
یعنی مخلص ساتھی ہوتا ہے، میرے حواری زیر ہیں (تفسیر قرطبی)

**فائدہ ہفتم** اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو جب لوگوں کا کفر اور  
مخالفت محسوس ہوئی اس وقت مددگاروں کی تلاش ہوئی تو فرمایا مَنِ الْفَصَّارِيُّ  
ابتداء میں نبوت کا منصبی کام اور دعوت شروع کرتے وقت تہنای تعمیل حکم کے لئے کھڑے  
ہو گئے تھے، پہلے سے کسی پارٹی یا جماعت بنانے کی فکر میں نہیں پڑے، جب ضرورت پیش  
آئی تو جماعت سی بن گئی، غور کیا جائے تو ہر کام ایسے ہی عزم و ہمت کو چاہتا ہے۔

وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ط وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكِيرِينَ ۝ اِذْ قَالَ

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے جس وقت کہا

اللَّهُ لِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَرَافِعُكَ اِلَى وَمُطَهِّرُكَ

اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لوں گا تجھ کو اور اٹھالوں گا اپنی طرف اور پاک کر دوں گا تجھ کو

مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاجْعَلِ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ

کافروں سے اور رکھوں گا ان کو جو تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں

كَفَرُوا اِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ ثُمَّ اِلَى مَرْجِعِكُمْ فَاَحْكُمُ

سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک پھر میری طرف چم سب کو پھر آنا پھر فیصلہ کر دوں گا



بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۵۵﴾

تم میں جس بات میں تم جھگڑاتے تھے

## خلاصہ تفسیر

اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اسرائیل میں سے آپ کے منکر نبوت تھے آپ کو ہلاک کرنے اور ایذا پہنچانے کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر و حیل سے آپ کو گرفتار کر کے سولی دینے پر آمادہ ہوئے) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی (جس کی حقیقت کا ان لوگوں کو بھی پتہ نہ لگا، کیونکہ انہیں مخالفین میں سے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل پر بنا دیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا جس سے وہ محفوظ رہے، اور وہ ہمیشہ سولی دیا گیا، ان لوگوں کو اس تدبیر کا علم تک بھی نہ ہوسکا اور دفع پر تو کیا قدرت ہوتی) اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں، (کیونکہ اوروں کی تدبیریں ضعیف ہوتی ہیں، اور کبھی قبیح اور بے موقع بھی ہوتی ہیں، اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خیر محض اور موافق حکمت کے ہوتی ہیں، اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت متروک اور پریشان ہوئے) فرمایا اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بے شک میں تم کو اپنے وقت موعود پر طبعی موت سے، وفات دینے والا ہوں (پس جب تمھارے لئے موت طبعی مقدر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں دار پر جان دینے سے محفوظ رہو گے) اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالم بالا کی) طرف اٹھائے لیتا ہوں، اور تم کو ان لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں (جو تمھارے منکر ہیں اور جو لوگ تمھارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ تمھارے منکر ہیں روز قیامت تک) گو اس وقت یہ منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں (پھر جب قیامت آجائے گی اس وقت) میری طرف ہوگی، سب کی واپسی (دنیا و برزخ سے) سو میں (اس وقت) تمھارے (سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کر دوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے کہ (منجملہ ان امور کے مقدمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا)۔

## آیت کے اہم الفاظ کی تشریح

اس آیت کے الفاظ و معانی میں بعض سرفروں نے تخریقات کا دروازہ کھولا ہے جو



تمام امت کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور آخر زمانہ میں نزول کے منکر ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان الفاظ کی تشریح وضاحت کے ساتھ کر دی جائے۔

وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمُنْكَرِينَ، لفظ ”مکر“ عربی زبان میں لطیف و خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں، اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو تو اچھا ہے، اور برائی کے لئے ہو تو بُرا ہے، اس لئے وَلَا يَجِئُ الْمُنْكَرُ الشَّيْءُ (۳۵:۳۳) میں مکر کے ساتھ ”شیئی“ کی قید لگائی، اردو زبان کے محاورات میں مکر صرف سازش اور بُری تدبیر اور حیلہ کے لئے بولا جاتا ہے، اس سے عربی محاورات پر شبہ نہ کیا جائے، اسی لئے یہاں خدا کو ”خیر الما کرین“ کہا گیا، مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کر دیں، حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھر دیئے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے، تورات کو بدلتا چاہتا ہے، سب کو بد دین بنا کر چھوڑے گا، اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دیدیا، اُدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر حق تعالیٰ کی لطیف و خفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذکر اگلی آیات میں ہے۔ (تفسیر عثمانی)

إِنِّي مُتَوَفِّيكَ، لفظ ”متوفی“ کا مصدر ”توفی“ اور مادہ ”توفی“ ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وقار، ایفاء، استيفاء اسی معنی کے لئے بولے جاتے ہیں، توفی کے بھی اصلی معنی پورا پورا لینے کے ہیں، تمام کتب لغت عربی زبان کی اس پر شاہد ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اَجَلِ مقدر پوری کر لیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے، اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا (۳۹:۳۲) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی ان کی نیند کے وقت۔

حافظ ابن تیمیہ نے الجواب الصیح ص ۸۳ ج ۲ میں فرمایا، التَّوَفَّى فِي لُحَّةِ الْعَرَبِ مَعْنَاهَا الْقَبْضُ وَالْإِسْتِيفَاءُ وَذَلِكَ ثَلَاثَةٌ الْوَجْهُ، أَحَدُهَا التَّوَفَّى فِي النَّوْمِ وَالثَّانِي تَوَفَّى النَّوْسِ وَالثَّالِثُ تَوَفَّى الرُّوحَ وَالْبَدَنَ جَمِيعًا اور کلمات ابوالبقاء میں ہے: التَّوَفَّى الْأَمَانَةَ وَقَبْضُ الرُّوحِ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْعَامَّةِ أَوِ الْإِسْتِيفَاءُ وَآخِذُ الْحَقِّ وَعَلَيْهِ اسْتِعْمَالُ الْبُلْغَاءِ۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لفظ متوفیک کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ المنذر میں مذکور ہے، اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو







نصرہ کران تمام خیالات کا ابطال کر دیا پھر اپنی طرف ہلانے کا ذکر فرمایا۔

اور حقیقت یہ ہے کہ کفار و مشرکین کی مخالفت و عداوت تو انبیاء علیہم السلام سے ہمیشہ ہی ہوتی چلی آتی ہے، اور عداوت اللہ یہ رہی ہے کہ جب کسی نبی کی قوم اپنے انکار اور ضد پر جمی رہی پیغمبر کی بات نہ مانی، ان کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہ لائی، تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کی گئی ہے، یا تو اس قوم پر آسمانی عذاب بھیج کر سب کو فنا کر دیا گیا، جیسے عاد و ثمود اور قوم لوط علیہ السلام و قوم صالح علیہ السلام کے ساتھ معاملہ کیا گیا یا پھر یہ صورت ہوتی کہ اپنے پیغمبر کو اس دار الکفر سے ہجرت کر کے کسی دوسری طرف منتقل کیا گیا اور وہاں ان کو وہ قوت و شوکت دی گئی کہ پھر اپنی قوم پر فتح پائی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت کر کے شام میں پناہ لی، اسی طرح حضرت موسیٰ مصر سے ہجرت کر کے ملا شام میں تشریف لے گئے اور آخر میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، پھر وہاں سے حطہ آور ہو کر مکہ فتح کیا، یہودیوں کے نزعہ سے بچانے کے لئے یہ آسمان پر بلا لینا بھی حقیقت ایک قسم کی ہجرت تھی، جس کے بعد وہ پھر دنیا میں واپس آ کر یہودیوں پر مکمل فتح حاصل کریں گے، رہا یہ معاملہ کہ ان کی یہ ہجرت سب کے الگ آسمان کی طرف کیوں ہے؟ تو حق تعالیٰ نے ان کے بارے میں خود فرما دیا ہے کہ ان کی مثال آدم علیہ السلام کی سی ہے، جس طرح آدم علیہ السلام کی پیدائش عام مخلوقات کے طریق پیدائش سے مختلف بغیر ماں باپ کے ہے اسی طرح ان کی پیدائش عام انسانوں کی پیدائش سے مختلف صورت سے ہوئی اور موت بھی عجیب و غریب طریقہ سے صد ہا سال کے بعد دنیا میں آ کر عجیب ہوگی تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی ہجرت بھی کسی ایسے عجیب طریقہ سے ہو۔

یہی عجائب قدرت تو جاہل نصاریٰ کے لئے اس عقیدہ میں مبتلا ہونے کا سبب بن گئے، کہ ان کو خدا کہنے لگے، حالانکہ انہی عجائب کے ہر قدم اور ہر چیز پر غور کیا جائے تو ہر ایک واقعہ میں انکی عبدیت و بندگی اور تابع فرمان الہی ہونے اور بشری خصائص سے متصف ہونے کے دلائل ہیں، اور اسی لئے ہر ایسے موقع پر قرآن حکیم نے عقیدہ الوہیت کے ابطال کی طرف اشارہ کر دیا ہے، آسمان پر اٹھانے سے یہ شبہ بہت قوی ہو جاتا، اس لئے متوفیقیت کو پہلے بیان کر کے شبہ کا قلع قمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا اس تقدیم و تاخیر الفاظ کے ذریعہ اسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہو گئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے



بڑی ہوں، ایک وقت آئے گا جب ان کو بھی موت آئے گی۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم و تاخیر اسی طرح کے مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر، ص ۱۴۸۱، ج ۲)

وَرَأَيْتُكَ إِلَىٰ، اس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ نام صرف روح کا نہیں بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہو ا جسمانی نہیں اٹھایا گیا بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ رفع کبھی بلندی مرتبہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رَفَعَ بَعْضُكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ (۱۶۶:۶)، اور يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ (۵۸:۱۱) وغیرہ آیات میں مذکور ہے۔

تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ رفع کو رفع درجہ کے معنی میں استعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرآن کی بناء پر مذکورہ آیات میں ہوا ہے، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ رفع کے ساتھ لفظ الی استعمال فرما کر اس مجازی معنی کا استعمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں رَأَيْتُكَ إِلَىٰ فرمایا، اور سورۃ نسا کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۚ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ (۱۵۸:۴) یعنی یہودیوں نے یقیناً نہ قتل کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا، اپنی طرف اٹھا لینا روح مع جسد کے زندہ اٹھا لینے ہی کے لئے بولا جاتا ہے، یہاں تک الفاظ آیت کی تشریح ہوئی۔

آیت مذکورہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں حضرت سے اللہ تعالیٰ کے پانچ وعدے عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے،

سب پہلا وعدہ یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی، اور وہ وقت موعود قرب قیامت میں آئے گا جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ متواترہ میں اس کی تفصیل موجود ہے، اور اس کا کچھ حصہ آگے آئے گا۔

دوسرا وعدہ فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھا لینے کا تھا، یہ اسی وقت پورا کر دیا گیا جس کے پورا کرنے کی خبر سورۃ نسا کی آیت میں اس طرح دیدی گئی، وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۚ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ (۱۵۸:۴) ”یقیناً ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا“



تیسرا وعدہ، ان کو دشمنوں کی ہمتوں سے پاک کرنے کا تھا وَمُطَهِّرُونَ الَّذِينَ  
كَفَرُوا، میں وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے، اور یہود کے  
سب غلط الزامات کو صاف کر دیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا  
ہونے کی وجہ ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، قرآن کریم نے اس الزام کو یہ فسر کر  
صاف کر دیا کہ وہ محض اللہ کی قدرت اور اس کے حکم سے بلا باپ کے پیدا ہوئے، اور یہ کوئی  
تعجب کی چیز نہیں، حضرت آدم کی پیدائش اس سے زیادہ تعجب کی چیز ہے، کہ ماں اور باپ  
دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدائی کے دعوے کا الزام لگاتے تھے، قرآن کریم کی  
بہت سی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس کے خلاف اپنی عبدیت اور بندگی اور بشریت  
کا اقرار نقل فرمایا۔

چوتھا وعدہ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فِي سَبْعَةِ مِائَاتٍ سَنَةٍ مِّنْ قَبْلِ يَوْمِ تَأْتِي السُّحُبُ بِرَبِّكَ،  
پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں اتباع سے مراد حضرت  
عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور اقرار مراد ہے، ان کے سب احکام پر ایمان و اعتقاد کی  
شرط نہیں، تو اس طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہو گئے کہ وہ حضرت عیسیٰ  
علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد و نجات  
آخرت کے لئے کافی نہیں بلکہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام  
احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے  
ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر  
اعتقاد و ایمان خستیاں نہ کیا، اس لئے نجات آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر بھی  
عمل کیا، اس لئے نجات آخرت کے مستحق ہو گئے، لیکن دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ  
صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر موقوف تھا، وہ دنیا کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو  
بمقابلہ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقیناً قیامت تک رہے گا۔

جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے  
کہ بمقابلہ یہود ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انھیں کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں  
اور رہیں۔

اسرائیل کی موجودہ حکومت	کیونکہ اول تو اس حکومت کی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ وہ روس
اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا	اور یورپ کے نصاریٰ کی مشترکہ چھاؤنی ہے جو انھوں نے مسلمانوں



کے خلاف قائم کر رکھی ہے، ایک دن کے لئے بھی اگر حکومت روس و امریکہ و دیگر ممالک یورپ اپنا ہاتھ اس کے سر سے ہٹالیں تو دنیا کے نقشہ سے اس کا وجود مٹتا ہوا ساری دنیا مشاہدہ کرے، اس لئے یہودی اسرائیل کی یہ حکومت حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ایک مجاز تو ہو سکتا ہے اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں، اور بالفرض اس کو انکی اپنی ہی حکومت تسلیم کر لیا جائے تو بھی نصاریٰ اور اہل اسلام کے مجموعہ کے مقابلہ میں اس کے مغلوب و مقہور ہونے سے کونسا صحیح العقل انسان انکار کر سکتا ہے، اس سے بھی قطع نظر کہ تو قرب قیامت میں چند روزہ یہود کے غلبہ کی خبر تو خود اسلام کی متواتر روایات میں موجود ہے، اگر اس دنیا کو اب زیادہ باقی رہنا نہیں ہے اور قیامت قریب ہی آچکی ہے تو اس کا ہونا بھی اسلامی روایات کے منافی نہیں، اور ایسی چند روزہ شورش کو سلطنت یا حکومت نہیں کہہ سکتے۔

**پانچواں وعدہ، قیامت کے روزانہ مذہبی اختلافات کا فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، جیسا کہ آیت میں ارشاد ہے ثُمَّ لَآتِي مَرْجِعَكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ**

## مسئلہ حیات و نزول عیسیٰ علیہ السلام

دنیا میں صرف یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو کر دفن ہو گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۃ نسا کی آیت میں واضح کر دی ہے، اور اس آیت میں بھی وَ مَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا کہ جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کر کے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا، آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِنْ  
شُبِّهَ لَهُمْ ۖ (۱۵۴:۴)

نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا

لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا کہ اپنے

ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہوئے،

اس کی مزید تفصیل سورۃ نسا میں آئے گی۔

نصاری کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہو گئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے، مذکورہ آیت نے ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کر دی، اور بتلادیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکہ



عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اس لئے مُشَبَّہ لَہُمْ کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہو گئے۔

ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ جو اس آیت اور دوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے آسمان پر زندہ اٹھائے گا ان کو قتل کیا جاسکا نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قریب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے، اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔

اسی عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تلخیص الجبر ص ۳۱۹ میں یہ اجماع نقل کیا ہے، قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اجماع امت سے ثابت ہے، یہاں اس کی پوری تفصیل کا موقع بھی نہیں، اور ضرورت بھی نہیں، کیونکہ علماء امت نے اس مسئلہ کو مستقل کتابوں اور رسالوں میں پورا پورا واضح فرما دیا ہے، اور منکرین کے جوابات تفصیل سے دیتے ہیں، ان کا مطالعہ کافی ہے مثلاً حضرت حجۃ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری کی تصنیف بزبان عربی عقیدۃ الاسلام فی حیات عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مولانا بدر عالم صاحب مباحثہ مدنی کی تصنیف بزبان اردو حیات عیسیٰ علیہ السلام، مولانا سید محمد آدریس صاحب کی تصنیف حیات مسیح علیہ السلام، اور بھی سینکڑوں چھوٹے بڑے رسائل اس مسئلہ پر بطور و مشتہر ہو چکے ہیں، احقر نے ہاں اسٹاؤ محترم حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے زائد احادیث جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ اٹھایا جانا اور پھر قریب قیامت میں نازل ہونا بتواتر ثابت ہوتا ہے ایک مستقل کتاب التصریح بما تواتر فی نزول مسیح میں جمع کر دیا ہے، جس کو حال میں حواشی و شرح کے ساتھ طب شام کے ایک بزرگ علامہ عبدالفتاح ابو غدہ نے بیروت میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔

اور حافظ ابن کثیرؒ نے سورۃ زخرف کی آیت **وَإِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ** (۶۱: ۳۳) کی تفسیر میں لکھا

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث

اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے حضرت

عیسیٰ علیہ السلام کے قبل قیامت نازل

ہونے کی خبر دی ہے ۵

وَقَدْ تَوَاتَرَتْ الْأَحَادِيثُ عَنْ

رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَنَّهُ أَخْبَرَ بِنُزُولِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ

قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِمَامًا عَادِلًا الْحَمْدُ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور زندہ رہنے پھر قریب قیامت



میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی نصوص قطعیہ اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے جن کو علماء امت نے مستقبل کتابوں رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے جن میں سے بعض کے نام اوپر درج ہیں مسئلہ کی مکمل تحقیق کے لئے تو انہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس پر نظر کرنے سے ذرا بھی عقل والوں کو شک ہو تو اس مسئلہ میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، وہ یہ ہے کہ سورۃ آل عمران کے چوتھے رکوع میں حق تعالیٰ نے انبیاء سابقین کا ذکر فرمایا تو حضرت آدم، نوح، آل ابراہیم، آل عمران، سب کا ذکر ایک ہی آیت میں اجمالاً کرنے پر اکتفا فرمایا، اس کے بعد تقریباً تین رکوع اور بائیس آیتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کا ذکر اس بسط و تفصیل کے ساتھ کیا گیا کہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جن پر قرآن نازل ہوا ان کا ذکر بھی اتنی تفصیل کے ساتھ نہیں آیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نانی کا ذکر ان کی نذر کا بیان والدہ کی پیدائش ان کا نام ان کی تربیت کا تفصیلی ذکر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بطن مادر میں آنا، پھر ولادت کا مفصل حال، ولادت کے بعد ماں نے کیا کھایا پیا اس کا ذکر، اپنے خاندان میں بچے کو لے کر آنا، ان کے طعن و تشنیع، اول ولادت میں ان کو بطور معجزہ گویائی عطا ہونا، پھر جوان ہونا اور قوم کو دعوت دینا، ان کی مخالفت، حواریں کی کی امداد، یہودیوں کا نرغہ، ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا جانا وغیرہ، پھر احادیث متواترہ میں ان کی مزید صفات، اشک و صورت، ہیئت، لباس وغیرہ کی پوری تفصیلات، یہ ایسے حالات ہیں کہ پورے قرآن و حدیث میں کسی نبی و رسول کے حالات اس تفصیل سے بیان نہیں کئے گئے، یہ بات ہر انسان کو دعوت فکر دیتی ہے کہ ایسا کیوں اور کس حکمت سے ہوا۔

ذرا بھی غور کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی و رسول ہیں کوئی دوسرا نبی آپ کے بعد آنے والا نہیں، اس لئے آپ نے اپنی تعلیمات میں اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ قیامت تک جو جو مراحل امت کو پیش آنے والے ہیں ان کے متعلق ہدایات دیدیں، اس لئے آپ نے ایک طرف تو اس کا اہتمام فرمایا کہ آپ کے بعد قابل اتباع کون لوگ ہوں گے، ان کا تذکرہ اصولی طور پر عام اوصاف کے ساتھ بھی بیان فرمایا بہت سے حضرات کے نام متعین کر کے بھی امت کو ان کے اتباع کی تاکید فرمائی، اس کے بالمقابل ان گمراہ لوگوں کا بھی پتہ دیا جن سے امت کے دین کو خطرہ تھا۔

بعد کے آنے والے گمراہوں میں سب سے بڑا شخص مسیح و جال تھا، جس کا فتنہ سخت گمراہ کن تھا اس کے لئے حالات و صفات بیان فرمادیئے کہ اس کے آنے کے وقت امت کو اس کے گمراہ ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے، اسی طرح بعد کے آنے والے مصلحین اور قابل اقتداء



بزرگوں میں سب سے زیادہ بڑے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کو حق تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے نوازا، اور فتنہ و جہال میں امت مسلمہ کی امداد کے لئے ان کو آسمان میں زندہ رکھا، اور قرب قیامت میں ان کو قتل و جہال کے لئے مامور فرمایا، اس لئے ضرورت تھی کہ ان کے حالات و صفات بھی امت کو ایسے واشگاف بتلائے جائیں جن کے بعد نزول عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کسی انسان کو ان کے پہچاننے میں کوئی شک و شبہ نہ رہ جائے۔

اس میں بہت سی حکم و مصالح ہیں، اول یہ کہ اگر امت کو ان کے پہچاننے ہی میں اشکال پیش آیا تو ان کے نزول کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، امت مسلمہ ان کے ساتھ نہ لگے گی تو وہ امت کی امداد و نصرت کس طرح فرمائیں گے۔

دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ اس وقت فرائض نبوت و رسالت پر مامور ہو کر دنیا میں نہ آئیں گے، بلکہ امت محمدیہ کی قیادت و امامت کے لئے بحیثیت خلیفہ رسول تشریف لائیں گے، مگر ذاتی طور پر جو ان کو منصب نبوت و رسالت حاصل ہے اس سے معزول بھی نہ ہوں گے، بلکہ اس وقت ان کی مثال اس گورنر کی سی ہوگی جو اپنے صوبہ کا گورنر ہے، مگر کسی ضرورت سے دوسرے صوبہ میں چلا گیا ہے، تو وہ اگرچہ صوبے میں گورنر کی حیثیت پر نہیں مگر اپنے عہدہ گورنری سے معزول بھی نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت بھی صفت نبوت و رسالت سے الگ نہیں ہوں گے، اور جس طرح ان کی نبوت سے انکار پہلے کفر تھا اس وقت بھی کفر ہوگا، تو امت مسلمہ جو پہلے سے ان کی نبوت پر شرابی ارشادات کی بناء پر ایمان لائے ہوئے ہے اگر نزول کے وقت ان کو نہ پہچانے تو انکار میں مبتلا ہو جائے گی، اس لئے انکی علامات و صفات کو بہت زیادہ واضح کرنے کی ضرورت تھی۔

تیسرے یہ کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ تو دنیا کی آخری عمر میں پیش آئے گا، اگر انکی علامات و حالات مبہم ہوتے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی دوسرا آدمی دعویٰ کر بیٹھے کہ میں مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوں، ان علامات کے ذریعہ اس کی تردید کی جاسکے گی، جیسا کہ ہندوستان میں مرزا قادیانی نے دعویٰ کیا کہ میں مسیح موعود ہوں، اور علماء امت نے انہی علامات کی بناء پر اس کے قول کو رد کیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس جگہ اور دوسرے مواقع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و صفات کا اتنی تفصیل کے ساتھ بیان ہونا خود ان کے قرب قیامت میں نازل ہونے اور دوبارہ دنیا میں تشریف لانے ہی کی خبر دے رہا ہے، احقر نے اس مضمون کو پوری وضاحت کے ساتھ اپنے رسالہ مسیح موعود کی پہچان میں بیان کر دیا ہے، اس کو دیکھ لیا جائے۔



فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَعَذِّبُهُمْ عَنْ أَبَاسٍ يَدِ الْدُّنْيَا

سودہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب دنیا میں

وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿۵۸﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا

اور آخرت میں اور کوئی نہیں ان کا مددگار اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور

عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

کام نیک کئے سوان کو پورا دے گا ان کا حق اور اللہ کو خوش نہیں آتے

الظَّالِمِينَ ﴿۵۹﴾ ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ﴿۶۰﴾

بے انصاف یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں اور بیان تحقیقی

رابط آیات | اور پر آیت میں مذکور تھا کہ "میں ان اختلاف کرنیوالوں کے درمیان قیامت کے روز عملی فیصلہ کروں گا" اس آیت میں اس فیصلہ کا بیان ہے:

## خلاصہ تفسیر

تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ ان اختلاف کرنے والوں میں کافر تھے سوان کو (ان کے کفر پر) سخت سزا دی گئی (مجموعہ دونوں جہان میں) دنیا میں بھی (کہ وہ تو ہو چکی) اور آخرت میں بھی (کہ وہ باقی رہی) اور ان لوگوں کا کوئی حامی (طرف دار) نہ ہوگا اور جو لوگ مومن تھے اور انھوں نے نیک کام کئے تھے سوان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کے) ثواب دیں گے اور کفار کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے (ایسے) ظلم کرنے والوں سے (جو خدا تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں یعنی چونکہ یہ ظلم عظیم ہے، معافی کے قابل نہیں، اس لئے مبغوض شدید ہو کر سزا یاب ہو جاتا ہے) یہ (قصہ مذکورہ) ہم تم کو (بذریعہ وحی کے) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ (آپ کے) منجملہ دلائل (نبوت) کے ہے اور منجملہ حکمت امیر مضامین کے ہے

## معارف و مسائل

مصائب دنیا کفار کے لئے کفارہ نہیں ہوتے | فَأَعَذِّبُهُمْ عَنْ أَبَاسٍ يَدِ الْدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ مومن کے لئے کفارہ ہو کر مفید ہوتے ہیں | اس آیت کے مضمون پر ایک خفیف سا اشکال ہوتا ہے، کہ قیامت کے فیصلہ کے بیان میں اس کہنے کے کیا معنی کہ میں دنیا و آخرت میں سزا دیں گا کیونکہ



اس وقت تو سزائے دنیوی نہیں ہوگی۔

حل اس کا یہ ہے کہ اس کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو یہ کہے کہ اس وقت تو ایک سال کی قید کرتا ہوں اگر جیل خانہ میں کوئی شرارت کی تو دو سال کی سزا کر دوں گا، فقط اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ دو سال آج کی تاریخ سے ہوں گے، پس اس بنا پر یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم ہو جاوے گا، حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعہ کی تکمیل بطور انضمام ایک سال زائد کے مرتب ہو جاوے گی۔

اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں تو سزا ہو چکی اس کے ساتھ سزائے آخرت منہم ہو کر مجموعہ قیامت کے روز تکمیل کر دیا جائے گا، یعنی سزائے دنیا کفارہ نہ ہو گا سزائے آخرت کے لئے بخلاف اہل ایمان کے کہ اگر ان پر دنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور عاقبت کی عقوبت خفیف یا دفع ہو جاتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کی طرف لَا يُجِيبُ الظَّالِمِينَ میں اشارہ فرمایا گیا، یعنی اہل ایمان بسبب ایمان کے محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں، اور اہل کفر بسبب کفر کے مبغوض ہیں، مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ (بیان القرآن)

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ طَخَلَقَهُ مِنْ تَرَابٍ ثُمَّ

بیشک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی بنایا اس کو مٹی سے پھر

قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝۹۰ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ

کہا اس کو کہ ہو جا وہ ہو گیا ، حق وہ ہے جو تیرا رب کہے پھر تو مت رہ شک

الْمُتَرَدِّينَ ۝۹۱ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ

لانے والوں میں سے پھر جو کوئی جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آچکی تیرے پاس

مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَ كُمْ وَنِسَاءَنَا

خبر بھی تو تو کہہ دے آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں

وَنِسَاءَ كُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ

اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان پھرا لتا کریں ہم سب اور لعنت کریں

اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝۹۲ إِنَّ هَذَا الْقَصَصَ الْحَقُّ ج

اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں ، بے شک یہی ہے بیان سچا ،



وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٣﴾

اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

پھر اگر متحول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے

## حُصْلَةُ تَفْسِيرِ

بیشک حالت عجیبہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک (یعنی ان کی تجویز ازلی میں) مشابہ حالت عجیبہ (حضرت آدم علیہ السلام) کے ہے کہ ان (آدم علیہ السلام) کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا، پس وہ (جاندار) ہو گئے، یہ امر واقعی (جو اوپر مذکور ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جائیے، پس جو آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے، تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجئے کہ (اچھا اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آجاذہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمھارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمھاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمھارے تنوں کو پھر ہم (سب مل کر) خوب ل سے زعماء کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث میں) ناحق پر ہوں، بیشک یہ (جو کچھ) مذکور (ہوا) وہی ہے سچی بات، اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے (یہ توحید ذاتی ہوئی) اور بلا شک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں (یہ توحید صفاتی ہوئی) پھر ان سب جھٹوں کے بعد بھی (اگر حق قبول کرنے سے سرتابی کریں) تو آپ ان کا معاملہ حوالہ بخدا کیجئے، کیونکہ اے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد کرنے والوں کو

## معارف و مسائل

### قیاس کی حیثیت

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیاس بھی حجت شرعیہ سے ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش



ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی، یعنی جس طرح آدم علیہ السلام کو بغیر باپ (اور ماں) کے پیدا کیا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بغیر باپ کے پیدا کیا، تو یہاں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کی پیدائش کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش پر قیاس کرنے کی طرف اشارہ فرما دیا (منظری)۔

**مُباہلہ کی تعریف** فَقُلْ تَعَالَوْا اِنْدَعِبْ اِنْ اِس آیت سے اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مباہلہ کرنے کا حکم دیا ہے، جس کی تعریف یہ ہے کہ اگر کسی امر کے حق و باطل

میں سر لقیں میں نزاع ہو جائے اور دلائل سے نزاع ختم نہ ہو تو پھر ان کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ سب مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو اس امر میں باطل پر ہو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے وبال اور ہلاکت پڑے، کیونکہ لعنت کے معنی رحمت حق سے بعید ہو جانا ہے، اور رحمت سے بعید ہونا قہر سے قریب ہونا ہے، پس حاصل معنی اس کے یہ ہوئے کہ جھوٹے پر قہر نازل ہو، سو جو شخص جھوٹا ہو گا وہ اس کا خمیازہ بھگے گا، اُس وقت پوری تعین صادق و کاذب کی منکرین کے نزدیک بھی واضح ہو جائے گی، اس طور پر دعا کرنے کو مُباہلہ کہتے ہیں، اور اس میں اصل خود مباحثہ کرنے والوں کا جمع ہو کر دعا کرنا ہے، اپنے اعزہ و اقارب کو جمع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر جمع کیا جاوے تو اس سے اور اہتمام بڑھ جاتا ہے۔

**واقعہ مُباہلہ اور ردِّ روافض** اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحران کے نصاریٰ کی جانب ایک فرمان بھیجا جس میں تین چیزیں

ترتیب وار ذکر کی گئی تھیں (۱) اسلام قبول کرو (۲) یا جزیرہ ادا کرو (۳) یا جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، نصاریٰ نے آپس میں مشورہ کر کے شرجیل، عبداللہ بن شرجیل اور جبار بن قیس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، ان لوگوں نے آکر مذہبی امور پر بات چیت شروع کی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کرنے میں ان لوگوں نے انتہائی بحث و تکرار سے کام لیا، اتنے میں یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی، اس پر آپ نے نصاریٰ کو مباہلہ کی دعوت دی، اور خود بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ، امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر مباہلہ کے لئے تیار ہو کر تشریف لائے، شرجیل نے یہ دیکھ کر اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ تم کو معلوم ہے کہ یہ اللہ کا نبی ہے، نبی سے مباہلہ کرنے میں ہماری ہلاکت ہے، بربادی یقینی ہے، اس لئے نجات کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو، ساتھیوں نے کہا کہ تمہارے نزدیک نجات کی کیا صورت ہے؟ اس نے کہا کہ میرے نزدیک بہتر صورت یہ ہے کہ نبی کی رائے کے موافق صلح کی جائے، چنانچہ اسی پر سب کا اتفاق ہو گیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر جزیہ مسترد کر کے صلح کر دی، جس کو انھوں نے بھی



منظور کر لیا (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اس آیت میں اَبْنَاءُ نَا سے مراد صرف اولادِ صلیبی نہیں ہے، بلکہ عام مراد ہے خواہ اولاد ہو یا اولاد کی اولاد ہو کیونکہ عرفاً ان سب پر اولاد کا اطلاق ہوتا ہے، لہذا اَبْنَاءُ نَا میں آپ کے نواسے حضراتِ حسنینؑ اور آپ کے داماد حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں، خصوصاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اَبْنَاءُ نَا میں داخل کرنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ آپ نے تو پرورش بھی حضور کی آغوش میں پائی تھی، آپ نے ان کو اپنے بچوں کی طرح پالا پوسا، اور آپ کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا، ایسے بچے پر عرفاً بیٹے کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اولاد میں داخل ہیں، لہذا روافض کا آپ کو اَبْنَاءُ نَا سے خارج کر کے اور اَنْفُسَنَا میں داخل کر کے آپ کی خلافت بلا فصل پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

تو کہہ لے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں

أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا

کہ بزرگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی کو اور نہ بنادے کوئی

بَعْضُنَا أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا

کسی کو رب سوائے اللہ کے پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ

بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۶۳﴾

ہم تو حکم کے تابع ہیں

## خلاصہ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہماری اور تمہاری درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر پھر اگر اس کے بعد بھی (وہ لوگ حق سے) اعراض کریں تو تم (مسلمان) لوگ کہہ دو کہ تم (سہماریے) اس (اقرار)



کے گواہ رہو کہ ہم تو اس بات کے، ماننے والے ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)۔

## معارف و مسائل

**تبلیغ و دعوت کے اہم اصول** **تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَمْ** اس آیت سے تبلیغ و دعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص

کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہش مند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، وہ دعوت نامہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ  
إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى  
أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدَعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمْتَ تَسْلَمُ يَوْمَكَ  
اللَّهُ أَجْرُكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ أَثْمَ الْإِثْمَيْنِ، يَا أَهْلَ  
الْكُتُبِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا  
اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ  
اللَّهِ (بخاری)

”میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے  
یہ خط محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسولؐ کی جانب سے، روم کے بادشاہ  
ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہو اس شخص کے لئے جو راہ ہدایت کی پیروی کرے  
بعد اس کے میں تجھے اسلام کے بلائے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسلام لا  
تو سلامت رہے گا، اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دوہرا اجر دے گا، اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ  
پر ان سب کسانوں کا وبال ہوگا جو تیری رعایا ہیں، اے اہل کتاب! ایک ایسی بات  
آگر جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی  
عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ شریک کریں، اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر  
آپس میں اپنوں کو رب بنائیں“



فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ، اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ تم گواہ رہو اس سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہئے، مزید بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ

اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور توریت اور انجیل تو اتریں

وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۹۵﴾ هَآنَتْكُمْ هَؤُلَاءِ

اس کے بعد کیا تم کو عقل نہیں سنے ہو تم لوگ

حَاجَّتُمْ فِيهِ الْكُمُورَ لِمَ تَحَاجُّونَ فِيهِمَا لَيْسَ

جھگڑانے کے جس بات میں تم کو کچھ خبر تھی، اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں تم کو

لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۹۶﴾ مَا كَانَ

کچھ خبر نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے نہ تھا

إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَ

ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی لیکن تھا حنیف یعنی سب جھوٹے مذہبوں کا بیزار اور حکیم دار

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۹۷﴾ إِنَّ أَوَّلِي النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ

اور نہ تھا مشرک، لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی جو ساتھ

اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۸﴾

اس کے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا

## خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب کیوں حجت کرتے ہو (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے بارے میں (کہ وہ طریق یہودیت پر تھے یا نصرا نیت پر تھے) حالانکہ ہمیں نازل کی گئی توراۃ اور انجیل، مگر ان کے زمانہ کے بہت بعد (اور یہ دونوں طریق ان دونوں کتابوں کے نزول کے بعد ظاہر ہوئے پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا، پھر حضرت ابراہیم ان طریقوں پر کس طرح ہو سکتے ہیں) کیا (ایسی خلاف عقل بات منہ سے نکالتے ہو اور) پھر سمجھتے نہیں ہو، ہاں تم ایسے ہو



کہ ایسی بات میں حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی (گو اس میں ایک غلط مقدمہ لگا کر نتیجہ غلط نکالتے تھے مراد اس سے خوارق ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے کہ یہ مطابق واقع کے ہے، البتہ اس میں یہ مقدمہ غلط ملا لیا گیا کہ ایسے خوارق والا الہ یا ابن الہ ہوگا لیکن ایک مقدمہ منشاء اشتباہ تو تھا، اس لئے اس کو ناکافی واقفیت کہیں گے، جب اس میں تمھاری غلطی ظاہر ہو گئی) سو ایسی بات میں (پھر) کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصل واقفیت نہیں، (کیونکہ اس دعوے کے لئے تو کوئی سبب اشتباہ کا بھی تھا ایسے پاس نہیں، کیونکہ ان کے اور ابراہیم علیہ السلام کے فروع شریعت میں موافقت بھی نہ تھی) اور اللہ تعالیٰ (ابراہیم علیہ السلام کے طریق کو خوب) جانتے ہیں تم نہیں جانتے (جب تم ایسے بے سربا دعوے کرتے ہو جس سے علم بھی مثل عدم علم کے سمجھا جاتا ہے، تو اب اللہ تعالیٰ سے ان کے طریق کو سنو کہ) ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن (البتہ) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے (سو یہود اور نصاریٰ کو تو مذہبی طریق کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ ہوتی، ہاں) بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے وقت میں) ان کا اتباع کیا تھا اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اور یہ ایمان والے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں) اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے کہ ان کو ان کے ایمان کا ثواب دیں گے)۔

وَدَّتْ لَهَا فِئَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ

آرزو ہے بعض اہل کتاب کو کہ کسی طرح گمراہ کریں تم کو اور گمراہ نہیں کرتے

إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٩﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ

مگر اپنے آپ کو اور نہیں سمجھتے، اے اہل کتاب کیوں انکار کرتے ہو

بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ

اللہ کے کلام کا اور تم قائل ہو، اے اہل کتاب کیوں سلاتے

تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٧١﴾

ہو سچ میں جھوٹ اور چھپاتے ہو سچی بات جان کر

خلاصہ تفسیر | دل سے چاہتے ہیں بعض لوگ اہل کتاب میں سے اس امر کو کہ تم کو (دین حق) گمراہ کر دے



گمراہ نہیں کر سکتے مگر خود اپنے آپ کو وبالِ اضلال میں گرفتار کر رہے ہیں) اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے اسے اہل کتاب کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے ساتھ جو قورات اور انجیل میں نبوتِ محمدیہ پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ان آیات کی تکذیب کرنا ہے جو کفر ہے) حالانکہ تم (اپنی زبان سے) اقرار کرتے ہو کہ وہ آیات حق ہیں یہ تو ملامت ہوئی ان کے ضلال پر آگے ضلال پر ملامت فرماتے ہیں کہ اسے اہل کتاب کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوتِ محمدیہ) کو غیر واقعی (یعنی عبارت تحریف شدہ یا تفسیر فاسد) سے اور (کیوں) چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو (کہ حق بات چھپا ہے ہو)

## معارف و مسائل

أَنْتُمْ تَشْهَدُونَ اور أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ کے الفاظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر وہ اقرار حق نہ کریں یا ان کو علم نہ ہو تو ان کے لئے کفر جائز ہوگا، وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر اپنی ذات کے اعتبار سے ایک قبیح فعل ہے، یہ ہر حالت میں ناجائز ہے، البتہ علم و اقرار کے بعد کفر اختیار کرنے میں ملامت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ

اور کہا بعض اہل کتاب نے مانا تو جو کچھ اترا

عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَكُفُّوا أَلْخَرَةَ لَعَلَّهُمْ

مسلمانوں پر دن چڑھے اور منکر ہو جاؤ آخر دن میں شاید وہ

يَرْجِعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَتَّبِعُوا إِلَّا مَن تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنْ

پھر جاویں، اور نہ مانیں مگر اسی کی جو چلے تمھارے دین پر کہہ دے کہ بیشک

الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيْتُمْ أَوْ

ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا جیسا کہ تم کو ملا تھا

يَحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنْ الْفَضْلُ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن

وہ غالب کیوں آگئے تم پر تمھارے رب کے آگے تو کہہ بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جس کو

يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢١﴾ يَخْصُصُ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ

چاہے اور اللہ بہت گنجائش والا ہے خبردار خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے



## وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۷۴﴾

اور اللہ کا فضل بڑا ہے

## خلاصہ تفسیر

اور بعض لوگوں نے اپنی کتاب میں سے (بطور مشورۃ باہم) کہا کہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ ظاہراً ایمان لے آو اس (کتاب) پر جو نازل کی گئی ہے، (بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) مسلمانوں پر (مراد یہ کہ قرآن پر ایمان لے کر) شروع دن میں (یعنی صبح کے وقت) اور (پھر) انکار کر بیٹھو آخر دن (یعنی شام کو) عجب کیا (اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی قرآن اور اسلام کے حق میں شبہ پڑ جائے اور) وہ (اپنے دین سے) پھر جاویں (اور یہ خیال کریں کہ یہ لوگ علم والے ہیں اور بے تعصب بھی ہیں کہ اسلام قبول کر لیا، اس پر بھی جو پھر گئے تو ضرور اسلام کا غیر حق ہونا ان کو دلائل علیہ سے ثابت ہو گیا ہو گا، اور ضرور انھوں نے اسلام میں کوئی خرابی دیکھی ہو گی جب ہی تو اس سے پھر گئے اور اہل کتاب نے یہ بھی باہم کہا کہ مسلمانوں کے دکھلانے کو صرف ظاہری ایمان (الما) اور (صدق دل سے) کسی کے روبرو (دین کا) اقرار مت کرنا، مگر ایسے شخص کے روبرو جو سمجھائے دین کا پیرو ہو اور اس کے روبرو تم کو اپنے قدیم دین کا اقرار خلوص سے کرنا چاہئے باقی غیر مذاہب والوں کے یعنی مسلمانوں کے روبرو ویسے ہی بہ مصلحت مذکورہ زبانی اسلام کا اقرار کر لینا حق تعالیٰ ان کی تدبیر کے پھر جانے کا اظہار فرماتے ہیں کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ (ان چالاکوں سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ) یقیناً ہدایت (جو بندوں کو ہوتی ہے وہ) ہدایت اللہ کی (طرف سے ہوتی) ہے (پس جب ہدایت قبضۃ خداوندی میں ہے تو وہ جس کو ہدایت پر قائم رکھنا چاہیں اس کو کوئی دوسرا کسی تدبیر سے نہیں بچلا سکتا ہے، آگے ان کے اس مشورہ و تدبیر کی علت بتلائے ہیں کہ اے اہل کتاب تم، ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی، (یعنی کتاب اور دین آسمانی) یا وہ اور لوگ تم پر غالب آجاویں (اس دین حق کی تعیین میں جو) تمھارے رب کے نزدیک (ہے) حاصل علت کا یہ ہوا کہ تم کو مسلمانوں پر حسد ہے کہ ان کو آسمانی کتاب کیوں مل گئی، یا یہ لوگ ہم پر مذہبی منافقہ میں کیوں غالب آجاتے ہیں اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام کے تنزیل کی کوشش کر رہے ہیں، آگے اس حدکار دہے کہ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجئے کہ بے شک فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے وہ اس سے جسے چاہیں عطا فرماویں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں فضل کی کمی نہیں اور) خوب جاننے والے ہیں



رکھ کس وقت کس کو دنیا مناسب ہے اس لئے) خاص کر دیتے ہیں اپنی رحمت (و فضل) کے ساتھ، جس کو چاہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں (پس اس وقت برعایت حکمت مسلمانوں پر فضل و رحمت فرما دیا اس میں حسد کرنا فضول اور جہل ہے)۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِعِقْطِ رِيْوْدَةٍ إِلَيْكَ

اور بعض اہل کتاب میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا تو ادا کر دیں بھجھ کو

وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ لِأَيُّودَةٍ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمَّتْ

اور بعض ان میں وہ ہیں کہ اگر تو ان کے پاس امانت رکھے ایک اشرفی تو ادا نہ کریں بھجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے

عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ يَأْخُذُكَ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّاتِ

اس کے سر پر کھڑا یہ اس واسطے کہ انھوں نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہے ہم پر ان لوگوں کے حق لینے

سَبِيلٌ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾

میں کچھ گناہ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر اور وہ جانتے ہیں

**رابط آیات** | اوپر کی آیتوں میں اہل کتاب کی خیانت فی الدین کا ذکر تھا، یعنی ان کا کفر کرنا آیات اللہ کے ساتھ اور خلط کرنا حق اور باطل کا، اور حق کے چھپانے کا، اور تدبیر کرنا مؤمنین کی گمراہی کی اگلی آیت میں ان کی اموال میں خیانت کرنے کا ذکر ہے، اور ان میں سے چونکہ بعض امانت دار بھی تھے، اس لئے دونوں قصوں کو ذکر فرمایا۔

## خلاصہ تفسیر

اور اہل کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب) اگر تم اس کے پاس انبیاء کا انبیاء مال بھی امانت رکھ دو تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے (بلکہ امانت رکھانے کا بھی اقرار نہ کرے)، مگر جب تک کہ تم (امانت رکھ کر) اس کے سر پر (برابر) کھڑے رہو (اس وقت تک تو انکار نہ کرے اور جہاں الگ ہوئے پھراؤ کرنے کا تو کیا ذکر ہے، سرے سے امانت ہی سے منکر ہواوے) یہ (امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے (مال کے) ہانے میں (اگر چوری چھپے لیا جاوے مذہباً) کسی طرح کا الزام نہیں (یعنی غیر اہل کتاب مثلاً قریش کا مال چھرا لینا یا پھین لینا سب جائز ہے



اللہ تعالیٰ آگے ان کے اس دعویٰ کی تکذیب فرماتے ہیں) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں،  
 کہ اس فعل کو حلال سمجھتے ہیں) اور دل میں وہ بھی جانتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال نہیں کیا بعض  
 تراشیدہ دعویٰ ہے)

## معارف و مسائل

کسی غیر مسلم کے اچھے اوصاف کی مدح کرنا درست ہے | میں بعض لوگوں کی امانت دار ہونے پر مدح کی گئی ہے، اگر اس بعض  
 سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو ایمان لائے تھے تو ان کی تعریف کرنے میں کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر  
 خاص مومن مراد نہ ہوں بلکہ مطلقاً اہل کتاب ہوں جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں تو اس صورت  
 میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا تو پھر ان کی مدح سے کیا فائدہ؟  
 جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا مقبول ہونا اور چیز ہے اور اس کی مدح کرنا اور چیز ہے، مدح  
 کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اللہ کے ہاں مقبول بھی ہے، اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ اچھی بات  
 گو کافر کی ہو وہ بھی کسی درجہ میں اچھی ہی ہے، جس کا فائدہ اس کو دنیا میں "نیک نامی" ہے، اور  
 آخرت میں عذاب کی کمی۔

اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں  
 لیتا بلکہ وہ کھلے دل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی اس کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے۔  
 اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِمْ قَائِمًا، اس آیت سے امام ابو حنیفہؒ نے استدلال کیا ہے کہ  
 دائن کو یہ حق ہے کہ وہ مدیون سے اپنا حق وصول کرنے تک اس کا پیچھا کرتا رہے (قرطبی ج ۴)

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۷۷﴾

کیوں نہیں جو کوئی پورا کرے اپنا اقرار اور وہ پرہیزگار ہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیزگاروں سے

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا

جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے اقرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول

أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَ

ان کا کچھ حصہ نہیں آخرت میں اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور

لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۷۸﴾

نہ نگاہ کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ پاک کرے گا ان کو اور ان کے واسطے عذاب ہے دردناک



**رَبِّ آيَاتِ** | اوپر دیکھو گئی ہے اہل کتاب کے دعویٰ کی تکذیب مذکور تھی، آگے ان آیات سے اسی تکذیب کی تاکید اور ایفاء عہد کی فضیلت اور نقض عہد کی مذمت کی تصریح ہے،

## خلاصہ تفسیر

(خاتن پر) الزام کیوں نہ ہوگا ضرور ہوگا، کیونکہ اس کے متعلق ہمارے یہ دو قانون ہیں، ایک یہ کہ جو شخص اپنے عہد کو (خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ سے ہو یا ہو یا بشرط جواز کسی مخلوق سے) پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں (ایسے) متقیوں کو اور دوسرا قانون یہ ہے کہ یقیناً جو لوگ معاوضہ (یعنی نفع دہی) لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو (انہوں نے) اللہ تعالیٰ سے کیا ہے (مثلاً انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا) اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے (مثلاً حقوق العباد و معاملات کے باب میں قسم کھالینا) ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا اور نہ خدا تعالیٰ اُن سے (لطف کا) کلام فرماویں گے اور نہ اُن کی طرف (نظر محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز اور نہ اُن کو (گناہوں سے) پاک کریں گے، اور ان کے لئے دردناک عذاب (تجویز) ہوگا

## معارف و مسائل

عہد کی تعریف اور اس کے خلاف | عہد اس قول کا نام ہے جو فریقین کے درمیان باہمی بات چیت کرنے والے پر چند وعیدیں سے ملے ہوتا ہے، جس پر جانبین کو قائم رہنا ضروری ہوتا ہے، بخلاف وعدہ کے کہ وہ صرف جانب واحد سے ہوتا ہے، یعنی عہد عام ہے اور وعدہ خاص ہے۔ ایفاء عہد کی قرآن و سنت میں بہت تاکید آئی ہے، چنانچہ اوپر کی آیت نمبر میں بھی عہد کی خلاف ورزی کرنے والے پر پانچ وعیدیں مذکور ہیں:-

① ان کے لئے جنت کی نعمتوں سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان کا حق دیا تو اس نے اپنے لئے آگ کو واجب کر دیا، راوی نے عرض کیا کہ اگر وہ چیز معمولی سی ہو تب بھی اس کے لئے آگ واجب ہوگی؟ آپ نے جواب میں فرمایا اگرچہ وہ درخت کی سبز ٹہنی ہی کیوں نہ ہو (رواہ مسلم بحوالہ منہجری)

② اللہ تعالیٰ ان سے خوش کن بات نہیں کریں گے۔

③ اور اللہ تعالیٰ ان کی طرف قیامت کے دن رحمت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔



۴۵ اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کو معاف نہیں کریں گے، کیونکہ عہد کے خلاف کرنے کی وجہ سے عہد کا حق تلف ہوا ہے اور حق العہد کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے۔

۴۶ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

وَإِنْ مِنْهُمْ لَفِرْقَانٌ يُقَايِلُونَ أَلَيْسَتْ لَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ

اور ان میں ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تاکہ تم جانو

مِنَ الْكِتَابِ مَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ

کہ وہ کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے

وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ

اور وہ نہیں اللہ کا کہا اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں

يَعْلَمُونَ ۴۸ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ

جان کر کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت

وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَ

اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر

لَكِنْ كُونُوا رَبَّكُمْ عَلِمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا

لیکن یوں کہے کہ تم اللہ والے ہو جاؤ جیسے کہ تم بکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ

كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۴۹ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ

تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے اور نہ یہ کہے کہ تم کو کہ ٹھہراؤ فرشتوں کو

وَالنَّبِيِّنَ آرِبَاءَ أَيَاْمُكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۵۰

اور نبیوں کو رب کیا تم کو کفر سکھائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو

## خلاصہ تفسیر

اور بے شک ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے میں) یعنی ان میں کوئی لفظ یا کوئی تفسیر غلط ملا دیتے ہیں اور غلط پڑھنا کج زبانی کہلاتا ہے تاکہ تم لوگ (جو اس کو سنو تو) اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا جزو



نہیں اور (صرف دھوکہ دینے کے لئے اس عملی طریق پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ یہ (لفظ یا مطلب) خدا تعالیٰ کے پاس سے (جو الفاظ یا قواعد نازل ہوئے ہیں ان سے ثابت) ہے حالانکہ وہ (کسی طرح) خدا تعالیٰ کے پاس سے نہیں (پس ان کا جھوٹا ہونا لازم آگیا، آگے تاکید کے لئے اس کی پھر تصریح ہے) اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور اپنا جھوٹا ہونا دل میں خود بھی (وہ جانتے ہیں) کسی بشر سے یہ بات نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرمادیں (جن میں ہر ایک کا مقتضایہ کفر و شرک سے ممانعت اور) پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ، خدا تعالیٰ (کی توحید) کو چھوڑ کر (یعنی نبوت اور امر باشرک جمع نہیں ہو سکتے) ولیکن (وہ نبی یہ تو کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) بوجہ اس کے کہ تم کتاب الہی اور دین کو بھی) بکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو (اور اس کتاب میں تعلیم ہے توحید کی) اور نہ (وہ بشر موصوف بالنبوة) یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے لو کیا (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتلا دے گا بعد اس کے کہ تم اس عقیدہ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعم خود مسلمان ہو،

## معارف مسائل

**عصرتِ انبیاء کی ایک دلیل** | مَآکَانَ یَبْشَیْ، وفدِ تہران کی موجودگی میں بعض یہود و نصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمد! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ بن مریم کو پوجتے ہیں! آپ نے فرمایا، معاذ اللہ! کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں، یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب و حکمت اور قوت فیصلہ دیتا اور پیغمبری کے منصبِ بلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغام الہی پہنچا کر لوگوں کو اس کی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے، اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے، اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوندِ قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا، دنیا کی کوئی حکومت بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے:

(۱) یہ شخص حکومت کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں؟



(۲) حکومت کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادۂ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس توقع کی جاسکتی ہے، کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو، بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبۂ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو، لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں، اگر کسی مرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاویز کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے، ورنہ علم الہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ! یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک اور خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔

اس میں نصاریٰ کے اس دعویٰ کا بھی رد ہو گیا جو کہتے تھے کہ ابنیت والوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا تھا، اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کے بجائے آپ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے؟ اور اہل کتاب پر بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا (العیاذ باللہ) (فوائد عثمانی)

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَ

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور

حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ

عسلم پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان

بِهِ وَلَتَنْتَضِرُنَّ قَالُوا أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ

لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول

إِصْرِي قَالُوا أَأَقْرَرْنَا قَالُوا فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ

کیا بولے ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

الشَّاهِدِينَ ﴿۸۵﴾ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

گواہ ہوں پھر جو کوئی پھر جائے اس کے بعد تو وہی لوگ ہیں

الْفَاسِقُونَ ﴿۸۶﴾ أَفَغَيْرِ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْمَ مَنْ

نافسردان اب کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا دین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو



فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَظُوعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٩٧﴾

کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لا چاری سے اور اسی کی طرف سب پھر جاویں گے۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ

تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر

وَأِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْكَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ

اور اسمعیل پر اور اسحق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو

وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ

اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٩٨﴾

اور ہم اسی کے شرمندہ وار ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا (حضرات) انبیاء (علیہم السلام) سے کہ جو کچھ تم کو کتاب اور علم (شریعت) دوں (اور) پھر تمھارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آوے جو مصداق (اور موافق) ہو اس (علامت) کا جو تمھارے پاس (کی کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی دلائل معتبرہ عند الشرع سے اس کی رسالت ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رسالت) پر (دل سے) اعتقاد بھی لانا اور (ساتھ پاؤں سے) اس کی مدد بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ آیا تم نے اقرار کیا اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا) وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو اپنے اس قرار پر) گواہ بھی رہنا کیونکہ گواہی سے پھرے کو ہر شخص ہر حال میں بُرا سمجھتا ہے، بخلاف اقرار کرنے والے کے کہ وہ جب سے غرض چلے کے اس کا پھر جانا زیادہ مستبعد نہیں ہوتا، اسی طرح تم صرف اقراری نہیں بلکہ گواہ کی طرح اس پر قائم رہنا) اور میں (بھی) اس (مضمون) پر تمھارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں، سو جو شخص (امتوں میں سے) روگردانی کرے گا (اس عہد سے) بعد اس کے (کہ انبیاء تک عہد لیا گیا اور امتیں تو کس شمار میں ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں، کیا دین اسلام سے جس کا عہد لیا گیا ہے روگردانی کر کے) پھر (اس) دین خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ (کی یہ شان



ہے کہ ان کے (علم کے) سامنے سب سرائگندہ ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور (جتنے) زمین میں ہیں (یعنی خوشی اور خستہ کاری سے) اور (یعنی) مجبوری سے اور (اول تو اس عظمت ہی کا مقتضی یہ تھا کہ کوئی ان کے عہد کی مخالفت نہ کرے خاص کر جب کہ آئندہ سزا کا بھی ڈر ہو چنانچہ) سب خدا ہی کی طرف (قیامت کے روز) لوٹائے (بھی) جاویں گے (اور اس وقت مخالفین کو سزا ہوگی) (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ دین اسلام کے اظہار کے لئے خلاصہ کے طور پر یہ (فرما دیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا اور اس (حکم) پر جو (حضرت) ابراہیم و اسمعیل و یعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں ان کی طرف بھیجا گیا اور اس (حکم و معجزہ) پر بھی جو (حضرت) موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے) (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی راہبان لانے کے معاملہ میں تفریق نہیں کرتے (کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں (اس نے ہی دین ہم کو بتلایا ہم نے خستہ کاری کر لیا)۔

## معارف و مسائل

**اللہ تعالیٰ کے تین عہد** | اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے تین طرح کے عہد لئے ہیں، ایک کا ذکر سورۃ اعراف میں "الَّتِي بَرَكْتُكُمْ" (۱۷۴: ۷) کے تحت کیا گیا ہے، اس عہد کا مقصد یہ تھا کہ تمام بنی نوع انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے کیونکہ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی، اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔ دوسرے کا ذکر وہ آخذُ اللہُ میثاقَ الذین اَوْثَرُوا لِكِتَابِ تَبْيِيْنَتِهِ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْفُرُوْهُ (۱۸۴: ۳) الخ سے کیا گیا، یہ عہد صرف اہل کتاب کے علماء سے لیا گیا تھا کہ وہ حق کو نہ چھپائیں، بلکہ صاف اور واضح طور پر بیان کریں۔

تیسرے عہد کا بیان وَلَئِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِثْقَاتِ التَّيِّبِيْنَ لَمَّا آتٰتِبْكُمْ مِنْ كِتَابِ وَحْكْمَةٍ سے کیا گیا ہے اس کی تفصیل آگے آئے گی (تفسیر احمدی)

میثاق سے کیا مراد ہے | میثاق کہاں ہوا؟ یا تو عالم ارواح میں ہوا یا دنیا میں بذریعہ وحی ہوا، دونوں اور یہ کہنا ہوا | احتمال ہیں، (بیان القرآن)

میثاق کیا ہے؟ اس کی تصریح تو قرآن نے کر دی ہے، لیکن یہ میثاق کس چیز کے



بارہ میں لیا گیا ہے؛ اس میں اقوال مختلف ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نبی علیہ السلام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ عہد تمام انبیاء سے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا تھا کہ اگر وہ خود ان کا زمانہ پائیں تو ان پر ایمان لائیں اور ان کی تائید و نصرت کریں اور اپنی اپنی امتوں کو بھی یہی ہدایت کر جائیں۔

حضرت طاؤس، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یہ میثاق انبیاء سے اس لئے لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی تائید و نصرت کریں (تفسیر ابن کثیر)  
اس دوسرے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے قول "وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ" وَاَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا عَلَیْهِمْ (۲۴: ۶۴) (احزاب) سے بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ عہد ایک دوسرے کی تائید و نصرت کے لئے لیا گیا تھا (تفسیر احمدی)

درحقیقت مذکورہ دونوں تفسیروں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے دونوں ہی مراد لی جاسکتی ہیں (تفسیر ابن کثیر)

تمام انبیاء سے ایمان کے | بظاہر یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو علیم وخبیر ہیں ان کو اچھی طرح مطالبے کا فائدہ | معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نبی کی موجودگی میں تشریف نہیں لائیں گے تو پھر انبیاء کے ایمان لانے کا کیا فائدہ؟

ذرا غور کیا جائے تو فائدہ بالکل ظاہر معلوم ہوگا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات پر ایمان قبول کرنے کا پختہ ارادہ کریں گے تو اسی وقت سے ثواب پائیں گے، (صاوی بحوالہ جلالین)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم | وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ پختہ عہد لیا کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہوگا تو پہلے نبی کے لئے ضروری ہے کہ پچھلے نبی کی سچائی اور نبوت پر ایمان خود بھی لائے اور دوسروں کو بھی اس کی ہدایت کرے، قرآن کے اس قاعدہ کلیہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی اسی طرح کا عہد انبیاء سے لیا ہوگا جیسا کہ علامہ سبکیؒ اپنے رسالہ "التعلیم والمنہ" فی التوہد میں فرماتے ہیں کہ "آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کوئی نبی بھی ایسا نہیں گزرا جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کے بارے میں تائید و نصرت اور آپ پر ایمان لانے کا عہد لیا ہو، اور کوئی بھی ایسا



نبی نہیں گزرا جس نے اپنی امت کو آپ پر ایمان لالے اور تائید و نصرت کی وصیت نہ کی ہو، اور اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انبیاء کے زمانے میں ہوتی تو ان سب کے نبی آپ ہی ہوتے اور وہ تمام انبیاء آپ کی امت میں شمار ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی شان محض نبی الائمہ ہی کی نہیں ہے بلکہ نبی الانبیاء کی بھی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں آپ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو وہ بھی قرآن حکیم اور تمھارے نبی ہی کے احکام پر عمل کریں گے (تفسیر ابن کثیر)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی نبوت "عامہ اور شاملہ" ہے، اور آپ کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں، اس بیان سے آپ کے ارشاد "بُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً" کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے، کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ کی نبوت آپ کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے صحیح نہیں، بلکہ آپ کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ "كُنْتُ نَبِيًّا وَادَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَالْجَسَدِ" عرش میں شفاعت کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام نبی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرنا حضور کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي

اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سوا اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا، اور وہ

الْآخِرَةُ مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿۸۵﴾

آخرت میں خراب ہے ۔

## خلاصہ تفسیر

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول و (منظور) نہ ہوگا، اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا (یعنی نجات نہ پاوے گا)۔



## معارف و مسائل

اسلام کی تعریف اور اسلام کے لفظی معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں، اور اصطلاح میں خاص اس اس کا مدار نجات ہونا دین کی اطاعت کا نام اسلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، کیونکہ اصول دین تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں ایک ہی ہیں۔

پھر لفظ اسلام کبھی تو اس عام مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور کبھی صرف اس آخری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، قرآن کریم میں یہ دونوں طرح کے اطلاقات موجود ہیں، انبیاء سابقین کا اپنے آپ کو مسلم کہنا اور اپنی امت کو امت مسلمہ کہنا بھی نصوص قرآن سے ثابت ہے، اور اس نام کا خاتم الانبیاء کی امت کے متعلق مخصوص ہونا بھی مذکور ہے۔

هُوَ سَمُّكُمُ الْمُؤْمِنِينَ (۲۲:۷۸)، خلاصہ یہ کہ ہر دین الہی جو کسی نبی و رسول کے ذریعہ دنیا میں آیا اس کو بھی اسلام کہا جاتا ہے، اور امت محمدیہ کے لئے یہ خاص لقب کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ قرآن کریم میں اس جگہ اسلام کے لفظ سے کونسا مفہوم مراد ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ دونوں میں سے جو بھی مراد لیا جائے، نتیجہ کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ انبیاء سابقین کے دین کو جو اسلام کا نام دیا گیا ہے وہ ایک محدود طبقہ اور مخصوص زمانے کے لئے تھا، اس وقت کا اسلام وہی تھا، اس طبقہ اور امت کے علاوہ دوسروں کے لئے اس وقت بھی وہ اسلام معتبر نہ تھا اور جب اس نبی کے بعد اور کوئی نبی بھیج دیا گیا تو اب وہ اسلام نہیں رہا، اس وقت کا اسلام وہ ہو گا جو جدید نبی پیش کرے، جس میں یہ تو ظاہر ہے کہ کوئی اصولی اختلاف نہیں ہو گا مگر فروعی احکام مختلف ہو سکتے ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اسلام دیا گیا وہ ناقابل نسخ دائمی قیامت ہے گا، اور حسب قاعدہ مذکورہ آپ کی بعثت کے بعد پچھلے تمام ادیان منسوخ ہو گئے، اب وہ اسلام نہیں بلکہ اسلام صرف وہ دین ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پہونچا، اسی لئے احادیث صحیحہ معتبرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو اس وقت ان پر بھی میرا ہی اتباع لازم ہوتا، اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، تو باوجود اپنے وصف نبوت اور عہد نبوت پر قائم رہنے کے



اس وقت وہ بھی آپ ہی کی شریعت کا اتباع کریں گے۔

اس لئے اس جگہ خواہ اسلام کا مفہوم عام مراد لیں یا مخصوص امت محمدیہ کا دین مراد لیں، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد صرف وہی دین اسلام کہلاتے گا جو آپ کے ذریعہ دنیا کو پہنچا ہے، وہی تمام انسانوں کے لئے مدارِ نجات ہے، آیت مذکورہ میں اسی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین جو شخص اختیار کرے وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں، اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورۃ کی آیت **إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ** **الْإِسْلَامُ** کے تحت صفحہ ۳۳ جلد دوم میں گذر گئی۔

**كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا**

کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہو گئے ایمان لاکر اور گواہی دے کر

**أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي**

کہ بیشک رسول سچا ہے اور آپ ان کے پاس نشانیاں لے کر اور اللہ راہ نہیں دیتا

**الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝۱۰ أُولَٰئِكَ جَزَاءُ ۝۱۱ هُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ**

ظالم لوگوں کو ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے

**اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۱۲ خَلِدِينَ فِيهَا لَا**

اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی ہمیشہ رہیں گے اس میں نہ

**يَخْفَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ ۝۱۳ إِلَّا الَّذِينَ**

ہلکا ہوگا ان سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے مگر جنہوں نے

**تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۱۴**

توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے توبہ اللہ غفور رحیم ہے،

**إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَدَّوْا كُفْرًا لَّنْ**

جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں ہرگز

**تُقْبَلُ تَوْبَتُهُمْ ۝۱۵ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ۝۱۶**

قبول نہ ہوگی ان کی توبہ اور وہی ہیں گمراہ جو

**الَّذِينَ كَفَرُوا وَأَمَّا تُوُوا هُمْ كُفَّارًا ۝۱۷ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ**

لوگ کافر ہوئے اور مر گئے کافر ہی تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے سے



مِّلْهُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ

زمین بھر کر سونا اگرچہ بدل دیوے اس قدر سونا اُن کو عذاب

الِیْمٌ ۖ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّصِیْرٍ ۙ ﴿۹۱﴾

دردناک ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار

## خلاصہ تفسیر

(اول اُن مرتدین کا بیان ہے جو کفر پر قائم رہ کر اس کو ہدایت سمجھتے رہے، چونکہ ان کا اعتقاد یا دعوای یہ تھا کہ خدا تعالیٰ نے ہم کو اب ہدایت فرمائی، لہذا اُن کی مذمت میں اس کی نفی بھی فرماتے ہیں کہ بھلا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہو گئے بعد ایمان لانے کے (دل سے) اور بعد اپنے اس اقرار کے (زبان سے) کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) دعویٰ رسالت میں) سچے ہیں، اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل (حقانیت اسلام کے) پہنچ چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی توفیق اسلام کی نہیں دیتے، بلکہ مقصود ان کے اسی دعوای مذکورہ بالا کی نفی کرنا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نے جو اسلام چھوڑ کر یہ طریق اختیار کیا ہے ہم کو خدا نے ہدایت دی ہے، خلاصہ نفی کا یہ ہوا کہ جو شخص کفر کا بے ڈھنگا راستہ اختیار کرے وہ ہدایت خداوندی پر نہیں، اس لئے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو خدا نے ہدایت دی ہے، کیونکہ ہدایت کا یہ (نتیجہ) بلکہ ایسے لوگ یقیناً گمراہ ہیں اور) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور (بہتر سے) آدمیوں کی بھی (غرض) سب کی (اور پھر وہ لعنت بھی ایسے طور پر رہے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (اور چونکہ اس لعنت کا اثر جہنم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور) ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونے پاوے گا اور نہ (داخل ہونے سے قبل) ان کو (کسی مبعاد تک) مہلت ہی دی جاوے گی (آگے ان کا بیان ہے جو پھر مسلمان ہو گئے ان کو اس حکم سے مستثنیٰ فرماتے ہیں یعنی) ہاں مگر جو لوگ توبہ کر لیں اس (کفر) کے بعد (یعنی مسلمان ہو جاویں) اور اپنے (دل) کو (بھی) سنواریں (یعنی منافقانہ طور پر صرف زبان سے توبہ کافی نہیں سو بے شک (ایسوں کے لئے) خدا تعالیٰ بخش دینے والے رحمت کرنے والے ہیں، بیشک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں (یعنی کفر پر دوام رکھا ایمان نہیں لائے) اُن کی توبہ (جو کہ اور گناہوں سے کرتے ہیں) ہرگز مقبول نہ ہوگی (کیونکہ توبہ عن المعاصی



ایک اطاعت قرعہ ہے، اور اطاعت فرعیہ کے مقبول ہونے کی شرط ایمان ہے) اور ایسے لوگ (اس توبہ کے بعد بھی بدستور) سچے گمراہ ہیں

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالت کفر ہی میں، سو ان میں سے کسی کا (بطور کفارہ) زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا، اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے (اور بے دینے تو کون پوچھتا ہے) ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے حامی (مددگار) بھی نہ ہوں گے۔

## معارف و مسائل

**ایک شبہ کا ازالہ** | کَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ الْخَلْقَ اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کسی کو مرتد ہونے کے بعد ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ بہت سے لوگ مرتد ہونے کے بعد ایمان قبول کر کے ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں۔

**جواب** یہ ہے کہ یہاں جو ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس کی مثال ہمارے محاورات میں ایسی ہے جیسے کسی بد معاش کو کوئی حاکم اپنے ہاتھ سے سزا دے اور وہ کہے کہ مجھ کو حاکم نے اپنے ہاتھ سے خصوصیت عنایت فرمائی ہے، اور اس کے جواب میں کہا جاوے کہ ایسے بد معاش کو ہم خصوصیت کیوں دینے لگے، یعنی یہ امر خصوصیت ہی نہیں، اور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایسا شخص کسی طرح قابل خصوصیت نہیں ہو سکتا اگرچہ شائستہ بن جاوے۔ (بیان القرآن)



لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا

برگزنہ حاصل کر سکو گے نیک میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ اور جو چیز خرچ

مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۹۲﴾

کر دے سو اللہ کو معلوم ہے ۔

رابط آیات مع تشریح | اس سے پہلی آیت میں کفار و منکرین کے صدقات و خیرات کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک غیر مقبول ہونا بیان کیا گیا تھا، اس آیت

میں مومنین کو صدقہ و معتبولہ اور اس کے آداب بتلائے گئے ہیں، اس آیت کے الفاظ میں سب سے پہلے لفظ بَرٍّ کے معنی اور اس کی حقیقت کو سمجھنے، تاکہ آیت کا پورا مفہوم صحیح طور پر ذہن نشین ہو سکے۔ لفظ بَرٍّ کے لفظی اور حقیقی معنی ہیں کسی شخص کے حق کی پوری ادائیگی، اور اس سے کامیاب ہو کر سبکدوشی اور احسان اور حسن سلوک کے معنی میں بھی آتا ہے، بَرٍّ بالفتح اور بتات اس شخص کیلئے استعمال ہوتا ہے جو اپنے ذمہ عائد ہونے والے حقوق کو پوری طرح ادا کر دے، قرآن کریم میں بَرُّ آبَوَالِدَیْنِ (۳۲: ۱۹) اور بَرُّ ابَوَالِدَیْنِ (۱۳: ۱۹) اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، ان حضرات کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جو اپنے والدین کے حقوق کو مکمل طور پر ادا کرنے والے تھے۔

اس لفظ بَرٍّ بالفتح کی جمع ابرار ہے، جو قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوئی ہے، ارشاد ہے  
إِنَّ الْآبِرَازَ شَرُّبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا (۵۰: ۷۶) اور دوسری جگہ ارشاد ہے  
إِنَّ الْآبِرَازَ لَفِي نَعِيمٍ ۚ عَلَى الْأَرْكَانِ يُنْظَرُونَ (۲۳: ۸۳) اور ایک جگہ ارشاد ہے إِنَّ الْآبِرَازَ لَفِي نَعِيمٍ ۚ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ (۱۳: ۸۳) اس آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ "بَرٍّ" کا مقابلہ اور ضد "فجور" ہے۔

امام بخاریؒ کے ادب المفرد میں اور ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت صدیق اکبرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سچ بولنے کو لازم پکڑو، کیونکہ "صدق" بَرٍّ کا ساتھی ہے، اور وہ دونوں جنت میں ہیں، اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ وہ فجور کا ساتھی ہے، اور یہ دونوں دوزخ میں ہیں۔

اور سورہ بقرہ کی آیت میں مذکور ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولِوا دُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۱۷۷: ۱۷۸) اس آیت میں نیک اعمال کی ایک فہرست دے کر ان سب کو "بَرٍّ" فرمایا گیا ہے، مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ اعمالِ بَرٍّ میں افضل ترین بَرٍّ یہ ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کی جائے، آیت مذکورہ میں ارشاد



ہے کہ تم ہرگز ”بڑ“ کو حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنی پیاری چیزوں میں سے کچھ خرچ نہ کرو، تو معنی یہ ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کی مکمل ادائیگی اور اس سے پوری سبکدوشی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اپنی محبوب اور پیاری چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کریں، اسی مکمل ادائیگی کو خیر کامل یا نیکی میں کمال یا ثواب عظیم سے ترجمہ کیا گیا ہے، اور مراد یہ ہے کہ ابرار کی صف میں داخل ہونا اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیزیں اللہ کی راہ میں قربان کی جائیں۔

## حُلاصۃ تفسیر

(اے مسلمانو! تم خیر کامل (یعنی اعظم ثواب) کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی بہت پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے اور (یوں) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (وگو غیر محبوب چیز ہو) اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (مطلق ثواب اس پر بھی دیدیں گے، لیکن کمال ثواب حاصل کرنے کا وہی طریقہ ہے)

## معارف و مسائل

آیت مذکورہ اور صحابہ کرامؓ کا جذبہ عمل | صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو قرآنی احکام کے اولین مخاطب اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا واسطہ شاگرد اور احکام قرآنی کی تعمیل کے عاشق تھے، اس آیت کے نازل ہونے پر ایک ایک نے اپنی محبوب چیزوں پر نظر ڈالی، اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخواستیں ہونے لگیں، انصارِ مدینہ میں سب زیادہ مالدار حضرت ابوطالبؓ تھے، مسجد نبویؐ کے بالکل مقابل اور متصل ان کا باغ تھا، جس میں ایک کنواں بیرجاء کے نام سے موسوم تھا، اب اس باغ کی جگہ تو بابِ تجیدی کے سامنے اصطفا منزل کے نام سے ایک عمارت بنی ہوئی ہے جس میں زائرینِ مدینہ قیام کرتے ہیں، مگر اس کے شمال مشرق کے گوشے میں یہ بیرجاء اسی نام سے اب تک موجود ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی اس باغ میں تشریف لے جاتے اور بیرجاء کا پانی پیتے تھے، آپ کو اس کنویں کا پانی پسند تھا، حضرت طلحہؓ کا یہ باغ بڑا قیمتی اور زرخیز اور ان کو اپنی جائداد میں سب زیادہ محبوب تھا، اس آیت کے نازل ہونے پر وہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ میرے تمام اموال میں بیرجاء مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ جس کام میں پسند فرمائیں اس کو صرف فرمادیں، آپ نے فرمایا کہ وہ تو عظیم الشان منافع کا باغ ہے عین مناسب یہ



سمجھتا ہوں کہ اس کو آپ اپنے اقرباء میں تقسیم کر دیں، حضرت ابو طلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشورہ کو قبول فرما کر اپنے اقرباء اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم فرما دیا، (یہ حدیث بخاری و مسلم کی ہے) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خیرات صرف وہ نہیں جو عام فقرا و مساکین پر صرف کی جائے، اپنے اہل و عیال اور عزیز و رشتہ داروں کو دینا بھی بڑی خیرات اور موجب ثواب ہے۔

حضرت زید بن حارثہؓ نے اپنا ایک گھوڑا لے ہوئے حاضر خدمت ہوئے، اور عرض کیا کہ مجھے اپنی انلاک میں یہ سب زیادہ محبوب ہے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتا ہوں، آپ نے اس کو قبول فرمایا، لیکن ان سے لے کر انہی کے صاحبزادے آسامہؓ کو دے دیا، زید بن حارثہؓ اس پر کچھ دلگیر ہوئے کہ میرا صدقہ میرے ہی گھر میں واپس آ گیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تسلی کے لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا یہ صدقہ قبول کر لیا ہے (تفسیر مظہری، بحوالہ ابن جریر و طبری وغیرہ)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کنیز سب سے زیادہ محبوب تھی، آپ نے اس کو لوجہ اللہ آزاد کر دیا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک کنیز تھی جس سے وہ محبت کرتے تھے، اس کو اللہ کے لئے آزاد کر دیا۔

الغرض آیت متذکرہ کا حاصل یہ ہے کہ حق اللہ کی مکمل ادائیگی اور خیر کامل اور نیک کامیابی کا حاصل جب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب کہ آدمی اپنی محبوب چیزوں میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، آیت مذکورہ میں چند مسائل قابل نظر اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اس آیت میں لفظ ہر تمام صدقات | اول یہ کہ اس آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے واجبہ اور نفلیہ کو شامل ہے | اس سے مراد بعض حضرات مفسرین کے نزدیک صدقات واجبہ زکوٰۃ وغیرہ ہیں، اور بعض کے نزدیک صدقات نافلہ ہیں، لیکن جمہور محققین نے اس کے مفہوم کو صدقات واجبہ اور نفلیہ دونوں میں عام قرار دیا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے واقعات متذکرہ بالا اس پر شاہد ہیں کہ ان کے یہ صدقات صدقات نفلیہ تھے۔

اس لئے مفہوم آیت کا یہ ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جو صدقہ بھی ادا کرو خواہ زکوٰۃ فرض ہو یا کوئی نفلی صدقہ و خیرات، ان سب میں مکمل فضیلت اور ثواب جب ہے کہ اپنی محبوب اور پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو، یہ نہیں کہ صدقہ کو نادان کی طرح مہر سے ٹالنے کے لئے قالمو، بیکار یا خراب چیزوں کا انتخاب کرو، قرآن کریم کی دوسری ایک آیت میں اس مضمون کو اور زیادہ



واضح اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا  
مِنْ خَيْرِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا  
أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ  
وَلَا تَيْسَرُوا بِالْخَيْثِ مِنْهُ  
وَتُسَفَّهُوا فِيهِ إِلَّا آتِ  
تُغْمِضُوا فِيهِ ۖ (۲: ۲۶۸)

یعنی اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے اور جو  
کچھ ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے  
اس میں سے عمدہ چیزوں کو چھانٹ کر اس  
میں خرچ کرو اور ردی چیز کی طرف ہمت  
لجایا کرو کہ اس میں خرچ کرو و حالانکہ وہ خیر  
اگر تمہارا حق کے بدلے میں تمہیں دیا جائے تو تم ہرگز  
قبول نہ کرو گے بجز اسکے کہ کسی وجہ چشم پوشی کر جاؤ

اس کا حاصل یہ ہوا کہ خراب اور بیکار چیزوں کا انتخاب کر کے صدقہ کرنا مقبول نہیں، بلکہ  
صدقہ مقبولہ جس پر مکمل ثواب ملتا ہے وہی ہے جو محبوب اور پیاری چیزوں میں خرچ کیا جائے۔  
صدقہ کرنے میں اعتدال چاہئے | دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آیت میں لفظ "مِمَّا" سے اشارہ کر دیا گیا ہے  
کہ یہ مقصود نہیں ہے کہ جتنی چیزیں اپنے نزدیک محبوب اور پیاری ہیں ان سبہی کو اللہ کی راہ  
میں خرچ کر دیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ جتنا بھی خرچ کرنا ہے اس میں اچھی اور پیاری چیز دیکھ کر  
خرچ کریں تو مکمل ثواب کے مستحق ہوں گے۔

تیسرا مسئلہ یہ کہ محبوب چیز خرچ کرنا صرف اسی کا نام نہیں کہ کوئی بڑی قیمت کی چیز خرچ  
کی جائے، بلکہ جو چیز کسی کے نزدیک عزیز اور محبوب ہے، خواہ وہ کتنی ہی قلیل اور قیمت کے  
اعتبار سے کم ہو، اس کے خرچ کرنے سے بھی اس "بڑے" کا مستحق ہو جائے گا، حضرت حسن بصریؒ  
نے فرمایا کہ جو چیز آدمی اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرے وہ اگرچہ کچھ بڑا ایک ڈالہ  
ہی ہو اس سے بھی انسان اس ثواب عظیم اور بڑے کامل کا مستحق ہو جاتا ہے جس کا آیت میں وعدہ  
کیا گیا ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس خیر عظیم اور  
بڑے کا ذکر ہے اس سے وہ غریب لوگ محروم رہیں گے جن کے پاس خرچ کرنے کے لئے مال نہیں،  
کیونکہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ خیر عظیم بغیر محبوب مال خرچ کئے حاصل نہیں کی جا سکتی،  
اور فقراء و مساکین کے پاس مال ہی نہیں جس کے ذریعہ ان کی یہاں تک رسائی ہو، لیکن غور  
کیا جائے تو آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ خیر عظیم اور ثواب عظیم حاصل کرنا چاہیں تو بجز مال محبوب کے  
خرچ کرنے کے ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا، بلکہ بات یہ ہے کہ یہ خیر عظیم کسی دوسرے  
ذریعہ سے مثلاً عبادت، ذکر اللہ، تلاوت قرآن، کثرت نوافل سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے، اصلے



فقار و غبار کو بھی یہ خیر عظیم دوسرے ذرائع سے حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ بعض روایات حدیث میں صراحتاً بھی یہ مضمون آیا ہے۔

مال محبوب کیا مراد ہے؟ پانچواں مسئلہ: یہ ہے کہ مال کے محبوب ہونے سے کیا مراد ہے؟ قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے کام میں آرہی ہو اور اس کو اس چیز کی حاجت ہو، فالتوا اور تمیکارتہ ہو، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ  
مِسْكِينًا. (۸۱:۷)

یعنی اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو حاجت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں، باوجود اس کے کہ اس کھانے کی خود ان کو بھی ضرورت ہے۔

اسی طرح دوسری آیت میں اسی مضمون کی اور زیادہ وضاحت اس طرح فرمائی:

وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ  
لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (۹۰:۵۹)

یعنی اللہ کے مقبول بندے اپنے اوپر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود بھی محتاج ہوں۔

فالتوا سامان اور حاجت زائد چیزیں جس اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بھی ثواب سے خالی نہیں

چھٹا مسئلہ: یہ ہے کہ آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ خیر کامل اور ثواب عظیم اور صفت ابرار میں داخلہ اس پر موقوف ہے کہ اپنی محبوب چیز اللہ کی راہ میں خرچ کریں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ضرورت سے زائد فالتوا مال خرچ کرنے والے کو کوئی ثواب ہی نہ ملے، بلکہ آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے وَمَا تُغْنُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ یعنی تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ آیت کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ خیر کامل اور صفت ابرار میں داخلہ خاص محبوب چیز خرچ کر لے پر موقوف ہے لیکن مطلق ثواب کوئی صدقہ خالی نہیں، خواہ محبوب چیز خرچ کریں یا زائد اور فالتوا اشیاء ہاں مکروہ اور ممنوع یہ ہے کہ کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کر لے کہ جب خرچ کرے فالتوا اور خراب چیز کا ہی انتخاب کر کے خرچ کیا کرے، لیکن جو شخص صدقہ خیرات میں اپنی محبوب اور عمدہ چیزیں بھی خرچ کرتا ہے، اور اپنی ضرورت سے زائد چیزیں، بچا ہوا کھانا یا پیرائے کپڑے، عیب دار برتن یا استعمالی چیزیں بھی خیرات میں دیدیتا ہے، وہ ان چیزوں کا صدقہ کرنے سے کہیں گناہ کا مرتکب نہیں بلکہ اس کو ان پر بھی ضرور ثواب ملے گا، اور محبوب چیزوں کے خرچ کرنے پر اس کو خیر عظیم بھی حاصل ہوگی، اور صفت ابرار میں اس کا داخلہ بھی ہوگا۔

آیت کے اس آخری جملہ میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کی اصلی حقیقت اللہ پر روشن ہے کہ وہ اس کے نزدیک محبوب ہے یا نہیں، اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کر رہا ہے یا ریا و شہرت کے لئے، محض کسی کا زبانی دعوے



اس کے لئے کافی نہیں کہ میں اپنی محبوب چیز کو اللہ کے لئے خرچ کر رہا ہوں، بلکہ علیم وخبیر خود کے پوشیدہ رازوں سے واقف ہے، دیکھ رہا ہے کہ واقع میں اس کے لئے خرچ کا کیا درجہ ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ

سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کو مگر وہ جو حرام کر لی تھیں اسرائیل

عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنْزَلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَأَتُوا بِالتَّوْرَةِ

نے اپنے اوپر تورات نازل ہونے سے پہلے تو کہہ لاؤ تورات اور

فَاتْلُوهَا إِنَّ كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾ فَمَنْ أَضَلُّ عَلَى اللَّهِ

پڑھو اس کو اگر تم سچے ہو پھر جو کوئی جوڑے اللہ پر

الْكُذِّبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۹۵﴾ قُلْ

جھوٹ اس کے بعد تو وہی ہیں بڑے بے انصاف تو کہہ

صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ

سچ فرمایا اللہ اب تابع ہو جاؤ دین ابراہیم کے جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور نہ تھا

مِنَ الْمَشْرِكِينَ ﴿۹۵﴾

شُرک کرنے والا

## خلاصہ تفسیر

(جن کھانے کی چیزوں میں گفتگو ہے یہ) سب کھانے کی چیزیں (حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے ہرگز حرام نہیں چلی آ رہی ہیں بلکہ یہ چیزیں) نزولِ تورات کے قبل ہاں سناں اس کے (یعنی گوشت شتر کے) جس کو (حضرت) یعقوب (علیہ السلام) نے (ایک خاص وجہ سے) اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا، (اور پھر وہ ان کی اولاد میں بھی حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود) بنی اسرائیل (کے) پر (بھی) حلال تھیں (تو ابراہیمؑ علیہ السلام کے وقت سے ان کی تحریم کا دعویٰ کب صحیح ہو سکتا ہے، اور نزولِ تورات کے قبل اس واسطے فرمایا کہ نزولِ تورات کے بعد ان مذکورہ حلال چیزوں میں سے بھی بہت سی چیزیں حرام ہو گئی تھیں، جس کی کچھ تفصیل سورۃ العام کی اس آیت میں ہے وَعَلَى الَّذِينَ هَآؤُا حَرَمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ إِلَىٰ آخِرِهَا (۱۴۷:۶) اور اگر اب بھی یہود کو تحریم کی قدامت مذکورہ کا دعویٰ ہے تو اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے) فرمائیے



کہ (اچھا تو) پھر توراۃ لاؤ پھر اس کو (لا کر) پڑھو اگر تم (دعویٰ مذکور میں) سچے ہو (تو اس میں کوئی آیت وغیرہ اس مضمون کی نکال دو، کیونکہ امور منقولہ میں نص کی ضرورت ہے، اور دوسری نصوص یقیناً منافی ہیں، صرف توراۃ باقی ہے، سو اس میں دکھلا دو، چنانچہ اس میں نہ دکھلا سکے تو کذب ان کا اس دعوے میں ثابت ہو گیا، آگے اس پر مرتب کر کے فرماتے ہیں) سو جو شخص اس (ظہور کذب بالدلیل) کے بعد بھی (اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی ہمت لگائے) (جاء) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے گوشت شتر و غیرہ کو حرام فرمایا، تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا (سورۃ اب) تم رکھو چاہئے کہ بعد ثبوت حقیقت قرآن کے، ملت ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع (اختیار) کرو جس میں ذرا کجی نہیں اور د (ابراہیم علیہ السلام) مشرک نہ تھے۔

## معارف مسائل

اد پر کی آیتوں میں اہل کتاب سے بحث چلی آتی ہے، کہیں یہود سے کہیں نصاریٰ سے کہیں دونوں سے، ایک بحث کا آگے بیان آتا ہے، جس کا قصہ روح المعانی میں بروایت واحدی کتب سے منقول ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ملت ابراہیمی پر ہونا باعتبار تمام اصول شرعیہ اور اکثر فروع کے بیان فرمایا، تو یہود نے اعتراض کیا کہ آپ اونٹ کا گوشت اور دودھ کھاتے ہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام تھا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ نہیں، ان پر یہ حلال تھا، یہود نے کہا جتنی چیزیں ہم حرام سمجھتے ہیں یہ سب حضرت نوح و حضرت ابراہیم علیہما السلام کے وقت سے حرام چلی آتی ہیں، یہاں تک کہ ہم تک وہ تحریم پہنچی، تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنیِ اِسْرَآئِیلَ کے تلمذ یہود کے لئے نازل فرمائی، جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ نزولِ توراۃ کے قبل باستثناء اس کے یعنی گوشت شتر کے جس کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے ایک خاص وجہ سے خود اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا اور پھر وہ ان کی اولاد میں حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود بنی اسرائیل پر بھی حلال تھیں۔

در اصل اس میں قصہ یہ ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا مرض تھا، آپ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سے شفاء دیں تو سب زیادہ جو کھانا مجھ کو محبوب ہے اس کو چھوڑ دوں گا، ان کو شفاء ہو گئی، اور سب زیادہ محبوب آپ کو اونٹ کا گوشت تھا



اس کو ترک فرمادیا (آخر جہ الحاکم وغیرہ بسند صحیح عن ابن عباس کذا فی روح المعانی) داخلہ  
 (ترمذی فی سورۃ الرعد مرفوعاً) پھر یہی تحریم جو نذر سے ہوتی تھی بنی اسرائیل میں حکم وحی باقی  
 رہ گئی، اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں نذر سے تحریم بھی ہو جاتی ہوگی، جس طرح  
 ہماری شریعت میں مباح کا ایجاب ہو جاتا ہے، مگر تحریم کی نذر جو درحقیقت کہیں ہے ہماری  
 شریعت میں جائز نہیں بلکہ اس میں قسم توڑنا پھر اس کا کفارہ دینا واجب ہے، لہذا قال  
 اللہ تعالیٰ لَمْ تُحَرِّمُوا مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ (۱۰۶) (۱۰۷) الایۃ، اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَ

بیشک سب پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور

هُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾

ہدایت جہان کے لوگوں کو۔

## خلاصہ تفسیر

یقیناً وہ مکان جو سب مکانات عبادت سے پہلے لوگوں (کی عبادت گاہ بننے) کی واسطے  
 (مخانب اللہ) مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ (شہر) مکہ میں ہے (یعنی خانہ کعبہ) جس کی حالت  
 یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے (کیونکہ اس میں دینی نفع یعنی ثواب ہے) اور (عبادت خاص مثلاً نماز  
 کا رخ بتلانے میں) جہان بھر کے لوگوں کا رہنا ہے (مطلب یہ ہے کہ حج وہاں ہوتا ہے اور مثلاً نماز  
 کا ثواب بروئے تصریح حدیث وہاں بہت زیادہ ہوتا ہے، دینی برکت تو یہ ہوتی، اور جو وہاں  
 نہیں ہیں ان کو اس مکان کے ذریعے سے نماز کا رخ معلوم ہوتا ہے یہ رہنمائی ہوتی)

## معارف و مسائل

مذکورہ آیت میں ساری دنیا کے مکانات یہاں تک کہ تمام مساجد کے مقابلہ میں بیت اللہ  
 یعنی کعبہ کا شرف اور افضلیت کا بیان ہے، اور یہ شرف و فضیلت کئی وجہ سے ہے۔

فضائل بیت اللہ { اول اس لئے کہ وہ دنیا کی تمام سچی عبادت گاہوں میں سب پہلی  
 عبادت گاہ ہے۔

تاریخ تعمیر { دوسرے کہ وہ برکت والا ہے۔  
 تیسرے یہ کہ وہ پورے جہان کے لئے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ ہے۔



آیت کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ سب پہلا گھر جو منجانب اللہ لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہ ہے جو مکہ میں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں سب پہلا عبادت خانہ کعبہ ہے، اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا کے سب گھروں میں پہلا گھر عبادت ہی کے لئے بنایا گیا ہو، اس سے پہلے نہ کوئی عبادت خانہ ہو نہ دولت خانہ، حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کی شان سے کچھ بعید نہیں کہ انھوں نے زمین پر آنے کے بعد اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر یعنی عبادت کی جگہ بنائی ہو، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عمر، مجاہد، قتادہ، سدی، وغیرہ صحابہ و تابعین اسی کے قائل ہیں کہ کعبہ دنیا کا سب پہلا گھر ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کے رہنے بہنے کے مکانات پہلے بھی بن چکے ہوں مگر عبادت کے لئے یہ پہلا گھر بنا ہو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔

بیہقی نے اپنی کتاب لائل النبوة میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم وحوار علیہما السلام کے دنیا میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کے ذریعہ ان کو یہ حکم بھیجا کہ وہ بیت اللہ (کعبہ) بنائیں، ان حضرات نے حکم کی تعمیل کر لی تو ان کو حکم دیا گیا کہ اس کا طواف کریں، اور ان سے کہا گیا کہ آپ اول الناس یعنی سب سے پہلے انسان ہیں، اور یہ گھر اول بیت وضع للناس ہے، یعنی سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے (ابن کثیر) ضعف ابن کثیر ابن ابیہ و لا یخفی انہ لیس بمتروک الحدیث مطلقا ولا سیما فی ہذا المقام فان الروایۃ قد تأیدت باشارات الکتاب۔

بعض روایات میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی یہ تعمیر کعبہ نوح علیہ السلام کے زمانے تک باقی تھی، طوفان نوح میں منہدم ہوئی، اور اس کے نشانات مٹ گئے، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا، پھر ایک مرتبہ کسی حادثہ میں اس کی تعمیر منہدم ہوئی تو قبیلہ حسرم کی ایک جماعت نے اس کی تعمیر کی، پھر ایک عربیہ منہدم ہوئی تو عمالقہ نے تعمیر کی اور پھر منہدم ہوئی تو قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ میں تعمیر کی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہوئے اور حجرات کو اپنے دست مبارک سے قائم فرمایا، لیکن قریش نے اس تعمیر میں بنا براہی سے کسی قدر مختلف تعمیر کی تھی کہ ایک حصہ بیت اللہ کا بیت اللہ سے الگ کر دیا جس کو خطیم کہا جاتا ہے، اور خلیل اللہ علیہ السلام کی بندہ میں کعبہ کے دو دروازے تھے، ایک داخل ہونے کے لئے دوسرا پشت کی جانب باہر نکلنے کے لئے، قریش نے صرف مشرقی دروازہ کو باقی رکھا، تیسرا تعمیر کیا کہ دروازہ بیت اللہ کا سطح زمین سے کافی بلند کر دیا تاکہ ہر شخص آسانی سے اندر نہ جاسکے، بلکہ جس کو وہ اجازت دیں وہی جاسکے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ



موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے اس کو بالکل بنادیں۔ ابراہیمی کے مطابق بنادوں، قریش نے جو تصرفات بنادیں ابراہیمی کے خلاف کئے ہیں ان کی اصلاح کر دوں، لیکن تو مسلم ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہونے کا خطرہ ہے، اسی لئے سرپرست اس کو اسی حال پر چھوڑتا ہوں، اس ارشاد کے بعد اس دنیا میں آپ کی حیات زیادہ نہیں رہی۔

لیکن حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنے ہوئے تھے، خلفائے راشدین کے بعد جس وقت مکہ مکرمہ پر ان کی حکومت ہوئی تو انھوں نے بیت اللہ منہدم کر کے ارشاد نبویؐ اور بنادیں ابراہیمی کے مطابق بنادیا، مگر عبداللہ بن زبیرؓ کی حکومت مکہ معظمہ پر چند روزہ تھی، ظالم اللہ حجاج بن یوسف نے مکہ پر فوج کشی کر کے ان کو شہید کیا، اور حکومت پر قبضہ کر کے اس کو گوارا نہ کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک ان کی مدح و ثناء کا ذریعہ بن رہا ہے، اس لئے لوگوں میں یہ مشہور کیا کہ عبداللہ بن زبیرؓ کا یہ فعل غلط تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جس حالت پر چھوڑا تھا ہمیں اسی حالت پر اس کو رکھنا چاہئے، اس پہلے سے بیت اللہ کو پھر منہدم کر کے اسی طرح کی تعمیر بنادی جو زمانہ جاہلیت میں قریش نے بنائی تھی، حجاج بن یوسف کے بعد آنے والے بعض مسلم بادشاہوں نے پھر حدیث مذکور کی بناء پر یہ ارادہ کیا کہ بیت اللہ کو از سر نو حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بنادیں، لیکن اس زمانہ کے امام حضرت امام مالک بن انسؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ اب بار بار بیت اللہ کو منہدم کرنا اور بنانا آگے آنیوالے بادشاہوں کے لئے بیت اللہ کو ایک کھلونا بنائے گا، ہر آنے والا بادشاہ اپنی نام آوری کے لئے یہی کام کرے گا، اس لئے اب جس حالت میں بھی ہے اس حالت میں چھوڑ دینا مناسب ہے، تمام امت نے اس کو قبول کیا، اسی وجہ سے آج تک وہی حجاج بن یوسف ہی کی تعمیر باقی ہے، البتہ شکست و ریخت اور مرمت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔

ان روایات سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ کعبہ دنیا کا سب سے پہلا گھر ہے، اور یا کم از کم سب سے پہلا عبادت خانہ ہے، قرآن کریم میں جہاں یہ ذکر ہے کہ کعبہ کی تعمیر بامر خداوندی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل علیہما السلام نے کی ہے وہیں اس کے اشارات بھی موجود ہیں کہ ان بزرگوں نے اس کی ابتدائی تعمیر نہیں فرمائی، بلکہ سابق بنیادوں پر اسی کے مطابق تعمیر فرمائی، اور کعبہ کی اصل بنیاد پہلے ہی سے تھی، قرآن کریم کے ارشاد **وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسماعيلُ** (۱۲: ۱۲) سے بھی ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے کہ قواعد بیت اللہ یعنی اس کی بنیادیں پہلے سے موجود تھیں سورۃ حج کی آیت میں ہے:



وَرِثَتْهُنَّ أَزْوَاجُ بَنِي إِسْرَٰءِيلَ

الْبَيْتِ (۲۶: ۲۲)

یعنی جب ٹھیک کر دیا ہم نے ابراہیم کیلئے  
ٹھکانا اس گھر کا

اس سے بھی یہی استفادہ ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی جگہ پہلے سے متعین چلی آتی تھی، اور پہلی آیت سے اس کی بنیادوں کا ہونا بھی مفہوم ہوتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو تعمیر بیت اللہ کا حکم دیا گیا تو فرشتہ کے ذریعہ ان کو بیت اللہ کی جگہ سابق بنیادوں کی نشاندہی کی گئی جو بیت کے ٹوڑوں میں دبی ہوئی تھی۔

بہر حال آیت مذکورہ سے کعبہ کی ایک فضیلت یہ ثابت ہوئی کہ وہ دنیا کا سب سے پہلا گھریا پہلا عبادت خانہ ہے، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ذرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ دنیا کی سب سے پہلی مسجد کونسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا، مسجد حرام، انھوں نے عرض کیا اس کے بعد کونسی مسجد ہے؟ آپؐ نے فرمایا مسجد بیت المقدس ہے، پھر دریافت کیا کہ ان دونوں کی تعمیر کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا چالیس سال کا۔

اس حدیث میں بیت اللہ کی بناء پر جدید جو ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اس کے اعتبار سے بیت المقدس کی تعمیر کا فاصلہ بیان کیا گیا ہے، کیونکہ روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ بیت المقدس کی ابتدائی تعمیر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ بیت اللہ کی تعمیر سے چالیس سال بعد میں ہوئی، اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو بیت المقدس کی تعمیر کی یہ بھی بیت اللہ کی طرح بالکل نئی اور ابتدائی تعمیر نہ تھی، بلکہ سلیمان علیہ السلام نے بناء پر اپنی پر اس کی تجدید کی ہے، اس طرح روایات میں باہم کوئی تعارض نہیں رہتا۔

حاصل یہ ہے کہ ہمیشہ سے دنیا میں اس کی تعظیم و تکریم ہوتی چلی آئی ہے، اس میں لفظ و ضمیر ملتائیں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اس گھر کی تعظیم و تکریم کسی خاص قوم یا جماعت ہی کا حصہ نہیں، بلکہ عامۃ خلایق اور سب انسان اس کی تعظیم کریں گے، اس کی سرشت میں حق تعالیٰ نے ایک عظمت اور ہیبت کا داعیہ رکھا ہے کہ لوگوں کے قلوب اس کی طرف خود بخود مائل ہوتے ہیں، اس میں لفظ کہ سے مراد مکہ معظمہ ہے، خواہ یہ کہا جائے کہ میم کو باء سے بدل دیا گیا ہے، عرب کے کلام میں اس کی نظائر بکثرت ہیں کہ میم کو باء سے بدل دیا کرتے ہیں، اور یا یہ کہا جائے کہ مکہ کا دوہرا نام مکہ بھی ہے۔

بیت اللہ کی برکات | اس آیت میں بیت اللہ کی دو مہری فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ



وہ مبارک ہے، لفظ مبارک، برکت سے مشتق ہے، برکت کے معنی ہیں بڑھنا اور ثابت رہنا، پھر کسی چیز کا بڑھنا اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا وجود کھلے طور پر مقدار میں بڑھ جاتے، اور اس طرح بھی کہ اگرچہ اس کی مقدار میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو لیکن اس سے کام اتنے نکلیں جتنے عادتاً اس سے زائد سے نکلا کرتے ہیں، اس کو بھی معنوی طور پر زیادتی کہا جاسکتا ہے۔

بیت اللہ کا بابرکت ہونا ظاہری طور پر بھی ہے معنوی طور پر بھی، اس کے ظاہری برکات میں یہ مشاہدہ ہے کہ مکہ اور اسکے آس پاس ایک خشک ریگستان اور بنجر زمین ہونے کے باوجود اس میں ہمیشہ ہر موسم میں ہر طرح کے پھل اور ترکاریاں اور تمام ضروریات ہتیار ہوتی ہیں، کہ صرف اہل مکہ کے لئے نہیں، بلکہ اطراف عالم سے آنے والوں کے لئے بھی کافی ہو جاتی ہیں، اور آنے والوں کا حال دنیا کو معلوم ہے کہ خاص موسم حج میں تو لاکھوں انسان اطراف عالم سے جمع ہوتے ہیں جنکی مردم شماری اہل مکہ سے چوگنی پانچ گنی ہوتی ہے، یہ ہجوم عظیم وہاں صرف دو چار روز نہیں بلکہ مہینوں رہتا ہے، موسم حج کے علاوہ بھی کوئی وقت ایسا نہیں آتا جس میں باہر سے ہزاروں انسانوں کی آمد و رفت نہ رہتی ہو، پھر خاص موسم حج میں جب کہ وہاں لاکھوں انسانوں کا زائد مجمع ہوتا ہے کبھی نہیں سنا گیا کہ بازار میں کسی وقت بھی شیار ضرورت ختم ہو گئیں، ملتی نہیں، یہاں تک کہ تیرائی کے بکرے جو وہاں پہنچ کر ایک ایک انسان تنو تنو بھی کرتا ہے اور وسطی کس ایک کا تو یقینی ہے، یہ لاکھوں بکرے وہاں ہمیشہ ملتے ہیں، یہ بھی نہیں کہ دوسرے ملک سے منگانی کا اہتمام کیا جاتا ہو، قرآن کریم میں یُعْبَدُ إِلَيْهِ شَتَّىٰ شَيْءٌ (۵۷: ۲۸)، "یعنی اس میں باہر سے لائے جاتے ہیں غرات ہر چیز کے" ان الفاظ میں اس کی طرف واضح اشارہ بھی موجود ہے۔

یہ تو ظاہری برکات کا حال ہے جو مقصود کی حیثیت نہیں رکھتیں، اور معنوی و باطنی برکات تو اتنی ہیں کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا، بعض اہم عبادات تو بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں جو اجر عظیم اور برکات روحانی ہیں ان سب کا مدار بیت اللہ پر ہے، مثلاً حج و عمرہ، اور بعض دوسری عبادات کا بھی مسجد حرام میں ثواب بدرجہا بڑھ جاتا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی انسان گھر میں نماز پڑھے اس کو ایک نماز کا ثواب ملے گا، اور اگر اپنے محلہ کی مسجد میں ادا کرے اس کو پچیس نمازوں کا ثواب حاصل ہوگا، اور جو جامع مسجد میں ادا کرے تو پانچ نمازوں کا ثواب پائے گا، اور اگر مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کی تو ایک ہزار نمازوں کا اور میری مسجد میں پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا، (یہ روایت ابن جبر و طحاوی وغیرہ نے نقل کی ہے) حج کے فضائل میں یہ حدیث عام مسلمان جانتے ہیں کہ حج کو صحیح طور پر ادا کرنے والا مسلمان پچھ گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے



پاک و صاف پیدا ہوا ہے (ظاہر ہے کہ یہ سب بیت اللہ کی معنوی اور روحانی برکات ہیں، انہی برکات کو آیت کے آخر میں لفظ ھُدًی سے تعبیر فرمایا گیا ہے مَبَارَكًا وَ ھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ۔

فِیْہِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مِّمَّا رَآہِمُۃٌ وَمَنْ دَخَلْہٗۤ کانَ اٰمِنًا

اس میں نشانیاں ہیں ظاہر جیسے مقام ابراہیم اور جو اس کے اندر آیا اس کو امن ملا،

وَلِلّٰہِ عَلٰی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِۤ اِنْ سَیَّطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا ط وَ

اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی، اور

مَنْ کَفَرَۤ اِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۙ ۹۷

جو نہ مانے تو پھر اللہ پرواہ نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی۔

## خلاصہ تفسیر

اس میں (کچھ تشریحی کچھ تکوینی) کھلی نشانیاں (اس کی افضلیت کی موجودگی میں) چنانچہ تشریحی نشانیوں میں اس کا مبارک اور ہدی تفسیر مذکور ہونا بیان ہو چکا اور کچھ مقام ابراہیم کے بعد مذکور ہیں یعنی اس میں داخل ہونے والے کا مستحق امن ہو جانا اور اس کا حج بشرائط فرض ہونا جو کہ مطلق مشروعیت مذکورہ سابق پر زائد مفہوم ہے، یہ چار نشانیاں تو تشریحی اس جگہ مذکور ہیں، اب درمیان میں تکوینی کا ذکر فرماتے ہیں کہ (مجلہ ان (نشانوں) کے ایک مقام ابراہیم (نشانی) ہے، اور (ایک تشریحی نشانی یہ ہے کہ) جو شخص اس (کے حدود متعلقہ) میں داخل ہو جاوے وہ (مشروعاً) امن والا ہو جاتا ہے اور (ایک تشریحی نشانی یہ ہے کہ) اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے (مگر سب کے ذمہ نہیں بلکہ خاص خاص کے) یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کے سبیل کی اور جو شخص (احکام خداوندی کا) منکر ہو تو (خدا تعالیٰ) کا کیا ضرر کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام جہان والوں سے غنی ہیں کسی کے ماننے پر ان کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا بلکہ خود اس منکر ہی کا ضرر ہے)

## معارف و مسائل

اس آیت میں بیت اللہ ہی کعبہ کی خصوصیات اور فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ اس میں اللہ کی قدرت کی بہت سی نشانیاں ہیں، (مجلہ ان مقام ابراہیم ہے) دوسرے یہ کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا

بیت اللہ کی  
تین خصوصیات



اور محفوظ ہو جاتا ہے، کوئی اس کو قتل نہیں کر سکتا، تیسرے یہ کہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر اس  
بیت اللہ کا حج فرض ہے، بشرطیکہ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو، اور قدرت رکھتا ہو۔  
پہلی بات کہ اس میں اللہ جل شانہ کی قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں، اس کی توضیح یہ ہے  
کہ جب سے بیت اللہ قائم ہوا اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو مخالفین کے حملوں سے  
محفوظ فرما دیا، اترہم نے ہاتھیوں کا لشکر لے کر چڑھائی کی، تو اللہ جل شانہ نے اپنی قدرت  
کاملہ سے ان کو پرندوں کے ذریعہ تباہ و ہلاک کر دیا، حرم مکہ میں داخل ہونے والا انسان بلکہ  
جانور تک محفوظ ہے، جانوروں میں بھی اس کا احساس ہے، حدودِ حرم کے اندر جانور بھی اپنے آپ کو  
محفوظ سمجھتے ہیں وہاں وحشی شکاری جانور انسان سے نہیں بھاگتا، عام طور پر یہ بھی مشاہدہ کیا جاتا ہے  
کہ بیت اللہ کی جس جانب بارش ہوتی ہے اس جانب کے ممالک زیادہ بارش سے سیراب ہوتے  
ہیں، ایک عجیب نشانی یہ ہے کہ ہجرات جن پر ہر ایک حج کرنے والا سات سات کنکریاں روزِ آ  
ئین روز تک پھینکتا ہے، اور ہر سال لاکھوں حجاج وہاں جمع ہوتے ہیں، یہ ساری کنکریاں اگر  
وہاں جمع ہو کر باقی رہیں تو ایک ہی سال میں وہ ہجرات کنکریوں کے ڈھیر میں دب جائیں اور چند  
سال میں تو وہاں ایک پہاڑ بن جائے، حالانکہ مشاہدہ یہ ہو کہ حج کے تینوں دن گزرنے کے بعد  
وہاں کنکریوں کا کوئی بہت بڑا انبار جمع نہیں ہوتا، کچھ کنکریاں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں جس کی  
وجہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ یہ کنکریاں فرشتے اٹھا لیتے ہیں  
اور صرف ایسے لوگوں کی کنکریاں باقی رہ جاتی ہیں جن کا حج کسی وجہ سے قبول نہیں ہوا، اور یہی وجہ  
ہے کہ ہجرات کے پاس سے کنکریاں اٹھا کر رمی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ وہ غیر مقبول ہیں  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق ہر دیکھنے والا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے  
کہ ہجرات کے آس پاس بہت تھوڑی سی کنکریاں نظر آتی ہیں، حالانکہ وہاں سے اٹھانے یا صاف  
کرنے کا نہ کوئی اہم تمام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے نہ عوام کی طرف سے۔

اس وجہ سے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے خصائص کبریٰ میں فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض معجزات ایسے بھی ہیں جو آپ کی وفات کے بعد بھی موجود اور قائم ہیں، اور قیامت تک باقی رہیں گے، اور ہر شخص ان کا مشاہدہ کر سکے گا، ان میں سے ایک تو قرآن کا بے نظیر ہونا ہے کہ ساری دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہے، یہ عجز جیسے عہد نبویؐ میں تھا ایسے ہی آج بھی موجود ہے، اور قیامت تک رہے گا، ہر زمانہ کا مسلمان پوری دنیا کو چیلنج کر سکتا ہے کہ فَاْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ، اسی طرح جبرائیل کے بارے میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان پر پھینکی ہوئی کنکریاں نامعلوم طور پر فرشتے اٹھا لیتے ہیں، صرف ان پر نصیب

اب معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے اٹھوانے کا انتظام کیا ہے۔ محمد تقی عثمانی



لوگوں کی کنکریاں رہ جاتی ہیں جن کے حج قبول نہیں ہوتے، آپ کے اس ارشاد کی تصدیق ہر زمانہ ہر قرن میں ہوتی رہی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی، یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ اور بیت اللہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے۔

**مقامِ ابراہیم** | اُن نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی مقامِ ابراہیم ہے، اسی لئے قرآن کریم نے اس کو مستقل طور پر علیحدہ بیان فرمایا، مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے

ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر فرماتے تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ پتھر تعمیر کی بلندی کے ساتھ ساتھ خود بخود بلند ہو جاتا تھا، اور نیچے اترنے کے وقت نیچا ہو جاتا تھا، اس پتھر کے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا گہرا نشان آج تک موجود ہے، ظاہر ہے کہ ایک بے حس و بے شعور پتھر میں یہ ادراک کہ ضرورت کے موافق بلند یا پست ہو جائے اور یہ تاثر کہ موم کی طرح نرم ہو کر قد میں کا مکمل نقش اپنے اندر لے لے، یہ سب آیات قدرت ہیں جو بیت اللہ کی اعلیٰ فضیلت ہی سے متعلق ہیں، یہ پتھر بیت اللہ کے نیچے دروازے کے قریب تھا، جب قرآن کا یہ حکم نازل ہوا کہ مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھو، **وَاذْكُرْ مَقَامَ إِبْرَاهِيمَ** اُس وقت طواف کرنے والوں کی مصلحت سے اس کو اٹھا کر بیت اللہ کے سامنے ذرا فاصلہ پر مطاف سے باہر بریزمزم کے قریب رکھ دیا گیا، اور آجکل اس کو اسی جگہ ایک محفوظ مکان میں مقفل کیا ہوا ہے، طواف کے بعد کی دو رکعتیں اسی مکان کے پیچھے پڑھی جاتی ہیں حال میں یہ ترمیم ہوئی کہ وہ مکان تو ہٹا دیا گیا اور مقامِ ابراہیم کو ایک بلوری غول کے اندر محفوظ کر دیا گیا، مقامِ ابراہیم اصل میں اس خاص پتھر کا نام ہے، اور طواف کے بعد کی رکعتیں اس کے اوپر یا اس کے پاس پڑھنا افضل ہے، لیکن مقامِ ابراہیم کے لفظی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ تمام مسجد حرام کو حاوی ہے، اسی لئے حضرات فقہار نے فرمایا کہ مسجد حرام کے اندر جس جگہ بھی طواف کی رکعتیں پڑھ لے واجب ادا ہو جائے گا۔

**داخل بیت اللہ کا مامون ہونا** | آیت مذکورہ میں بیت اللہ کی دوسری خصوصیت یہ بتلائی گئی ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا یعنی

مامون و محفوظ ہو جاتا ہے، اس میں داخل ہونے والے کا مامون و محفوظ ہونا ایک تو شرعی اعتبار سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو جسکم ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو جائے اس کو نہ ستاؤ نہ قتل کرو، اگر کوئی شخص کسی کو قتل کرے یا کوئی اور جرم کر کے وہاں چلا جائے اس کو بھی اس جگہ سزا دی جائے، بلکہ اس کو اس پر مجبور کیا جائے کہ وہ حرم سے باہر نکلے، حرم سے باہر آنے پر سزا جاری کی جائے گی، اس طرح حرم میں داخل ہونے والا



شرعی طور پر مومن و محفوظ ہو گیا۔

دوسرے حرم میں داخل ہونے والے کافران و مفسدین و منافقین بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طور پر ہر قوم و ملت کے دلوں میں بیت اللہ کی تعظیم و تکریم ڈال دی ہے، اور وہ سب عموماً ہزاروں اختلافات کے باوجود اس عقیدے پر متفق ہیں کہ اس میں داخل ہونے والا اگرچہ مجرم یا ہمارا دشمن ہی ہو تو حرم کا احترام اس کا مقتضی ہے کہ وہاں اس کو کچھ نہ کہیں، حرم کو عام جھگڑوں لڑائیوں سے محفوظ رکھا جائے، زمانہ جاہلیت کے عرب اور ان کے مختلف قبائل خواہ کتنی ہی عملی حشراہوں میں مبتلا تھے، مگر بیت اللہ اور حرم محترم کی عظمت پر سب جان دیتے تھے، ان کی جنگ جونی اور تند خوئی ساری دنیا میں مشہور ہے، لیکن حرم کے احترام کا یہ حال تھا کہ باپ کا قاتل بیٹے کے سامنے آتا تو مقتول کا بیٹا جو اس کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اپنی آنکھیں نیچی کر کے گزر جاتا تھا اس کو کچھ نہ کہتا تھا۔

فتح مکہ میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دین کی اہم مصلحت اور بیت اللہ کی تطہیر کی خاطر صرف چند گھنٹوں کے لئے حرم میں قتال کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی، اور فتح کے بعد آپ نے بڑی تاکید کے ساتھ اس کا اعلان و اظہار فرمایا کہ یہ اجازت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تطہیر بیت اللہ کی غرض سے تھی، اور وہ بھی چند گھنٹوں کے لئے تھی، اس کے بعد ہمیشہ کے لئے پھر اس کی وہی حرمت ثابت ہے جو پہلے سے تھی، اور فرمایا کہ حرم کے اندر قتل و قتال نہ مجھ سے پہلے حلال تھا نہ میرے بعد کسی کے لئے حلال ہے، اور میرے لئے بھی صرف چند گھنٹوں کے لئے حلال ہوا تھا پھر حرام کر دیا گیا۔

رہا یہ معاملہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے خلاف مکہ میں فوج کشی کی اور قتل و غارت کیا، یہ اس امین عام کے تشریفی طور پر اس لئے خلاف نہیں کہ باجماع امت اس کا یہ فعل حرام اور سخت گناہ تھا، تمام امت نے اس پر نعرین کی، اور ان کو اپنی طور پر بھی اس کو احترام بیت اللہ کے منافی اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ حجاج خود بھی اپنے اس عمل کے حلال ہونے کا معتقد نہ تھا، وہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک سنگین جرم کر رہا ہوں، لیکن سیاست و حکومت کی مصالحت نے اس کو اندھا کیا ہوا تھا۔

بہر حال یہ بات پھر بھی محفوظ تھی کہ عامہ حقائق بیت اللہ اور حرم کو اس درجہ واجب الاحترام سمجھتے رہے ہیں کہ اس میں قتل و قتال اور لڑائی جھگڑے کو بدترین گناہ سمجھتے ہیں، اور یہ ساری دنیا میں صرف بیت اللہ اور حرم محترم ہی کی خصوصیت ہے۔



**حج بیت اللہ کا فرض ہونا** | آیت میں بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر بیت اللہ کا حج کرنا لازم و

واجب قرار دیا ہے، بشرطیکہ وہ بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت و استطاعت رکھتے ہوں، اس قدرت و استطاعت کی تفصیل یہ ہے کہ اس کے پاس ضروریاتِ اصلیہ سے فاضل اتنا مال ہو جس سے وہ بیت اللہ تک آنے جانے اور وہاں کے قیام کا خرچ برداشت کر سکے، اور اپنی واپسی تک ان اہل و عیال کا بھی انتظام کر سکے جن کا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے، نیز ہاتھ پاؤں اور آنکھوں سے معذور نہ ہو، کیونکہ ایسے معذور کو تو اپنے وطن میں چلنا پھرنا بھی مشکل ہے، وہاں جانے اور ارکانِ حج ادا کرنے پر کیسے قدرت ہوگی۔

اسی طرح عورت کے لئے چونکہ بغیر محرم کے سفر کرنا شرعاً جائز نہیں، اس لئے وہ حج پر قادر اس وقت سمجھی جائے گی جب کہ اس کے ساتھ کوئی محرم حج کرنے والا ہو، خواہ محرم اپنے خرچ سے حج کر رہا ہو یا عورت اس کا خرچ بھی برداشت کرے، اسی طرح وہاں تک پہنچنے کے لئے راستہ کا نامون ہونا بھی استطاعت کا ایک جزو ہے، اگر راستہ میں بدامنی ہو، جان مال کا قومی خطرہ ہو تو حج کی استطاعت نہیں سمجھی جائے گی۔

لفظ حج کے لغوی معنی قصد کرنے کے ہیں، اور شرعی معنی کی ضروری تفصیل تو خود قرآن کریم نے بیان فرمائی کہ لُحُوفِ کَعْبَہ اور وقوف عرفہ و مزدلفہ وغیرہ ہیں، اور باقی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زبانی ارشادات اور عملی بیانات کے ذریعہ واضح فرمادی ہیں، اس آیت میں حج بیت اللہ کے فرض ہونے کا اعلان فرماتے کے بعد آخر میں فرمایا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَفِيْرٌ عَنِ الْعَالَمِيْنَ، یعنی جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے تمام جہانوں سے۔ اس میں وہ شخص تو داخل ہے ہی جو صراحۃً فریضہ حج کا منکر ہو، حج کو فرض نہ سمجھے،

اس کا دائرہ اسلام سے خارج اور کافر ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے وَمَنْ كَفَرَ کا لفظ اس پر صراحۃً صادق ہے، اور جو شخص عقیدہ کے طور پر فرض سمجھتا ہے، لیکن باوجود استطاعت و قدرت کے حج نہیں کرتا، وہ بھی ایک حیثیت سے منکر ہی ہے، اس پر لفظ وَمَنْ كَفَرَ کا اطلاق تہدید اور تاکید کے لئے ہے، کہ یہ شخص کافروں جیسے عمل میں مبتلا ہے، جیسے کافر و منکر حج نہیں کرتے یہ بھی ایسا ہی ہے، اسی لئے فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ آیت کے اس جملہ میں ان لوگوں کے لئے سخت وعید ہے جو باوجود قدرت و استطاعت کے حج نہیں کرتے، کہ وہ اپنے اس عمل سے کافروں کی طرح ہو گئے۔ العیاذ باللہ۔



قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ

تو کہ اے اہل کتاب کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے اور اللہ کے ردِ بروہے جو

مَا تَعْمَلُونَ ۝۹۸ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

تم کرتے ہو تو کہ اے اہل کتاب کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ

اللَّهِ مَنَ امِّنَ تَبْغُوا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ ۚ وَمَا اللَّهُ

سے ایمان لانیوالوں کو کہ ڈھونڈتے ہو اس میں عیب اور تم خود جانتے ہو اور اللہ

يَغَافِلُ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝۹۹ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا

بے خبر نہیں تمہارے کام سے اے ایمان والو اگر تم کہا مانو گے

فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

بعض اہل کتاب کا تو پھر کر دیں گے وہ تم کو ایمان لانے

كُفْرَيْنَ ۝۱۰۰ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُشْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ

کافرین اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو اور تم پر بڑھی جاتی ہیں آیتیں

اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۚ وَمَنْ يَعْتَصِرْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ

اللہ کی اور تم میں اس کا رسول ہے اور جو کوئی مضبوط پکڑے اللہ کو تو اس کو ہدایت

إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝۱۰۱

ہوئی سیدھے راستے کی

۱۰۱

رَبِطُ آيَاتُ | اوپر سے اہل کتاب کے عقائد فاسدہ اور ان کے مشبہات پر کلام چل رہا تھا،

درمیان میں بیست اللہ اور حج کا تذکرہ آیا، آگے پھر اہل کتاب ہی سے خطاب ہے جس کا تعلق

ایک خاص واقعہ سے ہے، کہ ایک یہودی شاہس بن قیس مسلمانوں سے بہت کینہ رکھتا تھا،

اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو ایک جگہ مجتمع و متفق دیکھا تو حسد کے

بے چین ہو گیا، اور ان میں تفریق ڈالنے کی فکر میں لگا، آخر یہ تجویز کی کہ ایک شخص سے کہا کہ ان

دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک بڑی جنگ عرصہ دراز تک رہ چکی ہے اور اس

کے متعلق فریقین کے فخریہ اشعار ہیں وہ اشعار ان کی مجلس میں پڑھ دیے جائیں، چنانچہ اشعار

کا پڑھنا تھا فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی، اور آپس میں چناں چیں ہونے لگی، یہاں تک



کہ موقع اور وقت لڑائی کا پھر مختار ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ان کے پاس تشریف لائے، اور فرمایا کیا اندھیر ہے، میرے ہوتے ہوئے پھر مسلمان ہونے اور باہم متفق و مانوس ہونے کے بعد یہ کیا جہالت ہے، کیا تم اسی حالت میں کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟ سب متنبہ ہوئے اور سمجھا کہ یہ شیطانی حرکت تھی، اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی اس واقعہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

اس واقعہ کو روح المعانی میں بروایت ابن اسحق اور ایک جماعت نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے، یہ مضمون کئی آیتوں تک چلا گیا ہے، جس میں اول ملامت ہے ان اہل کتاب جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر ملامت ہے پہلے ان کے کفر پر بھی ملامت کی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہتے تو یہ تھا کہ خود بھی مسلمان ہو جائے نہ یہ کہ دوسروں کے گمراہ کرنے کی فکر میں لگ رہے، پھر خطاب و فہمائش مسلمانوں کو ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ (ان اہل کتاب) فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب تم (بعد ظہور حجت حقانیت اسلام کے) کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا (اصول و فروع میں) سب آگئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں (تم کو اس سے بھی ڈر نہیں لگتا، اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب کیوں (ہٹانے کی کوشش کرتے) ہو اللہ کی راہ (یعنی اس کے دین حق) سے لیے شخص کو جو (اس دین حق کے ہونے پر) ایمان لا چکا اس طور پر کہ کچی (کی باتیں) ڈھونڈتے ہو اس راہ کے (اندر پیدا کرنے کے) لئے جیسا کہ قصہ مذکورہ میں کوشش کی تھی کہ اس کارروائی سے ان کے دین کے اندر بوجہ نا اتفاقی کہ گناہ بھی ہے اور اجتماعی قوت کی بربادی بھی، اور یہ کہ ان بکفیروں میں بڑکر دین حق سے ان کو بعد ہو جاوے گا) حالانکہ تم خود بھی (اس حرکت کے قبیح ہونے کی) اطلاع رکھتے ہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں (وقت معین پر اس کی سزا دیں گے) اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے (یعنی اہل کتاب میں سے) تو وہ لوگ تمہارے ایمان لائے پیچھے (اعتقاداً یا عملاً) کافر بنادیں گے اور (بھلا) تم کفر کیسے کر سکتے ہو (یعنی تمہارے لئے کب روا ہو سکتا ہے) حالانکہ (اسباب مانع کفر کے پورے جمع ہیں کیونکہ) تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام (قرآن میں) پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور (پھر) اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) موجود ہیں (اور دونوں قوی ذرائع ہیں ایمان پر قائم رہنے کے



پس تم کو چاہئے کہ ان دونوں ذریعوں کی تعلیم تلقین کے موافق ایمان پر اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو اور (یا درکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے (یعنی ایمان پر پورا قائم رہتا ہے) کیونکہ اللہ کو مضبوط پکڑنا یہی ہے کہ اس کی ذات و صفات کی تصدیق کرے، اس کے احکام کو مضبوط پکڑے، کسی دوسرے مخالف کی موافقت نہ کرے (تو ایسا شخص) ضرور راہِ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے (یعنی وہ راہِ راست پر ہوتا ہے، اور راہِ راست پر ہونا اصل ہے ہر صلاح و فلاح کی، پس اس میں ایسے شخص کے لئے ہر صلاح و فلاح کی بشارت و وعدہ ہے)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا

اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہئے اس سے ڈرنا اور نہ مرنے

وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۱۰۳﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

مسلمان اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور بھٹو نہ ڈالو

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ

اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت دی

بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى

تھمائیے دلوں میں اب ہو گئے اس کے فضل سے بھائی اور تم تھے کنارے

شَمًا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ

پر ایک آگ کے گڑھے کے پھر تم کو اس سے نجات دی اسی طرح کھولتا ہے اللہ

اللَّهُ لَكُمْ إِلَيْهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۰۴﴾

تم پر آئیں تاکہ تم راہ پاؤ۔

رابط آیات | سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہل کتاب اور دوسرے

لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اہتمام کریں

مذکورہ دو آیاتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط و ناقابلِ تسخیر بنانے کے دو اہم اصول

بتلائے گئے ہیں۔

اول تقویٰ، دوسرے باہمی اتفاق و اتحاد، اور تفرق و اختلاف سے بچنا۔



## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے (ایسا) ڈرا کرو (جیسا) ڈرنے کا حق ہے (کامل ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شرک و کفر سے بچے ہو اسی طرح تمام گناہوں سے بھی بچا کرو اور بلا وجہ شرعی لڑنا، معصیت ہے تو اس سے بھی بچنا فرض ہے) اور بجز اسلام (کامل) کے (جس کا حاصل وہی ہے جو کامل ڈرنے کا حق تھا) اور کسی حالت پر جان نہ دینا (یعنی اسی کامل تقویٰ اور کامل اسلام پر تا دم مرگ قائم رہنا) اور مضبوط پکڑے رہو، اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کو جس میں اصول و فروع سب آگئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو (جس کی اسی دین میں تعلیم بھی ہے) اور باہم نا اتفاقی مت کرو (جس کی اسی دین میں مانعت بھی ہے) اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام (ہوا) ہے اس کو یاد کرو جب کہ تم (باہم) دشمن تھے (یعنی قبل اسلام کے) چنانچہ اوس و خزرج کے دو قبیلوں میں طویل مدت سے جنگ چلی آتی تھی، اور عام طور پر اکثر عرب کے لوگوں کی یہی حالت تھی، پس اللہ تعالیٰ نے (اب) تمہارے قلوب میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی، سو تم خدا تعالیٰ کے (اس) انعام (تالیف قلوب) سے (اب) آپس میں بھائی بھائی (کی طرح) ہو گئے اور (ایک انعام جو کہ انعام مذکورہ کی بھی اصل ہے یہ فرمایا کہ) تم لوگ (بالکل) دوزخ کے گڑھے کے کنارے (ہی) پر کھڑے تھے (یعنی بوجہ کافر ہونے کے دوزخ سے اتنی قریب تھے کہ بس دوزخ میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی) سو اس (گڑھے) سے خدا تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی (یعنی اسلام نصیب کیا جس نے جہنم سے نجات دلائی، تو اب تم ان انعاموں کی قدر پہچانو اور آپس کے جدال و قتال سے جو کہ معصیت ہے اللہ کی اُن نعمتوں کو زائل نہ کرو، کیونکہ باہمی جنگ و جدال سے پہلا انعام یعنی سب کے قلوب کا باہم مربوط اور مانوس ہونا تو خود ہی زائل ہو جائے گا، اور دوسرا انعام یعنی دین اسلام بھی اس سے مختل اور کمزور ہو جائیگا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے (اور) احکام (بھی) بیان کر کے بتلاتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ (راست) پر قائم رہو۔

## معارف و مسائل

مسلمانوں کی اجتماعی قوت کے | مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں پہلا اصول اور دوسری میں دواصول تقویٰ اور باہمی اتفاق | دوسرا بتلایا گیا ہے، پہلا اصول جو مذکورہ آیت نے بتلایا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے یعنی اس کی ناپسندیدہ چیزوں سے بچنے کا مکمل اہتمام جو اللہ تعالیٰ کے حق کے



مطابق ہو۔

لفظ تقویٰ اصل عربی زبان میں بچنے اور اجتناب کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس کا ترجمہ ڈرنا بھی اس مناسبت سے کیا جاتا ہے کہ جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ڈرنے ہی کی چیزیں ہوتی ہیں، یا کہ ان سے عذاب الہی کا خطرہ ہے، وہ ڈرنے کی چیز تقویٰ کے کئی درجات ہیں، ادنیٰ درجہ کفر و شرک سے بچنا ہے، اس معنی کے لحاظ سے ہر مسلمان متقی کہا جاسکتا ہے، اگرچہ گناہوں میں مبتلا ہو، اس معنی کے لئے بھی قرآن میں کئی جگہ لفظ متقین اور تقویٰ استعمال ہوا ہے، دوسرا درجہ جو اصل میں مطلوب ہے وہ ہے اس چیز سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ نہیں، تقویٰ کے فضائل و برکات جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں وہ اسی درجہ پر موقوف ہیں۔

تیسرا درجہ تقویٰ کا اعلیٰ مقام ہے جو انبیاء علیہم السلام اور ان کے خاص نائبین اولیاء اللہ کو نصیب ہوتا ہے، کہ اپنے قلب کو ہر غر اللہ سے بچانا اور اللہ کی یاد اور اس کی رضا جوئی سے معمور رکھنا، مذکورہ آیت میں **اتَّقُوا اللَّهَ** کے بعد **حَقَّ تَقَاتِهِ** کا کلمہ بڑھایا گیا ہے کہ تقویٰ کا وہ درجہ حاصل کرو جو حق ہے تقویٰ کا۔

اس کی تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعود اور ربیع اور قتادہ اور ابن بصری رضی اللہ عنہم نے یہ فرمائی ہے جو مرفوعاً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے:

حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت ہر کام میں کی جائے، کوئی کام طاعت کے خلاف نہ ہو اور اس کو ہمیشہ یاد رکھیں کبھی بھولیں نہیں اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کریں کبھی ناشکری نہ کریں۔

**حَقَّ تَقَاتِهِ هُوَ أَنْ يُطَاعَ فَلَا يُعْصَى وَ  
يُنْكَرُ فَلَا يُفْسَى وَ يُشْكُرُ فَلَا يُكْفَرُ**  
(بحر محیط)

اسی مفہوم کو ائمہ تفسیر نے دوسرے عنوانات سے بھی ادا کیا ہے، مثلاً بعض نے فرمایا کہ حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت اور بُرائی کی پروا نہ کرے اور ہمیشہ انصاف پر قائم رہے، اگرچہ انصاف کرنے میں خود اپنے نفس یا اپنی اولاد یا مال باپ ہی کا نقصان ہوتا ہو، اور بعض نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک حق تقویٰ ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھے۔

اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں جو **اتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ** ہے یعنی اللہ سے ڈرو جتنا تمہاری قدرت میں ہے تو حضرت ابن عباسؓ اور طاؤسؓ نے فرمایا کہ یہ درحقیقت حق تقاتہ



کی ہی تفسیر و تشریح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ معاصی اور گناہوں سے بچنے میں اپنی پوری توانائی اور طاقت صرف کر دے تو حق تعالیٰ ادا ہو گیا، اگر کوئی شخص اپنی پوری توانائی صرف کرنے کے بعد کسی ناجائز میں مبتلا ہو ہی گیا تو وہ حقوق تعالیٰ کے خلاف نہیں۔

اگلے جملے میں جوار شاد فرمایا فَلَا تَقْنُوتُنَّ إِلَّا قَوْمَ مَسْلُومِينَ، اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درحقیقت پورا اسلام ہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت اور اس کی نافرمانی سے مکمل پرہیز کا ہی نام تقویٰ ہے، اور اسی کو اسلام کہا جاتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ آیت میں حکم یہ ہے کہ تمھاری موت اسلام ہی پر آنی چاہئے اسلام کے سوا کسی حال پر موت نہ آئی چاہئے۔

تو یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ موت تو آدمی کے اختیار میں نہیں کسی وقت کسی حال میں آ سکتی ہے، کیونکہ حدیث میں ہے كَمَا تَحْيَوْنَ كَمَا تَمُوتُونَ وَكَمَا قُمْتُمْ تَحْشَرُونَ، یعنی جس حالت پر تم اپنی زندگی گزار دو گے اسی پر موت آئے گی، اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں حشر میں کھڑے کئے جاؤ گے۔ تو جو شخص اپنی پوری زندگی اسلام پر گزارنے کا پختہ عزم رکھتا ہے، اور معتد و رہبر اس پر عمل کرتا ہے اس کی موت انشاء اللہ اسلام ہی پر آئے گی، بعض روایات حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوں گے کہ ساری عمر اعمال صالحہ کرتے ہوئے گزر گئی، آخر میں کوئی ایسا کام کر بیٹھے جس سے سارے اعمال جھٹ و برباد ہو گئے، یہ ایسے ہی لوگوں کو ہمیشہ آ سکتا ہے جن کے عمل میں اول اخلاص اور پختگی نہیں تھی۔ واللہ اعلم

مسلمانوں کی جہتہا علی قوت | دوسری آیت وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا، میں اس کو نہایت بلیغ سا دوسرا اصول یا بھی اتفاق اور حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے، کہ سب کے پہلے وہ اصول اور گریز لایا جو انسانوں کو باہمی مربوط اور متفق کرنے کا نسخہ اکسیر ہے، اس کے بعد آپس میں متفق ہونے کا حکم دیا، اس کے بعد آپس کے افتراق و انتشار سے منع فرمایا۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ اتفاق و اتحاد ایک ایسی چیز ہے جس کے محمود و مطلوب ہونے پر دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کے ہوں، کسی مذہب و مشرب کے تعلق رکھتے ہوں سب کا اتفاق ہے، اس میں دو رائیں ہونے کا امکان ہی نہیں، دنیا میں شاید کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ سکے جو لڑائی جھگڑے کو بذاتہ مفید اور بہتر جانتا ہو، اس لئے دنیا کی ہر جماعت ہر پارٹی لوگوں کو متفق کرنے کی ہی دعوت دیتی ہیں، لیکن دنیا کے حالات کا تجربہ بتلاتا ہے کہ اتفاق کے مفید اور ضروری ہونے پر سب کے اتفاق کے باوجود ہو یہ رہا ہے کہ انسانیت فرقوں، گروہوں، پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے، پھر ہر فرقہ کے اندر فرقے اور پارٹی کے اندر پارٹیاں



کا لامحدود سلسلہ ایسا ہے کہ صحیح معنی میں دو آدمیوں کا اتحاد و اتفاق بھی ایک افسانہ بن کر رہ گیا ہے، وقتی اغراض کے تحت چند آدمی کسی بات پر اتفاق کرتے ہیں، اغراض پوری ہو جائیں یا ان میں ناکامی ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اتفاق ختم ہو جائے بلکہ افتراق اور عداوتوں کی نوبت آتی ہے۔ غور کیا جائے تو اس کا سبب یہ معلوم ہوگا کہ ہر گروہ و ہر فرقہ اور ہر شخص لوگوں کو اپنے خود ساختہ پروگرام پر متحد و متفق کرنا چاہتا ہے، اور جبکہ دوسرے لوگ خود اپنا بنایا ہوا کوئی نظام و پروگرام رکھتے ہوں تو وہ ان سے متفق ہونے کی بجائے ان کو اپنے پروگرام پر متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں، اس لئے لازمی طور پر ہر دعوت اتحاد کا نتیجہ ایک ہی جماعتوں اور افراد کا افتراق و انتشار نکلتا ہے، اور اختلافات کی ذلزل میں پھنسی ہوئی انسانیت کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس لئے قرآن حکیم نے صرف اتحاد و اتفاق اور تنظیم و اجتماع کا وعظ ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کے حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا ایک ایسا منصفانہ و عادلانہ اصول بھی بتلادیا جس کے ماننے سے کسی گروہ کو اختلاف نہیں ہونا چاہئے، وہ یہ ہے کہ کسی انسانی دماغ یا چند انسانوں کے بنائے ہوئے نظام و پروگرام کو دوسرے انسانوں پر بھوپ کران سے یہ امید رکھنا کہ وہ سب اس پر متفق ہو جائیں گے عقل و انصاف کے خلاف اور خود فریبی کے سوا کچھ نہیں البتہ رب العالمین کا دیا ہوا نظام و پروگرام ضرور ایسی چیز ہے کہ اس پر سب انسانوں کو متفق ہونا ہی چاہئے، کوئی عقلمند انسان اس سے اصولاً انکار نہیں کر سکتا، اب اگر اختلاف کی کوئی راہ باقی رہتی ہے تو وہ صرف اس بات کے پہچاننے میں ہو سکتی ہے کہ حکم الحاکمین رب العالمین کا بھیجا ہوا نظام کیا اور کونسا ہے، یہودی نظام تورات کو، نصاریٰ نظام انجیل کو خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا واجب التحیل بتلاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرکین کی مختلف جماعتیں بھی اپنی اپنی مذہبی رسوم کو خدا تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرتی ہیں۔

لیکن اول تو اگر انسان اپنے جماعتی تعصب اور آبائی تقلید سے ذرا بلند ہو کر اپنی عقل خدا واد سے کام لے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجاتی ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ تعالیٰ کا آخری پیام فترآن کی صورت میں لائے ہیں، آج اس کے سوا کوئی نظام خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول نہیں، اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اس وقت مخاطب مسلمان ہیں جن کا اس پر ایمان ہے کہ آج قرآن کریم ہی ایک ایسا نظام حیات ہے جو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ہے، اور چونکہ خود حق تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے اس لئے قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف و تغیر کا بھی امکان نہیں، اس لئے ہر دست



میں غیر مسلم جماعتوں کی بحث کو چھوڑ کر قرآن پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں ہی سے کہتا ہوں کہ ان کے لئے تو صرف یہی لائحہ عمل ہے، اگر مسلمانوں کی مختلف پارٹیاں قرآن کریم کے نظام پر متفق ہو جائیں تو ہزاروں گروہی اور نسلی وطنی اختلافات ایک لحظہ میں ختم ہو سکتے ہیں جو انسانیت کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، اب اگر مسلمانوں میں کوئی باہمی اختلاف رہے گا تو وہ صرف فہم قرآن اور تعبیر قرآن میں رہ سکتا ہے، اور اگر ایسا اختلاف حدود کے اندر رہے بھی تو نہ وہ مذموم ہے اور نہ انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے مضر بلکہ ایسا اختلاف رائے عقلاء کے درمیان رہنا فطری امر ہے، سو اس پر قابو پانا اور حدود کے اندر رکھنا کچھ دشوار نہیں، بخلاف اس کے کہ قرآنی نظام سے آزاد ہو کر ہماری پارٹیاں لڑتی رہیں تو اس وقت خلافت و جدال کا کوئی علاج نہیں رہتا، اور اسی اختلاف و انتشار کو قرآن کریم نے سخنی کے ساتھ منع فرمایا ہے، اور آج اسی قرآنی اصول کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری پوری ملت انتشار و افتراق میں پھنس کر برباد ہو رہی ہے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں اس افتراق کو مٹانے کا نسخہ اکسیر اس طرح بتلایا ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا | یعنی اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط  
تھامو

اللہ کی رسی سے مراد قرآن مجید ہے، عبد اللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: كِتَابُ اللَّهِ هُوَ حَبْلُ اللَّهِ الْمَسْدُودُ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، یعنی کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے، (ابن کثیر) زید بن ارقمؓ کی روایت میں حبل اللہ هو القرآن کے الفاظ آئے ہیں (ابن کثیر)

محاورہ عربی میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے، قرآن کو یاد دین کو رستی سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ قرآن کے اس ایک جملہ میں حکیمانہ اصول بتلائے گئے، ایک یہ کہ ہر انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات یعنی قرآن پر مضبوطی سے عامل ہو، دوسری یہ کہ سب مسلمان مل کر اس پر عمل کریں، جس کا نتیجہ لازمی یہ ہے کہ مسلمان سب باہم متفق و متحد اور منظم ہو جائیں، جیسے کوئی جماعت ایک رستی کو پکڑے ہوئے ہو تو پوری جماعت ایک جہم واحد بن جاتی ہے، قرآن کریم نے ایک دوسری آیت میں اس کو اور زیادہ واضح اس طرح



بیان فرمایا ہے:

إِنَّ الدِّينَ أَمْرٌ وَعَمَلٌ  
سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا

(۹۶:۱۹)

یعنی جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں  
اللہ تعالیٰ ان کے آپس میں دوستی و محبت  
پیدا فرمادیتے ہیں۔

پھر اس میں ایک لطیف تمثیل بھی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی کتاب سے اعتصام کر رہے ہوں تو اس کی مثال اس حالت جیسی ہے جو کسی بلندی پر چڑھتے وقت ایک مضبوط رسی کو پکڑ لیں، اور ہلاکت سے محفوظ رہیں، لہذا اشارہ فرمایا کہ اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے، کوئی شیطان شرانگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل تسخیر ہو جائے گی، قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کر لیتی ہے، اور اس سے ہٹ کر ان کی قومی و اجتماعی زندگی تو تباہ ہو ہی جائیگی اور اس کے بعد انفرادی زندگی کی بھی کوئی خیر نہیں۔

پوری مسلم قوم کا اتفاق صرف یہاں سب سے پہلے یہ جاتا لازمی ہے کہ وحدت و اتفاق کے لئے اسلام ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس وحدت کا کوئی خاص مرکز ہو، پھر مرکز وحدت نسبی اور وطنی وحدت سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

تھی کہ تشریش ایک قوم اور بنو تمیم دوسری قوم سمجھی جاتی تھی، اور کہیں رنگ کا امتیاز اس وحدت کا مرکز بن رہا تھا، کہ کلے لوگ ایک قوم اور گورے دوسری قوم سمجھے جاتے کہیں وطنی اور لسانی وحدت کو مرکز اتحاد بنایا ہوا تھا، کہ ہندی ایک قوم اور عربی دوسری قوم کہیں آبائی رسوم و رواج کو مرکز وحدت بنایا گیا تھا، کہ جوان رسوم کے پابند ہیں وہ ایک قوم اور جوان کے پابند نہیں وہ دوسری قوم، جیسے ہندوستان کے ہندو اور آریہ سماج وغیرہ۔ قرآن کریم نے ان سب کو چھوڑ کر مرکز وحدت جبل اللہ قرآن کریم کو یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام محکم قرار دیا، اور دو ٹوک فیصلہ کر دیا کہ مومن ایک قوم ہے جو جبل اللہ سے وابستہ ہے، اور کافر دوسری قوم جو اس جبل متین سے وابستہ نہیں، خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ (۲: ۶۳) کا یہی مطلب ہے، جغرافیائی وحدتیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو مرکز وحدت بنایا جائے، کیونکہ وہ وحدتیں عموماً غیر اختیاری امور ہیں جن کو کوئی انسان اپنے سعی و عمل سے حاصل نہیں کر سکتا، جو کالا ہے وہ گورا نہیں ہو سکتا،



جو قریشی ہے وہ تمیمی نہیں بن سکتا، جو ہندی ہے وہ عربی نہیں بن سکتا، اس لئے ایسی وحدتیں بہت ہی محدود دائرہ میں ہو سکتی ہیں، ان کا دائرہ کبھی اور کہیں پوری انسانیت کو اپنی دست میں لے کر پوری دنیا کو ایک وحدت پر جمع کرنے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتا، اس لئے قرآن کریم نے مرکز وحدت جبل اللہ یعنی قرآن اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کو بنایا، جس کا اختیار کرنا اختیاری امر ہے، کوئی مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، گورا ہو یا کالا، عربی زبان بولتا ہو یا ہندی و انگریزی، کسی قبیلہ کسی خاندان کا ہو ہر شخص اس محمول اور صحیح مرکز وحدت کو اختیار کر سکتا ہے، اور دنیا بھر کے پورے انسان اس مرکز وحدت پر جمع ہو کر بھائی بھائی بن سکتے ہیں، اور اگر وہ آبائی رسم و رواج سے ذرا بلند ہو کر غور کریں تو ان کو اس کے سوا کوئی معقول اور صحیح راہ ہی نہ ملے گی، کہ خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کو پہچانیں، اور اس کا اتباع کر کے جبل اللہ کو مضبوطی سے تھام لیں، جس کا نتیجہ ایک طرف یہ ہوگا کہ پوری انسانیت ایک مضبوط و مستحکم وحدت مربوط ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ اس وحدت کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام کے مطابق اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح کر کے اپنی دنیوی اور دینی زندگی کو درست کر لے گا، یہ وہ حکیمانہ اصول ہے جس کو لے کر ایک مسلمان ساری دنیا کی اقوام کو لٹکا سکتا ہے، کہ یہی صحیح راستہ ہے، اس طرف آؤ، اور مسلمان اس پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے، لیکن افسوس ہے کہ یورپ والوں کی گہری سازش جو اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کر نیکی لئے صدیوں چل رہی ہے وہ خود اسلام کے دعویداروں میں کامیاب ہو گئی، اہل اسلام کی وحدت عربی، مصری، ہندی، سندھی میں جگر پارہ پارہ ہو گئی، قرآن کریم کی یہ آیت ہر وقت اور ہر جگہ ان سب کو با واز بلند یہ دعوت دے رہی ہے کہ یہ جاہلانہ امتیازات درحقیقت امتیازات ہیں اور نہ ان کی بنیاد پر قائم ہونے والی وحدت کوئی معقول وحدت ہے، اس لئے اعتصام بحبل اللہ کی وحدت اختیار کریں، جس نے ان کو پہلے بھی ساری دنیا میں غالب اور فائق اور سر بلند بنایا اور اگر پھر ان کی قسمت میں کوئی خیر مقدر ہے تو وہ اسی راستے سے مل سکتی ہے۔

الغرض اس آیت میں مسلمانوں کو دو ہدایتیں دی گئی ہیں، اول یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نظام حیات کے پابند ہو جائیں، دوسرے یہ کہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ اس نظام کو تھام لیں تاکہ ملت اسلامی کا شیرازہ خود بخود منظم ہو جائے، جیسا کہ اسلام کے قرون اولیٰ میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے۔

مسلمانوں میں اتفاق کے ایجابی پہلو کی وضاحت کے بعد فرمایا وَلَا تَفَرَّقُوا بآہم



نا اتفاقی ذکر، قرآن حکیم کا یہ حکیمانہ انداز ہے کہ وہ جہاں ایجابی پہلو واضح کرتا ہے وہیں سلبی پہلو سے مخالف چیزوں سے منع فرماتا ہے، چنانچہ ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ (۱۵۴:۶)

اس آیت میں بھی صراطِ مستقیم پر قائم رہنے کی تلقین ہے اور اپنی خواہشات کے زیر اثر خواہ مخواہ رستوں پر چلنے کی ممانعت، نا اتفاقی کسی قوم کی ہلاکت کا سبب پہلا اور آخری سبب ہے، اسی لئے قرآن حکیم نے بار بار مختلف اسالیب میں اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا:

<p>”یعنی جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالے اور مختلف پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے آپ کا ان کوئی تعلق اور کوئی واسطہ نہیں“</p>	<p>إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا أَنتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ط (۱۶۰:۶)</p>
---	---

علاوہ ازیں انبیاء علیہم السلام کی امتوں کے واقعات کو نقل فرمایا کہ کس طرح وہ امتیں باہمی اختلاف و شقاق کے باعث مقصدِ حیات سے منحرف ہو کر دنیا و آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو پسند فرمایا ہے اور تین چیزوں کو ناپسند، پسندیدہ چیزیں یہ ہیں:

اول یہ کہ تم عبادت اللہ تعالیٰ کے لئے کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے سنبھالو اور نا اتفاقی سے بچو، سوم یہ کہ اپنے حکام اور اولوالامر کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھو۔

اور وہ تین چیزیں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں یہ ہیں: (۱) بے ضرورت قیل وقال اور بحث و مباحثہ (۲) بلا ضرورت کسی سے سوال کرنا (۳) اصاعتِ مال (۴) ابن کثیر عن ابی ہریرۃ (۵)

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا ہر اختلاف مذموم ہے، یا کوئی اختلاف غیر مذموم بھی ہے، جواب یہ ہے کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے، بلکہ مذموم وہ اختلاف ہے کہ جس میں اپنی اہواء اور خواہشات کی بناء پر قرآن سے دور رہ کر سوچا جائے، لیکن اگر قرآن پر جستج رہتے ہوئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفصیل کو قبول کرتے ہوئے اپنی فطری استعداد اور دماغی صلاحیتوں کی بناء پر فروع میں اختلاف کیا جائے تو یہ اختلاف فطری ہے، اور اسلام اس سے منع نہیں کرتا، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف



اسی قسم کا اختلاف تھا، اور اسی اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا، ہاں اگر انہی فردعی بھٹوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سب و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے تو یہ بھی مذموم ہے، باہمی اتحاد کے ان دونوں پہلوؤں کو واضح کرنے کے بعد اس حالت کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں اسلام سے پہلے اہل عرب مبتلا تھے، قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کے کشت و خون کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی، اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی چیز نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی، چنانچہ فرمایا گیا:

وَإِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً قَالَتْ بَلَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُم مِّنْهَا

”بے شک یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی، سو تم اس کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی بن گئے، اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، سو اس نے تمہیں

اس سے بچالیا“

یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر خدا تعالیٰ نے اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے بھائی بھائی بنا دیا، جس سے تمہارے دین و دنیا درست ہو گئے، اور ایسی دوستی قائم ہو گئی جسے دیکھ کر تمہارے دشمن مرعوب ہوئے، اور یہ برادرانہ اتحاد خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے بھی میسر نہ آ سکتی تھی۔

واقعہ شان نزول میں شریر لوگوں نے جو اس و خزرج کے قبیلوں کو پھپھلی جنگ یاد دلا کر فساد برپا کرنا چاہا تھا آیت مذکورہ میں اس کا مکمل علاج ہو گیا، نتائج اور بذریعہ اسلام ان سے رہائی کا بیان فرما دیا۔

مسلمانوں کا باہمی اتحاد اللہ تعالیٰ | قرآن حکیم کے اس ارشاد سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوا، کی اطاعت پر موقوف ہے | وہ یہ کہ دلوں کا مالک و حقیقت المدجل شانہ ہے، دلوں کے اندر محبت یا نفرت پیدا کرنا اسی کا کام ہے، کسی جماعت کے قلوب میں باہمی محبت اور مودت پیدا کرنا خالص انعام خداوندی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انعام صرف اس کی اطاعت و فرمانبرداری ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، معصیت و نافرمانی کے ساتھ یہ انعام نہیں مل سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اگر مسلمان مستحکم تنظیم و اتحاد چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ فقط یہ



کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا شعار بنالیں، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا ہے کہ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لئے حقائق واضح کر کے بیان فرماتے ہیں تاکہ تم لوگ صحیح راہ پر رہو۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُونَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ

اور چاہئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلائی ہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے

بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾

اچھے کاموں کا اور منع کریں بُرائی سے اور وہی پیچھے اپنی مراد کو

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا

اور مت ہوا ان کی طرح جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ

جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۵﴾

پہنچ چکے ان کو حکم صاف اور اُن کو بڑا عذاب ہے ۔

**رَبِّطِ آيَاتِ** | پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و صلاح کے دو اصول بتلائے گئے تھے، جن میں ہر فرد کو ایک خاص انداز سے اپنی اصلاح کرنے کی ہدایت تھی کہ ہر شخص تقویٰ اختیار کرے، اور اللہ تعالیٰ کے سلسلہ (اسلام) سے مربوط ہو جائے اس طرح انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ خود بخود ایک اجتماعی قوت بھی مسلمانوں کو حاصل ہو جائے گی، مذکورہ دو آیتوں میں اسی نظام صلاح و فلاح کا مکمل اس طرح کیا گیا ہے کہ مسلمان صرف اپنے اعمال و افعال کی اصلاح پر بس نہ کریں، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کی فکر بھی ساتھ ساتھ رکھیں اسی صورت سے پوری قوم کی اصلاح بھی ہوگی، اور ربط و اتحاد کو بقاء و قیام بھی ہوگا۔

## خلاصہ تفسیر

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب کے) پورے کامیاب ہوں گے، اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے (دین میں) باہم تفسیق کر لی، اور (نفسانیت سے) باہم اختلاف کر لیا،



ان کے پاس واضح احکام پہنچنے کے بعد اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی یعنی قیامت کے روز)۔

## معارف و مسائل

مسلمانوں کی قومی اور اجتماعی فلاح دو چیزوں پر موقوف ہے پہلے تقویٰ اور اعتصام بحبل اللہ کے ذریعہ اپنی اصلاح، دوسرے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح۔

آیت **وَلَا تَكُن مِّن مَّن كُن** میں اسی دوسری ہدایت کا بیان ہے، گویا ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ خود بھی اپنے اعمال و اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قانون کے مطابق درست کرو، اور اپنے دوسرے بھائیوں کے اعمال کو درست کرنے کی بھی فکر رکھو، یہی مضمون ہے جو سورۃ والعصر میں ارشاد فرمایا ہے:

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

یعنی آخرت کے خسارہ سے صرف وہ لوگ محفوظ ہیں جو خود بھی ایمان اور عمل صالح کے پابند ہیں اور دوسروں کو بھی عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔

قومی اور اجتماعی زندگی کے لئے جس طرح یہ ضروری تھا کہ ان کا کوئی مضبوط و مستحکم رشتہ وحدت ہو جس کو پہلی آیت میں اعتصام بحبل اللہ کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے، اسی طرح رشتہ کو قائم اور باقی رکھنے کے لئے یہ دوسرا عمل بھی ضروری ہے جو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے، یعنی دوسرے بھائیوں کو احکام و سنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور بُرے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے، تاکہ یہ حبل اللہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے، کیونکہ بقول استاد مرحوم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہ رتی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے، اس لئے قرآن کریم نے اس رتی کے چھوٹ جانے کے خطرے کے پیش نظر یہ ہدایت جاری فرمائی کہ ہر مسلمان جس طرح خود نیک عمل کرنے کو اور گناہ سے بچنے کو اپنا فرض سمجھتا ہے اس کو بھی ضروری سمجھے کہ دوسرے لوگوں کو بھی نیک عمل کی ہدایت اور بُرے اعمال سے روکنے کی کوشش کرتا رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سب مل کر مضبوطی کے ساتھ حبل متین کو تھامے رہیں گے، اور اس کے نتیجہ میں فلاح دنیا و آخرت ان کے ساتھ ہوگی، اپنی اصلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ڈالنے کے لئے قرآن کریم میں بہت سے واضح ارشادات وارد ہیں،



سورۃ العنکبوت کا مضمون ابھی آپ دیکھ چکے ہیں، اور اسی سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ  
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ  
عَنِ الْمُنْكَرِ - (۱۱۰: ۳)

”تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکال  
گئی ہے، کیونکہ تم نیک کاموں کا لوگوں کو حکم  
کرتے ہو اور بُرے کاموں سے روکتے ہو۔“

اس میں بھی پوری امت پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے، اور دوسری امتوں پر اس کی فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا ہے، اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں بے شمار ہیں، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرُنَّ  
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ  
الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ  
يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْ عِذِّهِ  
لَمْ تَلِدْ عَنْهُ فَلَا يَسْتَجِيبُ لَكُمْ

”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری  
جان ہے کہ تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن  
المنکر کرتے رہو اور نہ قریب ہو کہ اللہ تعالیٰ  
گنہگاروں کے ساتھ تم سب پر بھی اپنا  
عذاب بھیج دے اس وقت تم خدا تعالیٰ سے  
دعا مانگو گے تو قبول نہ ہوگی۔“

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ  
بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ  
وَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ  
أَضْعَفُ الْإِيمَانِ -

”یعنی تم میں سے جو شخص کوئی گناہ ہوتا  
ہو ا دیکھے تو اس کو چاہئے کہ اپنے ہاتھ اور  
قوت سے اس کو روک دے، اور اگر یہ بھی  
نہ کر سکے تو زبان سے روکے اور یہ بھی نہ

کر سکے تو کم از کم دل میں اس فعل کو بُرا سمجھے، اور یہ ادنیٰ درجہ کا ایمان ہے۔“

ان تمام آیات اور روایات سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت و استطاعت پر احکام دائر ہوں گے جس کو جتنی قدرت ہو اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا ابھی جو حدیث آپ نے دیکھی ہے اس میں استطاعت ہی پر مدار رکھا گیا ہے۔

پھر استطاعت و قدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے، امر بالمعروف کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف و منکر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو جس کو خود ہی



معروف و منکر کی تمیز نہ ہو، یا اس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی نادان قفیت کی بنا پر کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا منکر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف و منکر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت پیدا کرے اور احکام شرعیہ کے معروف و منکر کا علم حاصل کرے اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے۔

لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں اس کا اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں جیسے اس زمانہ میں بہت سے جاہل و غلط کہنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ انھیں قرآن کا علم ہے نہ حدیث کا، یا بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو، یہ طریق کار بجائے معاشرہ کے درست کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ و جدل کا سبب ہوتا ہے۔

اسی طرح امر بالمعروف کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی ناقابل برداشت ضرر پہنچنے کا قومی خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دل ہی سے برا سمجھے ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کر سکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ قومی ہے کہ اس نے حق بات کی تلقین کی تو اس کی جان جائے گی، یا کوئی دوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پرواہ نہ کرے، اور نقصان برداشت کر کے بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، جیسے بہت سے صحابہؓ و تابعینؓ اور ائمہ اسلام کے واقعات منقول ہیں، یہ ان کی اولوالعزمی اور بڑی فضیلت ہے، جس سے ان کا مقام دنیا و آخرت میں بلند ہوا، مگر ان کے ذمہ ایسا کرنا فرض و واجب نہ تھا۔

سورہ العصر کی آیت اور کُتِبَ خَيْرُ اُمَّةٍ (۱۱۰:۳) وغیرہ آیات سے، نیز احادیث مذکورہ سے اقت کے ہر مفسر و پیراس کی قدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا جا رہا ہے، لیکن اس کے وجوب میں یہ تفصیل ہے کہ امور واجبہ میں معروف و منکر کا امر اور منکر سے نہی کرنا واجب اور امر مستحبہ میں مستحب ہے، مثلاً نماز پنجگانہ فرض ہے تو ہر شخص پر



واجب ہوگا کہ بے سمازی کو نصیحت کرے، اور نوافل مستحب ہیں، اس کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا، اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی سے اظہار کرے، اور واجبات میں اولاً نرمی اور نہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، آجکل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں، لیکن امور واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

نیز ہر شخص پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہوگا جب کہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے، مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا کسی غیر عورت سے مجرمانہ اختلاط کر رہا ہے، تو اس کے ذمہ واجب ہوگا کہ اپنی استطاعت و قدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش و تحقیق کر کے اس کو سزا دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد من رأی منکم من اسی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ جو شخص تم میں سے کسی منکر کو دیکھے۔

امر بالمعروف کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد ہی کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ ہی یہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے، اور چونکہ اس اہم فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کو مسائل کا پورا علم بھی ہو اور امر بالمعروف کو مؤثر بنانے کے آداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اس کو معلوم ہوں، اس لئے مکمل طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا، جو ہر طرح دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو، چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو بتلاتے ہوئے فرمایا:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ

عَنِ الْمُنْكَرِ، یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں، وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ



اُمّت میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں، کیونکہ ان کی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، پھر اس جماعت کے بعض اہم اوصاف اور امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ یعنی اس جماعت کا پہلا امتیاز خصوصاً یہ ہوگا کہ وہ خیر کی طرف دعوت دیا کرے گی، گویا دعوت الی الخیر اس کا مقصد اعلیٰ ہوگا، خیر سے مراد کیا ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ اَلْخَیْرُ هُوَ اِتِّبَاعُ الْقُرْآنِ وَ سُنَّتِیْ، یعنی خیر سے مراد قرآن اور میری سنت کا اتباع ہے۔ (ابن کثیر)

”خیر“ کی اس زیادہ جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی، پورا دین شریعت اس میں آگیا پھر یَدْعُوْنَ کو صیغہ مضارع سے لاکر بتلایا کہ اس جماعت کا وظیفہ ہی دعوت الی الخیر ہوگا، یعنی دعوت الی الخیر کی مسلسل اور لگاتار کوشش ان کا فریضہ ہوگا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ اس کی ضرورت خاص مواقع پر ہوگی، جب وہ منکرات دیکھے جائیں، لیکن یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ، کہہ کر بتلادیا کہ اس جماعت کا کام دعوت الی الخیر ہوگا، اگرچہ اس وقت منکرات موجود نہ ہوں، یا کسی فرض کی ادائیگی کا وقت نہ ہو، مثلاً آفتاب نکلنے کے بعد روال تک نماز کا وقت نہیں ہے، لیکن وہ جماعت اس وقت بھی نماز پڑھنے کی تلقین کرے گی، کہ وقت نماز آنے کے بعد نماز ادا کرنا ضروری ہے، یا روزہ کا وقت نہیں آیا، ابھی رمضان کا ہیڈنہ دور ہے، لیکن وہ جماعت اپنے فرض سے غافل نہیں رہے گی، بلکہ وہ پہلے سے لوگوں کو بتلاتی رہے گی کہ جب رمضان کا ہیڈنہ آئے تو روزہ رکھنا فرض ہوگا، غرضیکہ اس جماعت کا فریضہ دعوت الی الخیر ہوگا۔

پھر اس دعوت الی الخیر کے بھی دو درجے ہیں، پہلا یہ کہ غیر مسلموں کو خیر یعنی اسلام کی طرف دعوت دینا ہی، مسلمانوں کا ہر فرد عموماً اور یہ جماعت خصوصاً دنیا کی تمام قوموں کو خیر یعنی اسلام کی دعوت دے، زبان سے بھی اور عمل سے بھی، چنانچہ مسلمانوں کو جس آیت میں قتال و جہاد کا حکم دیا وہاں سچے مؤمنین کی اس طرح تعریف کی:

الَّذِينَ اِنْ تَمَكَّنْهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا بِالمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۴: ۲۱)، یعنی سچے مسلمان وہ ہیں کہ جب ہم ان کو زمین کی تسکین و قدرت یعنی حکومت دیتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی زمین میں نظم



اطاعت قائم کرتے ہیں جس کا ایک منہاں نماز ہے اور اپنا مالیاتی نظام زکوٰۃ کے اصولوں پر قائم کرتے ہیں، نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مقصد حیات بناتے ہیں، اگر آج امت مسلمہ اپنا مقصد دیگر اقوام کو خیر کی طرف دعوت دینا بنالیں تو وہ سب بیماریاں ختم ہو جائیں گی جو دوسری قوموں کی نقالی سے ہمارے اندر پھیلی ہیں، کیونکہ جب کوئی قوم اس عظیم مقصد (دعوت الی الخیر) پر مجتمع ہو جائے، اور یہ سمجھ لے کہ ہمیں علمی اور عملی حیثیت سے اقوام عالم پر غالب آنا ہے اور اقوام کی تربیت و تہذیب ہمارے ذمہ ہے، تو اس کی نا اتفاقیوں بھی یکسر ختم ہو جائیں گی اور پوری قوم ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے لگ جائے گی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کامیابیوں کا راز اس میں مضمر تھا، حدیث میں ہے کہ حضرت ضحاکؓ نے یہ آیت وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ قَلِيلٌ تِلَاوَت فرمائی اور پھر فرمایا: هُمْ خَاصَّةٌ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (ابن جریر) یعنی یہ جماعت مخصوص صحابہ کرام کی جماعت ہے، کیونکہ ان نفوس قدسیہ کا ہر فرد خود کو دعوت الی الخیر کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دعوت الی الخیر کا دوسرا درجہ خود مسلمانوں کو دعوت خیر دینا ہے، کہ تمام مسلمان علی العموم اور جماعت خاصہ علی الخصوص مسلمانوں کے درمیان تبلیغ کرے، اور فریضہ دعوت الی الخیر انجام دے، پھر اس میں بھی ایک تو دعوت الی الخیر عام ہوگی، یعنی تمام مسلمانوں کو ضروری احکام و اسلامی اخلاق سے واقف کیا جائے، دوسری دعوت الی الخیر خاص ہوگی، یعنی امت مسلمہ میں علوم و شرع و سنت کے ماہرین پیدا کرنا، اس طرف ایک دوسری آیت میں رہنمائی کی گئی۔

قُلْ لَا تَعْلَمُ مِنْ جُحَىٰ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ كَاتِبَتُ لَيْسَ فَمَوْافِي الدِّينِ وَلِيُسْنِي رُؤَا  
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ (۹: ۱۳۲)، آگے اس جماعت داعیہ دوسرا وصف اور امتیاز خصوصی یہ بتلایا یا مَرُودُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی وہ لوگ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی، اور چونکہ یہ امور خیر جانے پہچانے ہوئے ہیں اس لئے معروف کہلاتے ہیں۔

اسی طرح منکر میں تمام وہ برائیاں اور مفسد داخل ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم و معروف ہے، اس مقام پر واجباً اور معاصی کے بجائے معروف و منکر کا عنوان اختیار کرنے میں شاید یہ حکمت بھی ہو



کہ روکنے ٹوکنے کا معاملہ صرف ان مسائل میں ہوگا جو امت میں مشہور و معروف ہیں، اور سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں، اجتہادی مسائل جن میں اصول شرعیہ کے ماتحت رائیں ہو سکتی ہیں، ان میں یہ روک ٹوک کا سلسلہ نہ ہونا چاہئے، افسوس ہے کہ عام طور پر اس حکیمانہ تعلیم سے غفلت برتی جاتی ہے، اور اجتہادی مسائل کو جدال کا میدان بنا کر مسلمانوں کی جماعت کو ٹکرایا جاتا ہے، اور اس کو سبک بڑی نیکی قرار دیا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل متفق علیہ معاصی اور گناہوں سے روکنے کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی ہے آیت کے تحت تمام پر اس جماعت کے انجام اور عاقبت محمودہ کو ان لفظوں میں فرمایا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، یعنی درحقیقت یہ لوگ کامیاب ہیں، فلاح و سعادت دارین انہی کا حصہ ہے۔

اس جماعت کا سب سے پہلا مصداق جماعت صحابہؓ ہے، جو دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عظیم مقصد کو لئے کراٹھی اور قلیل عرصہ میں ساری دنیا پر چھا گئی، روم و ایران کی عظیم سلطنتیں روند ڈالیں، اور دنیا کو اخلاق و پاکیزگی کا درس دیا، نیکی اور تقویٰ کی شمعیں روشن کیں۔

حق تعالیٰ نے امت داعیہ الی الخیر کی ضرورت اور اس کے اوصاف کو بیان کرنے کے بعد مذکورہ صدر دوسری آیت میں مسلمانوں کو باہمی اختلاف اور تفرق و انتشار سے بچانے کی ہدایت فرمائی ہے، ارشاد ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ، یعنی ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد اختلاف کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو، جنہوں نے خدا تعالیٰ کے صاف حکام پہنچنے کے بعد محض ادھام و اہوار کی پیروی کر کے اصول شرع میں متفرق ہو گئے، اور باہمی جنگ و جدال سے عذاب الہی میں مبتلا ہو گئے، یہ آیت درحقیقت آیت وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا کا تتمہ ہے، اسی آیت میں مرکز وحدت اعتصام بحبل اللہ کی طرف دی گئی، اور اشارۃ بتلایا گیا کہ اجتماع اور اتحاد تمام امت اور قوم کو ایک شخص و احد میں تبدیل کر دیتا ہے، پھر دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اسی وحدت و اجتماع کو غذا پہنچائی جاتی ہے، اور نشوونما کیا جاتا ہے، پھر وَلَا تَفَرَّقُوا اور آیت وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا سے اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ تفرق اور اختلاف نے پچھل قوموں کو تباہ کر دیا، ان سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے میں یہ مرض پیدا ہونے نہ دو



آیت میں جس تصرف و اختلاف کی مذمت ہے، اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید کہ "احکام واضح" آنے کے بعد "اس امر پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اصول دین سب واضح ہوتے ہیں، اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی، لیکن جو فروع غیر واضح ہیں کسی نص صریح نہ ہونے کی وجہ سے، یا انصوص کے ظاہری تعارض کی وجہ سے ایسے فروع میں رائے و اجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں اور وہ حدیث صحیح اس کی اجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری و مسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاص سے روایت کی ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں، اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا، لہذا وہ اجتہادی اختلاف جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں ہوا ہے، اس کو اس آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں، بقول حضرت قاسم بن محمد و حضرت عمر بن عبدالعزیز صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے موجب رحمت و رخصت ہے (کذا فی روح المعانی نقلاً عن البیہقی والمدخل)

اجتہادی اختلافات میں کوئی جانب | یہاں سے ایک بہت اہم اصولی بات واضح ہو گئی کہ جو اجتہادی  
منکر نہیں ہوتی اس پر تکبر جائز نہیں | اختلاف شرعی اجتہاد کی تعریف میں داخل ہے، اس میں اپنے  
اپنے اجتہاد سے جس امام نے جو جانب اختیار کر لی اگرچہ عند اللہ اس میں سے صواب اور  
صحیح صرف ایک ہے دوسرا خطا ہے، لیکن یہ صواب و خطا کا فیصلہ صرف حق تعالیٰ کے کرنے  
کا ہے، وہ محشر میں بذریعہ اجتہاد صواب پر پہنچنے والے عالم کو دو ہر ثواب عطا فرما دیں گے اور  
جس کے اجتہاد نے خطا کی ہے اس کو ایک ثواب دیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اجتہادی  
اختلاف میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ یقینی طور پر یہ صحیح ہے دوسرا غلط ہے، ہاں اپنی فہم و بصیرت  
کی حد تک ان دونوں میں جس کو وہ اقرب الی القرآن والسنت سمجھے اس کے متعلق یہ  
کہہ سکتا ہے کہ میرے نزدیک یہ صواب ہے، مگر احتمال خطا کا بھی ہے، اور دوسری جانب  
خطا ہے، مگر احتمال صواب کا بھی ہے، اور یہ وہ بات ہے جو تمام ائمہ فقہاء میں مسلم ہے،  
اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اجتہادی اختلاف میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی کہ امر بالمعروف  
اور نہی عن المنکر کے ماتحت اس پر تکبر کیا جائے، اور جب وہ منکر نہیں تو غیر منکر پر تکبر خود  
امر منکر ہے، اس سے پرہیز لازم ہے، یہ وہ بات ہے جس میں آجکل بہت سے اہل علم بھی



غفلت میں مبتلا ہیں، اپنے مخالف نظریہ رکھنے والوں پر تبرّ اور سب و شتم سے بھی پرہیز نہیں کرتے، جس کا نتیجہ مسلمانوں میں جنگ و جدل اور انتشار و اختلاف کی صورت میں جگہ جگہ مشاہدہ میں آرہا ہے۔

اجتہادی اختلاف بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ تو ہرگز آیت مذکورہ وَلَا تَفَرَّقُوا سے خلاف اور مذموم نہیں، البتہ اس اجتہادی اختلاف کے ساتھ جو معاملہ آجکل کیا جا رہا ہے کہ اسی کی بحث و مباحثہ کو دین کی بنیاد بنالی گئی، اور اسی پر باہمی جنگ و جدل اور سب و شتم تک نوبت پہنچا دی گئی، یہ طرز عمل بلاشبہ وَلَا تَفَرَّقُوا کی کھلی مخالفت اور مذموم اور سنت سلف، صحابہ و تابعین کے بالکل خلاف ہے، اسلاف امت میں کبھی کہیں نہیں سنا گیا کہ اجتہادی اختلاف کی بناء پر اپنے سے مختلف نظریہ رکھنے والوں پر اس طرح نکیر کیا گیا ہو، مثلاً امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نماز جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جائے اس میں بھی مقتدیوں کو سورۃ فاتحہ پڑھنا فرض ہے، اور ظاہر ہے کہ جو اس فرض کو ادا نہیں کرے گا، اس کی نماز ان کے نزدیک نہیں ہوگی، اس کے بالمقابل امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مقتدی کو امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں، اسی لئے حنفیہ نہیں پڑھتے، لیکن پوری امت کی تاریخ میں کسی سے نہیں سنا گیا کہ شافعی مذہب والے حنفیوں کو تارک نماز کہتے ہوں کہ تمہاری نمازیں نہیں ہوتیں، اس لئے تم بے نمازی ہو، یا ان پر اس طرح نکیر کرتے ہوں جیسے منکرات شرعیہ پر کی جاتی ہے۔

امام ابن عبد البرؒ اپنی کتاب جامع العلم میں اس معاملہ کے متعلق سنت سلف کے بارے میں یہ بیان فرماتے ہیں:

عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ قَالَ مَسَا  
بِرَحْ أَهْلُ الْفُتُوَى يُفْتَوُونَ  
فَيُجَلُّ هَذَا وَيُحَرِّمُ هَذَا  
فَلَا يَرَى الْمُحَرِّمُ أَنَّ الْمُجِلَّ  
هَلَكٌ لِتَجْلِيلِهِ وَلَا يَرَى الْمُجِلُّ  
أَنَّ الْمُحَرِّمَ هَلَكٌ لِتَحْرِيمِهِ

(جامع بیان العلم، ص ۱)

یحییٰ بن سعیدؒ فرماتے ہیں کہ ہمیشہ اہل فتویٰ  
فتویٰ دیتے رہے ہیں ایک شخص غیر منصوص  
احکام میں ایک چیز کو اپنے اجتہاد سے حلال  
قرار دیتا ہے، دوسرا حرام کہتا ہے، مگر نہ  
حرام کہنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جس نے حلال  
ہونے کا فتویٰ دیا ہے وہ ہلاک اور گمراہ  
ہو گیا، اور نہ حلال کہنے والا یہ سمجھتا ہے  
کہ حرام کا فتویٰ دینے والا ہلاک اور گمراہ  
ہو گیا۔



تنبیہ ضروری | یہ تمام گفتگو اس اجتہاد میں ہے جو شریعت کے اصول اجتہاد کے ماتحت ہو جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں یا چند آیات درو آیا سے ظہر اور متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ایسے مواقع میں صرف ان لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں، مثلاً قرآن و حدیث کے متعلق تمام علوم و فنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی مکمل واقفیت وغیرہ، تو جو شخص کسی مخصوص مسئلہ میں اپنی رائے چلائے وہ اجتہاد کی اختلاف نہیں۔

اسی طرح شرائط اجتہاد جس شخص میں موجود نہیں اس کے اختلاف کو اجتہاد کی اختلاف نہیں کہا جاسکتا، اس کے قول کا کوئی اثر مسئلہ پر نہیں پڑتا، جیسے آجکل بہت سے بکھے پڑھے لوگوں نے یہ سن لیا ہے کہ اسلام میں اجتہاد بھی ایک اصول ہے، اور ان منصوصات شرعیہ میں رائے زنی کرنے لگے، جس میں کسی امام مجتہد کو بھی بولنے کا حق نہیں، اور یہاں تو شرائط اجتہاد کیا نفس علم دین سے بھی واقفیت نہیں ہوتی، العیاذ باللہ۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ

جس دن کہ سفید ہوں گے بعض منہ اور سیاہ ہوں گے بعض منہ سودہ لوگ کہ سیاہ ہوئے

وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ آيْمَانِكُمْ فَذُقُوا الْعَذَابَ

منہ ان کے، ان سے کہا جائے گا کیا تم کافر ہو گئے ایمان لا کر اب چکھو عذاب

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٩﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ

بدلہ اس کفر کرنے کا اور وہ لوگ کہ سفید ہوئے منہ ان کے

فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٠﴾ ذَلِكَ آيَةُ اللَّهِ

سورحمت میں ہیں اللہ کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یہ حکم ہیں اللہ کے

نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعَالَمِينَ ﴿١١١﴾

ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک ٹھیک اور اللہ ظلم کرنا نہیں چاہتا خلقت پر

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿١١٢﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہے ہر کام کا



## حُصَاة تَفْصِیْر

اس روز (یعنی قیامت کے روز) کہ بعض چہرے سفید (درودشن) ہو جاویں گے، اور بعض چہرے سیاہ (اور تاریک) ہوں گے، سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے ان سے کہا جائیگا کیا تم رہی (لوگ کافر ہوئے تھے، اپنے ایمان لانے کے بعد تو اب) سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (یعنی جنت) میں (داخل) ہوں گے، (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ (جو) اوپر مذکور ہوئیں، اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں اس سے تو مضمون بالا کا صحیح ہونا معلوم ہوا، اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے رہیں جو کچھ کسی کے لئے جزا و سزا تجویز کی ہے، وہ بالکل مناسب اس سے تجویز مذکور کا مناسب ہونا معلوم ہوا، اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے رہیں جب سب ان کی ملک ہے تو ان سب کے ذمہ اطاعت واجب تھی ان سے ان کا ملوک ہونا اور وجوب اطاعت ثابت ہوا، اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جاویں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا)۔

## معارف و مسائل

چہرے کی سفیدی اور چہرے کی سفیدی اور سیاہی کا ذکر قرآن مجید میں بہت سے مقامات میں آیا ہے، مثلاً: **وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَانُوا عَلَى اللَّهِ وَجْهًا مَسْرُورًا** (زمرہ: ۶۰:۳۹) **وَجْهًا يُؤْمِزُ مُسْفِرًا ۖ ضَاكًا مُثَبِّرًا ۚ وَوَجْهًا يُؤْمِزُ عَلَيْهَا غَبَرًا ۖ تَرَاهَا قَتَرًا ۚ وَوَجْهًا يُؤْمِزُ نَاصِرًا ۚ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرًا ۚ** (عبس: ۴۸:۸) ان آیات میں ایک ہی مفہوم سے متعلق متعدد الفاظ ذکر کئے گئے ہیں، یعنی "بیاض" اور "سواد" "غبرہ" "قرۃ" اور "ناصرۃ"۔ جہوں مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نور ایمان کی سفیدی ہے، یعنی مومنین کے چہرے نور ایمان سے روشن اور غایت مسرت سے خنداں اور مسرھاں ہوں گے، اور سیاہی سے مراد کفر کی سیاہی ہے، یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی، اور اوپر سے فسق و فجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ و تاریک کرے گی۔

سیاہ چہرے والے اور سفید | ان لوگوں کی تعبیر میں مفسرین کے متعدد اقوال مذکور ہیں حضرت چہرے والے کون لوگ ہیں | ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہل سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہل بدعت کے سیاہ ہوں گے، حضرت عطاءؓ فرماتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار کے چہرے



سفید ہوں گے اور بنی قریظہ اور بنی نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے (قرطبی)  
 امام ترمذی نے حضرت ابوامامہؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اس سے مراد خوارج  
 ہیں، یعنی سیاہ چہرے خوارج کے ہوں گے، اور سفید چہرے اُن لوگوں کے ہوں گے جن کو وہ  
 قتل کریں گے، فَقَالَ ابْنُ اِمَامَةَ كَلَابُ النَّارِ مَشَرُّ قَتْلَى تَحْتَ اَدِيمِ السَّمَاءِ وَخَيْرُ قَتْلَى مَنْ  
 قَتَلُوْكَ، ثُمَّ قَرَأَ "يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهُ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهُ" ابوامامہؓ سے جب یہ پوچھا گیا کہ آپؐ  
 یہ حدیث حضورؐ سے سنی ہے تو آپؐ نے جواب میں شمار کر کے بتلادیا کہ اگر حضورؐ سے میں نے سنا  
 مرتبہ یہ حدیث سنی ہوئی نہ ہوتی تو میں بیان نہ کرتا (ترمذی)

حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ سیاہ چہرے اہل کتاب کے ان لوگوں کے ہوں گے جو  
 آپؐ کی بعثت سے قبل تو آپؐ کی تصدیق کرتے تھے، لیکن جب آپؐ مبعوث ہوئے تو بجائے  
 آپؐ کی تائید و نصرت کرنے کے اُلٹا کذب کرنی شروع کر دی (تفسیر قرطبی)

مذکورہ اقوال کے علاوہ اور بھی بہت سے اقوال ہیں، لیکن ان سب میں کوئی تعارض  
 نہیں ہے، سب کا حاصل ایک ہی ہے، امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں آیت "يَوْمَ تَبْيَضُّ  
 وُجُوْهُ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهُ" کے متعلق فرمایا کہ مومنین مخلصین کے چہرے سفید ہوں گے، لیکن  
 ان کے علاوہ ان تمام لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے جنہوں نے دین میں تغیر و تبدل کیا  
 ہو، خواہ وہ مرتد اور کافر ہو گئے ہوں، خواہ اپنے دلوں میں نفاق کو چھپائے ہوئے ہوں ان سب  
 کے ساتھ یہی معاملہ کیا جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

چند اہم فوائد | اللہ تعالیٰ نے "يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهُ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهُ" میں بیاض کو سواد پر  
 مقدم کیا، لیکن فَاَمَّا الَّذِيْنَ اَسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ میں سواد کو بیاض پر  
 مقدم کیا، حالانکہ ترتیب کا تقاضا یہ تھا کہ بیاض کو یہاں بھی مقدم رکھا جائے، اس ترتیب کو  
 برعکس کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد تخلیق کی طرف اشارہ کیا ہے،  
 وہ مقصد اپنی مخلوق پر رحمت کرنا ہے، نہ کہ عذاب، اس لئے سب سے قبل اللہ تعالیٰ نے اہل بیاض  
 کو بیان کیا جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ثواب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اہل سواد کو ذکر کیا  
 گیا جو عذاب کے مستحق ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیت کے خاتمہ پر "فَنَحْنُ رَحِيْمٌ" (اللہ  
 اللہ) سے اپنی رحمت عظمیٰ کا بھی اظہار فرمایا تو آیت کے شروع اور اس کے آخر دونوں  
 جگہ اہل رحمت کو بیان کیا، درمیان میں اہل سواد کا، جس میں اپنی رحمت بیکراں کی طرف اشارہ  
 کر دیا کہ بنی نوع انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ ان کو اپنے عذاب کا منظر بنایا جائے بلکہ اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری رحمت کا فائدہ اٹھائیں۔  
 دوسرا فائدہ یہ کہ اہل بیاض کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں



رہیں گے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رحمت سے مراد اس جگہ جنت ہے، یہاں بھی بظاہر جنت کو رحمت سے تعبیر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ آدمی خواہ کتنا ہی عابد اور زاہد کیوں نہ ہو وہ جنت میں محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی جائے گا، کیونکہ عبادت کرنا بھی انسان کا کوئی ذاتی کمال نہیں ہے، بلکہ اس کی قدرت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہے، اس لئے عباد کرنے سے دخول جنت ضروری نہیں ہو جاتا، بلکہ جنت کا داخلہ تو اللہ کی رحمت ہی سے ہوگا (تفسیر کبیر)

تیسرا فائدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ”فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ“ کے بعد ”هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“ فرما کر بتا دیا کہ مؤمنین اللہ کی جس رحمت میں ہوں گے وہ اُن کے لئے عارضی نہیں ہوگی، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہوگی، ان سے یہ نعمت کبھی سلب یا کم نہ کی جائے گی، اس کے بالمقابل اہل سواد کے لئے یہ تصریح نہیں فرمائی کہ وہ اس حال میں ہمیشہ رہیں گے۔

آدمی سزا اپنے ہی | **فَذُوُوا الْعَذَابَ** اب یہاں کُتِبَ لَكُمْ فُتُورٌ میں اشارہ فرما دیا کہ گناہوں کی پانہ ہے | آج کا عذاب ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی کمائی سے جو دنیا میں کرتے رہے ہو، کیونکہ درحقیقت جنت و دوزخ کی نعمتیں اور مصائب درحقیقت ہمارے اعمال ہی کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں، اسی بات پر متنبہ کرنے کے لئے آخر میں یہ بھی فرما دیا: **وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلَمًا لِلْعَالَمِينَ** یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے عذاب ثواب جو کچھ ہے عین انصاف و مقتضائے حکمت و رحمت ہے۔

**كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ**

تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھی گئی عالم میں حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا

**وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَكُمْ مِّنْ أَهْلِ**

اور منع کرتے ہو بُرے کاموں سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے

**الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِّنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمْ**

اہل کتاب تو ان کے لئے بہتر تھا کچھ تو ان میں سے ہیں ایمان پر اور اکثر ان میں

**الْفَاسِقُونَ ۝۱۱۰**

نافرمان ہیں

**رَبِطِ آيَاتِ** | سابقہ آیات میں مسلمانوں کو ایمان پر ثابت قدم رہنے اور امر بالمعروف اور نہی



عن ہنسکر کا خاص اہتمام کرنے کی ہدایت تھی، اس آیت میں اس کی مزید تاکید اس طرح کی گئی ہے کہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو جو حق تعالیٰ نے تمام امتوں سے افضل و اعلیٰ اور خیر الامم قرار دیا ہے اس کی بڑی وجہ ان کی یہی صفات ہیں۔

## حُصْلَۃ تفسیر

(اے امت محمدیہ) تم لوگ (سب اہل مذاہب) اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے (نفع ہدایت پہنچانے کے لئے) ظاہر کی گئی ہے، (اور نفع پہنچانا جو اس امت کے خیر اور افضل ہونے کی وجہ ہے اس کی صورت یہ ہے کہ) تم لوگ (بمقتضائے شریعت زیادہ اہتمام کے ساتھ) نیک کاموں کو بستلاتے ہو اور بُری باتوں سے روکتے ہو اور (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو یعنی ایمان پر قائم رہتے ہو یہاں اللہ پر ایمان میں وہ تمام عقائد و اعمالِ اہل حق ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں) اور اگر اہل کتاب (بھی جو تم سے مخالفت کر رہے ہیں تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ بھی اہل حق کی اسی بہتر جماعت میں داخل ہو جاتے، مگر افسوس کہ وہ سب مسلمان نہ ہوئے بلکہ) ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر داخل اسلام ہو گئے) اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں (کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اور ان کی بہتر امت میں شامل نہیں ہوئے)

## معارف و مسائل

امت محمدیہ کا خیر الامم | قرآن کریم نے امت محمدیہ کو خیر الامم قرار دینے کی وجہ متعدد آیتوں میں بیان فرمائی ہیں اس سلسلہ کی سب سے اہم آیت سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے، وَ کُنَّا لَیْلًا جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَ سَطًا (۱۴۳، ۱۴۲) الیہ، وہیں اس آیت کی تفسیر اور امت محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی بڑی وجہ اس کا اعتدال مزاج ہونا اور پھر ہر شعبہ زندگی میں امت محمدیہ کے اعتدال کی تفصیل بیان ہوئی ہے (معارف القرآن جلد اول، ص ۳۰۹ تا ص ۳۱۶)

اس آیت میں امت محمدیہ کے خیر الامم ہونے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ خلق اللہ کو نفع پہنچانے ہی کے لئے وجود میں آئی ہے، اور اس کا سب سے بڑا نفع یہ ہے کہ خلق اللہ کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی فکر اس کا منصب فرض ہے، اور پچھلی سب امتوں سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تکمیل اس امت کے ذریعہ ہوئی، اگرچہ امر بالمعروف



اور نہی عن المنکر کا فریضہ پچھلی امتوں پر عائد تھا، جس کی تفصیل احادیث صحیحہ میں مذکور ہے، مگر اول تو پچھلی بہت سی امتوں میں جہاد کا حکم نہیں تھا، اس لئے ان کا امر بالمعروف صرف دل اور زبان سے ہو سکتا تھا، امت محمدیہ میں اس کا تیسرا درجہ ہاتھ کی قوت سے امر بالمعروف کا بھی ہے جس میں جہاد کی تمام اقسام بھی داخل ہیں، اور بزور حکومت اسلامی قوانین کی تقیید بھی اس کا جزو ہے، اس کے علاوہ اہم سابقہ میں جس طرح دین کے دوسرے شعائر غفلت عام ہو کر محو ہو گئے تھے، اسی طرح فریضہ امر بالمعروف بھی بالکل متروک ہو گیا تھا، اور اس امت محمدیہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیش گوئی ہے کہ: "اس امت میں تا قیامت ایک ایسی جماعت قائم رہے گی جو فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم رہے گی۔"

دوسری ہستیازی صفت اس امت کی تَوْفِیْقُونِ بِاللّٰہِ بیان فرمائی ہے، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ایمان باللہ تو تمام انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کا مشترک وصف ہے، پھر اس کو وجہ ہستیازی کس بنا پر قرار دیا۔

جواب واضح ہے کہ اصل ایمان تو سب میں مشترک ہے، مگر کمال ایمان کے درجات مختلف ہیں، ان میں امت محمدیہ کو جو درجہ حاصل ہے وہ سابقہ امتوں کے مقابلہ میں خاص ہستیاز رکھتا ہے۔

اور آخر آیت میں جو اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ ان میں سے کچھ مسلمان ہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ ابن سلام وغیرہ۔

لَنْ يَضُرَّكُمْ وَلَا أَذَىٰ وَإِنْ يَقَاتِلْكُمْ يَوْئُوكُمْ

وہ کچھ نہ بھاڑ سکیں گے تمہارا مگر ستانا زبان سے اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ

الَادِّ بَارِقًا ثُمَّ لَا يَنْصُرُونَ ۝۱۱۱

دیں گے پھر ان کی مدد نہ ہوگی۔

رابطہ آیات | پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کی مسلمانوں سے دشمنی اور ان کو دینی ضرر پہنچانے کی تدبیریں کرنا مذکور تھا، اس آیت میں مسلمانوں کے لئے دنیوی ضرر کی تدبیریں کرنے کا ذکر ہے۔

وہ (اہل کتاب) تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، مگر ذرا ہلکی سی اذیت (یعنی زبانی برا بھلا کہہ کر دل دکھانا)

حُلاصۃ تفسیر



اور اگر وہ (اس سے زیادہ کی ہمت کریں اور) تم سے مقابلہ کریں تو تم کو پیٹہ دکھا کر بھاگ جائیں گے پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہو گا کہ) کسی طرف سے ان کی امداد بھی نہ ہوگی۔

## معارف و مسائل

یہ قرآن کی پیشگوئی اس طرح پوری ہوئی کہ اہل کتاب زمانہ نبوت میں کسی موقع پر بھی صحابہ کرامؓ پر جو کہ بقریۃ مقام اس مضمون کے خاص مخاطب ہیں غالب نہ آ سکے، خصوصاً یہود جن کے قبائل خصوصیت سے اس جگہ مذکور ہیں جس میں وہ حصہ صحابہ کرام کے آپس میں تفرقہ ڈالنے کی کارروائی کا بھی ہے، انجام یہ ہوا کہ یہ لوگ ذلیل و خوار ہوئے، بعض پر حبسز یہ لگایا گیا بعض مقتول ہوئے، بعض جلا وطن کئے گئے، آیت آئندہ میں اسی مضمون کا کلمہ ہے:

ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذَّلَّةُ أَيُّنَ مَا تَقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ

ماری گئی اُن پر ذلت جہاں دیکھے جائیں سوائے دستِ آویز

اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءٌ وَبِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ

اللہ کے اور دستِ آویز لوگوں کے اور کمایا انھوں نے غصہ اللہ کا اور لازم کر دی گئی

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ

اُن کے اور پر حاجت مندی یہ اس واسطے کہ وہ انکار کرتے رہے ہیں اللہ کی

اللَّهُ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا

آیتوں سے اور قتل کرتے رہے ہیں پیغمبروں کو ناحق یہ اس واسطے کہ نافرمانی کی

وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾

انھوں نے اور حد سے بھل گئے۔

## خلاصہ تفسیر

چھاپ دی گئی ہے ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جاویں گے مگر ہاں (دو ذریعوں سے وہ اس ذلت سے نجات پا سکتے ہیں) ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے، اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے (اللہ کی طرف کا ذریعہ تو یہ ہے کہ کوئی کتابی غیر مسلم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنے طریق پر ایسا مشغول و مصروف



ہو کہ مسلمانوں سے لڑتا پھرتا نہ ہو، اُس کو جہاد میں قتل نہیں کیا جاتا، اگرچہ اس کی کافرانہ عبادت آخرت میں اس کے کام نہ آئے گی، اسی طرح اللہ کی طرف ذریعہ میں یہ بھی آگیا کہ وہ کتابی نابالغ یا عورت ہو کہ شریعت اسلام کی رو سے ان کو بھی جہاد میں قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور آدمیوں کی طرف کے ذریعہ سے مراد معاہدہ اور صلح ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ ہو جائے کیونکہ شریعت اسلام میں جس شخص سے کوئی معاہدہ صلح کا ہو جائے وہ بھی مامون ہے اس کا قتل جائز نہیں) اور مستحق ہو گئے یہ لوگ (غضب الہی کے، اور جہاد کی گئی ان پر پستی کہ ان کے طبائع میں بھی اولوالعزمی نہ رہی، نیز جزیہ و خراج مسلمانوں کو ادا کر کے رہنا بھی مسکنت اور پستی میں داخل ہے یہ ذلت و غضب) اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے، حکام الہیہ سے، اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو اس طرح سے کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی (ناحق رہتا تھا) اور یہ ذلت و غضب اس وجہ سے بھی ہوا کہ انھوں نے اطاعت نہ کی، اور دائرۃ اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

## معارف مسائل

یہود پر ذلت و غضب کا مطلب | یہ بحث سورۃ بقرہ کی آیت (۶۱) میں تفصیل سے گزر چکی ہے  
موجودہ اسرائیلی حکومت شہادہ جواب | جس میں کوئی استثناء نہیں ہے، آیت آل عمران میں اِلَّا  
يَحْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلُ مِنَ النَّاسِ کے استثناء کی تحقیق وہاں گزر چکی ہے، اس کو  
معارف القرآن جلد اول، صفحہ ۹۷ تا ۱۸۱ میں دیکھ لیا جائے، اتنی بات یہاں مکرر قابل ذکر  
ہے کہ کشاف کی تفسیر کے مطابق استثناء کو متصل تفسیر دے کر معنی آیت کے یہ ہیں کہ یہود  
پر ذلت و خواری لگی ہی رہے گی، مگر صرف دو صورتوں میں وہ اس ذلت سے بچ سکتے ہیں  
ایک اللہ کا عہد مثلاً نابالغ بچہ یا عورت ہونے کی بناء پر بحکم خداوندی وہ قتل وغیرہ سے  
مامون ہیں، دوسرے یَحْبِلُ مِنَ النَّاسِ، یعنی لوگوں سے معاہدہ صلح کی بناء پر ان کی  
ذلت و خواری کا ظہور نہ ہو، اس جگہ الفاظ تفسیر آن یَحْبِلُ مِنَ النَّاسِ ہیں، جو مؤمن و کافر  
سب کو شامل ہیں، اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدہ صلح  
کر کے بے فکر ہو جائیں اور یہ بھی محتمل ہے کہ دوسری غیر مسلم طاقتوں سے معاہدہ صلح  
کر کے محفوظ ہو جائیں، جیسا کہ حکومت اسرائیل کی موجودہ صورت ہے، کہ کسی صاحب  
بصیرت پر مخفی نہیں کہ اسرائیل کی حکومت درحقیقت اہل یورپ کی ایک مشترکہ  
چھاؤنی سے زیادہ نہیں، اس کی جو کچھ قوت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتہ پر ہے



اگر امر کی برطانیہ، روس وغیرہ آج اس پر سے اپنا ہاتھ اٹھالیں تو وہ ایک دن اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا، واللہ اعلم۔

لَيْسَ سَوَاءً مَنْ أَهْلُ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتَمَلَّوْنَ

وہ سب برابر نہیں اہل کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر پڑتے ہیں

آيَاتِ اللَّهِ أَنْعَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ كَيِّدُونَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

آیتیں اللہ کی راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں ایمان لاتے ہیں اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے

وَيَسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٤﴾

اور دوڑتے ہیں نیک کاموں پر اور وہی لوگ نیک بخت ہیں

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوا بِهِ ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١١٥﴾

اور جو کچھ کریں گے وہ لوگ نیک کام اس کی ہرگز ناقدری نہ ہوگی اور اللہ کو خبر ہے پرہیزگاروں کی

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالَّذِينَ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

وہ لوگ جو کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے انکو ان کے مال اور نہ اولاد

مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ط وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

اللہ کے آگے کچھ اور وہی لوگ نہ بنے والے ہیں آگ میں دونوں کی وہ اس آگ میں ہمیشہ رہیں گے

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فَيُّسَا

جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں اس کی مثال جیسے ایک ہوا کہ اس میں ہو

حَرًّا أَصَابَتْ حَرَّتِ قَوْمٍ أَظْلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَاهْلَكَ كَمَا

پالا جالگی کھیتی کو اس قوم کی کہ انھوں نے اپنے حق میں بُرا کیا تھا پھر اس کو نابود کر گئی

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٦﴾

اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

رَبِّطِ آيَاتِ | اور اہل کتاب کے متعلق بیان ہوا تھا کہ ان میں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں، اور

زیادہ کافر ہیں، اسی مضمون کی مزید تفصیل ان آیات میں ہے۔



## خلاصہ تفسیر

یہ (اہل کتاب) سب برابر نہیں (بلکہ) ان (ہی) اہل کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے جو (دین حق پر) قائم ہیں (اور) اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں (اور) اللہ پر اور قیامت والے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں (اور) (دوسروں کو) نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) شکستہ لوگوں میں (شمار کئے جاتے ہیں) اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس (کے ثواب) سے محروم نہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اہل تقویٰ کو خوب جانتے ہیں، (اور یہ لوگ چونکہ اہل تقویٰ ہیں تو حسب وعدہ جزاء کے مستحق ہیں) بیشک جو لوگ کافر ہے ہرگز ان کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور نہ اولاد اللہ تعالیٰ کے (عذاب کے) مقابلہ میں ذرا بھی اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (اور کبھی نجات نہ ہوگی) وہ (کفار) جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیاوی زندگی میں اس کی حالت (برباد و ضائع ہونے میں) اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیسرے سردی (یعنی پالا) ہو (اور) وہ لگ جاوے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے (بددینی سے) اپنا نقصان کر رکھا ہو پس وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کر ڈالے (اسی طرح ان لوگوں کا خرچ کرنا آخرت میں سب ضائع ہے) اور (اس ضائع کرنے میں) اللہ تعالیٰ ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود (کفر کے ارتکاب کے جو کہ مانع قبول ہے) اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے (نہ وہ کفر کرتے نہ ان کے سب نفقات ضائع ہوتے)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا

اے ایمان والو نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کسی

يَا لَوْ نَكُنْكُمْ خَبَا لَا وَدَّ وَأَمَّا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ

نہیں کرتے تمہاری خرابی میں ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف میں رہو نکلی پڑتی ہے دشمنی

مِنَ أَفْوَهِهِمْ وَمَا تَخْفَىٰ صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا

ان کی زبان سے اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے ہم نے بتا دیا

كُفْرًا لَا يَتَّخِذُونَ ۖ هَٰؤُلَاءِ يُجِبُونَ

تم کو پتہ ہے اگر تم کو عقل ہے سن لو تم لوگ ان کے دوست ہو



وَلَا يُجِبُّكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا اتَّعَقَبْتُمْ قَالَُوا

اور وہ تمہارے دوست نہیں اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں

اٰمَنَّا بِكُمْ وَإِذَا أَخْلَوْا عُضُوًا عَلَيْكُمْ إِلَّا نَامِلًا مِّنَ الْغَيْظِ لِقُلِّ

ہم مسلمان ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے تو کہہ

مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۱۲۰﴾

مرو تم اپنے غصہ میں اللہ کو خوب معلوم ہیں دلوں کی باتیں

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُوهُمْ وَإِنْ تَصِيبْكُمْ سَيِّئَةٌ

اگر تم کو ملے کچھ بھلائی تو بُری لگتی ہے ان کو اور اگر تم پر پہنچے کوئی بُرائی تو

يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ

خوش ہوں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو تو کچھ نہ بگڑے گا تمہارا ان کے

شَيْءٌ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۱﴾

کچھ بیشک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے

## حُلاصۃ تفسیر

اے ایمان والو اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو محبت کے برتاؤ میں (صاحب خصوصیت مت بناؤ کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے (اور دل سے بھی) تمہاری مصرت (دنوی و دینی) کی تمنا رکھتے ہیں، (دلوں میں تمہاری طرف سے اس قدر بغض بھرا ہے کہ) واقعی (وہ) بغض (بعض اوقات) ان کے منہ سے (بے اختیار بات چیت میں) ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر اُن کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے (چنانچہ) ہم (ان کی عداوت کے) علامات (اور قرائن) تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان یقینی علامات سے دیکھ لو) ہاں (بجھو) تم ایسے ہو ان لوگوں سے محبت (کا برتاؤ) رکھتے ہو، اور یہ لوگ تم سے اصلاً محبت نہیں رکھتے (نہ دل سے نہ برتاؤ سے) حالانکہ تم تمام (آسانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو اس میں ان کی کتابیں بھی شامل ہیں اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن پر ایمان نہیں رکھتے مگر وہ تو باوجود اس تمہارے ایمان کے بھی تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم باوجود ان کے



اس عدم ایمان کے بھی ان سے محبت رکھتے ہو) اور (تم ان کے ظاہری دعویٰ ایمان سے شبہ مت کرنا کہ وہ بھی تو ہماری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ) یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں (صرف تمھارے دکھانے کو منافقانہ طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب (تم سے) الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں، مارے غیظ (وغضب) کے (یہ کنایہ ہے شدت غضب) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں (مراد یہ کہ اگر تم مر بھی جاؤ گے تب بھی تمھاری مراد پوری نہ ہوگی) بیشک خدا تعالیٰ خوب جانتے ہیں (دلوں کی باتوں کو) اسی لئے ان لوگوں کے دلوں میں جو رنج و غبار اور عداوت تمھاری طرف سے بھری ہیں سب بتلا دی اور ان کا یہ حال ہے کہ) اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (مثلاً تم میں باہم اتفاق ہوا غیروں پر غلبہ ہو جائے) تو ان کے لئے موجب بچ ہوئی ہے، (جس کا سبب اشد وجہ کا حسد ہے) اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس (بڑے) خوش ہوتے ہیں (جس سے ان کی شہادت ثابت ہے) سو ان کے جب یہ حالات ہیں تو وہ اس قابل کب ہیں کہ ان سے دوستی یا دوستی کا برتاؤ کیا جاوے، ان کے مذکورہ حالات سننے کے بعد دلوں میں یہ خیال پیدا ہونا بعید نہیں تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں کو ضرر پہنچانے میں کوئی کسر نہیں رکھیں گے، اس لئے اگلی آیت میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا، اور اگر تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی (تم اس سے بے فکر رہو تو دنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں سزائے دوزخ ہوگی کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر (علی) احاطہ رکھتے ہیں (کوئی عمل ہم سے مخفی نہیں اس لئے وہاں سزائے بچنے کے لئے کسی حیلہ حوالے کی گنجائش نہیں)

## معارف مسائل

شان نزول اس آیت کا یہ ہے کہ مدینہ کے اطراف میں جو یہودی آباد تھے ان کے ساتھ اوس اور خزرج کے لوگوں کی قدیم زمانہ سے دوستی چلی آتی تھی، انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور یہودی ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے، جب اوس اور خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ پُرانے تعلقات نبھاتے رہے اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے



لیکن یہودیوں کو حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے لئے ہوئے دین سے جو عداوت تھی اس کی بناء پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لئے تیار نہ تھے جو اس دعوت کو قبول کر کے مسلمان ہو گیا ہو، انھوں نے انصار کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آ رہے تھے، مگر دل میں اب وہ ان کے دشمن ہو چکے تھے، اور اسی ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کر دیں، اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں، اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اس منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت اہم ضابطہ بیان فرماتے ہیں کہ :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةِ قَوْمٍ دُورِكُمْ، یعنی اے ایمان والو! اپنے (یعنی مسلمانوں کے) علاوہ کسی کو گہرا اور رازدار دوست نہ بناؤ، بِطَانَةِ کے معنی ہیں ولی، دوست، رازدار اور بھیدیں، کپڑے کا باطنی استر جو جسم سے ملا رہے وہ بھی بطانہ کہلاتا ہے، یہ بطن سے مشتق ہے، بطن کا استعمال ہر شے میں ظہر کے خلاف ہوتا ہے، اوپر کی جانب کو ظہر اور اندر کی جانب کو بطن بولتے ہیں، اور کپڑے کے اوپر کے حصہ کو ظہارہ اور اندرونی اور نیچے کے حصہ کو جو جسم سے ملا رہے جیسے استر وغیرہ کو بطانہ کہتے ہیں، جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ اس کا اور ٹھہنا بچھونا ہے، یعنی وہ اس کو نہایت مرغوب و محبوب ہے، اسی طرح بطانۃ الثوب سے بطور استعارہ ولی، دوست اور معتمد جو باطنی امور کا رازدار ہو اس کے لئے بطانۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، عربی لغت کی مشہور معتبر کتاب لسان العرب میں بطانۃ کے معنی اس طرح کئے بطانۃ الرجل صاحب سترہ و داخلۃ امرہ الذی یثاودہ فی احوالہ، یعنی بطانۃ الرجل کسی شخص کے ولی اور رازدار دوست اور اس کے معاملات میں دخیل کو کہا جاتا ہے جس سے وہ اپنے معاملات میں مشورہ لے، اصفہانی نے مقررات القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی یہی معنی بیان کئے ہیں، جس کا حاصل یہ ہوا کہ بطانہ اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کو رازدار، ولی اور دوست سمجھا جائے، اور اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور مشیر بنایا جائے۔

تو اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت والوں کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی ملت و حکومت کے راز کھول دو



اسلام نے اپنی عالمگیر رحمت کے سایہ میں جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی، نفع رسانی اور مروت و رواداری کی غیر معمولی ہدایات فرمائی اور نہ صرف زبانی ہدایات بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معاملات میں اس کو عملی طور پر رواج دیا ہے وہیں عین حکمت کے مطابق مسلمانوں کی اپنی تنظیم اور ان کے مخصوص شعائر کی حفاظت کے لئے یہ احکام بھی صادر فرمائے کہ قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت مسلمان کو نہیں دی جاسکتی کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کے لئے ضرر اور خطرے کھلے ہوئے ہیں اور یہ ایسا صریح، معقول، مناسب اور ضروری انتظام ہے جس سے فرد اور ملت دونوں کی حفاظت ہوتی ہے، جو غیر مسلم اسلامی مملکت کے باشندے ہیں، یا مسلمانوں سے کوئی معاہدہ کئے ہوئے ہیں، ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور انکی حفاظت کے لئے انتہائی تاکیدات اسلامی قانون کا جز ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”جس شخص نے کسی ذمی کو ستایا تو قیامت کے روز اس کی طرف سے میں دعویٰ رہوں گا، اور جس مقدمہ میں میں دعویٰ رہوں گا، تو میں ہی غالب ہوں گا۔“

مَنْ أَذَى ذِمِّيًّا فَإِنَّا خَصَمُهُ وَ  
مَنْ كُنْتُ خَصَمَهُ خَصَمْتُهُ  
يَوْمَ الْقِيَمَةِ  
(عن ابن مسعودؓ)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

”مجھے میرے پروردگار نے منع فرمایا ہے کہ میں کسی معاہدہ یا کسی دوسرے پر ظلم کروں“

مَنْعَنِي رَبِّي أَنْ أَظْلِمَ مُعَاهِدًا  
وَلَا غَيْرَكَ (عن عليؓ)

ایک اور حدیث میں فرمایا:

”تجربہ دار جو کسی غیر مسلم معاہدہ پر ظلم کرے، یا اس کے حق میں کمی کرے یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالے، یا اس سے کوئی چیز بغیر اس کی دلی رضامندی کے حاصل کرے، تو قیامت کے روز میں اس کا وکیل ہوں گا۔“

أَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ  
أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ  
شَيْئًا بَغَيْرِ طَيْبِ نَفْسٍ مِنْهُ فَإِنَّا  
نَجْجِبُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ۔

لیکن ان تمام مراعات کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی جماعت اور ملت کی حفاظت کے لئے یہ ہدایات بھی دی گئیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کو اپنا گہرا دوست اور ازاں معتمد نہ بنایا جائے۔



ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کہتا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے، اگر اس کو آپ اپنا میرمنشی بنالیں تو بہتر ہو، اس پر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

قَدْ اتَّخَذْتُ إِذَا بَطَانَةً مِّنْ  
دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

”یعنی اس کو میں ایسا کروں تو مسلمانوں کو  
چھوڑ کر دوسرے ملت والے کو رازدار بنالوں گا  
جو نص قرآن کے خلاف ہے“

امام مستطیٰ جو پانچویں صدی کے مشہور عالم اور مفسر ہیں بڑی حسرت اور درد کے ساتھ مسلمانوں میں اس تعلیم کی خلاف ورزی اور اس کے نتائج بد کا بیان اس طرح فرماتے ہیں:

وَقَدْ انْقَلَبَتِ الْأَحْوَالُ فِي هَذِهِ  
الْأَسْرَافِ بِاتِّخَاذِ أَهْلِ الْكِتَابِ  
كُتَبًا وَأُمَنَاءَ وَتَسْوِؤِ دَوَابِّ الْإِلَاحِ  
عِنْدَ جَهْلَةِ الْأَغْنِيَاءِ مِنَ الْوُكُلَةِ  
وَالْأُمَرَاءِ

”یعنی اس زمانہ میں حالات میں ایسا انقلاب  
آیا کہ یہود و نصاریٰ کو رازدار و امین بنالیا  
گیا، اور اس ذریعہ سے وہ جاہل اغنیاء  
امراء پر مسلط ہو گئے“

آج بھی کسی ایسی مملکت میں جس کا قیام کسی خاص نظریہ پر ہو وہاں اس نئی روش کے زمانے میں بھی کسی ایسے شخص کو جو اس نظریہ کو قبول نہیں کرتا، مشیر اور معتمد نہیں بنایا جاسکتا۔ روس اور چین میں کسی ایسے شخص کو جو کمیونزم پر ایمان نہیں رکھتا ہو، کسی ذمہ داری پر فائز نہیں کیا جاتا، اور اس کو مملکت کا رازدار اور مشیر نہیں بنایا جاتا، اسلامی مملکتوں کے زوال کی داستانیں پڑھیں تو زوال کے دوسرے اسباب کے ساتھ بکثرت یہ بھی ملیگا کہ مسلمانوں نے اپنے امور کا رازدار و معتمد غیر مسلموں کو بنالیا تھا، سلطنت عثمانیہ کے زوال میں بھی اس کو کافی دخل تھا۔

آیت مذکورہ میں اس حکم کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے لَا يَأْتِيَنَّكُمْ حَتَبًا لَا دِيَّةَ یعنی وہ لوگ تمہیں دہائی و فساد میں مبتلا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے، اور تمہارے دکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بعض تو ان کی زبانوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے دل میں چھپاتے ہوئے ہیں وہ اور بھی بڑھ کر ہے، ہم تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر چکے ہیں، اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھییدی اور مشیر نہ بنائیں، کیونکہ یہود و ہوں یا نصاریٰ، منافقین ہوں یا مشرکین،



کوئی جماعت تمھاری حقیقی خیر خواہ نہیں ہو سکتی، بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کو ہشاش میں لگے رہتے ہیں کہ تمھیں بیوقوف بنا کر نقصان پہنچائیں، اور دینی و دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں، انکی آرزو یہ ہے کہ تم تکلیف میں رہو، اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچے، جو دشمنی یا ضرر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے، لیکن بسا اوقات عداوت غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا بھی ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں، مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی، پس عقلمند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے دشمنوں کو رازدار بنائے، خدا سے تعالیٰ نے دوست و دشمن کے پتے اور موالات کے احکام بتلا دیئے ہیں، جس میں عقل ہوگی اس سے کام لے گا۔

وَذُرْ أَمَّا عِدَّتُمْ، یہ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے، اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی آگئی کہ کوئی غیر مسلم کسی حال میں مسلمانوں کا حقیقی دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا هَا تَنْتَهُمُ اُولَآئِیْہِمْ نَزَّہُمْ الَیْہِ یعنی تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور یہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے، اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو، اور وہ جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کٹاکٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے اُکھڑے ہو جاتے ہو، بیشک اللہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے، یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے رہو اور وہ تمھارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں، اور عجیب بات یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو ملتے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں، اور کسی زمانہ میں کسی پیغمبر نازل ہوئی ہو اس کے برخلاف یہ لوگ تمھاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے، بلکہ اپنی کتابوں پر بھی خود ان کا ایمان صحیح نہیں، اس لحاظ سے چاہئے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور اور بیزار رہتے، مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔

اس کافرانہ ذہنیت کی مزید توضیح یہ ہے کہ اِنْ تَسْتَكْمُرُوْا حَسْبَہُ، یعنی ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اگر تمھیں کوئی اچھی حالت پیش آجائے تو یہ ان لوگوں کو ڈکھ بچاتی ہے، اور اگر تم پر کوئی بُری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔

پھر منافقوں کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد اور مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا آسان اور سہل الاصول نسخہ یہ بیان کیا گیا کہ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُہُمْ شَيْْءًا اِنَّ اللہَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُجِیْطٌ، اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کئے رہو تو



تم کو ان کی چالیں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔

مسلمانوں کی فتح و کامیابی اور تمام مشکلات میں آسانی کا راز صبر اور تقویٰ کی دو صفوں میں مضمر ہے اور پریشانیوں سے محفوظ رہنے کے لئے صبر و تقویٰ کو صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ دوسری آیات میں بھی ایک مؤثر علاج کی حیثیت سے بیان فرمایا، اسی رکوع کے بعد دوسرے رکوع میں ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا وَاصْبِرُوا** (۱۲۵:۳) اس میں امدادِ غیبی کا وعدہ اپنی دو شرطوں یعنی صبر و تقویٰ پر موقوف رکھا گیا ہے، سورۃ یوسف میں فرمایا: **إِنَّهُ مِنْ يَتَّقِي وَيَصْبِرُ** (۹۰:۱۲)، اس میں بھی فلاح و کامیابی صبر و تقویٰ کے ساتھ وابستہ بتلائی گئی ہے، اسی سورۃ کے ختم پر صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جا رہی ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَاصْبِرُوا وَاصْبِرُوا** (۲۰۰:۳) اس میں بھی فلاح و کامیابی کو صبر و تقویٰ پر معلق کیا گیا ہے۔

صبر و تقویٰ مختصر عنوان کے اندر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ، عوامی اور فوجی نظم و نسق کا ایک کامیاب ضابطہ بڑی جامعیت کے ساتھ آگیا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي لَأَعْلَمُ آيَةً لَوْ أَخَذَ النَّاسُ بِهَا كَفَفَتْهُمْ وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں کہ اگر لوگ اس پر عمل اختیار کر لیں تو ان کے دین و دنیا کے لئے وہی کافی ہے اور آیت یہ ہے کہ من يتق الله يجعل له مخرجاً یعنی جو
---	--

الایۃ (۲۱۶۵)۔ (مسواۃ احمد)

شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ نکال دیتے ہیں ۛ

**وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ**

اور جب صبح کو نکلا تو اپنے گھر سے بٹھلانے لگا مسلمانوں کو لڑائی کے

**لِقَائِهِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝۱۲۶** **إِذْ هَمَّتْ طَلِيفَتَانِ**

ٹھکانوں پر اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے جب قصد کیا دو سترقوں نے

**مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا ۚ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ۚ فَلْيَسْتَوِ كِلَا**

تم میں سے کہ نامردی کریں اور اللہ مددگار تمہاراں کا اور اللہ ہی پر چاہئے کہ بھروسہ



الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۶۳﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ

کریں مسلمان اور تمہاری مدد کر چکا ہے اللہ بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور تھے

فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ ﴿۱۶۴﴾

سو ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم احسان مانو۔

**رابط آیات** | گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ اگر مسلمان صبر و تقویٰ پر قائم رہیں تو کوئی طاقت ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی، اور یہ کہ غزوہ احد کے موقع پر جو عسائری شکست اور تکلیف مسلمانوں کو پہنچی، وہ انہی دو چیزوں میں بعض حضرات کی طرف سے کوتاہی کی بناء پر تھی، مذکورہ آیات میں اسی غزوہ احد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، اور غزوہ بدر میں فتنہ کا۔

## خلاصہ تفسیر

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ آپ صبح کے وقت (تایخ قتال سے پہلے) اپنے گھر سے (اس غرض سے) نکلے (کہ مسلمانوں کو (کفار سے) مقابلہ کرنے کے لئے (مناسب) مقامات پر جمانے کے لئے آمادہ کر) رہے تھے (پھر اسی تجویز کے مطابق سب کو ان مقامات پر جما دیا) اور اللہ تعالیٰ (اس وقت کی باتیں) سب سن رہے تھے (اور اس وقت کے حالات) سب جان رہے تھے (اسی کے ساتھ یہ قصہ بھی ہوا کہ) تم (مسلمانوں) میں سے دو جماعتوں نے (کہ وہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ ہیں) دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں (اور ہم بھی عبداللہ ابن ابی منافق کی طرح اپنے گھر جا بیٹھیں) اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا، (بھلا ان کو کب ہمت ہارنے دیتا، چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان کو اس خیال پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا) اور (ہم آئندہ کے لئے ان جماعتوں اور سب کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب تم مسلمان ہو) پس مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہئے (اور ایسی کم ہمتی کبھی نہ کرنا چاہئے) اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو (غزوہ) بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم (محض) بے سروسامان تھے، (کیونکہ مجمع بھی کفار کے مقابلہ میں کم تھا، وہ ایک ہزار تھے، اور مسلمان تین سو تیرہ تھے اور ہتھیار وغیرہ بھی بہت کم تھے) سو (چونکہ یہ منصور ہونا بدولت تقویٰ کے تھا، جس میں استقلال و صبر بھی داخل ہے تو تم پر لازم ہے کہ آئندہ بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) تاکہ تم (اس نعمت نصرت کے) مشکور گزار رہو



کیونکہ شکر گزاری صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پورا مشکر یہ ہے کہ زبان اور قلب بھی مشغول ہو، اور طاعت کی بھی پابندی ہو بالخصوص جبکہ اس طاعت کا اس نعمت میں دخیل ہونا بھی ثابت ہو جائے۔

## معارف و مسائل

**غزوہ اُحد کا پس منظر** | آیت مذکورہ کی تفسیر سے قبل ضروری ہے کہ غزوہ اُحد کے واقعی پس منظر کو سمجھ لیا جائے۔

رمضان المبارک ۳ہ میں بدر کے مقام پر قریشی فوج اور مسلمان مجاہدین میں جنگ ہوئی، جس میں کفار مکہ کے سرنامور اشخاص مارے گئے، اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اس تباہ کن اور ذلت آمیز شکست سے جو حقیقتاً عذاب الہی کی پہلی قسط تھی قریش کا جذبہ انتقام بھڑک اٹھا، جو سردار ماریے گئے تھے ان کے اقارب نے تمام عرب کو غیرت دلائی، اور یہ معاہدہ کیا کہ جب تک ہم اس کا بدلہ مسلمانوں سے نہ لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے، اور اہل مکہ سے اپیل کی کہ ان کا تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے وہ سب اسی ہم پر خرچ کیا جائے، تاکہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں، سب نے منظور کیا، اور ۳ہ میں قریش کے ساتھ بہت سے دوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے نکل پڑے، حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں تاکہ موقع آنے پر مزوں کو غیرت دلا کر پسپائی سے روک سکیں، جس وقت یہ تین ہزار کاشکرا سلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل جبل اُحد کے قریب خیمہ زن ہوا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مشورہ لیا۔ آپ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے، یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی جوہظاہر مسلمانوں میں شامل تھا، اس سے بھی رائے لی گئی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی مگر بعض پر جو شمسلمان جہنیں بدر کی شرکت نصیب ہوئی تھی اور شوق شہادت بے چین کر رہا تھا مصر ہوئے کہ ہم کو باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے، تاکہ دشمن ہمارے بارے میں بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ کرے، کثرت رائے اسی طرف ہو گئی۔

اس عرصہ میں آپ مکان کے اندر تشریف لے گئے، اور ذرہ پہن کر باہر آئے، تو اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہم آپ کو آپ کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر جنگ کرنے پر مجبور کیا، یہ غلط ہوا، اس لئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ کا منشاء نہ ہو تو



یہیں تشریف رکھے، فرمایا: ایک پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے اور ہتھیار لگے پھر بدون قتال کئے ہوئے بدن سے اتارے۔ اس جملہ میں نبی اور غیر نبی کا فرق واضح ہو رہا ہے کہ نبی کی ذات سے کبھی کمزوری کا اظہار نہیں ہو سکتا، اور اس میں امت کے لئے بھی ایک بڑا سبق ہے۔

جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، تقریباً ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ تھے، مگر منافق عبداللہ بن ابی قریظہ بن سوادیموں کو ساتھ لے کر راستہ سے یہ کہتا ہوا واپس ہو گیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا اور دوسروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں، کیوں ہم خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں، اس کے ساتھیوں میں زیادہ تو منافقین ہی تھے، مگر بعض مسلمان بھی ان کے فریب میں آکر ساتھ لگ گئے تھے۔

آخر آپ کھل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لے کر میدان جنگ میں پہنچ گئے، آپ نے بہ نفس نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں، صف آرائی اس طرح کی کہ اُحد کو پشت کی جانب رکھا، اور دوسکر انتظامات اس طرح کئے کہ حضرت معتب بن عمیر کو علم (جھنڈا) عنایت کیا، حضرت زبیر بن عوامؓ کو رسالہ کا افسر مقرر کیا، حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئے، اس لئے پیچھے تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا، اور حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب ٹیلہ پر حفاظت کا کام انجام دیں، لڑنے والوں کی فتح و شکست سے تعلق نہ رکھیں اور اپنی جگہ سے نہ ہٹیں، عبداللہ بن جبیرؓ ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے، قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے بھی ترتیب سے صف آرائی کی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صف آرائی اور فوجی قواعد کے لحاظ جنگی ترتیب غیروں کی نظر میں سے نظم و ضبط کو دیکھ کر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے رہبر کامل، مقدس نبی ہونے کے ساتھ سپہ سالار اعظم کے لحاظ سے بھی بے نظیر ہیں، آپ نے جس انداز میں مورچے قائم کئے اور لڑائی کا نظم قائم کیا، اس وقت کی دنیا اس سے نا آشنا تھی، اور آج جبکہ فن حرب ایک مستقل سائنس کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، وہ بھی آپ کے فوجی قواعد اور نظم و ضبط کو سراہتا ہے، اسی حقیقت کو دیکھ کر ایک مسیحی مورخ بول اٹھا،

”برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا چاہے کہ فن حرب کی بھی نئی راہ نکالی، مکہ والوں کی بے دھڑک اور اندھا



رطائی کے مقابلہ میں خوب دورانِ لشی اور سخت قسم کے نظم و ضبط سے کام لیا۔

یہ الفاظ بیسویں صدی کے ایک مورخ ٹام انڈر کے ہیں جو اس نے لائف آف محمدؐ میں بیان کئے۔  
**جنگ کا آغاز** | اس کے بعد جنگ شروع ہوئی، ابتدائے مسلمانوں کا پتہ بھاری رہا، یہاں تک کہ مقابل کی فوج میں ابتری پھیل گئی، مسلمان سمجھے کہ فتح ہو گئی، مال غنیمت کی طرف متوجہ ہوئے، اُدھر جن تیسرا نڈازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پشت کی جانب حفاظت کے لئے بٹھایا تھا انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن بھاگ نکلا ہے، تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر پہاڑ کے دامن کی طرف آنے لگے، حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تاکیدِ حکم یاد دلا کر روکا، مگر چند آدمیوں کے سوا دوسروں نے کہا کہ حضورؐ کے حکم کی تعمیل تو موقت تھی اب ہمیں سب کے ساتھ مل جانا چاہئے، اس موقع سے خالد بن ولیدؓ جو ابھی تک مسلمان نہ تھے اور اس وقت لشکر کفار کے رسالہ کی کمان کر رہے تھے، بردقت فائدہ اٹھایا، اور پہاڑی کا چکر کاٹ کر عقب کے درہ سے حملہ کر دیا، عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے قلیل ساتھیوں نے اس حملہ کو ہمت و شجاعت سے روکنا چاہا، مگر مدافعت نہ کر سکے، اور یہ سیلاب یکایک مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا، دوسری طرف جو دشمن بھاگ گئے تھے، وہ بھی پلٹ کر حملہ آور ہو گئے اس طرح لڑائی کا پانسہ ایک دم پلٹ گیا، اور مسلمان اس غیر متوقع صورت حال سے اس قدر ہراسیمہ ہوئے کہ ان کا ایک بڑا حصہ پر آگندہ ہو کر میدان سے چلا گیا، تاہم کچھ صحابہؓ ابھی تک میدان میں ڈٹے ہوئے تھے، اتنے میں کہیں سے یہ افواہ اڑ گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، اس خبر نے صحابہؓ کے رہے سہے ہوش و حواس بھی گم کر دیئے اور باقی ماندہ لوگ بھی ہمت ہار کر بیٹھ گئے، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش صرف دس بارہ جاں نثار رہ گئے تھے، اور آپؐ خود بھی زخمی ہو گئے تھے، شکست کی تکمیل میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی، کہ عین وقت پر صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسلامت تشریف رکھتے ہیں، چنانچہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر پھر آپؐ کے گرد جمع ہو گئے، اور آپؐ کو بسلامت پہاڑی کی طرف لے گئے، اس شکست کے بعد مسلمان حدودِ جہ پریشان رہے، اور یہ عارضی شکست چند اسباب کا نتیجہ تھی، قرآن مجید نے ہر سبب پر چھپنے والے الفاظ میں تبصرہ کیا اور آئندہ کے لئے محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔

اس واقعہ کی تفصیل میں کچھ ایسے واقعات ہیں جو اپنے اندر عظیم سبق لئے ہوئے ہیں اور اس میں تمام مسلمانوں کے لئے موعظت و نصیحت کے جواہر پائے جاتی ہیں۔

**اُحد کے واقعہ سے چند سبق** | ① پہلی بات جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ کفار قریش



اس جنگ میں عورتوں کو بھی لائے تھے، تاکہ وہ مردوں کو پسپائی سے روک سکیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ عورتیں ہندہ زوجہ ابی سفیان کی سربراہی میں اشعار گھا کر مردوں کو جوش دلارہی ہیں۔

إِنْ تَقْبَلُوا الْعَاقِبَةَ ۖ وَنَفَرِشُ النَّمَارِقِ  
أَوْ تَدْبُرُوا الْفَارِقَ ۖ فِرَاقٌ غَيْرَ وَاقِعٍ

”مطلب یہ تھا کہ اگر مقابلہ پر ڈٹے رہے اور سچ پائی تو ہم تم کو گلے لگائیں گے، اور تمھارے لئے نرم بستر بچائیں گے، لیکن اگر تم نے پیٹھ موڑی تو ہم تم کو بالکل چھوڑ دیں گے۔“  
خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ الفاظ دعائیہ جاری تھے،  
اللّٰهُمَّ بِكَ اَصُوْلُ وَبِكَ اَقَاتِلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ  
”اے اللہ میں تجھ ہی سے قوت حاصل کرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے حملہ کرتا ہوں“  
اور تیرے ہی دین کے لئے قتال کرتا ہوں، اللہ ہی کافی ہے اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے۔“

اس دعا کا ایک ایک لفظ تعلق مع اللہ کی تاکید اور مسلمانوں کے تمام افعال و اعمال حتیٰ کہ جنگ و قتال کو بھی دیگر اقوام کے جنگ و قتال سے ممتاز کر رہا ہے۔

② دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ اس غزوہ میں بعض صحابہؓ نے بہادری و شجاعت و جاں نثاری اور فدائیت کے وہ نقوش چھوڑے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، حضرت ابو دجانہؓ نے اپنے جسم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بنالیا تھا، کہ ہر آنے والا تیرا اپنے سینہ پر رکھاتے تھے، حضرت طلحہؓ نے بھی اسی طرح اپنے بدن کو چھلنی کرالیا تھا، لیکن حضورؐ کی رفاقت کو نہیں چھوڑا، حضرت انس بن مالکؓ کے چچا حضرت انس بن انصاریؓ جنگ بدر سے غیر حاضر رہے تھے اس لئے ان کو اس کا افسوس تھا، آرزو کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں اگر کوئی موقع ملتا تو اپنے دل کی حسرت پوری کر دیتا۔  
جب کچھ دن کے بعد جنگ اُحد کا واقعہ پیش آیا تو انس بن انصاریؓ شریک ہوئے، مسلمان جب منتشر ہو گئے تھے اور کفار قریش کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا تو یہ اپنی تلوار لے کر آگے بڑھے، اتفاقاً حضرت سعدؓ سے ملاقات ہوئی، سعدؓ بھی منتشر ہونے والوں میں جا رہے تھے، پکار کر کہا: ”سعد! کہاں چلے جا رہے ہو؟ میں تو اُحد کے اس دامن میں جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں“ یہ کہہ کر آگے بڑھے اور شدید قتال کے بعد اپنی جان جہاں افسوس کے سپرد کر دی (ابن کثیر)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان منتشر ہو گئے اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم



کے ساتھ صرف گیارہ حضرات رہ گئے تھے جن میں حضرت طلحہؓ بھی تھے، کفار قریش کا سیلا اُمڈ رہا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کون ان کی خبر لے گا؟ حضرت طلحہؓ بول اٹھے، میں یا رسول اللہ! ایک دوسرے انصاری صحابی نے کہا: ”میں حاضر ہوں“ انصاری کو آپؐ نے جانے کا حکم دیا، وہ قتالی کے بعد شہید ہو گئے، پھر ایک ریلہ آیا، آپؐ نے پھر وہی سوال کیا، حضرت طلحہؓ نے وہی جواب دیا، اور بے تاب ہو رہے تھے کہ حضورؐ حکم دیں تو میں آگے بڑھوں، حضورؐ نے پھر کسی دوسرے انصاری صحابی کو بھیجا، اور حضرت طلحہؓ کی تمنا پوری نہیں ہوئی، اسی طرح سات بار حضورؐ نے کہا، اور ہر مرتبہ حضرت طلحہؓ کو اجازت نہیں دی گئی، اور دوسرے صحابہؓ کو اجازت دی جاتی تھی وہ شہید ہو جاتے تھے۔

جنگ بدر میں باوجود قلت تعداد کے مسلمانوں کو فتح ہوئی، غزوہ احد میں بدر کی بہ نسبت کثرت تھی، پھر بھی شکست ہوئی، اس میں بھی مسلمانوں کے لئے ہجرت ہے، اگر مسلمان کو کبھی کثرت ساز و سامان پر نہیں جانا چاہئے، بلکہ فتح کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھے، اور اسی سے اپنے تعلق کو مضبوط رکھے۔

جنگ یرموک کے موقع پر جب محاذ جنگ حضرت عمرؓ کو مزید فوجی کمک بھیجنے کے لئے لکھا گیا اور قلت تعداد کی شکایت کی گئی تو تحریر فرمایا:

”میرے پاس تمہارا خط آیا جس میں تم نے زیادہ فوجی مدد طلب کی ہے لیکن میں تم کو ایک ایسی ذات کا پتہ دیتا ہوں جو نصرت کے لحاظ سے سب سے زیادہ غالب اور فوج کے لحاظ سے زیادہ محفوظ ہے وہ اللہ رب العالمین کی ذات ہے، لہذا تم اسی سے مدد طلب کرو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بدر میں باوجود قلت عدد کے مدد دی گئی، جب میرا یہ خط تم کو پہنچے تو ان پر ٹوٹ پڑو اور مجھ سے اس سلسلہ میں کوئی مراجعت نہ کرو“

قَدْ جَاءَنِي كِتَابُكُمْ تَسْتَعِينُ وَنَحْنُ  
وَإِنِّي أَدُلُّكُمْ عَلَى مَنْ هُوَ  
أَعَزُّ نَصْلًا وَأَخْصَنُ جُنْدًا  
اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فَاسْتَنْصِرُوا  
فَإِنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَدْ نَصَرَ فِي يَوْمٍ بَدْرٍ  
فِي أَقَلِّ مِنْ عِدِّتِكُمْ فَإِذَا جَاءَكُمْ  
كِتَابِي هَذَا فَقَاتِلُوهُمْ وَلَا  
تَوَاجَعُوا (بحوالہ مسند احمد)

(ابن کثیر)

اس واقعہ کے راوی بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کو یہ خط ملا ہم نے اللہ کا نام لے کر کفار کے لشکر کثیر پر یکبارگی حملہ کیا جس میں ان کو شکست فاش ہوئی، حضرت فاروق اعظمؓ کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کی فتح و شکست، قلت و کثرت پر دائر نہیں ہوتی، بلکہ



اللہ پر توکل اور اس کی مدد پر موقوف ہے، جیسا کہ قرآن کریم نے غزوہ حنین کے بارے میں اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ بیان فرمادیا، ارشاد ہے:

<p>یَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كُنُوزُكُمْ فَلَمْ تَغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا۔ (۲۵:۹۱)</p>	<p>”یعنی غزوہ حنین کو یاد کرو جب کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا، تو یہ کثرت تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی“</p>
--	--

اب آیات کی تفسیر پر غور فرمائیے:

إِذْ خَذَ وَتَ مِنْ أَهْلِكَ الْآيَةُ، یعنی جب کہ آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے چلے، جنگ کے لئے مختلف مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھارہ تھے۔

قرآن مجید کا نقل واقعات میں ایک خاص معجزانہ اسلوب ہے، کہ وہ عام طور پر کوئی واقعہ پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ بیان نہیں کیا کرتا، مگر جن واقعات اور جزئیات میں خاص ہدایات مضمون ہوتی ہیں وہ بیان کی جاتی ہیں، مذکورہ آیت میں جو خاص جزوی امور کی تصریح ہے، مثلاً گھر سے نکلنے کا وقت کیا تھا، اس کو لفظ خَذَ وَتَ سے بیان فرمادیا، اور روایات حدیث سے یہ ثابت ہے کہ یہ صبح ساتویں تا بیچ شوال کی سلسلہ کی تھی۔

اس کے بعد یہ بھی بتلایا کہ اس سفر کی ابتداء کس جگہ سے ہوئی، مِنْ أَهْلِكَ کے لفظ سے اشارہ ہوا کہ آپ اُس وقت اپنے اہل و عیال میں تھے، ان کو وہیں چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے حالانکہ یہ حملہ مدینہ ہی پر ہونے والا تھا، ان جزوی حالات میں یہ ہدایت مضمون ہے کہ جب اللہ کا حکم آجائے تو اس کی تعمیل میں اہل و عیال کی محبت سنگ راہ نہیں ہونی چاہئے، اس کے بعد گھر سے نکل کر محاذ جنگ تک پہنچنے کے جزئی واقعات کو چھوڑ کر محاذ جنگ کا پہلا کام یہ بیان کیا گیا کہ:

كُنُوزُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ، یعنی آپ مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات پر جمارہ تھے۔

پھر اس آیت کو اس طرح ختم کیا گیا کہ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ یعنی اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے، سمیع علیم کی صفات کو یاد دلا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین دونوں جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ رہے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آچکا، اور اس موقع پر مخالفین و موافقین کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شے اس سے مخفی نہیں رہی، اور اسی طرح اس جنگ کا انجام بھی اس سے مخفی نہیں اس کے بعد دوسری آیت ہے إِذْ هَمَّتْ خَالِفَتُنَّ بِكُمْ أَنْ تَفْشَلُوا، یعنی جب



تم میں سے دو جماعتیں اس کا خیال کر بیٹھیں کہ ہمت ہار دیں، درانحالیکہ اللہ دونوں کا مددگار تھا، ان دونوں جماعتوں سے مراد قبیلہ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ ہیں، ان دونوں جماعتوں نے عبداللہ بن ابی کی مثال دیکھ کر اپنے میں کمزوری اور کم ہمتی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور اس دسوسہ کو دسوسہ کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیا اور یہ خیال بھی جو انھیں پیدا ہوا، اپنی قلت تعداد، قلت سامان اور مادی کمزوری کی بناء پر تھا، نہ کہ ضعف ایمان کی بناء پر، معاذی کے مشہور امام مورخ ابن ہشام نے اس کو واضح فرما دیا ہے، اور وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمْ کا جملہ خود ان کے ایمان کا مل کا شہادت ہے، ہاں اس لئے ان دونوں قبیلوں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ: اگرچہ اس آیت میں ہم پر کچھ عتاب بھی ہے، لیکن وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمْ کی بشارت بھی ہمارے لئے آئی ہے۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا کہ ”مسلمانوں کو اللہ پر اعتماد رکھنا چاہئے“ اس میں واضح کر دیا کہ کثرت عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے، بلکہ بقدر استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر ہونا چاہئے بنو حارثہ اور بنو سلمہ کو کمزوری اور کم ہمتی کا جو دسوسہ پیدا ہوا تھا وہ اسی مادی ضعف کی بناء پر تھا اس لئے ان کے دسوسہ کا علاج توکل سے بتلایا گیا کہ توکل و اعتماد ان دسوسہ کے لئے نسخہ اکیر ہے۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ہے، محققین صوفیاء نے اس کی حقیقت پر مفصل بحثیں کی ہیں، یہاں اس قدر سمجھتے کہ توکل کے معنی یہ نہیں کہ تمام اسباب ظاہری بالکل قطع تعلق کر کے اللہ پر اعتماد کیا جائے، بلکہ توکل یہ ہو کہ تمام اسباب ظاہری کو اپنی قدرت کے مطابق جمع کرے اور خستیار کرے، اور پھر نتائج اللہ کے سپرد کرے، اور ان ظاہری اسباب پر فخر و ناز نہ کرے، بلکہ اعتماد صرف اللہ پر رہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے، خود اسی جہاد میں مسلمانوں کے لشکر کو جنگ کے لئے منظم کرنا، اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامان حرب فراہم کرنا، محاذ جنگ پر پہنچ کر مناسب حال و مقام نقشہ جنگ تیار کرنا، مختلف مورچے بنا کر صحابہ کرام کو ان پر بٹھانا وغیرہ یہ سب مادی انتظامات ہی تو تھے جن کو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دست مبارک سے استعمال فرما کر بتلادیا کہ مادی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں، ان سے قطع نظر کرنے کا نام توکل نہیں، یہاں مؤمن اور غیر مؤمن میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مؤمن سب سامان اور مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھی بھروسہ و توکل صرف



اللہ پر کرتا ہے، غیر مومن کو یہ ردِ ممانیت نصیب نہیں، اس کو صرف اپنی مادی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے، اور اسی فرق کا ظہور تمام اسلامی غزوات میں ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔

اب اس کے بعد اس غزوہ کی طرف ذہن کو منتقل کیا جا رہا ہے، جس میں مسلمانوں نے کامل توکل کا مظاہرہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی و نصرت سے سرفراز کیا تھا، ارشاد ہر وَلَقَدْ لَصَرَ صَرَّ اللَّهُ بِبَنِي إِسْرَءِيلَ أَنْ يَدْرُسُوا الْعِبْرَةَ لِمَا أَفْعَلْنَا لَهُمْ بِمُوسَىٰ وَهَارُونَ إِذْ لَمْ يَخْلُصُوا إِلَيْنَا فَوَلَّيْنَا الْفِرْعَوْنَ وَهُوَ بِآيَاتِنَا إِنَّهُ كَفُورٌ۔  
 نے بدر میں تمہاری امداد فرمائی، جبکہ تم تعداد میں بھی صرف تین سو تیرہ تھے، اور وہ بھی سب کلمہ سامان۔  
 بدر کی اہمیت اور | بدر مدینہ کے جنوب مغرب میں کوئی آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک پڑاؤ اور منڈی اس کا محل وقوع کا نام ہے۔

اُس وقت اُس کو اس لئے اہمیت حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی، اور یہ عرب کے ریگستانی میدانوں میں بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان یہیں سبک پہ سلا معرکہ بروز جمعہ ۱۲، رمضان المبارک ۱۲۲ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۲۲ھ کو پیش آیا تھا، یہ غزوہ بنظاہر تو ایک مقامی جنگ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا، اسی لئے قرآن کی زبان میں اس کو یوم البقران کہا گیا ہے، فرنگی مورخوں نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے۔

امریکی پروفیسر ہنری اپنی کتاب ہسٹری آف دی عربین میں لکھتا ہے:

”یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی۔“

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ۔ یعنی تم اس وقت تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر تھے، مسلمان تعداد میں قوی روایات کے مطابق ۳۱۳ تھے، اس فوج کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے، اور اونٹ ستر کی تعداد میں تھے، انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔  
 آخر کی آیت میں فرمایا گیا فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ یعنی اللہ سے ڈرتے ہو تاکہ تم شکر گزار رہو۔

قرآن نے جگہ جگہ منافقین کے کید اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج بد سے محفوظ رہنے کے لئے تقویٰ اور صبر کو علاج بتلایا ہے، انہی دو چیزوں کے اندر ساری تنظیمی جدوجہد اور فتح مبین کا راز مضمر ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اور یہاں صبر و تقویٰ کے بجائے صرف تقویٰ پر اکتفا کیا گیا ہے، کیونکہ درحقیقت تقویٰ ایسی صفت جامع ہے کہ صبر بھی اس میں شامل ہے۔



إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ

جب تو کہنے لگا مسلمانوں کو کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہاری مدد کو بھیجے رب تمہارا تین

الْآفِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنَزَّلِينَ ﴿۱۲۷﴾ بَلَىٰ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا

ہزار فرشتے آسمان سے اتارنے والے البتہ اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو

وَيَأْتُوكُمْ مِنَ فَوْرِهِمْ هَذَا يُمِدُّكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ

اور وہ آئیں تم پر اس دم تو مدد بھیجے تمہارا رب

الْآفِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿۱۲۸﴾ وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا

ہزار فرشتے نشان دار گھوڑوں پر اور یہ تو اللہ نے تمہارے دل کی

بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا

خوشی کی اور تاکہ تسکین ہو تمہارے دلوں کو اس سے اور مدد ہے صرف

مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿۱۲۹﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ

اللہ ہی کی طرف سے جو کہ زبردست ہے حکمت والا تاکہ ہلاک کرے بعضے

كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ ﴿۱۳۰﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ

کافروں کو یا ان کو ذلیل کرے تو پھر عادیں محروم ہو کر تیرا اختیار کچھ نہیں

الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ

یا ان کو توبہ دیوے خدا سے تعالیٰ یا ان کو عذاب کرے کہ وہ

ظَالِمُونَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ

ناحق برہین اور اللہ ہی کا مال ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے بخش دے

لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۳۲﴾

جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔

رَبِّطِ آيَاتِ | سابقہ آیات میں بعض قصہ اُحد غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امداد

غیبی ہونے کا ذکر تھا، آگے اس امداد کی کچھ تفصیل اور فرشتوں کے بھیجنے

کی حکمت کا بیان ہے ۔



## حُلاصۂ تفسیر

اِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ (اے ایمان والو!) فَيَقْبَلُوا خَائِبِينَ (وغزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی یہ امداد اس وقت ہوئی تھی) جبکہ آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں سے یوں فرماتے تھے کہ کیا تم کو (تقویت قلب کیلئے) یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ (جو اسی کام کے لئے آسمان سے) امانے جاویں گے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجے کے فرشتے ہوں گے، ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا (روح) پھر اوپر کے استفہام کا خود جواب اس طرح ارشاد فرمایا) ہاں! کیوں نہیں، (کافی ہوگا، اس کے بعد اس امداد میں مزید زیادتی کا وعدہ اس طرح فرمایا کہ مقابلہ کے وقت) اگر مستقیل رہو گے اور تقویٰ پر قائم رہو گے (یعنی کوئی امر خلاف احکام نہ کرو گے) اور وہ لوگ تم پر یکبارگی حملہ کر دیں گے (جس میں عادیہ کسی مخلوق سے مدد پہنچنا مشکل ہوتا ہے) تو تمہارا رب تمہاری امداد سوائے گنا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع کے بنائے ہوں گے (جیسے عام جنگوں میں اپنی اپنی فوج کی پہچان کے لئے کوئی خاص وردی ہوتی ہے، آگے اس امداد و نصرت کی حکمت کا بیان ہے کہ اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد (مذکور فرشتوں سے ہوئی) محض اس لئے کی کہ تمہارے لئے (غلبہ اور فتح کی) بشارت ہو، اور تمہارے دلوں کو اس سے قرار آئے اور نصرت (و غلبہ) تو صرف اللہ کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں (کہ ویسے بھی غالب کر سکتے ہیں لیکن) حکیم (بھی) ہیں (تو جب مقتضائی حکمت یہ ہوتا ہے کہ اسباب کے ذریعہ غلبہ دیا جاتے تو ویسے ہی اسباب پیدا فرمادیتے ہیں یہ تو امداد بالملائکہ کی حکمت تھی آگے اس کی حکمت کا بیان ہے کہ یہ فتح و غلبہ تمہیں کیوں عطا کیا گیا، اس کے لئے ارشاد فرمایا گیا) تاکہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے (چنانچہ کافروں کے ستر سردار رہیں مارے گئے) یا ان (میں سے بعض) کو ذلیل و خوار کر دے پھر وہ ناکام ٹوٹ جاویں (یعنی ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو جائے اور اگر دونوں ہو جاویں تو اور بھی بہتر ہے، چنانچہ دونوں باتیں ہوئیں کہ ستر سردار مارے گئے، ستر قید ہو کر ذلیل ہوئے، باقی ذلیل و خوار ہو کر بھاگ گئے)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (اے نبی!) عَفْوَ سَاءَ حِيلُهُ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو کسی کے مسلمان ہونے یا کافر رہنے کے متعلق خود کوئی دخل نہیں (خواہ علم کا دخل ہو یا قدرت کا بلکہ یہ سب خدا تعالیٰ کے علم اور قبضہ میں ہے آپ کو صبر کرنا چاہئے)



یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو رحمت سے (متوجہ ہو جاوے) یعنی ان کو اسلام کی توفیق دیدے، تو اس وقت صبرِ صریح اور سرور سے بدل جائے گا، اور یا ان کو دنیا ہی میں (کوئی سزا دیں) تو اس وقت صبرِ تسکین قلبی میں بدل جائے گا، اور سزا دینا کچھ بجا بھی نہیں، کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں (مراد اس سے کفر و شرک ہے، جیسا کہ فرمایا اِنَّ الشِّرْكَ نَظْمٌ عَظِيْمٌ گے اس مضمون کی تاکید ہے) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے وہ جس کو چاہیں بخش دیں (یعنی اسلام نصیب کر دیں جس سے مغفرت ہوتی ہے) اور جس کو چاہیں عذاب دیں (یعنی اسلام نصیب نہ ہو اور اس وجہ سے عذاب دائمی ہو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے (اور) بڑے رحمت کرنے والے ہیں (تو بخشنے کا تو ذرا بھی تعجب نہیں، کیونکہ رحمت تو ان کی سابق ہی ہے، اس لئے عذاب دینے کی وجہ اور بیان فرمائی، فَاَنُفِثُ ظَالِمُوْنَ)۔

## معارف و مسائل

فرشتوں کی امداد بھیجنے کی حکمت اور اصل مقصد | یہاں طبعی طور پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور تعدادِ ملائکہ میں مختلف عدد بیان کرنا کی حکمت  
نے اپنے فرشتوں کو وہ طاقت بخشی ہے کہ ایک ہی فرشتہ پوری بستی کا تحفہ اُلٹ سکتا ہے، جیسا کہ قومِ نوح کی زمین تنہا جبریل امین نے اُلٹ دی تھی، تو پھر فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔

نیز یہ کہ جب فرشتے میدان میں آئے ہی تھے تو ایک کا فر بھی بچنا نہیں چاہئے تھا اس کا جواب خود قرآن کریم نے آیت وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلُكَ میں دیدیا ہے، کہ فرشتوں کے بھیجنے میں درحقیقت ان سے کوئی میدانِ جنگ فتح کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ مجاہدینِ مسلمین کی تسلی اور تقویتِ قلب اور بشارتِ فتح دینا مقصود تھا، جیسا کہ اس آیت کے الفاظ اِلَّا بَشَرًا اور لِنُظَمِّیْنَ کُلُوْا بِکُمْ سے واضح ہے، اور اس سے زیادہ صریح سورۃ انفال میں اسی واقعہ کے متعلق آئے ہوئے الفاظ میں فَخَبَّرُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۲۸) جس میں فرشتوں کو خطاب کر کے ان کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو جمانے رکھیں، پریشان نہ ہونے دیں، اس تثبیتِ قلوب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اپنے تصرف کے ذریعہ ان کے قلوب کو مضبوط کر دیں جیسا کہ مشائخِ صوفیہ اہل تصرف کا معمول ہے۔

اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے یہ واضح کر دیں کہ اللہ کے



فرشتے ان کی مدد پر کھڑے ہیں، کبھی سامنے ظاہر ہو کر کبھی آواز سے، کبھی کسی اور طریق سے، جیسا کہ میدان بدر میں یہ سب طریقے استعمال کئے گئے، آیت فَاَضْرِبُوا قُوَّةَ الْأَعْثَانِ (۱۲:۸) کی ایک تفسیر میں یہ خطاب فرشتوں کو ہے، اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ مسلمان نے کسی مشرک پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس کا سر خود ہی بدن سے جدا ہو گیا، (کنز الدین عن سہیل بن حنیف بروایۃ الحاکم و تصحیح البیہقی) اور بعض صحابہ کرامؓ نے جبریل امین کی آواز بھی سنی کہ اَقْدِمْ حِیْزِیْہُمْ فَرَارِہِمْ ہیں، اور بعض نے خود بھی بعض ملائکہ کو دیکھا بھی (رواہ مسلم) یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، کہ ملائکہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دلانے کے لئے کچھ کچھ کام ایسے بگائے ہیں کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں اور دراصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویت قلب تھا، فرشتوں کے ذریعہ میدان جنگ فتح کرنا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں جنگ و جہاد کے فرائض انسانوں پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کر لے جائیں تو دنیا میں کفر و کافروں کا نام ہی نہ رہتا، حکومت و سلطنت کی تو کیا گنجائش تھی، مگر اس کا رخاۃ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں، یہاں تو کفر و ایمان اور طاعت و معصیت ملے جلے ہی چلتے رہیں گے، ان کے نکھار کے لئے حشر کا دن ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ غزوہ بدر میں ملائکہ اللہ کو مدد کے لئے بھیجنے میں جو وعدے آئے ہیں ان میں سورۃ انفال کی آیت میں تو ایک ہزار کا وعدہ ہے، اور آل عمران کی مذکورہ آیت میں پہلے تین ہزار کا پھر پانچ ہزار کا وعدہ ہے اس میں کیا حکمت ہے، بات یہ ہے کہ سورۃ انفال میں مذکور یہ ہے کہ جب میدان بدر میں مسلمانوں نے مخالف کی تعداد ایک ہزار دیکھی، اور ان کی تعداد میں سوتیرہ تھی تو بارگاہ رب العزت میں استغاثہ کیا، اس پر یہ وعدہ ایک ہزار فرشتوں کی امداد کا کیا گیا، کہ جو عدد تمھارے دشمن کا ہے اتنا ہی عدد فرشتوں کا بھیج دیا جائے گا آیت کے الفاظ یہ ہیں: اِذَا تَسْتَفِیْضُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجِبْ لَکُمْ اِنِّیْ مُمِیْدٌ کُمْ بِالْأَمْرِ مِنَ الْمَلَائِکَۃِ مُزِدِّ فِیْہِ (۹:۸) اور اس آیت کے بعد بھی فرشتوں کی مدد بھیجنے کا یہی مقصد ظاہر فرما دیا کہ مسلمانوں کے قلوب جھے رہیں اور ان کو فتح کی بشارت ملے، چنانچہ اس کے بعد کی آیت کے الفاظ ہیں: وَمَا جَعَلْہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشْرٰی وَ لَیَطْمِئِنَّ بِہِ قُلُوْبُکُمْ۔ اور سورۃ آل عمران کی آیت زیر نظر میں عین ہزار فرشتوں کا وعدہ شاید اس بنا پر کیا گیا کہ بدر کے میدان میں مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر بخاری اپنے قبیلہ کا لشکر لے کر



مشرکین تک کی امداد کو آرہا ہے (کذا فی الروح) یہاں دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ پہلے ہی سے تھی، مسلمان اس خبر سے کچھ پریشان ہوئے تو تین ہزار فرشتوں کا وعدہ کیا گیا تا کہ معاملہ برعکس ہو کر مسلمانوں کی تعداد دشمن سے تین گنا ہو جائے گی۔ پھر اسی آیت کے آخر میں اس تعداد کو چند شرطوں کے ساتھ بڑھا کر پانچ ہزار کر دیا وہ شرطیں دو تھیں، ایک یہ کہ مسلمان صبر و تقویٰ کے مقام اعلیٰ پر قائم رہیں، دوسرے یہ کہ دشمن ان پر یکبارگی حملہ کرے، مگر ان دو شرطوں میں سے دوسری شرط یکبارگی حملہ کی واقع نہیں ہوئی، اس لئے پانچ ہزار کی تعداد کا وعدہ نہ رہا، پھر اس میں ائمہ تفسیر و تائید کے اقوال مختلف ہیں، کہ اگرچہ وعدہ کی یہ شرط مستحق نہیں ہوئی پھر بھی یہ وعدہ پانچ ہزار کی صورت میں پورا ہوا یا صرف تین ہزار کی صورت میں، یہ اقوال مختلفہ روح المعانی میں مذکور ہیں۔

آیت قِیسَ لَکَ مِنَ الْکُفْرِ مِثْلَ مِثْلٍ۔ یہاں سے پھر اصل قصہ اُحد کی طرف عود ہے

درمیان میں مجملہ قصہ بدر کا ذکر آ گیا تھا، اور سبب نزول اس آیت کا یہ ہے کہ اس غزوہ اُحد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک جو کہ سامنے کے دواؤ پر کے دو نیچے کے دانتوں کی کروٹوں میں چار دانت ہوتے ہیں دواؤ پر دابنے بائیں دو نیچے داہنے بائیں، ان چاروں میں نیچے داہنی طرف کا دانت شہید ہو گیا، اور چہرہ مبارک مجروح ہو گیا تو آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات آ گئے، کہ ایسی قوم کو کیسے فلاح ہوگی جنہوں نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا کیا، حالانکہ وہ نبی ان کو خدا کی طرف بلارہا ہے، اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاری سے ایک قصہ اور بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے بعض کفار کے لئے بدعا

بھی سنرائی تھی، اس پر یہ آیت نازل فرمائی، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تحمل کی تعلیم دی گئی ہے (از بیان لہشران ملخصاً)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً

اے ایمان والو! مت کھاؤ سود دینے پر دونا

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۴﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي

اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو اور بچو اس آگ سے



## أَعَدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝

جو تیار ہوئی کافروں کے واسطے۔

### خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! سود مت کھاؤ (یعنی مت لواصل سے) کئی حصے زائد کر کے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو (یعنی جنت نصیب ہو) اور دوزخ سے نجات ہو) اور اس آگ سے بچو جو (دراصل) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (اور آگ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ سود وغیرہ حرام کاموں سے بچو)۔

### معارف و مسائل

اس آیت میں سود کھانے کی حرمت و ممانعت کے ساتھ اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کا ذکر حرمت کی قید نہیں بلکہ سود کی قباحت کو واضح کرنے کے لئے ہے، کیونکہ دوسری آیات میں مطلقاً ربو کی حرمت کا بیان نہایت تشدید و تاکید کے ساتھ آیا ہے جس کی تفصیل سورہ بقرہ میں آچکی ہے، اور اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً کے ذکر میں اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس کو سود کھانے کی عادت ہو جائے تو خواہ وہ اصطلاحی سود مرکب یعنی سود در سود کے معاملہ سے پرہیز بھی کر لے تو سود سے حاصل شدہ کمائی کو جب دوبارہ سود پر چلائے گا تو وہ لامحالہ اضعاف مضاعف ہوتا چلا جائے گا، اگرچہ سود خوردوں کی اصطلاح میں اس کو سود مرکب یعنی سود در سود نہ کہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر ایک سود انجام کار اضعاف مضاعف ہی ہوتا ہے۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

اور حکم مانو اللہ کا اور رسول کا تاکہ تم پر رحم ہو اور

سَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

دوڑو بخشش کی طرف اپنے رب کی اور جنت کی طرف جس کا عرض ہے

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَعَدَّتْ لِلشَّقِيقِينَ ۝

آسمان اور زمین تیار ہوئی واسطے پرہیزگاروں کے۔



## خلاصہ تفسیر

اور خوشی سے کہا ما نواللہ کا اور (اس کے) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے (یعنی قیامت میں) اور دوڑو طرف مغفرت کے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے (نصیب) ہو اور (دوڑو) طرف جنت کے (مطلب یہ ہے کہ ایسے نیک کام اختیار کرو جس سے پروردگار تمھاری مغفرت کر دیں اور تم کو جنت عنایت ہو اور وہ جنت ایسی ہے) جس کی وسعت ایسی (تو) ہے (ہی) جیسے سب آسمان اور زمین (اور زیادہ کی نفی نہیں چنانچہ واقع میں زائد ہونا ثابت ہے اور) وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔

## معارف مسائل

آیت مذکورہ میں دو مسئلے زیادہ اہم ہیں، اول پہلی آیت کا مضمون جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر رسول کی اطاعت بعینہ اللہ تعالیٰ کی اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب قرآن کی اطاعت کا نام ہے تو پھر اس کے علاوہ بیان کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اور اگر ان دونوں میں کچھ فرق ہے تو کیا ہے؟

دوسری بات جو ہمیشہ یاد رکھنے اور اپنی علی زندگی کا قبلہ بنانے کے قابل ہے وہ وہ صفات اور علامات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقبول اور پرہیزگار بندوں کے لئے ان آیات میں بتلا کر یہ واضح فرما دیا ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت محض زبانی جمع خرچ سے نہیں ہوتی بلکہ اطاعت گزاروں کے کچھ صفات اور حالات ہوتے ہیں جن سے وہ پہچانے جاتے ہیں۔

پہلا مسئلہ: پہلی مختصر آیت میں اس طرح بیان فرمایا: **رَسُولَ اللَّهِ تَعَالَىٰ** سے الگ کر کے بیان کریں حکمت **وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ** یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے: اس میں رحمت خداوندی کے لئے جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو بھی اسی طرح لازم اور ضروری قرار دیا ہے، اور یہ پھر صرف اسی آیت میں نہیں پورے قرآن میں بار بار اس کا تکرار اسی طرح ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم ہوتا ہے وہیں اطاعت رسول کا بھی ذکر مستقلاً ہے، قرآن حکیم کے یہ متواتر اور مسلسل ارشادات ایک



انسان کو اسلام اور ایمان کے بنیادی اصول کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ ایمان کا پہلا جزہ خدائے تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی بندگی اور اس کی اطاعت کا اصرار کرنا ہے، تو دوسرا جزہ ”رسول“ کی تصدیق اور اس کی اطاعت ہے۔

اب یہاں غور طلب یہ ہے کہ قرآن کریم ہی کے ارشادات سے یہ بھی ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب یا ذن خداوندی ہوتا ہے، اپنی طرف سے کچھ نہیں ہوتا، قرآن کریم کا ارشاد ہے ”وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ“ (۴۱: ۵۳) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بولتے ہیں وہ کسی اپنی خواہش سے نہیں کہتے، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”وحی“ ہوتی ہے، اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ ”رسول“ کی اطاعت بعینہ خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہوتی ہے، اس سے الگ کوئی چیز نہیں، سورۃ نساء آیت ۸۰ میں خود قرآن نے بھی ان الفاظ میں اس کو واضح فرما دیا،

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ

”یعنی جس نے اطاعت کی رسول کی اس نے اطاعت کی اللہ کی“

تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان دونوں اطاعتوں کو الگ الگ بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے؟ خصوصاً اس التزام اور اہتمام کے ساتھ کہ پورے قرآن کریم میں یہی عادت مستمر ہے کہ دونوں اطاعتوں کا ساتھ ساتھ حکم دیا جاتا ہے۔

راز اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لئے ایک کتاب بھیجی، اور ایک رسول، رسول کے ذمہ یہ کام لگائے گئے، اول یہ کہ وہ قرآن کریم کی آیات ٹھیک اسی صورت اور لب لہجہ کے ساتھ لوگوں کو پہنچا دیں جس صورت سے وہ نازل ہوئیں۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو ظاہری اور باطنی گندگیوں سے پاک کریں۔

تیسرے یہ کہ وہ اس کتاب کے مضامین کی امت کو تعلیم دیں، اور اس کے مقاصد کو بیان فرمائیں، نیز یہ کہ وہ کتاب کے ساتھ حکمت کی تعلیم دیں، یہ مضمون قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں تقریباً ایک ہی عنوان سے آیا ہے، يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَزُكِّرْتِهٖمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق (۲: ۱۲۹)

معلوم ہوا کہ رسول کے فرائض منصبی میں صرف اتنا ہی داخل نہیں کہ وہ قرآن لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اس کی تعلیم اور تبیین بھی رسول کے ذمہ ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عرب کے فصحاء و بلغاء تھے، ان کے لئے قرآن کریم کی تعلیم کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ محض الفاظ قرآنی کے لغوی معنی ان کو سمجھائے جائیں، کیونکہ وہ سب



خود بخود ان کو بخوبی سمجھتے تھے، بلکہ اس تعلیم و تہذیب کا مقصد صرف یہی تھا اور یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کریم نے ایک حکم مجمل یا مبہم الفاظ میں بیان فرمایا، اس کی تشریح اور تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وحی کے ذریعہ سے لوگوں تک پہنچائی جو قرآن کے الفاظ میں نہیں آئی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک میں ڈالی جس کی طرف آیت قرآن **إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ** میں اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً قرآن نے بے شمار مواقع میں صرت **أَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ** فرمائی پر اکتفا کیا ہے، کہیں نماز کے معاملہ میں قیام، رکوع اور سجدہ کا ذکر بھی آیا تو وہ بھی بالکل مبہم ہے ان کی کیفیات کا ذکر نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل امینؑ نے خود آ کر اللہ کے حکم سے ان تمام اعمال اور ارکان کی تفصیلی صورت عمل کر کے بتلائی، اور آپ نے اسی طرح قول و عمل کے ذریعہ امت کو پہنچا دیا۔

زکوٰۃ کے مختلف نصاب اور ہر نصاب پر زکوٰۃ کی معتدرا کا تعین، پھر یہ بات کہ کس مال پر زکوٰۃ ہے اور کس مال پر نہیں، اور مقدار ہر نصاب میں کتنا حصہ معاف ہے، یہ سب تفصیلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائیں، اور ان کے فرامین لکھوا کر متعدد صحابہ کرامؓ کے سپرد فرمائے۔

یا مثلاً قرآن حکیم نے حکم دیا کہ،

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ

بِالْبَاطِلِ (۱۸۸:۲)

تین آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ پر ناحق نہ کھاؤ۔

اب اس کی یہ تفصیل کہ رائج الوقت معاملات، بیع و شراء اور اجارہ میں کیا کیا صورتیں ناحق اور بے انصافی یا ضرر عوام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے باطل ہیں، یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باذن خداوندی امت کو بتلائی، اسی طرح تمام شرعی احکام کا بھی یہی حال ہے۔ تو یہ تمام تفصیلات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے بہ وحی الہی امت کو پہنچائیں، چونکہ یہ تفصیلات قرآن کریم میں مذکور نہیں، اس لئے یہ احتمال تھا کہ کسی وقت کسی نادان کو یہ دھوکا ہو کہ یہ تفصیلی احکام خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام نہیں، اس لئے خدا تعالیٰ کی اطاعت میں ان کی تعمیل ضروری نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے سارے قرآن میں بار بار اپنی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے، جو حقیقت میں تو خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، مگر ظاہری صورت اور تفصیل بیان کے اعتبار سے اس سے کچھ مختلف بھی ہے، اس لئے بار بار تاکیدات کے ساتھ بتلا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو کچھ حکم دیں اس کو بھی خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت سمجھ کر مانو، خواہ وہ قرآن



میں صراحت موجود ہو یا نہ ہو، یہ مسئلہ چونکہ اہم تھا اور کسی ناواقف کو دھوکہ لگ جانے کے علاوہ دشمنان اسلام کے لئے اسلامی اصول میں گڑبڑ پھیلانے اور مسلمانوں کو اسلام کے صحیح راستہ سے بہکانے کا بھی ایک موقع تھا، اس لئے قرآن کریم نے اس مضمون کو صرف لفظ اطاعت رسول کے ساتھ ہی نہیں، بلکہ مختلف عنوانات سے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو بتلایا ہے، مثلاً آپ کے فرائض میں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کا اضافہ کر کے اس طرف اشارہ کر دیا، کہ علاوہ کتاب کے کچھ اور بھی آپ کی تعلیمات میں داخل ہے اور وہ بھی مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع ہے جس کو لفظ حکمت سے تعبیر فرمایا گیا ہے، کہیں ارشاد فرمایا کہ لَتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۲۴: ۱) یعنی رسول کے بھیجے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے لئے آپ پر نازل شدہ آیات کے مطالب و مقاصد اور تشریحات کو بیان فرمائیں۔

اور کہیں یہ ارشاد ہے کہ مَا أَمَرْتُ الرِّسُولَ فَخُذُوهُنَّ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (۵۹: ۷) یعنی رسول تم کو جو کچھ دیں وہ لے لو، اور جس سے روکیں اس سے باز آ جاؤ، یہ سب انتظام اس کا کیا گیا کہ کل کو کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ ہم تو صرف ان احکام کے مکلف ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، جو احکام ہیں قرآن میں نہ ملیں ان کے ہم مکلف نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ کسی زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو رسول کی تعلیمات اور تشریحات سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے یہی دعویٰ کریں گے کہ ہمیں کتاب اللہ کافی ہے، اس لئے ایک حدیث میں صراحت بھی اس کا ذکر فرمایا، جس کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، بیہقی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے اپنی اپنی کتابوں میں ان الفاظ سے نقل فرمایا ہے:

”یعنی ایسا نہ ہو کہ میں تم سے کسی کو ایسا پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر کئیہ لگائے ہوئے بے قدری سے بیٹھے ہوئے میرے اور نبی کے متعلق یہ کہہ دے کہ ہم اس کو نہیں جانتے ہمارے لئے تو کتاب اللہ کافی ہے، جو کچھ اس میں پاتے ہیں اس کا اتباع کر لیتے ہیں۔“

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَحَدٌ كَمْ مَثَلًا عَلَى  
أَمْرِيكَ يَا قَتِيلَ الْأَمْرِ مِنْ أَمْرِي  
مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ  
فَيَقُولُ لَا أَدْرِي مَا وَجَدْنَا  
فِي كِتَابِ اللَّهِ اتَّبَعْنَا

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ جگہ جگہ رسول کی اطاعت کا بار بار ارشاد اور پھر مختلف عنوانات سے رسول کے دیئے ہوئے احکام کو ماننے کی ہدایات یہ سب اسی خطرہ کے پیش نظر ہیں کہ کوئی شخص ذخیرۂ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی تفصیلات احکام کو قرآن سے الگ اور اطاعت خدا تعالیٰ سے جدا سمجھ کر انکار نہ کر بیٹھے،



کہ وہ درحقیقت الگ نہیں ہے

گفتہ او گفتہ اللہ بود

گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

دوسری آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مسابقت کا حکم دیا گیا ہے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد یہ دوسرا حکم دیا گیا، یہاں مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں، یعنی وہ اعمال صالحہ جو باعث مغفرت الہی ہیں، صحابہ و تابعین سے اس کی تفسیریں مختلف عنوانات سے منقول ہیں، مگر مضمون اور مضمون سب کا ایک ہی ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی تفسیر "ادائیگی فرائض" سے فرمائی، حضرت ابن عباسؓ نے "اسلام" سے، ابوالعالیہؓ نے "ہجرت" سے، انس بن مالکؓ نے "تکبیر اولیٰ" سے، سعید بن جبیرؓ نے "اداء طاعت" سے، ضحاکؓ نے "جہاد" سے، عکرمہؓ نے "توبہ" سے کی ہے، ان تمام اقوال کا حال یہی ہے کہ مغفرت سے مراد وہ تمام اعمال صالحہ ہیں جو مغفرت الہی کا باعث اور سبب ہوتے ہیں۔

اس مقام پر دو باتیں قابل غور ہیں، پہلی بات تو یہ ہے اس آیت میں مغفرت اور جنت کی طرف مسابقت اور مسابقت کا حکم دیا جا رہا ہے، حالانکہ دوسری آیت میں لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (۳۲:۴) فرما کر دوسرے فضائل حاصل کرنی تمنا کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ فضائل دو قسم کے ہیں، ایک فضائل تو وہ ہیں جن کا حاصل کرنا انسان کے اختیار اور بس سے باہر ہو جن کو فضائل غیر اختیاریہ کہتے ہیں، جیسے کسی کا سفید رنگ یا حسین ہونا یا کسی بزرگ خاندان سے ہونا وغیرہ، دوسرے وہ فضائل جن کو انسان اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کر سکتا ہے، ان کو فضائل اختیاریہ کہتے ہیں، فضائل غیر اختیاریہ میں دوسرے کی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش بلکہ اس کی تمنا کرنے سے بھی اس لئے روکا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے مطابق مخلوق میں تقسیم کئے ہیں، کسی کی کوشش کا اس میں دخل نہیں، اس لئے وہ فضائل جو کوشش اور تمنا سے حاصل تو ہونگے نہیں، اب سوائے اس کے کہ اس کے دل میں حسد اور بغض کی آگ بھڑکتی ہے اور کوئی فائدہ نہیں، مثلاً ایک شخص کا لاپہ وہ گورا ہونے کی تمنا کرتا رہے تو اس سے کیا نتیجہ نکلے گا، البتہ جو فضائل اختیاریہ ہیں ان میں مسابقت اور مقابلہ کا حکم دیا گیا، صرف ایک آیت میں نہیں، بلکہ متعدد آیتوں میں آیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ (۱۳۸:۲) دوسری جگہ ارشاد ہے: وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ (۲۶:۸۳)



ایک بزرگ نے فرمایا کہ اگر کسی انسان میں کوئی فطری اور طبعی کوتاہی ہو جس کا دور کرنا اس کے بس سے باہر ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنی اس کوتاہی پر قانع رہ کر دوسروں کے کمال کو دیکھے بغیر اپنا کام کرتا رہے، کیونکہ اگر وہ اپنی کوتاہی پر تاسف اور دوسروں کے کمال پر حسد کرتا رہا تو جتنا کام کر سکتا ہے اس قدر بھی نہیں کر سکے گا، اور بالکل ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔

دوسری چیز جو اس جگہ قابل غور ہے وہ یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مغفرت کو جنت سے مقدم کیا، اس میں ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ جنت حاصل کر لینا مغفرت الہی کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ انسان اگر تمام عمر بھی نیکیاں کرتا رہے، اور معصیت سے کنارہ کش رہے تب بھی اس کے تمام اعمال جنت کی قیمت نہیں ہو سکتے، جنت میں لے جانے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ مغفرت باری تعالیٰ ہے اور اس کا فضل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

راستی اور حق کو اختیار کرو، درمیانی راہ  
نہ اختیار کرو اور (اللہ کے فضل) کی بشارت  
حاصل کرو، کسی شخص کا عمل اس کو جنت میں  
نہیں پہنچائے گا، لوگوں نے کہا، نہ آپ کا  
یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا، نہ میرا عمل  
جنت میں پہنچائے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ  
مجھ کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے ۵

سَيِّدُ دُؤَا قَارِئٍ وَأَوْ أَبْشِرُ وَا  
فَاتَهُ لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ  
عَمَلُهُ قَالُوا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ  
اللَّهِ قَالَ وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِي  
اللَّهُ بِرَحْمَتِهِ  
(ترغیب ترہیب بحوالہ بخاری مسلم)

حاصل یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں، لیکن عادت اللہ ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی بندے کو نوازتا ہے جو اعمال صالحہ کرتا ہے، بلکہ جس کو اعمال صالحہ کی توفیق ہوگی، وہی علامت ہے کہ اللہ اس سے راضی ہیں، لہذا اعمال کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہیں کرنا چاہئے، معلوم ہوا کہ دخول جنت کا اصلی باعث اور سبب مغفرت الہی ہے، اسی لئے مغفرت کی اہمیت کے پیش نظر مطلق مغفرت نہیں فرمایا گیا، بلکہ متغیرۃ بینکم فرمایا گیا صفت ربوبیت کے بیان کرنے میں مزید لطف اور امتنان کا اظہار مقصود ہے۔

دوسری چیز جس کی طرف دوڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے وہ جنت ہے، اور جنت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی وسعت اس قدر ہے جتنا سارا آسمان و زمین ہے، انسان کے دماغ میں آسمان و زمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت آہی نہیں سکتی، اس لئے سمجھانے کے لئے جنت کے عرض کو اس سے تشبیہ دی، گویا بتلادیا کہ جنت بہت وسیع ہے



اس کے عرض میں سارے زمین و آسمان سما سکتے ہیں، پھر جب اس کے عرض کا یہ حال ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا ہوگا، یہ معنی تو اس وقت ہیں جب عرض کو طول کے مقابل لیا جائے، لیکن اگر عرض کو ثمن یعنی قیمت کے معنی میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جنت کوئی معمولی شے نہیں ہے، اس کی قیمت سارا آسمان و زمین ہیں، لہذا ایسی قیمتی اور عظیم الشان چیز کے لئے مسابقت اور مسابقت کرو۔

تفسیر کبیر میں ہے:

قَالَ أَبُو مُسْلِمٍ إِنَّ الْعَرْضَ هُنَا مَا  
يُخْتَصُّ مِنَ الثَّمَنِ فِي مُقَابَلَةِ  
الْمُسَبِّحِ أَيْ ثَمَنُهَا كَوَيْبَعَتِ  
كَثْمَنِ التَّمُوتِ وَالْأَمْرِضِ وَ  
الْمُرَادُ بِذَلِكَ عَظَمُ مَقْدَرِهَا  
وَجَلَالَةُ حُطْبِهَا وَإِنَّهُ لَا يُبَاوَى  
شَيْءٌ وَإِنْ عَظُمَ

ابو مسلم کہتے ہیں کہ عرض سے مراد آیت  
میں وہ چیز ہے جو مسبح کے مقابلہ میں بطور  
قیمت پیش کی جائے، مطلب یہ ہے کہ  
اگر بالفرض جنت کی قیمت لگائی جائے  
تو سارا آسمان و زمین اور ان کی کائنات  
اس کی قیمت ہوگی، مقصود اس جنت  
کی عظمت اور جلالت قدر کا بیان کرنا ہے۔

جنت کا دوسرا وصف بتلایا، اَعْدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ، یعنی جنت پر مہیزگاروں کے لئے  
تیار کی گئی ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت پیدا کی جا چکی ہے، قرآن و حدیث کے واضح  
اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ساتویں آسمان کے اوپر ہے، اس طرح کہ ساتواں آسمان  
اس کی زمین ہے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكُظَّيْمِينَ

جو خرچہ کرتے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں اور دبا لیتے ہیں

الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۴۲﴾

غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ چاہتا ہے ان کے کرنے والوں کو

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا

اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا بُرا کام کریں اپنے حق میں تو یاد کریں

اللَّهَ فَاسْتَغْفِرُوا لَهُمْ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مِمَّا رَزَقَهُمُ اللَّهُ

اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے گناہ بخشنے والا



إِلَّا اللَّهُ مَنْ وَكُمُ يُصِرُّوْا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۸﴾ أُولَٰئِكَ

سوا اللہ کے اور اڑتے نہیں اپنے کئے پر اور وہ جانتے ہیں اپنی

جَزَاءُ وَهُمْ مَغْفِرَةٌ ۖ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتُ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا

جزا ہے بخشش اُن کے رب کی اور باغ جن کے نیچے نہریں بہتی

الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَمِلِينَ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَلَتْ

ہیں ہمیشہ رہیں گے وہ لوگ ان باغوں میں اور کیا خوب مزدوری ہے کام کر میاںوں کی ہو چکے ہیں تم

مِّن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۖ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

سے پہلے واقعات سو پھرد زمین میں اور دیکھو کہ کیا ہوا

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ﴿۱۴۰﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَ

انجام بھٹلانے والوں کا یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور

مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۴۱﴾

نصیحت ہے ڈرنے والوں کو۔

## خلاصہ تفسیر

ایسے لوگ ہیں جو کہ نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں (دہر حال میں) فراغت میں (بھی) اور تنگی میں (بھی) اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں کی تقصیرات سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو (جن میں یہ خصال ہوں بوجہ اکمل) محبوب رکھتا ہے اور ایک ان مذکورین کے اعتبار سے دوسرے درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں (دوسروں پر) زیادتی ہو یا کوئی گناہ کر کے خاص) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں تو (فوراً) اللہ تعالیٰ کی عظمت اور عذاب کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں یعنی اس طریقہ سے جو معافی کے لئے مقرب ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے میں ان اہل حقوق سے بھی معاف کرائے اور خاص اپنی ذات کے متعلق گناہ میں اس کی حاجت نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرانا دونوں میں مشترک ہے، اور (واقعی) اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشا ہو (رہا اہل حقوق کا معاف کرنا سودہ لوگ اس کا اختیار تو نہیں رکھتے کہ عذاب سے بھی بچالیں اور حقیقی بخشش اسی کا نام ہے) اور وہ لوگ اپنے فعل (بد) پر اصرار



(اور ہٹ نہیں کرتے اور وہ ان باتوں کو) جانتے بھی ہیں (فلاں کام ہم نے گناہ کا کیا اور یہ کہ توبہ ضرور ہے اور یہ کہ خدا تعالیٰ غفار ہے، مطلب یہ کہ اعمال کی بھی درست کر لیتے ہیں، اور عقائد بھی درست رکھتے ہیں) ان لوگوں کی جزا بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور (مہشت کے) ایسے باغ ہیں کہ ان کے (درختوں اور مکانوں کے) نیچے سے نہریں جلتی ہوگی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اور اسی مہرت اور جنت کی تحصیل کا شروع آیتوں میں حکم تھا، یح میں اس کا طریقہ بتلایا، ختم پر اس کا وعدہ فرمایا (اور یہ) اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا (وہ کام استغفار اور حسن اعتقاد ہے، اور استغفار کا نتیجہ آئندہ اطاعت کی پابندی ہے جس پر عدم اصرار دلالت کرتا ہے) بالتحقیق تم سے قبل (زبانوں میں) مختلف طرق (کے لوگ) گذر چکے ہیں (انہیں مسلمان بھی تھے اور کفار بھی) اور ان میں اختلاف و مقابلہ و مقابلہ بھی ہوا، لیکن انجام کار کفار ہی ہلاک ہوئے، چنانچہ اگر تم آثار کا مشاہدہ کرنا چاہو تو تم روستے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھ لو کہ اخیر انجام تکذیب کرنے والوں کا (یعنی کفار کا) کیسا ہوا، (یعنی ہلاک و برباد ہوئے) چنانچہ ان کی ہلاکت کے آثار اس وقت تک بھی باقی تھے جس کو دوسری آیت میں فرمایا ہے فَبَلَّغْ مَنَاسِكُهُمْ لَمْ تُسَكَّنْ لَهُمُ الْاَمْشَارُ (۵۸:۲۸) وَ اَلَيْسَ لِبِاعَادِ قُتَيْبٍ (۵۹:۱۵) یہ (مضمون مذکور) بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے کہ اگر اس میں غور کریں تو عبرت حاصل کر سکتے ہیں) اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لئے (یعنی ہدایت اور نصیحت بھی یہی لوگ حاصل کرتے ہیں، ہدایت یہ کہ اس کے موافق عمل کریں)۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں حق تعالیٰ نے مؤمنین متقین کی خاص صفات اور علامات بتلائی ہیں جن سے بہت سے فوائد متعلق ہیں، مثلاً یہ کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ نیک بندوں کی صحبت اور ان کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی تاکید فرمائی ہے، کہیں حِرَاطِ الَّذِیْنِ اَلْعَمَتْ عَلَیْهِمْ فرما کر دین کی سیدھی اور صحیح راہ انہیں مقبول بندوں سے سیکھنے کی طرف اشارہ فرمایا کہیں تَحَوُّلُ اَمَةِ الصَّادِقِیْنِ فرما کر ان کی صحبت اور معیت کی خاص افادیت کی تلقین فرمائی، اور دنیا میں ہر گروہ کے اندر اچھے بُرے لوگ ہوا کرتے ہیں، اچھوں کے لباس میں بُرے بھی ان کی جگہ لے لیتے ہیں، اس لئے ضرورت تھی کہ مقبول بندوں کی خاص علامات و صفات بتلا کر یہ سمجھا دیا جائے کہ لوگ غلط رہنماؤں اور مقتداؤں سے پرہیز کریں، اور



صادقین کی علامتیں پہچان کر ان کا اتباع کریں، مؤمنین متقین کی صفات و علامات بیان فرمائے کے بعد انکی راہنمائی کا میابی اور جنت کے اعلیٰ مقامات بتلا کر نیک بندوں کو خوشخبری اور بُری راہوں پر چلنے والوں کے لئے نصیحت و ترغیب کا راستہ کھولا گیا ہے ان آیات کے اخیر میں ہذا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ، میں اسی کی طرف اشارہ ہے، مقبولین کی جو صفات و علامات یہاں ذکر کی گئی ہیں، اس میں ابتدائی آیات میں ان صفات کا بیان ہے جن کا تعلق انسانی حقوق اور باہمی معاشرت سے ہے، اور بعد کی آیات میں وہ صفات ہیں جن کا تعلق حق تعالیٰ کی عبادت و طاعت سے ہے، جن کو دوسرے لفظوں میں حقوق العباد اور حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا آیات میں حقوق انسانی سے متعلقہ صفات کو پہلے اور حقوق اللہ سے متعلقہ صفات کو بعد میں بیان فرما کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حقوق اللہ سارے حقوق پر مقدم ہیں، لیکن دونوں میں ایک خاص فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے حقوق بندوں پر لازم کئے ہیں ان سے نہ خدا تعالیٰ کا اپنا کوئی فائدہ متعلق ہے، نہ خدا تعالیٰ کو ان کی حاجت ہے، اور نہ ان کے ادا نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہے، اُس کی ذات سب سے بے نیاز ہے، اس کی عبادت سے فائدہ خود عبادت کرنیوالے کا ہے، پھر وہ رحیم الرحیم اور کریم الکریم بھی ہے، اس کے حقوق میں بڑی سے بڑی کوتاہی اور غلطی کرنیوالا انسان جس وقت بھی اپنے کئے ہوئے پر نادم ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے اور توبہ کر لے تو بارگاہ رحم و کرم سے اس کے سارے گناہ ایک دم میں معاف ہو سکتے ہیں، بخلاف حقوق العباد کے کہ انسان ان کا محتاج ہے، اور جس شخص کے حقوق کسی کے ذمہ لازم ہیں اگر وہ ادا نہ کرے تو اس کا نقصان بھی ہے، اور اپنے نقصان کو معاف کرنا بھی انسان کے لئے آسان نہیں، اس لئے حقوق العباد کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نظام عالم کی درستی اور انسانی معاشرے کی اصلاح کا سب سے بڑا دار و مدار باہمی حقوق کی ادائیگی پر ہے، اس میں ذرا سی کوتاہی جنگ و جدال اور فساد کی راہیں کھول دیتی ہے، اور اخلاقی فاضلہ اگر پیدا کرنے جائیں تو دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں، صدیوں کی لڑائیاں صلح و آشتی میں تبدیل ہو جاتی ہیں، اس لئے بھی ان صفات و علامات کو مقدم کیا گیا جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے، ان صفات میں سب سے پہلی صفت یہ بتلائی گئی ہے:

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ فِي السَّاعَةِ وَالضَّرَاءِ، یعنی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں اپنا



مال خرچ کرنے کے ایسے عادی اور خوگر ہیں کہ ان پر فراخی ہو یا تنگی ہر حال میں مقدور بھر خرچ کرتے رہتے ہیں، زیادہ میں سے زیادہ اور کم میں سے کم، اس میں ایک طرف تو یہ ہدایت ہے کہ غریب فقیر آدمی بھی اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بالکل قانع نہ سمجھیں اور اس کی راہ میں خرچ کر کے کی سعادت سے محروم نہ ہوں، کیونکہ ہزار روپے میں سے ایک روپیہ خرچ کرنے کا بخود رحہ ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہزار پیسے میں سے ایک پیسہ خرچ کرنے کا بھی ہے، اور علی طور پر جس طرح ہزار روپے کے مالک کو ایک روپیہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دینا کچھ مشکل نہیں اسی طرح ہزار پیسوں کے مالک کو ایک پیسہ خرچ کرنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔

دوسری طرف یہ ہدایت بھی ہے کہ تنگی کی حالت میں بھی بقدر حیثیت خرچ کرتے رہنے سے خرچ کرنے کی مبارک نصلت و عادت قائم نہیں ہوگی، اور شاید اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے فراغت اور فراخی بھی عطا فرمادیں۔

تیسری اہم چیز اس میں یہ ہے کہ جو شخص اس کا خوگر ہو کہ دوسرے انسانوں پر اپنا مال خرچ کر کے ان کو فائدہ پہنچائے، غریبوں، فقیروں کی امداد کرے، ظاہر ہے کہ وہ کبھی دوسروں کے حقوق غصب کرنے اور ان کی مرضی کے خلاف ہضم کرنے کے پاس بھی نہ جائے گا، اس لئے اس پہلی صفت کا حاصل یہ ہوا کہ مومنین متقین اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے دوسرے انسانوں کو نفع پہنچانے کی فکر میں رہا کرتے ہیں، خواہ ان پر فراخی ہو یا تنگی، حضرت عائشہؓ نے ایک وقت صرف ایک انگور کا دانہ خیرات میں دیا، کیونکہ اس وقت ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہ تھا، بعض سلف سے منقول ہے کہ کسی وقت انھوں نے صرف ایک پیاز کا صدقہ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

اَتَقُوا النَّاسَ وَتَرُثُ ثَمَرَةً  
وَرُدُّوا السَّائِلَ وَكَوْ بِظِلْفِ  
سَائِلٍ

”یعنی تم جہنم کی آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ اگرچہ ایک کھجور کا ٹکڑا صدقہ میں دیکر ہی ہو، اور سائل کو خالی واپس نہ کر دو اور کچھ نہ ہو تو بکری کے پاؤں کی ٹھری ہی دیدو“

تفسیر کبیر میں امام رازی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی، تو جن کے پاس سونا چاندی تھا انھوں نے وہ صدقہ میں دیدیا، ایک شخص کھجور کے چھلکے لایا، کہ میرے پاس اور کچھ نہیں، وہ ہی صدقہ کر دیئے گئے، ایک اور شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس کوئی چیز صدقہ



کرنے کے لئے نہیں ہے، البتہ میں اپنی قوم میں عزت دار سمجھا جاتا ہوں میں اپنی عزت کی خیرات کرتا ہوں کہ آئندہ کوئی آدمی مجھے کتنا ہی برا بھلا کہے میں اس سے ناراض نہیں ہونگا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ انفاق فی سبیل اللہ صرف مالداروں اور اغنیاء ہی کا حصہ نہیں ہے، غریب، فقیر بھی اس صفت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ اپنی اپنی مقدرت کے موافق اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے اس عظیم صفت کو حاصل کر لیں۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ضروری یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ نہیں کہ مال ہی خرچ کیا جائے **يُنْفِقُونَ** کا تو ذکر فرمایا کہ وہ لوگ تنگی اور فراخی ہر حال میں فی سبیل اللہ خرچ کرتے ہیں، یہ متعین نہیں فرمایا کہ کیا خرچ کرتے ہیں، اس کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں صرف مال و دولت ہی نہیں بلکہ ہر خرچ کرنے کی چیز داخل ہے، مثلاً جو شخص اپنا وقت، اپنی محنت اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ بھی اس انفاق کی صفت سے موصوف کیا جائے گا، جو حدیث بحوالہ تفسیر کبیر اور گزرمی یہ ہے وہ اس پر شاہد ہے تنگی اور فراخی کے ذکر یہ بھی ہے کہ یہی وہ حالتیں ہیں جن میں عادتاً انسان خدا کو بھولتا ہے، میں ایک اور حکمت جب مال و دولت کی فراوانی ہو تو عیش میں خدا کو بھول جاتا ہے، اور جب تنگی اور مصیبت ہو تو بسا اوقات اسی کی فکر میں رہ کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے، اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو نہ عیش میں خدا کو بھولتے ہیں نہ مصیبت و تکلیف میں، ظفر شاہ دہلوی کا کلام اس معنی میں خوب ہے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانے گا خواہ کتنا ہی صاحب فہم و ذکا

جسے عیش میں یا وحشت میں رہے جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

اس کے بعد ان کی ایک خاص صفت اور علامت یہ بتلائی گئی کہ اگر ان کو کسی ایسے شخص سے سابقہ پڑے جو ان کو اذیت اور تکلیف پہنچائے، تو وہ غصہ میں شعل اور مخلوب نہیں ہو جاتے، اور غصہ کے مقتضی پر عمل کر کے انتقام نہیں لیتے، پھر صرف یہی نہیں کہ انتقام نہ لیں بلکہ دل سے بھی معاف کر دیتے ہیں، اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ تکلیف دینے والے کے ساتھ احسان کا معاملہ فرماتے ہیں، اسی ایک صفت میں گویا تین صفتیں شامل ہیں، اپنے غصہ پر قابو پانا، تکلیف دینے والے کو معاف کرنا، پھر اس کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا، ان تینوں چیزوں کو اس آیت میں بیان فرمایا:

وَالَّذِينَ ظَلَمُوا النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَاللَّهُ يَجِبُ الْمُحْسِنِينَ



یعنی وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں اور لوگوں کا قصور معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

امام بیہقی نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت سیدنا علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کا ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا ہے کہ آپ کی ایک کنیز آپ کو وضو کرا رہی تھی کہ اچانک پانی کا برتن اس کے ہاتھ سے پھوٹ کر حضرت علی ابن حسین رضی اللہ عنہما کے اوپر گرا، تمام کپڑے بھیگ گئے، غصہ آنا طبعی امر تھا، کنیز کو خطرہ ہوا، تو اس نے فوراً یہ آیت پڑھی، وَالْكَافِرِينَ الْغَيْظُ۔ یہ سنتے ہی حساندان نبوت کے اس بزرگ کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، بالکل خاموش ہو گئے، اس کے بعد کنیز نے آیت کا دوسرا جملہ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ پڑھ دیا، تو فرمایا کہ میں نے تجھے دل سے بھی معاف کر دیا، کنیز بھی ہوشیار تھی، اس کے بعد اس نے تیسرا جملہ بھی سنا دیا، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ، جس میں احسان اور حسن سلوک کی ہدایت ہے، حضرت علی بن حسینؑ نے یہ شکر فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کر دیا (روح المعانی بحوالہ بیہقی)

لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں کو معاف کر دینا انسانی اخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے، اور اس کا ثواب آخرت نہایت اعلیٰ ہے، حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "قیامت کے روز حق تعالیٰ کی طرف سے منادی ہوگی کہ جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر کوئی حق ہے وہ کھڑا ہو جائے، تو اس وقت وہ لوگ کھڑے ہوں گے، جنہوں نے لوگوں کے ظلم و جور کو دنیا میں معاف کیا ہوگا"

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

مَنْ سَرَّكَ أَنْ يُشْرَكَ لَكَ الْبُشَيْرُ  
وَتَرْفَعُ لَكَ الدَّرَجَاتُ فَلْيَعْفُ  
عَنْ مَنْ ظَلَمَكَ وَيُعْطِ مَنْ  
حَرَمَكَ وَيَصِلْ مَنْ قَطَعَكَ

جو شخص یہ چاہے کہ اس کے محلات جنت میں اونچے ہوں اور اس کے درجات بلند ہوں اس کو چاہیے کہ جس نے اس پر ظلم کیا ہو اس کو معاف کر دے اور جس نے اس کو

کبھی کچھ نہ دیا ہو اس کو بخشش دہریہ دیا کرے اور جس نے اس سے ترک تعلقات کیا ہو

یہ اس سے ملنے میں پرہیز نہ کرے

قرآن کریم نے دوسری جگہ اس سے زیادہ وضاحت سے بُرائی کرنے والوں کے ساتھ احسان کرنے کا خلق عظیم سکھلایا، اور یہ بتلایا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں، ارشاد فرمایا:



إِدْفَعْ يَٰ أَيُّهَا النَّبِيُّ أَوْ أَجْزَأُ  
الَّذِي فِي بَيْتِكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ  
كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ (۳۳:۴۱)

یعنی برائی کی مداخلت بھلائی اور احسان  
کے ساتھ کرو، تو جس کے ساتھ دشمنی ہو  
تو اگھر اور دست بن جائے گا۔

حق تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حسناتی تربیت بھی اسی اعلیٰ پیمانہ پر  
فرمائی ہے کہ آپ نے اپنی امت کو بھی یہ ہدایت دی کہ :

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْفُ عَنِ  
ظَلَمَتِكَ وَأَخِشْ إِلَى مَنْ أَسَاءَ  
إِلَيْكَ

یعنی جو شخص آپ سے قطع تعلق کرے  
آپ اُن سے ملیں اور جو آپ پر ظلم کرے  
آپ اُس کو معاف کریں، اور جو آپ کے  
سنگھرائی کرے آپ اُس پر احسان کریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی شان ہے، آپ کی تعلیمات کی برکت یہی اخلاق و  
اوصاف آپ کے خدام میں بھی حق تعالیٰ نے پیدا فرمادیتے تھے، جو اسلامی معاشرے  
کا طرہ امتیاز ہے، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اور اسلاف امت کی تاریخ اس قسم کے  
واقعات سے لبریز ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص نے بھرے بازار میں امام اعظمؒ کی  
شان میں گستاخی کی اور گالیاں دیں، حضرت امام اعظمؒ نے غصہ کو ضبط فرمایا، اور اس کو  
کچھ نہیں کہا، اور گھر پر واپس آنے کے بعد ایک خوان میں کافی درہم و دینار رکھ کر اس شخص  
کے گھر تشریف لے گئے، دروازے پر دستک دی، یہ شخص باہر آیا تو اشرافیوں کا یہ خوان اس  
کے سامنے یہ کہتے ہوئے پیش فرمایا کہ آج تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا، اپنی نیکیاں مجھے  
دیدیں، میں اس احسان کا بدلہ کرنے کے لئے یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں، امامؒ کے اس معاملہ  
کا اس کے قلب پر اثر ہونا ہی تھا، آئندہ کو اس بڑی خصلت سے ہمیشہ کے لئے متائب  
ہو گیا، حضرت امامؒ سے معافی مانگی، اور آپ کی خدمت اور صحبت میں علم حاصل کرنے لگا  
یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں میں ایک بڑے عالم کی حیثیت اختیار کر لی۔

یہاں تک ان اوصاف کا بیان تھا جو انسانی حقوق سے متعلق ہیں، اس کے بعد  
حقوق اللہ سے متعلق صفات کا بیان اس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی  
نہیں کرتے، اور کبھی بمقتضائے بشریت ان سے گناہ ہو جاتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی  
طرف متوجہ ہو کر استغفار کرتے ہیں، اور آئندہ اس گناہ سے باز آنے کا ارادہ نچتے  
کر لیتے ہیں، ارشاد ہے :



وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا  
 لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ شَيْءٍ وَأَعْلَىٰ مَا نَفَعُهُمْ أَنْ يَعْلَمُوا أَنَّهُمْ إِلَىٰ اللَّهِ بِرُحْمَةٍ  
 قَرِيبُونَ۔ گناہوں میں مبتلا ہونا اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر سے غفلت کے سبب ہوتا ہے، اس لئے  
 جب کوئی گناہ سرزد ہو اللہ تعالیٰ کی یاد کو فوراً تازہ کرنا چاہئے، اور ذکر اللہ میں مشغول ہونا چاہئے۔  
 دوسری یہ ہدایت ہے کہ گناہوں کی معافی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک پچھلے  
 گناہوں پر ندامت اور اس سے معافی مانگنا اور مغفرت کی دعا کرنا، دوسرے آئندہ  
 کے لئے اس کے پاس نہ جانے کا عزم مکمل کرنا۔  
 اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن کریم کے بتلائے ہوئے اخلاقِ فاضلہ نصیب فرماوے  
 اللہم آمین۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ

مُؤْمِنِينَ۔ اور ہمت نہ ہمو اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان

رکھتے ہو۔ اگر پہنچا تم کو زحمت تو پہنچ چکا ہے ان کو بھی زحمت

مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ

الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

الظَّالِمِينَ۔ اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں اور اس لئے کہ معلوم

کرے اللہ جن کو ایمان ہے اور کرے تم میں سے شہید اور اللہ کو محبت نہیں ظلم

الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

الظَّالِمِينَ۔ اور اس واسطے کہ پاک صاف کرے اللہ ایمان والوں کو اور مشاویرے

الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۶۱ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا

كَانَ سُرُودٌ كُو۔ کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک

يَعْلَمُ اللَّهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۶۲

معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت رہنے والوں کو

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْا مَوْفِقًا

اور تم تو آرزو کرتے تھے مرنے کی اس کی ملاقات سے پہلے

سو اب



## رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝

دیکھ لیا تم نے اس کو آنکھوں کے سامنے۔

ان آیات میں پھر قصہ اُحد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دینے کا مضمون ہے، ربط آیات کہ ہمیشہ سے یہی طریق الہی چلا آیا کہ انجام کار کفار ہی خائب و خاسر ہوتے ہیں اگرچہ تم اس وقت اپنی بے عنوانی سے مغلوب ہو گئے، لیکن اگر اپنے مقتضیات ایمان یعنی ثبات و تقویٰ پر قائم رہے تو اخیر میں کفار ہی مغلوب ہوں گے۔

## خلاصہ تفسیر

اور تم (اگر اس وقت مغلوب ہو گئے تو کیا ہوا) ہمت مت ہارو اور ہمت کر دو اور آخر تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے مومن رہے (یعنی اس کے مقتضیات پر ثابت) (اگر تم کو زخم (صدمہ) پہنچ جاوے، جیسا اُحد میں ہوا) تو (کوئی گھبرانے کی بات نہیں کیونکہ اس میں چند حکمتیں ہیں، ایک تو یہ کہ) اس قوم کو بھی (جو کہ تمہارے مقابل تھی یعنی کفار) ایسے ہی زخم (صدمہ) پہنچ چکا ہے، (چنانچہ گزشتہ بدر میں وہ صدمہ اٹھا چکے ہیں) اور (ہمارا معمول ہے کہ) ان ایام کو (یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانہ کو) لوگوں کے درمیان اولتے بدلتے رہتے ہیں، (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب اور دوسری کو مغلوب کر دیا، کبھی اس کا عکس کر دیا، سو اسی معمول کے مطابق پارساں وہ مغلوب ہوئے تھے، اب کے تم ہو گئے، ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (دوسری حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر) جان لیویں (کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور نیک کا امتحان ہو جاتا ہے) اور (تیسری حکمت یہ ہے کہ) تم میں سے بعضوں کو ٹھیس دینا تھا، (بقیہ حکمتیں آگے آتی ہیں درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ظلم و کفر و شرک کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (پس اس کا احتمال نہ کیا جاوے کہ شاید ان کو محبوب ہونے کی وجہ سے غالب فرما دیا ہو ہرگز نہیں) اور (چوتھی حکمت یہ ہے) تاکہ (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو (کیونکہ مصیبت سے اخلاق و اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (پانچویں حکمت یہ ہے) مشادیوں کا فرد کو (یہ اس لئے کہ غالب آجانے سے ان کی ہمت بڑھے گی، پھر مقابلہ میں آئیں گے اور ہلاک ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے قبر خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے) ہاں اور مستو! کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں (خصوصیت کے ساتھ) جاو اخل ہو گے، حالانکہ ہنوز



اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں، جنہوں نے تم میں سے (خوب) جہاد کیا ہو اور جو جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہوں، اور تم کو (شہید ہو کر) مرنے کی (بڑی) تمنا کیا کرتے تھے، موت کے سامنے آنے سے پہلے سو (تمنا کے مطابق)، اس (کے سامان) کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا (پھر اس کو دیکھ کر کیوں بھلا گئے لگے اور وہ تمنا کہاں بھول گئے)

## معارف و مسائل

غزوہٴ اُحد کا واقعہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ اسی سورت میں بیان کیا جا چکا ہے جس میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس جہاد میں مسلمانوں کی بعض کوتاہیوں کے سبب ابتدائی فتح کے بعد پھر مسلمانوں کو شکست ہوئی، نثر صحابہ کرام شہید ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم آئے، مگر ان سب امور کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے جنگ کا پالسا پلٹا، اور دشمن پسپا ہو گئے۔

اس عارضی شکست کے تین سبب تھے، پہلا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیر اندازوں کو دیا تھا وہ بعض اسباب کے ان پر قائم نہ رہے، کیونکہ اس بارے میں اختلاف رہا ہو گیا، کوئی کہتا تھا کہ ہم کو یہیں جے رہنا چاہیے، اکثر نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، چل کر سب کے ساتھ غنیمت حاصل کرنے میں لگنا چاہیے، تو پہلا سبب آپس کا جھگڑا تھا، دوسرا سبب یہ ہوا کہ جب حضورؐ کے قتل کی خبر مشہور ہو گئی، تو مسلمانوں کے قلوب میں کمزوری پیدا ہو گئی، جس کا نتیجہ بزدلی اور کم ہمتی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تیسرا سبب جو ان دونوں سببوں سے زیادہ اہم تھا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اختلاف پیش آیا، یہ تین لغزشیں مسلمانوں سے ہو گئی تھیں، جن کی بنا پر ان کو عارضی شکست ہوئی، یہ عارضی شکست اگرچہ انجام کار فتح میں تبدیل ہو چکی تھی، لیکن مسلمان مجاہدین زخموں سے پورے پورے تھے، ان کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے پڑی تھیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اشتیاق نے مجروح کر دیا تھا، شہداء و یاس کا ہجوم تھا، اور اپنی ان لغزشوں کا بھی شدید صدمہ تھا، اب یہاں دو چیزیں پیدا ہو چکی تھیں، ایک تو گزشتہ باتوں کا بچہ و غم، دوسری چیز جس کا خطرہ تھا وہ یہ کہ مسلمان آئندہ کے لئے کہیں کمزور نہ ہو جائیں، اور اقوامِ عالم کی امامت کا جو فریضہ ان پر عائد ہے، اس میں ضعف نہ پیدا ہو جائے، اس لئے ان دونوں زخموں کو بند کرنے کے لئے قرآن کریم کا یہ ارشاد آیا:



لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْآخِلُونَ إِنَّ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۖ يَعْنِي تَمِمْ آمَدَہ کے لئے کمزوری اور سستی اپنے پاس نہ آنے دو، اور گزشتہ پر رنج و ملال نہ کرو، اور انجام کا تم ہی غالب ہو کر رہو گے، بشرطیکہ ایمان و ایقان کے راستہ پر مستقیم رہو، اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوئے اطاعتِ رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔

مطلب یہ تھا کہ گزشتہ بائیں اور خزشیں جو ہو چکی ہیں اُن پر رنج و غم میں اپنا وقت اور توانائی صرف کرنے کے بجائے مستقبل میں اپنے کام کی درستی کی فکر کرو، اور اسے کامیاب بناؤ، ایمان و ایقان، اطاعتِ رسولؐ و رخشاں مستقبل کا ضامن ہے، ان کو ہاتھ سے نہ جانے دو، انجام کا رتم ہی غالب رہو گے۔

اس فقرہ کی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا، اور پشمرہ جہول میں تازہ روح پھونک دی، غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی کس طرح تربیت و اصلاح فرمائی اور ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ایک ضابطہ اور اصول دیدیا، کہ گزشتہ فوت شدہ امور پر رنج و ملال میں وقت صرف کرنے کے بجائے آمندہ کے لئے قوت و شوکت کے اسباب بہم پہنچانے چاہئے، پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلادیا گیا کہ غلبہ اور بلندی حاصل کرنے کے لئے صرف ایک ہی چیز اصل ہے یعنی ایمان اور اس کے تقاضے پورے کرنا، ایمان کے تقاضے میں وہ تیاریاں بھی داخل ہیں جو جنگ کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں، یعنی اپنی فوجی قوت کا استحکام، سامانِ جنگ کی بہم رسانی اور ظاہری اسباب سے بقدر وسعت آراستہ و مسلح ہونا، غزوہٴ احد کے واقعات اول سے آخر تک ان تمام امور کے شاہد ہیں۔

اس آیت کے بعد ایک دوسرے انداز میں مسلمانوں کی تسلی کے لئے ارشاد ہے کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اٹھانی پڑی، تو اسی طرح کے حوادث فریقِ مقابل کو بھی تو پیش آچکے ہیں، اگر اُحد میں تمہارے شہر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے ان کے شہر آدمی بہم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں، اور خود اس لڑائی میں بھی ابتداءً ان کے بہت سے آدمی مقتول و مجروح ہوئے، لہذا فرمایا:

إِنَّ يَمَسُّكُمْ كَمَا يَمَسُّ الْقَوْمَ كَرَّحٍ مِّثْلَهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نَضَّا كُمُ الْبَيْنَ النَّاسِ، یعنی اگر تم کو زخم پہنچا تو ان کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے، اور ہم ان ایام کو باری باری بدلتے رہتے ہیں، جس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

اس آیت میں ایک اہم ضابطہ اور اصول کی طرف رہنمائی فرمائی، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اس عالم میں یہی ہے کہ وہ سختی، نرمی، دکھ، مسکھ، تکلیف و راحت کے دنوں کو



لوگوں میں اول بدل کرتے ہیں اگر کسی وجہ سے کسی باطل قوت کو عارضی فتح و کامرانی حاصل ہو جائے تو جماعتِ حقہ کو اس سے بدل نہیں ہونا چاہئے، اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہم کو اب ہمیشہ شکست ہی ہوا کرے گی، بلکہ اس شکست کے اسباب کا پتہ لگنا کہ ان اسباب کا تدارک کرنا چاہئے، انجام کار فتح جماعتِ حقہ ہی کو نصیب ہوگی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ

اور محمدؐ تو ایک رسول ہے جو پہلے اس سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر

مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ

وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے اٹلے پاؤں اور جو کوئی پھر جائے گا اٹلے

عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا ۚ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۲۴﴾

پاؤں تو ہرگز نہ بگاڑے گا اللہ کا کچھ اور اللہ ثواب دیکھا شکر گزاروں کو

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ كِتَابًا مُّوجَّلاً ۚ

اور کوئی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا ہے ایک وقت معطر

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ

اور جو کوئی چاہے گا بدلہ دنیا کا دیوں گے ہم اس کو دنیا ہی سے اور جو کوئی چاہے گا بدلہ

الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۖ وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۲۵﴾

آخرت میں اس میں سے دیوں گے ہم اس کو اور ہم ثواب دیں گے احسان ماننے والوں کو

## خلاصہ تفسیر

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں جس پر قتل یا موت ممکن نہ ہو) آپ سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں (اسی طرح آپ بھی ایک روز گزر رہی جائیں گے) سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ شہید ہو جاویں تو کیا تم لوگ (جہاد یا اسلام سے) اٹلے پھر جاؤ گے (جیسا کہ اس واقعہ میں بعض مسلمان میدانِ جنگ سے بھاگ پڑے تھے اور منافقین ترغیبِ ارتداد کی دے رہے تھے) اور جو شخص (جہاد یا اسلام سے) الٹا پھر جاؤ گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا (بلکہ اپنا ہی کچھ کھودے گا) اور خدا تعالیٰ جلد ہی (نیک) عوض دے گا (حق شناس لوگوں کو) جو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو



یا درک کر اس کی اطاعت پر قائم و مستقر رہتے ہیں، اور قیامت کو ملنا جلد ہی ملنا ہے، کیونکہ قیامت روزانہ قریب ہی ہو رہی ہے) اور نیز کسی کے مرنے سے اتنا گھبرانا بھی فضول ہی، کیونکہ اول تو کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں (خواہ طبعاً خواہ عقلاً) برون حکم خدا کے دیکھ کر خدا کے حکم سے ہے تو اس پر راضی رہنا ضرور ہے، دوسرے یہ کہ جس کی موت آتی بھی ہے تو اس طور سے کہ اس کی مبادی معلوم نہ ہوئی رہتی ہے (جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، تو پھر ارمان اور حسرت محض بیکار ہے، تو وہ وقت پر ضرور ہوگی، اور وقت سے پہلے ہرگز نہ ہوگی) اور دیکھو کہ اس توحش پر بھاگنے کا آخر نتیجہ کیا، بحسب اس کے کہ دنیا میں اور چند روز زندہ رہیں، سو ایسی تدبیر کا اثر سن لو کہ جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) دنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ (بشرط اپنی مشیت کے) دیدیتے ہیں (اور آخرت میں اس کے لئے کچھ حصہ نہیں) اور جو شخص (اپنے اعمال و تدابیر میں) آخری نتیجہ چاہتا ہے (مثلاً جہاد میں اس لئے ثابت قدم رہا کہ یہ تدبیر ہے ثواب آخرت کی) تو ہم اس کو آخرت کا (حصہ اور ذمہ کر کے) دیں گے، اور بہت جلد (نیک) عوض دیں گے (ایسے) حق شناسوں کو (جو اپنے اعمال میں آخرت کی نعمت چاہیں)

## معارف و مسائل

یہ آیات بھی غزوہ اُحد کے واقعات سے متعلق ہیں، کیونکہ ان واقعات کو کسی وجہ سے خاص اہمیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ آل عمران کے چار پارچے رکوع تک غزوہ اُحد میں پیش آنے والی فتح و شکست اور ان دونوں میں جو قدرتی ہدایات پوشیدہ تھیں ان کا بیان مسلسل فرمایا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں سے پہلی آیت میں بعض صحابہ کرام کی ایک لغزش پر تہدید آمیز تنبیہ کر کے ایک ایسے اصولی مسئلہ کی طرف ہدایت کی گئی ہے کہ سوچنے والوں کو اس سے یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ اس عارضی شکست اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زخمی ہونے اور حضور کی وفات کی خبر پھیل جانے کی اور اس پر بعض صحابہ کی ہمت پست ہو جانے میں یہ راز بھی تھا کہ مسلمان اس اصولی مسئلہ پر عملی طور پر سنجیدہ ہو جائیں، وہ مسئلہ یہ تھا کہ جہاں اصول اسلام میں اس کی بڑی اہمیت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و محبت کو چرچہ ایمان و قرار دیا گیا ہے، اس میں ادنیٰ کمزوری کو کفر کے مرادف بتلایا گیا ہے، وہیں یہ بات بھی اتنی ہی اہم تھی کہ کہیں مسلمان اس مرض کا شکار نہ ہو جائیں جس میں نصاریٰ اور



عیسائی مسلمان ہو گئے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کو پرستش اور عبادت کی حد تک پہنچا دیا، اور ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریکِ خدائی ٹھہرایا۔

غزوہٴ احد کی عارضی شکست کے وقت جب کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو صحابہ کرامؓ پر جو کچھ گزری اور گزرنی چاہئے تھی اس کا ادنیٰ سا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کے لئے آسان نہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لگا سکتا ہے جس کو صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری اور عشقِ رسولؐ کا کچھ اندازہ ہو، جس کو یہ پوری طرح معلوم ہو کہ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مال، اولاد اور اپنی جانیں اور سب کچھ گمنا دینے کو دنیا کی سب سے بڑی سعادت سمجھی اور عمل سے اس کا ثبوت دیا ہے۔

ان عشاقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں جب یہ خبر پڑی ہوگی ان کے ہوش و حواس کا کیا عالم ہو گا خصوصاً جب کہ میدانِ جنگ گرم ہے، اور فتح کے بعد شکست کا منظر آنکھوں کے سامنے ہے، مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں، اس عالم میں وہ ہستی جو ساری کوششوں کا محور اور ساری امیدوں کا منظر تھی وہ بھی ان سے رخصت ہوتی ہے، اس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی ایک بھاری جماعت سرایسمہ ہو کر میدانِ جنگ سے ہٹنے لگی، یہ میدان جہاد سے ہٹ جانا اگرچہ ہنگامی اور سرسری اور رفتی سرایسگی کا نتیجہ تھا، خدا نخواستہ اسلام سے پھر جانے کا کوئی شبہ یا دوسوہ بھی نہ تھا، لیکن حق تعالیٰ تو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو ایک ایسی پاکباز فرشتہ خصلت جماعت بنانا چاہتا ہے جو دنیا کے لئے نمونہ عمل بنے، اس لئے ان کی ادنیٰ لغزش بھی سخت قرار دی گئی ہے

نزدیکان را بیش بود حیرانی

ان کے لئے میدانِ جنگ چھوڑنے پر ایسا خطاب کیا گیا: اسلام چھوڑنے پر کیا جاتا ہے، اور سخت عتاب کے ساتھ اس بنیادی مسئلہ پر تنبیہ کی گئی کہ دینِ عبادت اللہ کے لئے اور جہاد اسی کے لئے ہیں، جو ہمیشہ زندہ اور قائم ہے، اگر بالفرض یہ خبر صحیح بھی ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو بہر حال یہ تو ایک دن ہونا ہی ہے، اس پر ہمت ہار بیٹھنا اور دین کا کام چھوڑ دینا ان حضرات کے شایانِ شان نہیں۔ اس لئے ارشاد فرمایا:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۖ الْآيَةُ، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رسول ہی تو ہیں

(خدا تو نہیں) آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اگر آپ کی وفات ہو جائے یا آپ کو شہید کر دیا جائے تو کیا تم لوگ اٹے پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو کوئی اٹے پاؤں پھر جائے گا



وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، اور اللہ تعالیٰ ثواب دے گا شکر گزاروں کو۔

اس میں تنبیہ فرمادی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک نہ ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں، آپ کے بعد بھی مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رہنا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس عارضی شکست کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مجروح ہونے اور وفات کی خبر مشہور ہونے میں یہ قدرتی راز تھا کہ آپ کے بعد جو حالات صحابہ کرام پر پیش آسکتے تھے وہ آپ کی دنیوی حیات ہی میں ظاہر کر دیئے گئے، تاکہ ان میں جو لغزش ہو اس کی اصلاح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہو جائے، اور آئندہ جب یہ واقعہ وفات سچ سچ پیش آئے تو یہ عشاق رسول از جارفہ نہ ہو جائیں، چنانچہ یہی ہوا آپ کی وفات کے وقت جب بڑے بڑے صحابہ کرام کے ہوش و حواس بجا نہ تھے، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی قسم کی آیات قرآنیہ کی سند لے کر ان کو بچھایا، اور وہ سب سنبھل گئے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں بھی حوادث اور مصائب کے وقت ثابت قدم رہنے کی تعلیم دینے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ ہر انسان کی موت اللہ تعالیٰ کے نزدیک لکھی ہوئی ہے، اس کی تاریخ، دن اور وقت معلوم ہے، نہ اس سے پہلے کسی کو موت آسکتی ہے نہ اس کے بعد وہ زندہ رہ سکتا ہے، پھر کسی کی موت سے ایسے سراسیمہ ہو جانے کے کوئی معنی نہیں۔

آخر میں اس پر تنبیہ فرمائی کہ اس حادثہ کے ظاہری اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ جن حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی جانب پہاڑی پرنگراں بنا کر بٹھایا تھا، ابتدائی فتح کے وقت عام مسلمانوں کو مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول دیکھ کر ان میں بھی چند حضرات کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اب تو فتح ہو گئی، اس جگہ ٹھہرنے کی ضرورت نہ رہی، پھر ہم بھی مال غنیمت جمع کرنے میں کیوں حصہ نہ لیں؟ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے، اس لئے فرمایا:

وَمَنْ يَرْجُ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يَرْجُ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهَا مِنْهَا  
وَسَنُجْزِي الشَّكِرِينَ  
یعنی جو شخص اپنے عمل سے دنیا کا بدلہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا میں کچھ حصہ دیدیتے ہیں، اور جو آخرت کا ثواب چاہتا ہے تو اس کو آخرت کا ثواب ملتا ہے، اور ہم عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دیں گے۔

اس میں اشارہ فرمایا کہ مال غنیمت جمع کرنے کی فکر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ کام کو چھوڑ بیٹھنے میں ان سے غلطی ہوئی، یاد رہے کہ حقیقت کے اعتبار سے مال



غنیمت جمع کرنا بھی نری دنیا طلبی نہیں جو شرعاً مذموم ہے، بلکہ مال غنیمت جمع کر کے محفوظ کرنا اور پھر اس کو اس کے مصرف میں صرف کرنا یہ بھی ایک جزو جہاد ہے، اور عبادت ہی ہے، ان حضرات صحابہ کا اس میں شریک ہونا صرف طبع دنیوی کی وجہ سے نہ تھا، کیونکہ شرعی ضابطہ سے اگر وہ اس مال کے جمع کرنے میں شریک ہوتے جب بھی ان کو مال غنیمت میں وہ حصہ ملتا جو آپ ملا، اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان حضرات نے طبع دنیا کے لئے اپنے مقام کو چھوڑا، لیکن جیسا کہ پہلی آیت کی تفسیر میں بتلایا گیا ہے کہ بڑوں کی تھوڑی لغزش بھی بڑی سمجھی جاتی ہے، ان کے معمولی جرم کو بڑا سخت جرم قرار دے کر عتاب خطاب کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی ہے کہ مال غنیمت جمع کرنے میں کچھ نہ کچھ دنیوی منفعت کا تعلق ضرور تھا، اور اس تعلق کا طبعی اثر قلوب میں ہونا بھی مستبعد نہ تھا، صحابہ کرامؓ کے معیار اخلاق کو بلند سے بلند کرنے کے لئے ان کے اس عمل کو بھی ارادہ دنیا سے تعبیر کر دیا کہ طبع دنیا کا ادنیٰ غبار بھی اُن کے قلوب تک نہ جاسکے۔

وَكَايْنٍ مِّنْ ذِي قُلَّةٍ مَّعَهُ زَبَبُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا

اور بہت ذی قنہ ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خدا کے طالب پھر نہ ہائے ہیں کچھ

أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ

تکلیف پہنچنے سے اللہ کی راہ میں اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ

يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٣٩﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا

محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے اور کچھ نہیں بولے مگر یہی کہائے رب ہمارے

اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبَّتْ أَقْدَامَنَا

بخش ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمارے کام میں اور ثابت رکھ قدم ہمارے

وَأَنْصَرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿١٤٠﴾ فَاتَّخَذَهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ

اور مدد دے ہم کو قوم کفار پر پھر دیا اللہ نے ان کو ثواب

الدُّنْيَا وَحَسَنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٤١﴾

دنیا کا اور خوب ثواب آخرت کا اور اللہ محبت رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں سے

رَبِّ آيَاتٍ | سابقہ آیات میں غزوہ احد میں پیش آنے والی بعض کوتاہیوں پر مسلمانوں کو تنبیہ اور ملامت تھی، ان آیات میں بھی اس کا تکملہ پچھلی امتوں کے بعض حالات



واقعات کی طرف اشارہ کر کے کیا گیا ہے کہ وہ کس طرح میدان جنگ میں ثابت قدم استقلال کے ساتھ رہے، انھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔

**بعض لغات کی تشریح** رَبِّیُّوْنَ، کسر راہ و تشدید باء مکسورہ و ضم یاء رب کی طرف منسوب ہے، جیسے رَبَّیُّوْا یعنی میں رب والے، اس میں حرف راہ مفتوح کی بجائے مکسور خطا قیاس استعمال ہوا ہے، (روح) بعض حضرات نے رَبِّیُّوْا کے معنی بہت سی جماعتوں کے کئے ہیں، اُن کے نزدیک یہ رِبَّیَّة کسر راہ بمعنی الجماعۃ کی طرف منسوب ہے، رَبِّیُّوْنَ اللہ والے سے مراد یہاں کون لوگ ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ اس سے مراد علماء و فقہاء ہیں۔ (روح المعانی) اِسْتِکَانُوْا، اِسْتِکَانَتْہُ سے مشتق ہے، جس کے معنی ڈب جانے اور عاجز ہو کر رُک جانے کے ہیں (بیضاوی) وَهْنًا، وَهْنٌ سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں ضعف و کمزوری۔

## خلاصہ تفسیر

اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ بہت بہت اللہ والے (کفار کے ساتھ) لڑے ہیں، نہ انھوں نے ہمت ہاری ان مصائب کی وجہ سے جو اُن پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں اور نہ ان کے (قلب یا بدن) کا زور گھٹا اور نہ وہ (دشمن کے سامنے) دبے (کہ ان سے عاجزی اور خوشامدی باتیں کرنے لگیں) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے (اور افعال میں تو ان سے کیا لغزش ہوئی) اُن کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انھوں نے (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں کو حد سے آگے بکھل جانے کو بخش دیجئے، اور ہم کو (کفار کے مقابلہ میں) ثابت قدم رکھئے، اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے تو (اس استقلال اور دعا کی برکت سے) ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بدلہ بھی دیا (یعنی فتح و ظفر) اور آخرت کا بھی عہد بدلہ دیا (یعنی رضا اور جنت) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکوکاروں سے محبت ہے۔

## معارف و مسائل

آیات مذکورہ میں سابق انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جہاد میں شریک اللہ والوں کی جنگ میں ثابت قدمی اور مصائب و شدائد سے نہ گھبرانا نہ کمزور ہونا بیان فرمانے کے



بعد ان کی ایک اور عظیم شان صفت کا بیان بھی اس طرح فرمایا ہے کہ وہ اپنی اس بے مثال شربانی کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چند دعائیں کرتے رہتے تھے:

اول یہ کہ ہمارے پچھلے گناہ معاف فرمادے۔

دوسرے یہ کہ حالیہ عمل جہاد میں ہم سے جو کوتاہی ہو گئی ہو اس کو معاف فرمادے۔

تیسرے یہ کہ ہمیں ثابت قدمی پر قائم رکھے۔

چوتھے یہ کہ ہمیں دشمنوں پر غالب کرے۔

ان دعاؤں کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اہم ہدایات ہیں:

اپنے کسی نیک عمل پر ناز نہیں کرنا چاہئے | اول یہ کہ حقیقت شناس مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ  
بلکہ ہر حال میں اللہ سے مغفرت اور عمل پر | کتنا ہی بڑا نیک کام اور کتنی ہی جدوجہد اللہ کی راہ  
قائم رہنے کی دعا کرتے رہنا چاہئے | میں کر رہا ہو، اس کو یہ حق نہیں کہ اپنے عمل پر ناز و فخر  
کرے، کیونکہ درحقیقت اس کا عمل بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، اس کے  
بغیر کوئی نیک عمل ہو ہی نہیں سکتا، حدیث میں مذکور ہے:

فَوَاللَّهِ لَوْ لَا اِنَّهُ مَا اَهْتَدَيْنَا

وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

یعنی اگر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو

ہمیں نہ سیدھے راستہ کی ہدایت ملتی اور

نہ ہم بے زکوٰۃ و نماز ادا ہو سکتے۔

اس کے علاوہ جو نیک عمل کوئی انسان کرتا ہے وہ کتنا ہی درست کر کے کرے لیکن  
مالک الملک و الملکوت کی شانِ جلالی کے مطابق کر لینا اس کے بس میں نہیں، اس لئے اس  
کے ادا سے حق میں کوتاہی ناگزیر ہے اس سے حالتِ عمل میں بھی استغفار کی ضرورت ہے  
نیز یہ بھی کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا کہ جو نیک عمل وہ اس وقت کر رہا ہے آگے بھی  
اسے اس کی توفیق ہوگی، اس لئے موجودہ عمل میں کوتاہی پر تداوت اور آئندہ کے لئے اس پر  
قائم رہنے کی دعا۔ مؤمن کا وظیفہ ہونا چاہئے۔

مذکورہ دعاؤں میں سب سے پہلے اپنے پچھلے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنے میں  
اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں انسان کو جو بچ و غم یا کوئی تکلیف یا دشمن کے مقابلہ میں  
شکست پیش آتی ہے وہ اکثر اس کے سابقہ گناہوں کا اثر ہوتا ہے، جس کا علاج استغفار  
و توبہ ہے، مولانا رومیؒ نے فرمایا ہے

عَنَّمْ جَوْبِیْ زُوْدَ اسْتَغْفَارِ کُنْ

عَنَّمْ بِاَمْرِ حَسْبِیْ اَمْدَ کَارِ کُنْ



آخری آیت میں اللہ والوں کو دنیا و آخرت دونوں میں اچھا بدلہ دینے کا ذکر ہے، کہ دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ انجام کار دشمنوں پر غالب اور اپنے مقصد میں کامیاب فرماتے ہیں، پھر آخرت کا بدلہ تو اصل بدلہ دُعا ہی راحت ہے جس کو کبھی فنا نہیں، اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ثواب آخرت کے ساتھ لفظ حَسَن بڑھا دیا گیا، وَحَسَنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُرَدُّوكُمْ

اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو پھیر دیں گے

عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خِصْرِينَ ﴿۱۵۹﴾ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ

اُن کے پاؤں پھر جا پڑو گے تم نقصان میں بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے

وَهُوَ خَيْرُ النَّصِيرِينَ ﴿۱۶۰﴾

اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے

## خلاصہ تفسیر

**رابطِ آیات** غزوہ اُحُد میں مسلمانوں کی عارضی شکست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی افواہ گرم ہونے پر منافقین نے جب جنگ کا پانسہ پلٹے ہوئے دیکھا تو شرارت کا موقع مل گیا، مسلمانوں سے کہنے لگے کہ جب آپ ہی نہ رہے تو ہم اپنا ہی دین کیوں نہ بھتیا کر لیں، جس سے سارے جھگڑے مٹ جائیں، اس سے منافقین کی بجاہشت اور مسلمانوں کا بدخواہ دشمن ہونا ظاہر ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان دشمنوں کی بات پر کان نہ لگائیں، ان کو اپنے کسی مشورہ میں شریک نہ کریں نہ ان کے کسی مشورہ کا اتباع کریں، تو جیسے پھلی آیات میں اللہ والوں کا اتباع کرنے کی ہدایت تھی اس میں منافقین اور مخالفین اسلام کے مشورہ پر عمل نہ کرنے اور ان سے بچتے رہنے کی ہدایت ہے، خلاصہ تفسیر یہ ہے:

اے ایمان والو اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو (کفر کی طرف) الٹا پھیر دیں گے (مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹا اور بدگمان کرنا ہے جس کو کبھی صراحتہً بھی کہہ دیتے ہیں اور کبھی صاف نہیں کہتے مگر انداز ایسا ڈالتے ہیں کہ رفتہ رفتہ ان کے دل سے اسلام کی عظمت و نجت کم ہوتی چلی جائے) پھر تم (ہر طرح) ناکام ہو جاؤ گے (خلاصہ یہ کہ وہ تمہارے دوست ہرگز نہیں اگر اظہار دوستی کا کریں)



بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا دوست ہے، اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے، (اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں، اسی کی مدد پر بھروسہ کریں، مخالفین اگر تمہاری نصرت و امداد کی کچھ تدبیریں بھی بتلائیں تو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف ان پر عمل نہ کرو)

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا

اب ڈالیں گے ہم کافروں کے دل میں ہیبت اس واسطے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

لَمْ يُنْزِلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوًى لِلظَّالِمِينَ ﴿١٥٢﴾

جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے ظالموں کا

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِآذِينِهِ فَحَتَّىٰ إِذَا

اور اللہ تو سچا کر چکا تم سے اپنا وعدہ جب تم قتل کرنے لگے ان کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ

فَنِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَمَرَكُم مَّا

جب تم نے نامروی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دکھایا تھا تمہاری

تُحِبُّونَ مِمَّنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِمَّنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۖ

غوشی کی چیز کوئی تم میں سے چاہتا تھا دنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت

ثُمَّ صَرَّفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو

پھر تم کو الٹ دیا ان پر سے تاکہ تم کو آزمائے اور وہ تو تم کو معاف کر چکا اور اللہ کا

فَضْلٌ عَلَى السَّوْغِيَةِ ﴿١٥٣﴾

فضل ہے ایمان والوں پر۔

رَبِطَ آيَاتٍ سَابِقَةٍ مِّنَ اللَّهِ تَعَالَىٰ كَمَا نَصَرُوا وَمَدَّ يَدَهُمْ كَمَا نَصَرُوا ۚ إِنَّ آيَاتِ اللَّهِ لَتُتْلَىٰ

اللہ کے کچھ واقعات کا ذکر ہے۔

## خلاصہ تفسیر

ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں رعب (ہیبت) کافروں کے دلوں میں، بسبب اس کے

کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس کے قابل شرکست ہونے پر اللہ تعالیٰ

نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (نہ لفظاً اور نہ معنی یعنی ایسی دلیل جس کا شرع میں



اعتبار ہو اس میں تمام دلائل عقلیہ و اخلاقیہ ہو گئے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر جاہل اپنی کوئی دلیل پیش کیا ہی کرتا ہے، مگر کوئی قابل اعتبار دلیل ان کے پاس نہیں) اور ان کی جگہ جہنم ہے، اور وہ بُری جگہ ہے ظالموں کی، (اس آیت میں کفار پر رعب و ہیبت طاری کرنے کا جو وعدہ ہے اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ اول تو باوجود اس کے کہ شکست مسلمانوں کو ہو رہی تھی، مشرکین عرب بلا کسی ظاہری سبب کے مکہ کی طرف لوٹ گئے (بہیضادی) پھر جب کچھ راستے طے کر چکے تو اپنی حماقت پر افسوس کرنے لگے کہ جب مسلمان دم توڑ چکے تھے تو اس وقت وہاں سے واپس آنا کوئی دانشمندی نہیں تھی، اور پھر مدینہ کی طرف واپس کا کچھ ارادہ کیا، تو اللہ نے ان کے دلوں پر ایسا رعب ڈالا کہ مدینہ کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

کسی راہ چلتے گاؤں والے سے کہدیا کہ ہم تجھے اتنا مال دیں گے، تم مدینہ جا کر مسلمانوں کو ڈراؤ کہ وہ پھر لوٹ کر آرہے ہیں، یہاں یہ سارا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے تعاقب کے لئے مقام حراء الاسد تک پہنچے، مگر وہ بھاگ چکے تھے، یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔

اگلی آیتوں میں غزوہ اُحد کے اندر مسلمانوں کی عارضی شکست اور مغلوبیت کے اسباب کا بیان ہے، ارشاد ہے) اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنا وعدہ (نصرت کو سچا کر دکھایا جس وقت کہ تم (ابتداءً قتال میں) ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے، (اور یہ تمہارا غلبہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا) یہاں تک کہ تم خود ہی (راسے میں) کمزور ہو گئے، اس طرح کہ جو تجویز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کے مورچہ پر بچاؤ سپاہی اور ایک افسر کو بٹھا کر فرمائی تھی اس میں بعض کو غلط فہمی ہو گئی کہ مسلمان فتح پا چکے ہیں، اب یہاں بیٹھے رہنے کی ضرورت ختم ہو گئی، اس لئے ہمیں بھی دشمن کے مقابلہ میں شریک ہونا چاہیئے، اور باہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) حکم میں اختلاف کرنے لگے (کہ بعض تو اسی جگہ بچے رہنے کی ہدایت پر قائم رہے، مگر بعض دوسروں نے دوسری تجویز پیش کر دی، انکار و ملامت اسی دوسری تجویز پر ہے کہ) اور تم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات (آنکھوں سے) دکھادی تھی (یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھلایا تھا، اور اس وقت تمہاری یہ حالت تھی کہ) تم میں سے بعض تو وہ تھے جو دنیا رکالینا چاہتے تھے (یعنی کفار کا تعاقب کر کے مال غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے) اور بعض تم میں وہ تھے جو (صرف) آخرت کے طلبگار تھے (اب چونکہ بعض سے رائے کی کمزوری اور خلاف حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری تجویز پیش کرنا اور آپ کے کہنے پر نہ چلنا



اور طلب دنیا جیسے بعض امور سرزد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کر دیا اور پھر تم کو ان کفار پر غالب آئے، سے ہٹا دیا (باد جو دیکھ یہ عارضی شکست تھا ارے فعل کا نتیجہ تھی، مگر پھر بھی منجانب اللہ یہ عمل بطور سزا کے نہیں بلکہ اس مصلحت سے ہوا) تاکہ خدا تعالیٰ تمہاری آزمائش (ایمان کی) فرمائے (چنانچہ اس وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور خالصین کی قدر بڑھ گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کر دیا (اب آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں کے حال پر

## معارف و مسائل

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرامؓ یہ ظاہر ہے کہ غزوہٴ احد میں بعض صحابہ کرامؓ کی رائے کی غلطی ہوئی کا مقام بلند اور اس کی رعایتیں تھی جس پر سابقہ متعدد آیات میں تنبیہ اور آئندہ کے لئے اصلاح حال کی ہدایات کا سلسلہ چلا آتا ہے، مگر اس عتاب اور تنبیہات کے اندر بھی صحابہ کرامؓ کے ساتھ حق جل شاد کی عنایات قابل دید ہیں، اول تو لَبَّيْكَ مُحَمَّدٌ ظاہر فرما دیا کہ عارضی شکست کی جو صورت پیش آئی یہ بطور سزا کے نہیں، بلکہ آزمائش کے لئے ہے، پھر صاف لفظوں میں خطا کی معافی کا اعلان فرما دیا وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ

بعض صحابہ کرامؓ کے آیات مذکورہ میں ارشاد ہوا ہے کہ اُس وقت صحابہ کرامؓ کے دو گروہ ہو گئے ارادۂ دنیا کا مطلب تھے، بعض دنیا چاہتے تھے، بعض صرف آخرت کے طلب گار تھے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جن حضرات کے متعلق طالب دنیا ہونے کا ذکر ہے یہ ان کے کس عمل کی بنا پر ہے، ظاہر ہے کہ مال غنیمت جمع کرنے کے ارادے کو طلب دنیا سے تعبیر کیا گیا ہے، اب غور کرو کہ اگر یہ حضرات اپنے مورچے پر جمے رہتے اور مال غنیمت جمع کرنے میں شریک نہ ہوتے تو کیا ان کے حصہ غنیمت میں کوئی کمی آجاتی، اور شریک ہو گئے تو کوئی زیادہ حصہ مل گیا، قرآن و حدیث سے ثابت شدہ قانون غنیمت کو جو شخص جانتا ہے اس کو اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ مال غنیمت کے جو حصہ ان کو ملے گا اس میں کس حال کوئی فرق کمی بیشی کا نہ تھا، مال غنیمت جمع کرنے کی صورت میں بھی اُن کا حصہ وہی رہے گا جو اپنی جگہ مورچے پر جمے رہنے کے وقت ملتا۔

تو اب یہ ظاہر ہے کہ اُن کا یہ عمل خالص طلب دنیا تو ہو نہیں سکتا، بلکہ مجاہدین کے کام میں شرکت ہے، ہاں طبعی طور پر اس وقت مال غنیمت کا خیال دل میں آ جانا مستبعد نہیں، مگر حق تعالیٰ اپنے رسولؐ کے ساتھیوں کے قلوب کو اس سے بھی پاک و صاف دیکھنا چاہتے ہیں،



کہ مال کا تصرف ہی کیوں آوے، اس لئے اس تصرّف کو طلب دنیا سے تعبیر کر کے ناپسندیدگی کا اظہار فرمادیا، واللہ اعلم۔

إِذْ تَصْعَدُونَ وَلَا تَكُونُ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي

تم چڑھے چلے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کہیں کو اور رسول پکارتا تھا تم کو تمھارے

اُخْرٰكُمْ فَأَتَاكُمْ غَمًّا بَغِيمٌ يَّكِيدُ لَكُمْ تَحْزِنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ

پیچھے سے پھر پہنچا تم کو غم عوض میں غم کے تاکہ تم غم نہ کیا کرو اس پر جو ہاتھ سے نکل جانے

وَلَا مَا آصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۵۶﴾ ثُمَّ أَنْزَلَ

اور نہ اس پر کہ جو کچھ پیش آجائے اور اللہ کو خبر ہے تمھارے کام کی پھر تم پر اتارا

عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نَّعَاسًا يَغْشَى طَائِفَةً مِّنْكُمْ

تسل کے بعد امن کو جو اونٹنک تھی کڑھانک لیا اس اونٹنک نے بعضوں کو تم میں سے

وَلَا يَفْقَهُ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ

اور بعضوں کو فکر پڑ رہا تھا اپنی جان کا خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال

ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ وَنَسُوا

جاہلوں جیسے کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں تو کہہ

إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي

سب کام ہے اللہ کے ہاتھ وہ اپنے جی میں

أَنْفُسُهُمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانَتْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ

جھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا

شَيْءٌ مَا قَتَلْنَا هَٰؤُلَاءِ قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بَيْوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ

ہمارے ہاتھ تو ہم ماریں نہ جاتے اس جگہ تو کہہ اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْشُرَ اللَّهُ مَا

جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا اپنے پڑاؤ پر اور اللہ کو آزمانا تھا جو کچھ

فِي صُدُورِكُمْ وَلِيَبْلُغَنَّ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ

تمھارے جی میں ہے اور صاف کرنا تھا اس کا جو تمھارے دل میں ہے اور اللہ جانتا ہے



بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۱۵۴ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى

دلوں کے بھید جو لوگ تم میں سے ہٹ گئے جس دن لڑیں دو

الْجَمْعِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ

توہیں سوان کو بہکا دیا شیطان نے ان کے گناہ کی شامت سے اور ان کو

عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ط إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝۱۵۵

بخش چکا اللہ اللہ بخشنے والا ہے تحمل کرنے والا

رَبِّطِ آيَاتِ | یہ آیات بھی غزوہٴ اُحد کے واقعہ مذکورہ سے متعلق ہیں، پہلی آیت میں اس واقعہ پر صحابہ کرامؓ کے حزن و غم کا ذکر ہے، اور دوسری طویل آیت میں اس غم کے ازالہ کا بیان ہے، تیسری آیت میں مکرر اس کا اظہار ہے کہ اس میں جو صورت شکست پیش آئی وہ بھی کوئی سزا نہیں، بلکہ تو منین مخلصین اور منافقین میں تفرقہ کرنے کے لئے ایک آزمائش تھی، اور پھر مکرر صحابہ کرامؓ کی لغزش کی معافی کا اعلان ہے۔

## خلاصہ تفسیر

وہ وقت یاد کرو جب تم رہھا گئے ہوئے جنگل کو (چڑھے چلے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے (کہ ادھر آؤ ادھر آؤ مگر تم نے سنا ہی نہیں) سو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے کے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تاکہ (اس پاداش اور مصیبت سے تم میں جنگی پیدا ہو جائے جس سے پھر) تم مغموں نہ ہوا کرو نہ اس جیسے پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جاوے، اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے، اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی اس لئے تم جیسا کام کرتے ہو اس کے مناسب پاداش تجویز فرماتے ہیں آگے ازالہ غم کا بیان ہے) پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر حسین (اور راحت) بھیج دی یعنی اونگھ (جب کہ کفار میدان سے واپس ہو گئے اس وقت غیب سے مسلمانوں پر اونگھ غالب ہوئی جس سے سب غم غلط ہو گیا) کہ تم میں سے ایک جماعت (یعنی مسلمانوں) پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا اور ایک جماعت وہ تھی (یعنی منافقین کی) کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی (کہ دیکھئے یہاں کچھ کر بھی جاتے ہیں) وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلافت واقع گمان کر رہے تھے جو محض حماقت کا خیال تھا (وہ خیال آگے ان کے قول سے



اور اس کا حماقت و جہالت ہونا اس کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، ان کا قول یہ تھا کہ (وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا اختیار کچھ چلتا ہے) مطلب یہ تھا کہ ہماری رائے کسی نے نہ سنی جو جنگ سے پہلے ہم نے دی تھی خواہ مخواہ سب کو مصیبت میں پھنسا دیا، آپ فرمادیکئے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا (چلتا) ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر عمل بھی ہوتا جب بھی قضا الہی غالب رہتی اور جو افتار آنے والی تھی آکر رہتی، چنانچہ ان کے قول اور اس کے جواب کا مطلب آگے مفصل آتا ہے) وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے (صراحتاً) ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ ظاہر میں ان کے اس قول کا کہ ہمارا کیا اختیار ہے یہ مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ تقدیر الہی کے سامنے بندہ کی تدبیر نہیں چلتی جو کہ عین ایمان کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جو لطیف جواب دیا گیا اس میں اس معنی کی تصدیق بھی ہے کہ واقعی اختیار اللہ ہی کا غالب ہے مگر درحقیقت ان کا مطلب اس قول سے یہ نہیں تھا، بلکہ وہ یہ بات اس معنی سے کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا (یعنی ہماری رائے پر عمل ہوتا) تو ہم (میں جو لوگ یہاں قتل ہوئے وہ) یہاں مقتول نہ ہوتے (جس کا حاصل یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اسی لئے آگے ان کے اس قول کی تکذیب اس طرح کی گئی کہ) آپ فرمادیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقتدر ہو چکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف (آنے کے لئے) نکل پڑتے جہاں وہ (قتل ہو کر) گرے ہیں (غرض یہ ہے کہ یہ ظاہری مضرت جس قدر ہوتی وہ تو ٹلنے والی نہ تھی) اور اس کے فوائد و منافع بہت عظیم تھے کیونکہ جو کچھ ہوا اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات (یعنی ایمان) کی آزمائش کرے (کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین کا اتفاق کھل گیا اور مؤمنین کا ایمان اور زیادہ مؤکد اور محقق ہو گیا) اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات (یعنی اسی ایمان) کو دشوائب اور وساوس سے صاف کر دے (کیونکہ مصیبت سے مؤمن کی توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاتی ہے جس سے ایمان کو جلا اور قوت پہنچتی ہے) اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں ان کو آزمائش کی حاجت نہیں، مگر اس لئے کہ عدالتی طریقہ سے مجرم کا جرم کھل کر سامنے آجائے ایسے امور واقع کئے جاتے ہیں، یقیناً تم میں جن لوگوں نے (میدان جنگ کے) پشت پھیر دی تھی جس روز کہ وہ دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور کفار کی) باہم مقابل ہوئیں (یعنی اُحد کے روز اس کی وجہ) اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دیدی ان کے بعض اعمال (گزشتہ) کے سبب (یعنی ان سے کچھ خطا و قصور) ایسے ہو گئے تھے جس سے شیطان کو ان سے اور بھی مصیبت کرا دینے کی طبع ہو گئی، اور اتفاق



سے وہ طبع پوری بھی ہو گئی، اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو معاف فرمایا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے  
معفرت کرنے والے بڑے حلم والے ہیں (کہ صدور خطا کے وقت بھی کوئی سزا نہیں دی)

## معارف و مسائل

مذکورہ صدر پہلی آیت میں کچھ صحابہ کرام کا میدان جنگ چھوڑ کر چلا جانا اور خود رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کے آواز دینے پر بھی ان کا نہ آنا اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غم ہونا  
اور اس غم کے بدلے میں انجام کار صحابہ کو غم ہونا مذکور ہے، اور روایات حدیث میں ہے کہ حضرت  
کعب بن مالکؓ نے پکارا تو مسلمان جمع ہو گئے۔

اس کی توجیہ و تطبیق صاحب روح المعانی نے اس طرح کی ہے کہ اول رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے پکارا جو صحابہ کرامؓ نے سنا نہیں، اور دُور نکلے چلے گئے، اُس وقت حضرت  
کعب بن مالکؓ نے پکارا وہ سب سُن لیا تو جمع ہو گئے۔

بیانِ قرآن میں حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ اصل وجہ گھبراہٹ کی یہ خبر تھی کہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے، آپ کے پکارنے میں اس خبر کی کوئی تردید تو تھی نہیں  
اور آواز اگر پہنچ بھی ہو تو پہچانی نہیں گئی، پھر جب حضرت کعب بن مالکؓ نے پکارا تو اس  
میں اس خبر کی تردید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حیات ہونا مذکور تھا، یہ سن کر سب کی  
تسلی ہوئی اور سب جمع ہو گئے، باقی رہا یہ کہ پھر اس پر حق تعالیٰ کی طرف سے عتاب اور رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم کو غم کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر مستقبل مزاج رہتے تو آواز کو  
پہچان سکتے تھے۔

وَ لَیْسَ بِتِلْکَی اِلٰہِ مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَلَا یَہْدِیْکُمْ اللّٰہُ  
کہ غزوہٗ اُحد میں جو مصائب اور تکالیف صحابہ کرامؓ کو  
پیش آئیں وہ بطور سزا نہیں بلکہ بطور آزمائش تھیں  
معاف کر دی گئی

اس امتحان کے ذریعہ مؤمنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اظہار کرنا تھا، اور  
آثَابُکُمْ غَمًّا کے الفاظ سے جو اس کا سزا ہونا معلوم ہوتا ہے اس کی تطبیق یہ ہے کہ  
صورت تو سزا ہی کی تھی مگر یہ سزا مرثیہ اصلاح کے لئے تھی جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے  
کو، استاد اپنے شاگرد کو کچھ سزا دیتا ہے تو عرف میں اس کو سزا بھی کہہ سکتے ہیں، مگر  
درحقیقت یہ تربیت اور اصلاح کی ایک صورت ہوتی ہے، اہل کمانہ سزا اس مختلف ہے۔



واقعہ اُحد میں مسلمانوں پر حملہ مذکور لَیْسَتِلٰی سے آخر آیت تک ہوا شاید اس سے تو یہ معلوم مضائقہ اسباب کیا تھے؟ ہوتا ہے کہ وقوع مصائب کا سبب یہ ربانی حکمتیں تھیں، لیکن اگلی آیت میں اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کوئی سابقہ لغزش اس شیطانی اثر کا سبب ہو۔

جواب یہ ہے کہ ظاہری سبب تو وہ لغزش ہی ہوتی کہ اس کی وجہ سے شیطان کو ان سے اور معصیت کرا دینے کی بھی طبع ہو گئی، اور اتفاق سے اس کی وہ طبع پوری بھی ہو گئی، مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں یہ ٹکونی حکمتیں مستور تھیں، جن کو لَیْسَتِلٰی کُم میں بیان فرمایا ہے، روح المعانی میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعض وہ گناہ یاد دلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا نہ معلوم ہوا، اس لئے جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر کے پھر پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور شہید ہو کر اللہ سے ملیں۔

ایک گناہ دوسرے گناہ کا آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے، بھی سبب ہو جاتا ہے جیسے ایک نیکی دوسری کو کھینچتی ہے، یعنی اعمالِ حسنہ اور سیئہ میں

تجاذب ہے، جب انسان کوئی ایک نیک کام کر لیتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کے لئے دوسری نیکیاں بھی آسان ہو جاتی ہیں، اس کے دل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی طرح انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے دوسرے گناہوں کا راستہ ہوار کر دیتا ہے، دل میں گناہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے، اسی لئے بعض بزرگوں نے فرمایا،

اِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةَ  
بَعْدَ هَا وَاِنْ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ  
السَّيِّئَةِ بَعْدَ هَا۔  
”یعنی نیک کام کی ایک نقد جزا وہ  
دوسری نیکی ہے جس کی توفیق اس کو ہو جاتی  
ہے اور برے عمل کی ایک سزا وہ دوسرا گناہ  
ہے جس کیلئے پہلے گناہ نے راستہ ہوار کر دیا ہے۔“

حضرت حکیم الامت نے مسائل السلوک میں فرمایا کہ حدیث کی تصریح کے مطابق گناہ سے قلب میں ایک ظلمت اور تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اور جب قلب میں ظلمت آ جاتی ہے تو شیطان قابو پا لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحابہ کرامؓ کا مقام بلند اور ان کی خطاؤں پر عفو و درگزر کا بیشال معاملاً جس مورچہ پر بچا پس صحابہؓ کو یہ حکم دے کر بٹھایا تھا کہ ہم پر کچھ بھی حال گذرے تم یہاں سے نہ ہٹنا، ان کی بڑی تعداد یہاں سے ہٹ گئی، اگرچہ ہٹنے کا



سبب ان کی یا جہت اوی غلطی یہی کہ ابستج ہو چکی ہے اس حکم کی تعمیل پوری ہو چکی ہے، یہاں سے نیچے آکر سب مسلمانوں کے ساتھ مل جانا چاہئے، مگر وہ حقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات کے خلاف تھا، اسی خطا و قصور کے نتیجہ میں میدان جنگ بھاگنے کی غلطی سرزد ہوئی چکا اس میں بھی کسی تاویل ہی کا سہارا لیا گیا ہو، جیسا کہ زجاج سے اور نقل کیا جا چکا ہے، پھر یہ میدان جنگ بھاگنا ایسی حالت میں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ ہیں، اور پیچھے سے ان کو آواز دے رہے ہیں، یہ چیزیں اگر شخصیات اور گرد و پیش کے حالات سے الگ کر کے دیکھی جائیں تو بلاشبہ سخت ترین اور ایسے سنگین جرم تھے کہ مشاجرات صحابہ کے سلسلہ میں مختلف صحابہ پر جتنے الزامات مخالفین کی طرف سے لگائے جاتے ہیں یہ ان سب سے زیادہ شدید جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مگر غور کیجئے کہ حق تعالیٰ ان تمام خطاؤں اور غرضوں کے بعد بھی ان حضرات کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا، وہ مذکورہ آیات میں بڑی وضاحت سے آگیا، کہ اول ظاہری العام اولیٰ کا بھیج کر ان کی تکلیف اور مکان و پریشانی دور کی گئی، پھر یہ بتلایا گیا کہ جو مصائب اور عیش مسلمانوں کو اس وقت پہنچا ہے وہ نرمی سزا و عقوبت نہیں بلکہ اس میں کچھ مرتبہ حکمتیں مستور ہیں، پھر صاف لفظوں میں معافی کا اعلان فرمایا، یہ سب چیزیں ایک مرتبہ اس سے پہلے آچکی ہیں، اس جگہ پھر ان کا اعادہ فرمایا، اس تکرار کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ پہلی مرتبہ تو خود صحابہ کرام کی تسلی کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا، اور اس جگہ منافقین کے اس قول کا رد بھی مقصود ہے، جو وہ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم نے ہماری رائے پر عمل نہ کیا اس لئے مصائب و تکالیف کا سامنا ہوا۔

بہر حال ان تمام آیات میں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آگئی کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہے کہ اتنی بڑی عظیم خطاؤں اور غرضوں کے باوجود ان کے ساتھ معاملہ صرف عفو و درگزر کا ہی نہیں، بلکہ لطف و کرم کا فرمایا گیا، یہ معاملہ تو خود حق تعالیٰ کا اور نصوص قرآنی کا بیان ہوا ہے، اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کا حضور کے سامنے پیش ہوا، انھوں نے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے حالات کے متعلق ایک خط لکھ دیا تھا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ وحی اس کی حقیقت کھل اور خط پکڑا گیا تو صحابہ کرام میں حاطب ابن ابی بلتعہ کے خلاف سخت غیظ و غضب تھا، فاروق اعظم نے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن مار دوں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ وہ منافق



نہیں مومن نخلص میں مگر یہ غلطی ان سے سرزد ہو گئی، اس لئے اس کو معاف فرمایا، اور فرمایا کہ یہ اہل بدر میں سے ہیں، اور شاید اللہ تعالیٰ نے تمام حاضرین بدر کے متعلق مغفرت اور معافی کا حکم نافذ کر دیا ہے (یہ روایت حدیث کی سب سے معتبر کتب میں موجود ہے)

صحابہ کرام کے متعلق عام یہ ہیں سے اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ اور عمل کی تصدیق ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں، ان سے بڑے گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود امت کے لئے یہ جائز نہیں کہ ان کی طرف کسی بُرائی اور عیب کو منسوب کرے، جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتنی بڑی لغزشوں اور خطاؤں کو مغفرت کر کے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمایا اور ان کو رضی اللہ عنہم ورضوانہ کا مقام عطا فرمایا، تو پھر کسی کو کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کا بُرائی کے ساتھ تذکرہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے ایک مرتبہ کسی نے حضرت عثمان غنیؓ اور بعض صحابہ کرامؓ پر غزوہ احد کے اسی واقعہ کا ذکر کر کے طعن کیا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جس چیز کی معافی کا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا اس پر طعن کرنے کا کسی کو کیا حق ہے (صحیح بخاری)

اس لئے اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی کتابیں سب اس پر متفق ہیں کہ تمام صحابہ کرامؓ کی تعظیم اور ان پر طعن و اعتراض سے پرہیز واجب ہے، عقائدِ نسفیہ میں ہے:

وَيَكْفُ عَنْ ذِكْرِ الصَّحَابَةِ  
إِلَّا بِخَيْرٍ

یعنی واجب ہے کہ صحابہ کا ذکر بغیر خیر کے اور بھلائی کے نہ کرے۔

اور شرح مسامہ ابن ہام میں ہے:

إِعْتِقَادُ أَهْلِ السُّنَّةِ تَرْكِهٖ  
جَمِيعِ الصَّحَابَةِ وَالشَّاءُ عَلَيْهِمْ

یعنی اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ کو عدل و ثقات سمجھیں، ان کا ذکر مدح و ثناء کے ساتھ کریں۔

شرح مواقف میں ہے:

يَجِبُ تَعْظِيمُ الصَّحَابَةِ كُلِّهِمْ  
وَالْكَفُّ عَنِ الْقَدَحِ فِيهِمْ

یعنی تمام صحابہؓ کی تعظیم واجب ہے، اور ان پر طعن و اعتراض سے باز رہنا واجب ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے عقیدہ واسطیہ میں فرمایا ہے کہ:-



اہل سنت والجماعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے درمیان جو اختلافات اور قتل و قتال ہوئے ہیں ان میں کسی پر الزام و اعتراض کرنے سے باز رہیں، وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں جو روایا اُن کے عیوب کے متعلق آئی ہیں ان میں بکثرت توجہی اور غلطیوں جو دشمنوں نے اڑائی ہیں، اور بعض وہ ہیں جن میں کمی بیشی کر کے اپنی اصلیت کے خلاف کر دی گئی ہیں، اور جو بات صحیح بھی ہے تو صحابہ کرامؓ اس میں اجتہادی رائے کی بناء پر معذور ہیں، اور بالفرض جہاں وہ معذور بھی نہ ہوں تو اللہ کا قانون یہ ہے کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ یعنی اعمالِ صالحہ سے بُرے اعمال کا بھی کفار ہو جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ کے اعمالِ صالحہ کے برابر کسی دوسرے کے اعمال نہیں ہو سکتے، اور اللہ تعالیٰ کے عقود و کرم کے جتنے وہ مستحق ہیں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں کہ ان کے اعمال پر مواخذہ کرے، اور ان میں سے کسی پر طعن و اعتراض کی زبان کھولے۔  
(عقیدہ واسطیہ ملخصاً)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا

لے ایمان والو تم نہ ہو اُن کی طرح جو کافر ہوئے اور کہتے ہیں

لَاخْوَانَهُمْ إِذَا خَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غَنَىٰ لَّهُمْ أَوْ كَانُوا

اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کو نکلیں ملک میں یا ہوں چہاد میں اگر رہتے

عِنْدَ نَاَمَاتٍ أَوْ مَا قَتَلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي

ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ ملے جاتے تاکہ اللہ ڈالے اس گمان سے افسوس

قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ مُخِيٍّ وَيُمِيتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

ان کے دلوں میں اور اللہ ہی چلاتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تمہارے سب کام

بَصِيرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مِتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ

دیکھتا ہے اور اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا مر گئے تو بخشش

مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ وَلَئِنْ مِتُّمْ

اللہ کی اور مہربانی اس کی بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں اور اگر تم مر گئے

أَوْ قُتِلْتُمْ لَا إِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ۝

یا مارے گئے تو ابتر اللہ ہی کے آگے اکٹھے ہو گئے تم سب



**رَبِّطِ آيَاتِ** | پچھلی آیتوں میں منافقین کا یہ قول بیان کیا گیا تھا کہ لَوْ كَانَتْ لَنَا مِنْ آلَاءِكَ شَيْءٌ مِمَّا قِيلَ لَنَا هَذَا، یعنی اگر ہمارا کچھ خستیاں ہوتا اور ہماری رائے مانی جاتی تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے، جسکو آگے بھی نقل کیا گیا ہے، ایسے اقوال کے سننے سے یہ احتمال تھا کہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شکوک و شبہات نہ پیدا ہو جائیں، اس لئے مذکورہ بالا آیات میں مسلمانوں کو ایسے اقوال و احوال سے پرہیز کرنے کی اور موت و حیات کو صرف تالیفِ تقدیر ہونے کی ہدایات دی گئی ہیں،

### خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو (حقیقت میں) کافر ہیں مگر ظاہراً اسلام کا دعویٰ کرتے ہوں، اور کہتے ہیں اپنے (ہم نسب یا ہم مشرب) بھائیوں کی نسبت جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں (اور وہاں اتفاقاً مر جاتے ہیں) یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں (اور اس میں تقدیر سے قتل ہو جاتے ہیں تو وہ منافق کہتے ہیں) کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے (سفر اور غزوہ میں نہ جاتے) تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (یہ بات ان کے دل اور زبان پر اس لئے آتی ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب کے لئے موجب حسرت کر دیں (یعنی نتیجہ اس طرح کی باتوں کا حسرت کے سوا کچھ نہیں) اور مارتا چلاتا تو اللہ ہی ہے (خواہ سفر ہو یا حضر اور جنگ ہو یا امن) اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں، (تو اگر تم بھی ایسی باتیں کر دیا ایسے خیالات میں مبتلا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا) اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ (اللہ کی راہ میں) مر جاؤ (تو یہ کوئی) خسارہ نہیں نفع ہی نفع ہے کیونکہ بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت (دنیا کی) ان چیزوں کا بدلہ دے گا، بہتر ہے جنگو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں (اور اسی کے لالچ میں زندگی کو محبوب رکھتے ہیں اور) اگر تم (ویسے بھی) مر گے یا مارے گے (تب بھی) بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (پس اول تو قصاص ملے نہیں) دوسرے اللہ کے پاس جانے کسی حال میں نہیں سکتے اور دین کی راہ میں مرنے یا مارا جانا تو موجب مغفرت و رحمت ہے تو پھر ویسے مرنے یا مارے جانے کی راہ میں جانا بہتر ہے اس لئے اقوال دنیا میں موجب حسرت اور آخرت میں موجب جہنم ہے ان پر ہیز لازم ہے،

فِي سَبَأٍ رَّحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لَئِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكَ فِتْنَةٌ فَخَاطِلٌ

سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے جو تیرے دل میں گیا ان کو اور اگر تُو ہوتا تشریح و سخت

الْقَلْبُ لَا تَفْضَحُوا مِنْ حَوْلِكَ صَدَقَ عَنْهُمْ وَأَسْتَغْفِرُ لَهُمْ

دل تو متفرق ہو جائے میرے پاس سے سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ



وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ

اور ان سے مشورہ لے کام میں پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر اللہ

اللَّهُ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾

کو محبت ہے توکل والوں سے -

**رابط آیات** غزوہ اُحُد میں بعض مسلمانوں کی لغزش اور میدان چھوڑنے سے جو صدمہ اور غم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچا تھا، اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طبعی اخلاق اور عادات عفو و کرم کی بناء پر ان کو اس پر کوئی ملامت نہیں کی، اور کوئی معاملہ سختی کا بھی نہیں کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے رسولؐ کے ساتھیوں کی دلجوئی اور ان کے دلوں میں اس غلطی پر جو صدمہ اور اپنے قصور پر جو مذمت تھی ان سب کو دھو دینا منظور ہوا تو اس آیت میں آپؐ کو مزید لطف و کرم کی ہدایت اور صحابہ کرامؓ سے معاملات میں مشورہ لینے کا حکم دیا۔

## خلاصہ تفسیر

بعد اس کے کہ صحابہ کرامؓ سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپؐ کو ملامت اور مواخذہ کر لے کا حق تھا، خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپؐ پر ہے) آپؐ ان کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپؐ (خدا بخواسستہ) بخند و خنک مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپؐ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض و برکات کہاں نصیب ہوتے) سو جب آپؐ نے برتاؤ میں ایسی نرمی فرمائی تو ان سے جو غلطی آپؐ کی تعمیل حکم میں ہو گئی ہے اس کو دل سے بھی ان کو معاف کر دیجئے (اور ان سے جو غلطی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی سے ہوئی اس کیلئے) آپؐ ان کے لئے استغفار کیجئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خود انکی معافی اور مغفرت کا اعلان پہلے ہی فرما دیا تھا مگر آپؐ کا ان کے لئے دعا و مغفرت کرنا مزید ان کے لئے مفید اور موجب تسلی ہوگا) اور ان سے خاص خاص باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے (تاکہ اس خصوصی لطف سے ان کے دلوں سے غم و صعل جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپؐ (کسی ایک جانب) رائے پہنچتے کر لیں (خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف) تو خدا تعالیٰ پر اعتماد (کر کے اس کام کو کر ڈالا) کریں بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔



## معارف و مسائل

مرشد و مربی کی خاص صفات صحابہ کرامؓ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق اور اپنی جان و مال سے زیادہ آپ کو عزیز رکھنے والے تھے، ان سے جب آپ کے حکم کے خلاف ایک لغزش صادر ہوگئی تو یہاں ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ ان حضرات کو جب اپنی لغزش اور خلاف ورزی حکم پر تنبیہ ہو تو ان کا صدمہ حد سے بڑھ جائے، جو ان کے قلب و دماغ کو معطل کر دے۔

یا رحمت سے مایوس بنائے، اس کا علاج تو بھلی آیت میں بتلادیا گیا کہ فَاثَابَكُمْ عَذَابًا فَجِيمًا اس عجز و شرم کی سزا دنیا میں دی جا چکی ہے، آخرت کا کھانا بیابان ہو گیا۔

دوسری طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غلطی اور لغزش کے نتیجہ میں زخمی ہوئے، جس سے جسمانی تکلیف بھی پہنچی، اور روحانی تکلیف تو پہلے ہی سے تھی، تو اس جسمانی درد و جانی تکلیف سے یہ احتمال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں صحابہ کرامؓ کی طرف سے تکذیب پیدا ہو جائے، جو ان کی ہدایت و تلقین میں مغل ہو جائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تعلیم دینا تھی کہ آپ ان کی خطا سے درگزر فرمائیں، ان کی لغزش و دل سے معاف کر دیں، اور آئندہ کے لئے بھی لطف و مہربانی کا معاملہ جاری رکھیں۔ اس مضمون کو حق تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب اسلوب بیان کے ساتھ ارشاد فرمایا، جس میں ضمنی طور پر چند اہم فوائد بھی آگئے:

ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں کا حکم ایسے انداز سے دیا گیا ہے جس میں آپ کی ثناء و تعریف اور عظمت شان کا اظہار بھی ہے کہ یہ صفات آپ کے اندر پہلے سے موجود ہیں، اور دوسرے اس سے پہلے فَبِمَا رَحْمَةٍ کا لفظ بڑھا کر یہ بھی بتلادیا کہ ان صفات کمال کا آپ کے اندر ہونا یہ ہماری رحمت سے ہے، کسی کا ذاتی کمال نہیں پھر لفظ رحمت کو بصورتِ نکرہ لاکر رحمت کے عظیم اور وسیع ہونے کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ رحمت صرف صحابہ کرامؓ پر ہی نہیں، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ہے کہ آپ کو ان صفات کمال کے ساتھ متصف فرمادیا۔

اس کے بعد ایک تیسرا اہم فائدہ بعد کے جملوں سے ظاہر فرمادیا، کہ یہ نرم خوئی، خوش اخلاقی، عفو و درگزر اور لطف و مہربانی کی صفات اگر آپ کے اندر نہ ہوتیں تو اصلاحِ خلایق کا جو کام آپ کے سپرد ہے وہ حسبِ منشاء انجام نہ پاتا، لوگ آپ کے ذریعہ اپنی اصلاح اور تزکیہ حسیل نہ حاصل کرنے کے بجائے آپ سے بھاگ جاتے۔



اور اس سب مجموعہ سے ایک اور اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ ارشاد و اصلاح اور تبلیغ کے آداب اس سے معلوم ہو گئے، کہ جو شخص رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کے کام کا ارادہ کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول کی سخت برداشت نہیں ہو سکتی تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدد اور کج خلقی کے ساتھ خلق اللہ کو اپنے گرد جمع کرے، اور ان کی اصلاح کا فرض انجام دے سکے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ تند خو، سخت طبیعت ہوتے، تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لئے تند خوئی سخت کلامی، زہر اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا فَاعْفُ عَنْهُمْ، یعنی ان سے جو خطا ہو گئی ہے اس کو آپ معاف فرمادیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے، بلکہ عفو و درگزر سے کام لے، بُرا کہنے والوں پر متعل نہ ہو، ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ، یعنی آپ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں، جس میں یہ ہدایت ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں، بلکہ دل سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑیں، اور چونکہ سب بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی درستی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب بچانے کے لئے بخشش کی دعا مانگیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ، یعنی حسب سابق اپنے فیصلوں اور کاموں میں ان حضرات سے مشورہ بھی لیا کریں تاکہ ان کی پوری تسلی ہو جائے، اس میں اس کی طرف ہدایت فرمائی کہ جو خیر خواہی کا داعیہ ان کے لئے قلب میں ہے عمل سے بھی اس کا اظہار کریں کہ اپنی مشاورت سے ان کو مشرف فرمادیں۔

اس پوری آیت میں مصلح و مبلغ کے لئے چند صفات کا ہونا ضروری قرار دیا گیا، اوّل سخت کلامی اور کج خلقی سے بچنا، دوسرا ان لوگوں سے کوئی غلطی یا ان کے متعلق ایذا کی کوئی چیز صادر ہو جائے تو انتقام کے درپے نہ ہونا بلکہ عفو و درگزر کا معاملہ کرنا، تیسرے یہ کہ انکی خطاؤں اور لغزشوں کی وجہ سے اُن کی خیر خواہی نہ چھوڑنا، ان کے لئے دعا و استغفار بھی کرتے رہنا اور ظاہری معاملہ میں ان کے ساتھ سلوک کا معاملہ چھوڑنا، مذکورہ آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا حکم اور پھر مشورہ کے بعد طریق عمل کی ہدایت کی گئی ہے، مشورہ کے بارے میں قرآن کریم نے دو جگہ صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیت مذکورہ دوسرے سورہ شوریٰ کی آیت جس میں



سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (۳۸:۴۲)، یعنی اور ان کا ہر کام آپس کے مشورے ہوتا ہے۔ اور بعض جگہ ضمنی طور پر مشورہ کی ہدایت فرمائی ہے جیسے رضاعت کے احکام میں ارشاد فرمایا: **عَنْ تَوَاضُعٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ** (۲۳۳:۲) یعنی بچے کا دودھ چھڑانا ماں اور باپ دونوں کی رضا مندی اور مشورہ سے ہونا چاہئے، مشورہ سے متعلق چند اہم مسائل قابل غور ہیں۔

**پہلا مسئلہ**، لفظ امر اور مشورہ کے معنی، دوسرا مسئلہ، مشورہ کی شرعی حیثیت، تیسرا مسئلہ، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا درجہ، چوتھا مسئلہ، حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ، پانچواں مسئلہ، مشورہ میں اختلافِ رائے ہو تو فیصلہ کی صورت، چھٹا مسئلہ، ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل۔

**پہلا مسئلہ** | لفظ امر کا اطلاق عربی زبان میں کسی معنی کیلئے ہوتا ہے، ایک عام معنی میں لفظ امر اور شوری کی تحقیق آتا ہے، جو ہر مہتمم بالشان قول و فعل کو شامل ہے، دوسرا اطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے، جس پر قرآن کریم میں لفظ ادلی الامر معمول ہے، تیسرا اطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لئے ہے، جس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے مثلاً **الْأَلَهُ الْخَلْقِ وَالْأَمْرِ** (۵۴:۴)، **إِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا** (۲۳:۱۱)، **إِنَّ الْأُمُورَ كُلَّهَا يَكُونُ** (۱۵۴:۳)، **أَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ** (۲۴۵:۲)، اور محققین کے نزدیک **قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي** (۸۵:۱۷) میں بھی یہی امر مراد ہے، اب قرآن کے ارشاد **وَتَشَاوُرُهُمْ فِي الْأُمْرِ** (۱۵۹:۳) اور **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (۳۸:۴۲) میں دونوں معنی کا احتمال ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں اور دوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ عجیب نہیں، کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات سبھی خاص اہمیت رکھتے ہیں اس لئے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو، خواہ حکومت سے متعلق ہو، خواہ معاملات سے، اور لفظ شوری، مشورہ، مشاورت کے معنی ہیں کسی قابل غور معاملہ میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا، اس لئے **وَتَشَاوُرُهُمْ فِي الْأُمْرِ** کے معنی یہ ہوتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ قابل غور معاملات میں جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں، صحابہ کرام سے مشورہ لیا کریں، یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورہ شوری کی آیت **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** کے معنی یہ ہوتے کہ ہر قابل غور معاملہ میں جس میں کوئی اہمیت ہو، خواہ حکم و حکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے، ان میں سچے مسلمانوں کی عادتِ مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔



دو میں امسئلہ | اس بارہ میں قرآن کریم کے ارشادات مذکورہ اور احادیث نبویہ سے معلوم مشورہ کی شرعی حیثیت ہوتا ہے کہ ہر ایسے معاملہ میں جس میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں خواہ وہ حکم و حکومت سے متعلق ہو یا کسی دوسرے معاملہ سے باہمی مشورہ لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی سنت اور دنیا و آخرت میں باعث برکات ہے، قرآن و حدیث میں اس کی تائید آئی ہے، اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے جیسے معاملات حکومت ان میں مشورہ لینا واجب ہے۔ (ابن کثیر)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف ہدایت مل جاتی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب تمھارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں اور تمھارے مالدار سخی ہوں، اور تمھارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوں، تو زمین کے اوپر رہنا تمھارے لئے بہتر ہے، اور جب تمھارے حکام بدترین افراد ہوں اور تمھارے مالدار بخیل ہوں، اور تمھارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمھارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم پر خواہش پرستی غالب آجائے کہ بھلے بُرے اور نافع و مضر سے قطع نظر کر کے محض عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے معاملات اس کے سپرد کر دو تو اس وقت کی زندگی سے تمھارے لئے موت بہتر ہے، ورنہ مشورہ میں کسی عورت کی بھی رائے لینا کوئی ممنوع نہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے تعامل سے ثابت ہے اور قرآن کریم میں سورۃ بقرہ کی آیت جو ابھی بیان کی گئی ہے اس میں ارشاد ہے عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ، یعنی بچہ کا درد چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے، اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے، اس لئے خاص طور سے عورت کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

الْمُسْتَشَارُ مَوْتٌ اِذَا اسْتَشِيرَ | ”یعنی جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے

فَلَيْشُءٌ بِمَا هُوَ صَانِعٌ لِّنَفْسِهِ | وہ امین ہے اس پر لازم ہے کہ اس معاملہ

میں جو کام وہ خود اپنے لئے تجویز کرتا ہے وہی راستہ دوسرے کو دے اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔“



یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں بسند حسن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (منظری)  
 البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف اپنی چیزوں میں مستنون ہے جن کے بارہ میں  
 قرآن و حدیث کا کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو، ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہو  
 اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں بلکہ جائز بھی نہیں، مثلاً کوئی شخص اس میں مشورہ کرے  
 کہ نماز پڑھے یا نہیں، زکوٰۃ دے یا نہیں، حج کرے یا نہیں، یہ مشورہ کی چیزیں نہیں، شرعی  
 طور پر فرض قطعی ہیں، البتہ اس میں مشورہ کیا جاسکتا ہے کہ حج کو اس سال جائے یا آئندہ، اور  
 پانی کے جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے، اور سکی کے راستے سے جائے یا دوسرے طریق سے۔  
 اسی طرح زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ مشورہ لیا جاسکتا ہے کہ اس کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ  
 کیا جائے، کیونکہ یہ سب امور شرعاً اختیاری ہیں۔

ایک حدیث میں خود اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے، حضرت علی  
 کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ کے بعد  
 اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحتہً قرآن میں نازل نہیں ہوا، اور آپ  
 بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو، تو ہم کیا کریں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لئے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار فقہاء کو جمع کرو، اور  
 ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو، کسی کی تہنارائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس حدیث شریفہ سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مشورہ صرف دنیوی معاملات  
 میں نہیں بلکہ جن احکام شرعیہ میں قرآن و حدیث کی صریح نصوص نہ ہوں ان احکام میں بھی  
 باہمی مشورہ مستنون ہے، اور دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ ایسے لوگوں سے لینا چاہئے جو  
 موجودہ لوگوں میں تفقہ اور عبادت گزاری میں معروف ہوں (اخرج الخطیب کذا فی الروح)  
 نیز خطیب بغدادی نے حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے:

اَسْتَشِرُّكُمْ وَالْعَاقِلُ وَلَا تَعْصُوْا

فَدَنْتُمْ مَوَا

”یعنی عقل مند آدمی سے مشورہ لو اور اس

کے خلاف نہ کرو ورنہ ندامت اٹھانی ہوگی“

ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ مجاہد شوری کے ارکان میں دو وصف  
 ضروری ہیں، ایک صاحب عقل و رائے ہونا، دوسرے عبادت گزار ہونا، جس کا حاصل ہے  
 ذی رائے اور متقی ہونا، اور اگر مسئلہ شرعی ہے تو فقیہ ہونا بھی لازم ہے۔



تفصیل مسئلہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرام سے مشورہ لیں، اس میں یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور صاحب وحی ہیں، آپ کو کسی سے مشورہ

کی کیا حاجت ہے، آپ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی ہے، ان لئے بعض علماء نے اس حکم مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی، نہ اس مشورہ پر آپ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرام کے اعزاز اور دل جوئی کے لئے مشورہ کا حکم آپ کو دیا گیا ہے، لیکن امام ابو بکر جصاصؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا، اور نہ مشورہ کا کسی کام پر کوئی اثر ہے تو پھر اس مشورہ پر کوئی دل جوئی اور اعزاز بھی نہیں رہتا، بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام امور میں تو براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے، مگر بمقتضائے حکمت و رحمت بعض امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ایسے ہی امور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی قسم کے امور میں مشورہ لینے کا آپ کو حکم دیا گیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے صحابہ کرام سے مشورہ لیا تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ اگر آپ ہمیں دریا میں کود پڑنے کا حکم دیں تو ہم اس میں کود پڑیں گے، اور اگر آپ ہمیں برک الغماد جیسے دور دراز مقام کی طرف چلنے کا ارشاد فرمائیں گے تو ہم آپ کے ساتھ ہوں گے، ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب کفار سے مقابلہ کریں، بلکہ ہم یہ عرض کریں گے کہ آپ تشریف لے چلیں ہم آپ کے ساتھ آپ سے آگے اور پیچھے اور دائیں بائیں دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

اسی طرح غزوہ اُحُد میں اس بارہ میں مشورہ کیا کہ کیا مدینہ شہر کے اندر رہ کر مدافعت کریں یا شہر سے باہر نکل کر عام طور سے صحابہ کرام کی رائے باہر نکلنے کی ہوئی، تو آپ نے اسی کو قبول فرمایا، غزوہ خندق میں ایک خاص معاہدہ پر صلح کرنے کا معاملہ پیش آیا، تو سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ نے اس معاہدہ کو مناسب نہ سمجھ کر اختلاف کیا، آپ نے انہی دونوں کی رائے قبول فرمائی، حدیثیہ کے ایک معاملہ میں مشورہ لیا تو صدیق اکبرؓ کی رائے پر فیصلہ فرما دیا۔ قصہ افک میں صحابہ کرام سے مشورہ لیا، یہ سب معاملات وہ تھے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص جانب متعین نہیں کی گئی تھی۔



خلاصہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت اور صاحبِ وحی ہونا کچھ مشورہ کے منافی نہیں، اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشورہ محض نمائشی دل جوئی کے لئے ہو، اس کا اثر معاملات پر نہ ہو بلکہ بہت مرتبہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو آپ نے اپنی رائے کے خلاف بھی قبول فرمالیا، بلکہ بعض امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بذریعہ وحی کوئی خاص صورت متعین نہ فرمانے اور مشورہ لے کر کام کرنے میں حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ آئندہ امت کے لئے ایک سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جاری ہو جائے کہ جب آپ کو بھی مشورہ سے استغناء نہیں تو پھر ایسا کون ہے جو استغناء کا دعویٰ کر سکے، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام میں ایسے مسائل میں مشاورت کا طریق ہمیشہ جاری رہا، جن میں کوئی نص شرعی نہ تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کا بھی یہی معمول رہا، بلکہ بعد میں تو ایسے احکام شرعیہ کی دریافت کے لئے بھی مشورہ کا معمول رہا، جن میں قرآن و حدیث کا کوئی صریح فیصلہ نہ تھا، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریق کار بتلایا تھا۔

چوتھا مسئلہ: حکومتِ اسلامی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے دو جگہ مشورہ میں مشورہ کا درجہ کیا ہے | کا صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیت مذکورہ اور دوسرے

سورۃ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے، ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے: **وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ** (۳۸:۴۲) یعنی اور ان کا کام آپس کے مشورے ہوتا ہے ان دونوں جگہ پر مشورہ کے ساتھ لفظ امر مذکور ہے، اور لفظ امر کی مفصل تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ہر مہتمم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے، اور حکم اور حکومت کے لئے بھی بولا جاتا ہے، امر کے خواہ معنی اول مراد لیں یا دوسرے معنی حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا بہر صورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے، حکم یا حکومت مراد لینے کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے، اور اگر معنی عام لئے جائیں جب بھی حکم اور حکومت کے معاملات مہتمم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابل مشورہ ٹھہریں گے، اس لئے امیر اسلام کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت کے اہم معاملات میں اہل حل و عقد سے مشورہ لیا کرے، قرآن کی آیات مذکورہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا مسلسل تعامل اس کی روشن سند ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جس طرح معاملات حکومت میں مشورہ کی ضرورت واضح ہوئی اسی طرح ان سے اسلام کے طرز حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اصول بھی سامنے



آگئے، کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں، آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے، شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً و کرہاً اسی طرف آرہی ہیں، لیکن اب سے چودہ سو برس پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے جبکہ پوری دنیا پر آج کے تین بڑوں کی جگہ دو بڑوں کی حکومت تھی، ایک کسریٰ، دوسرا قیصر اور ان دونوں کے آئین حکومت شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں مشترک تھے، جس میں ایک شخص واحد لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی قابلیت و صلاح سے نہیں، بلکہ وراثت کے ظالمانہ اصولوں کی بناء پر حکومت کرتا تھا، اور انسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی بادشاہی العام سمجھا جاتا تھا، یہی نظریہ حکومت دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلط تھا، صرف یونان میں جمہوریت کے چند دھندلے اور تمام نقوش پا سے جاتے تھے، لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مدہم تھے کہ ان پر کسی مملکت کی بنیاد رکھنا مشکل تھا، اسی وجہ سے جمہوریت کے ان یونانی اصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہیں بن سکی، بلکہ وہ اصول اور سطو کے فلسفہ کی ایک شاخ بن کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کر کے امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں دیا، جس کو وہ اپنے نمائندوں اہل حل و عقد کے ذریعہ استعمال کر سکیں، بادشاہ پرستی کی ذلزل میں پھنسی ہوئی دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ اور فطری نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی روح ہے اسی طرز حکومت کی، جس کو آج جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن موجودہ طرز کی جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم و ستم کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق العنان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنایا کہ ان کے قلب و دماغ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصلی مالکیت و حکومت کے تصور سے بھی بیگانہ ہو گئے، اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ ہی کے بچے ہوئے عوامی اختیار پر خدا تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی بار خاطر خلاف انصاف تصور کرنے لگیں۔

اسلامی آئین نے جس طرح خلق خدا کو کسریٰ و قیصر اور دوسری شخصی بادشاہتوں کے جبر و استبداد کے پنجہ سے نجات دلائی، اسی طرح ناخدا آشنا مغربی جمہوریتوں کو بھی خدا شناسی اور خدا پرستی کا راستہ دکھلایا، اور بتلایا کہ ملک کے حکام ہوں، یا عوام، خدا تعالیٰ کے دیئے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں، ان کے عوام اور عوامی اسمبلی کے اختیارات، قانون سازی، عزل و نصب خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں، ان پر لازم ہے کہ امیر کے انتخاب میں اور



پھر عہد دل اور منصبوں کی تقسیم میں ایک طرف قابلیت اور صلاحیت کی پوری رعایت کریں تو دوسری طرف ان کی دیانت و امانت کو پرکھیں، اپنا امیر ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم، تقویٰ، دیانت، امانت، صلاحیت، اور سیاسی تجربہ میں سب بہتر ہو، پھر یہ امیر منتخب بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں، بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے، قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تعامل اس پر شاہد عدل ہیں، حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:

لَا خِلَافَةَ إِلَّا عَنْ مَشُورَةٍ | یعنی شوریئت کے بغیر خلافت نہیں ہے۔

(کنز العمال بحوالہ ابن ابی شیبہ)

شوریئت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کے لئے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے حتیٰ کہ اگر امیر مملکت مشورہ سے آزاد ہو جائے، یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطہ نظر سے مشورہ کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا ضروری ہے۔

ذَكَرَ ابْنُ عَطِيَّةٍ أَنَّ الشُّورَى	ابن عطیہ نے فرمایا کہ شوریئت شریعت
مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِيعَةِ وَعَزَائِمِ	کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے
الْأَحْكَامِ وَمَنْ لَا يَسْتَشِيرُ أَهْلَ الْعِلْمِ	جو امیر کہ اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ
وَالِدِينَ فَعَرَلَهُ وَاجِبٌ، هَذَا مَا لَا خِلَافَةَ	لے، اس کا عزل کرنا واجب ہے، اور یہ ایک ایسا
(البحر المحیط لابن حیان)	مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے

مشورہ کے ضروری ہونے سے اسلامی حکومت اور اس کے باشندوں پر جو ثمرات اور برکات حاصل ہوں گے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا، ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کو اس مشورہ کی حاجت نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لئے ایک رحمت بنایا ہے (بیان ہمتراں)

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسول کو ہر کام بذریعہ وحی بتلا دیتا، کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا، لیکن امت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے، اس لئے بہت سے امور ایسے چھوڑ دیئے جن میں صراحت کوئی وحی نازل نہیں ہوئی، ان میں آپ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔



پانچواں مسئلہ: مشورہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو کیا آجکل کے پارلیمانی اصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا، یا اس کو اختیار ہوگا فیصلہ کی کیا صورت ہوگی؟

مشورہ میں اگر اختلاف رائے ہو جائے تو کیا آجکل کے پارلیمانی اصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا، یا اس کو اختیار ہوگا کہ اکثریت ہو یا اقلیت جس طرف دلائل کی قوت اور مملکت کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے؟

قرآن و حدیث اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اکثریت رائے کے فیصلہ کا پابند و مجبور ہے، بلکہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعامل صحابہؓ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صواب و ید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کر سکتا ہے، خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے، البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لئے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لئے سبب اطمینان بن سکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں غور فرمائیے، اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے **وَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَشَّلْ عَلَى اللَّهِ**، یعنی مشورہ کے بعد آپ جب کسی جانب کو طے کر کے عزم کر لیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجئے، اس میں **عَزَمْتَ** کے لفظ میں عزم یعنی نفاذ حکم کا پختہ ارادہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا، **عَزَمْتُمْ** نہیں فرمایا جس سے عزم و تنفیذ میں صحابہؓ کی شرکت معلوم ہوتی، اس کے اشارہ سے ثابت ہوا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد نفاذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے، حضرت عمر بن الخطابؓ بعض وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ بن عباسؓ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے، حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہؓ موجود ہوتے تھے، جو ابن عباسؓ سے عمر اور علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو جمہور صحابہؓ کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے، حتیٰ کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیت مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ لینے کے لئے نازل ہوئی،۔ حاکم نے مستدرک میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباس رضی سے روایت کیا ہے:

ابن عباس رضی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں  
شاورہم کی ضمیر سے مراد حضرات شیخین  
ہیں

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ قَوْلُهُ تَعَالَى  
(وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) قَالَ  
أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ (ابن کثیر)



کلی کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَزَلَتْ فِي أَبِي بَكْرٍ  
وَعُمَرَوُكَانَا حَوَاطِي رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَزِيرِيهِ  
وَأَبُو بَكْرٍ الْمُسْلِمِينَ

(ابن کثیر)

”ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت  
ابوبکرؓ و عمرؓ سے مشورہ لینے کے بارے میں  
نازل ہوئی ہے یہ دونوں حضرات جناب  
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی  
اور وزیر تھے، اور مسلمانوں کے مرنے تھے“

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات شجینؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا  
لَوِ اجْتَمَعْتُمْ فِي مَشُورَةٍ مَا خَالَفْتُمْكَ  
(ابن کثیر بحوالہ مسند احمد)

جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ  
تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا

ایک اشکال اور اس کا جواب | یہاں یہ اشکال کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی ہے،  
اور شخصی حکومت کا طرز ہے، اور اس سے جمہور کو نقصان پہنچنے  
کا اندیشہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلے کر لی ہے، کیونکہ عوام کو یہ اختیار  
ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں امیر بنادیں بلکہ ان پر لازم قرار دیا ہے کہ علم و عمل اور صلاحیت کار  
اور خدا ترسی اور دیانت کی رُو سے جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں صرف اس کو امیر منتخب کریں  
تو جس شخص کو ان اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ صفات کے تحت منتخب کیا گیا ہو، اس پر ایسی پابندیاں  
عائد کرنا جو بد دیانت اور فساق، فجار پر عائد کی جاتی ہیں، عقل و انصاف کا خون کرنا، اور کام  
کرنے والوں کی بہت شکنی اور ملک و ملت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے مرادف ہوگا۔

چھٹا مسئلہ: ہر کام میں اس جگہ یہ بات بہت ہی قابل غور ہے کہ نظام حکومت اور دوسرے  
مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ اہم امور میں تدبیر اور مشورہ کے احکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے  
تعالیٰ پر توکل کرنا کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کر دو تو

اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کر دو بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کر دو، کیونکہ یہ  
سب تدبیر بدتر الامور کے قبضہ قدرت میں ہیں، انسان کیا اور اس کی رائے و تدبیر کیا،  
ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے،  
مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے

خویش را دیدیم در سوائی خویش  
امتحان ما مکن اے شاہ بیش



اس جملہ قیاد اعزمت فتوکل علی اللہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ توکل ترکِ سبب اور ترکِ تدبیر کا نام نہیں بلکہ اس سببِ قریب کو چھوڑ کر توکل کرنا سنتِ انبیاء اور تعلیمِ قرآن کے خلاف ہے، ہاں اس سببِ بعیدہ اور دور از کار فکروں میں پڑے رہنا یا صرف اس سبب اور تدبیر ہی کو موثر سمجھ کر مستبب الاسباب اور مدبرا لامور سے غافل ہو جانا بے شک خلافِ توکل ہے۔

إِنَّ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَتَّخِذْ لَكُمْ فَسَنَ ذَا

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب ہو سکے گا اور اگر مدد نہ کرے تمہاری تو پھر ایسا کون ہے

الَّذِي يَنْصُرْكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾

جو مدد کرے تمہاری اس کے بعد اور اللہ ہی پر بھروسہ چاہئے مسلمانوں کو

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ

اور نبی کا کام نہیں کہ چھپا رکھے اور جو کوئی چھپا دیکھا وہ لائے گا اپنی چھپائی چیز دن قیامت کے

ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦١﴾ أَفَمِنْ

پھر ہر پاوے کا ہر کوئی جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا کیا ایک شخص

أَتَبِعَ رِضْوَانِ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَمَا وَدَّ جَهَنَّمَ

جو تابع ہے اللہ کی مرضی کا برابر ہو سکتا ہے اس کے جس نے کمایا غصہ اللہ کا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ الْهَضِيرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ ذَرَجَتْ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِصِيرُ

اور کیا ہی بُری جگہ پہنچا ہے لوگوں کے مختلف درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ

بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ

کرتے ہیں اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں

فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ

رسول اپنی میں کا پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی اور پاک کرتا ہوا انکو یعنی شریعتِ عیزہ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ

سے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور حکم کی بات اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں

مَبِينٍ ﴿١٦٤﴾ أَوَلَمْ آصَابَكُمْ مَصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَهَا

تھے کیا جس وقت پہنچی تمکو ایک تکلیف کہ تم پہنچا چکے ہو اس سے دو چہرہ



قَدْ تُمْرَأَىٰ هَذَا أَقْلٌ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

تو کہتے ہو یہ کہاں سے آئی تو کہہ دے یہ تکلیف تم کو پہنچی تمہاری ہی طرف سے بیشک اللہ ہر چیز

پر قادر ہے ۝ وَمَا آصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَيَا ذِي

اللہ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا

سے اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور تاکہ معلوم کرے ان کو جو منافق تھے ۱

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْادُ قَعُوا قَالُوا

اور کہا گیا ان کو کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا دفع کرو دشمن کو بولے

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا اتَّبَعْنَا هَٰؤُلَاءِ الْكُفْرَ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ

اگر ہم کو معلوم ہو لڑائی تو اللہ تمہارے ساتھ ہیں وہ لوگ اس دن کفر کے قریب ہیں

مِنْهُمْ لِلَّيْمَانِ يَقُولُونَ بِأَهْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ط

بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے جو نہیں ان کے دل میں

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ۝ الَّذِينَ قَالُوا الْإِخْوَانُ هُمْ

اور اللہ خوب جانتا ہے جو چھپاتے ہیں وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو

وَقَعْدُوا لَوْ آلَطَاعُوا مَا قُتِلُوا قُلْ فَادْرَءُوا عَنِ أَنْفُسِكُمْ

اور آپ بیٹھ رہے ہیں اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جلتے تو کہہ دے اب ہٹا دیجو اپنے اوپر سے

الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ

موت کو اگر تم سچے ہو اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو

قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَالًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ

جو مائے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس

يُرْسِلُونَ ۝ فَرِحَ حَتَّىٰ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۝ وَ

کھاتے پیتے خوش کرتے ہیں اس پر جو دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے اور

يَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ ۝

خوش ہوتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے ان کے پاس ان کے پیچھے سے



الْأَخَوْفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٤﴾ يَسْتَبِشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ

اس واسطے کہ نہ ڈر ہے اُن پر اور نہ اُن کو غم خوش وقت ہونے میں اللہ کی

مِنْ اللَّهِ وَفَضْلٍ ۚ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥﴾

نعمت اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ ضائع نہیں کرتا مزدوری ایمان والوں کی

**رابط آیات** واقعہ اُحد میں عارضی شکست اور مسلمانوں کی پریشانی پر حضرات صحابہ کرام کی تسلی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چند امور کا حکم ہوا تھا، جس سے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا خطرہ تو زائل ہو گیا، لیکن ان حضرات کو اس واقعہ مغلوبیت سے حسرت بھی تھی، اس لئے متذکرہ بالا بارہ آیات میں سے پہلی آیت میں ان کی حسرت مغلوبیت کو دل سے اتارتے ہیں، نیز بدر کے روز مالِ غنیمت میں ایک چادر لگم ہو گئی، بعض (کم سمجھ یا مٹا) لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، اور یہ امر حقیقتاً یا صورتاً حیات ہے، نبی کی شان اس سے منزہ ہے، لہذا دوسری، تیسری اور چوتھی آیات کے اندر جنابِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان صفتِ امانت اور اس خیال کی غلطی کو بیان کر کے پانچویں آیت کے اندر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ باجود کا نعمتِ عظمیٰ ہونا اور آپ کی بعثت کا انسانیت کے لئے احسانِ عظیم ہونا واضح فرمایا گیا ہے۔

چونکہ مؤمنین کو اس شکست کی سخت کلفت تھی کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ مصیبت کیوں اور کدھر سے آگئی، اس پر صحابہ کرام کو تعجب اور افسوس تھا، نیز منافقین کہا کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تو ہلاک نہ ہوتے، اور ان شہداء کی موت کو بد نصیبی اور محرومی قرار دیتے تھے، اس لئے چھٹی، ساتویں، اور آٹھویں آیات کے اندر دوسرے عنوان سے اس عارضی مصیبت و تکلیف کی علت و حکمت واضح فرمائی گئی، اور اس کے ضمن میں منافقین کی تردید بھی۔

اور نویں آیت میں ان کے غلط عقیدہ کہ گھروں میں بیٹھے رہنا ہلاکت سے نجات کا سبب ہے تردید کی گئی، اور دسویں، گیارہویں اور بارہویں آیات میں حضرات شہداء کرام کی اعلیٰ درجہ کی کامیابی اور حیاتِ حقیقیہ اور دائمی نعمتوں کا اثبات فرمادیا گیا ہے؛

## خلاصہ تفسیر

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا اور اگر تمہارا ساتھ



نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے (اور تم کو غالب کرے) اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہئے، اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ (نعمت باللہ) خیانت کرے حالانکہ (خائن کی تو قیامت میں رسوائی اور فضیحت ہوگی، کیونکہ) جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن (میدانِ حشر میں) حاضر کرے گا (تاکہ سب خلایق مطلع ہوں اور سب کے رویہ و فضیحت اور رسوائی ہو) پھر (میدانِ قیامت کے بعد) ہر شخص کو (ان خائنتوں میں سے) اس کے کئے کا (دوزخ میں) پورا عوض ملے گا، اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا (کہ جرم سے زائد سزا ہونے لگے، غرض خائن تو مغضوب اور مستحق جہنم ہوا، اور انبیاء علیہم السلام بوجہ رضا جوئی حق کے قیامت میں سر بلند ہوں گے پس دونوں امر جمع نہیں ہو سکتے، جیسا آگے ارشاد ہے) سو ایسا شخص جو رضائے حق کا تابع ہو (جیسے نبی) کیا وہ اس شخص کے مثل ہو جائے گا جو کہ غضبِ الہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو، (جیسے خائن) اور وہ جانے کی بڑی جگہ ہے (ہرگز دونوں برابر نہیں ہوں گے بلکہ) یہ مذکورین (یعنی متبعانِ رضائے حق اور مغضوبین) درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کہ متبع محبوب جتنی ہے اور مغضوب دوزخی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں اُن کے اعمال کو اس لئے ہر ایک کے مناسب معاملہ فرما دیں گے (حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا) احسان کیا، جب کہ ان میں اپنی کی مجلس سے ایک ایسے (عظیم الشان) پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں (اور احکام) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (ظاہری اور باطنی گمندگیوں سے) ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب (الہی) اور سمجھ کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) قبل سے صریح غلطی (یعنی شرک و کفر) میں (مبتلا) تھے اور جب (اُحد میں) تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو گنا تم (بد میں) جیت چکے تھے (کیونکہ اُحد میں نصرِ مسلمان شہید ہوئے اور بدر میں نصرِ کافروں کو قید اور نصر کو قتل کیا تھا) تو کیا ایسے وقت میں تم (بطور اعتراض نہ سہی بطور تعجب کے) یوں کہتے ہو کہ (باوجود ہمارے مسلمان ہونے کے) یہ (ہار) کدھر سے ہوئی (یعنی کیوں ہوئی) آپ فرمادیں گے کہ یہ ہار تمہاری طرف سے ہوئی (اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف نہ کرتے تو نہ ہارتے، کیونکہ اس قید کے ساتھ وعدہ نصرت ہو چکا تھا) بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (جب تم نے اطاعت کی اپنی قدرت سے تم کو غالب کر دیا اور جب خلاف کیا اپنی قدرت سے تم کو مغلوب کر دیا) اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ دونوں گروہ (مسلمانوں اور کفار کے) باہم (مقاتلہ کے لئے) مقابل ہوئے،



(یعنی اُحد کے دن) سو وہ مصیبت (خدا تعالیٰ کے حکم سے) ہوتی (کیونکہ چند در چند حکمتیں تھیں جن کا بیان اوپر بھی آچکا ہے) اور (ان میں سے ایک حکمت یہ ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی دیکھ لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت اخلاص و غیر اخلاص ظاہر ہو جاتا ہے جیسا گذر بھی چکا ہے) اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا اور ان سے (شروع جنگ کے وقت جبکہ تین سو آدمیوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جیسا کہ پہلے آچکا ہے) یوں کہا گیا کہ (میدان جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یاد دہشت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر (دشمنوں کی مدافعت کرنا) کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو ان پر رعب ہو گا اور اس سے شاید ہٹ جاویں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمھارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گئے زیادہ پھر ان کے پاس سامان بھی زیادہ ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑتا ہے لڑائی اس کو نہیں کہتے، حق تعالیٰ اس پر ارشاد فرماتے ہیں) یہ منافقین اس روز (جبکہ ایسا خشک جواب دیا تھا) کفر سے (ظاہراً بھی) نزدیک تر ہو گئے، بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ (پہلے سے ظاہراً) ایمان سے (کسی قدر) نزدیک تھے (کیونکہ پہلے سے گو وہ دل سے مومن نہ تھے مگر مسلمانوں کے سامنے موافقت کی باتیں بناتے رہتے تھے، اس روز ایسی طوطا چٹسی غالب ہوئی کہ کھلم کھلا مخالفت کی باتیں منہ سے نکلنے لگیں، اس لئے پہلے سے جو ظاہری قرب ایمان کے ساتھ تھا وہ کفر کے قرب میں تبدیل ہو گیا، اور یہ قرب اس قرب سے زیادہ اس لئے ہے کہ موافقت کی باتیں دل سے نہ تھیں، اس لئے زور دار نہ تھیں، اور یہ مخالفت کی باتیں دل سے تھیں اس لئے عبارت بھی زور دار تھی) یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں (یعنی دل میں تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیں گو لڑائی ڈھنگ ہی کی کیوں نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں (اس لئے ان کے اس قول کا غلط ہونا اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے) یہ ایسے لوگ ہیں کہ (خود تو جہاد میں شریک نہ ہوئے اور) اپنے (ہم نسب) بھائیوں کی نسبت (جو کہ مقتول ہو گئے، گھروں میں) بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے (یعنی ہمارے منع کر لے پر نہ جاتے) تو (بے فائدہ) قتل نہ کئے جاتے، آپ فرمادیجئے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم (اس خیال میں) سچے ہو کہ میدان میں جانے سے ہی ہلاکت ہوتی ہے، کیونکہ قتل سے بچنا تو موت ہی سے بچنے کے لئے مقصود ہے جب وقت مقرر پر موت گھر بیٹھے بھی آجاتی ہے تو قتل بھی وقت مقرر پر نہیں ٹل سکتا، اور (اے مخاطب) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے گئے ان کو (اور مردوں کی طرح) مردہ مت



خیاں کر بلکہ وہ لوگ ایک ممتاز حیات کے ساتھ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے (اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (و کرم) سے عطا فرمائی (مثلاً درجات قرب وغیرہ یعنی رزق ظاہری بھی ملتا ہے اور رزق معنوی یعنی مسرت بھی) اور (جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں اسی طرح) جو لوگ (ابھی دنیا میں زندہ ہیں اور) ان کے پاس نہیں پہنچے (بلکہ) ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ (شہداء) خوش ہوتے ہیں کہ (اگر وہ بھی شہید ہو جاویں تو ہماری طرح) ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ (کسی طرح) مغموم ہوں گے (غرض ان کو دو خوشیاں حاصل ہوں گی، ایک اپنے متعلق، دوسرے اپنے متعلقین کے متعلق، آگے ان دونوں خوشیوں کا سبب یہ بتلایا کہ) وہ (اپنی حالت پر تو) خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت و فضل خداوندی کے (جس کا انھوں نے مشاہدہ کر لیا) اور (دوسروں کی حالت پر خوش ہوتے ہیں) اس وجہ سے کہ (وہاں جا کر مشاہدہ کر لیا کہ) اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے اعمال کا اجر ضائع نہیں کرتے (تو جو لوگ ان کے متعلقین پیچھے رہ گئے ہیں اور نیک اعمال جہاد وغیرہ میں لگے ہیں ان کو بھی ایسے ہی انعامات ملیں گے)۔

## معارف و مسائل

مال غنیمت میں چوری گناہ عظیم ہے | آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغْلُ، ایک خاص واقعہ کے متعلق کسی نبی سے ایسے گناہ کا احتمال نہیں آئی ہے، اس کے ضمن میں غلول، یعنی مال غنیمت کی چوری کا مسئلہ بھی آگیا۔

واقعہ حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ غزوہ بدر میں مال غنیمت میں ایک چادر گم ہو گئی، بعض لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لی ہو، یہ کہنے والے اگر منافق تھے تو کوئی بعیدیات نہیں، اور ممکن ہے کہ کوئی نا سمجھ مسلمان ہی ہو تو اس نے یہ سمجھا ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا غتیار ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں غلول کا گناہ عظیم ہونا اور قیامت کے روز اس کی سزائے شدید کا ذکر ہے اور یہ کہ کسی نبی کے متعلق یہ گمان کرنا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہو گا نہایت بیہودہ جسارت ہے کیونکہ انبیاء ہر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔

لفظ غلول مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور خاص کر مال غنیمت کی خیانت کے لئے بھی، اور مال غنیمت میں چوری اور خیانت کا جرم عام چوریوں اور



خیانتوں سے زیادہ اشد ہے، کیونکہ مالِ غنیمت میں پورے لشکر اسلام کا حق ہوتا ہے تو جن نے اس میں چوری کی اس نے سیکڑوں ہزاروں آدمیوں کی چوری کی، اگر کسی وقت اس کو تلافی کا خیال بھی آوے تو بہت مشکل ہے کہ سب کو ان کا حق پہنچائے یا معاف کرائے، بخلاف دوسری چوریوں کے کہ مال کا مالک معلوم و متعین ہے، کسی وقت اللہ نے توبہ کی توفیق دی تو اس کا حق ادا کر کے یا معاف کرا کر بری ہو سکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ ایک غزوہ میں ایک شخص نے اون کا کچھ حصہ چھپا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا، مالِ غنیمت تقسیم ہونے کے بعد اس کو خیال آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا، آپ نے باوجود رحمتِ للعالمین ہونے اور امت پر ماں باپ سے زیادہ شفیق ہونے کے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اب میں اس کو کس طرح سارے لشکر میں تقسیم کروں، اب تو قیامت کے روز ہی تم اس کو لے کر حاضر ہو گے۔

اسی لئے غلول کی سزا بھی عام چوریوں سے زیادہ اشد ہے، کہ میدانِ حشر میں جہاں ساری مخلوق جمع ہوگی، سب کے سامنے اس کو اس طرح رسوا کیا جائے گا کہ جو مال چوری کیا تھا وہ اس کی گردن پر لٹا ہوا ہوگا، صحیحین میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مذکور ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ قیامت میں کسی کو اس طرح دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لٹا ہوا ہو اور یہ اعلان ہوتا ہو کہ اس نے مالِ غنیمت کا اونٹ چرایا تھا، وہ شخص اگر مجھ سے شفاعت کا طالب ہوگا تو میں اس کو صاف جواب دے دوں گا کہ میں نے حکیم الہی پہنچا دیا تھا اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔

اللہ بچائے یہ میدانِ حشر کی رسوائی ایسی ہوگی کہ بعض روایات میں ہے کہ جن کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ تمنا کریں گے کہ ہمیں جہنم میں بھیج دیا جائے مگر اس رسوائی سے بچ جائیں۔

اموالِ اوقات اور ہرکاری | یہی حال مساجد، مدارس، خانقاہوں اور اوقات کے اموال کا ہے، جس خزانہ میں چوری حکم غلول ہے | میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے، اگر معاف بھی کر لے تو کس کس سے معاف کرائے، اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے، کیونکہ اس میں پورے ملک کے باشندوں کا حق ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی، مگر چونکہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بکثرت ہوتے ہیں، اس لئے آجکل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے، اور لوگ اس کے انجامِ بد اور وبالِ عظیم سے غافل ہیں کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذابِ جہنم کے میدانِ حشر کی رسوائی بھی ہے، اور رسول اللہ



صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محرومی بھی (نہوذا باللہ منہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود | آیت لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ الْآيَةُ اِذْ اَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا يَمْلِكُ بَاطِلٌ شَيْئًا مِنَ اللَّهِ لَعَلَّ الْمُؤْمِنِينَ يَتَّقُونَ | ایک آیت تقریباً اپنی الفاظ کے ساتھ سورۃ بقرہ میں گزر چکی ہے جس کی تفسیر و تشریح تفصیل کے ساتھ معارف القرآن جلد اول صفحہ ۳۲۹ میں آچکی ہے، اس کو دیکھ لیا جاتے، یہاں آیت میں ایک لفظ زائد ہے، لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں مبعوث فرما کر حق تعالیٰ نے مؤمنین پر بڑا احسان فرمایا ہے۔

اس کے متعلق پہلی بات تو یہ قابل غور ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، اور پورے عالم کے لئے آپ کا وجود نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہے، اس جگہ اس کو صرف مؤمنین کے لئے فرمانا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کریم کو ہدائی لِّلْمُتَّقِينَ فرمانا کہ قرآن کا سارے عالم کے لئے ہدایت ہو تا دوسری آیات سے ثابت ہے، مگر بعض جگہ اس کو متقین کے ساتھ مخصوص کر کے بیان فرمایا، اس کی وجہ و دواعی جگہ مشترک طور پر ایک ہی ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود سارے عالم اور ہر مومن و کافر کے لئے نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہے اسی طرح قرآن کریم سارے عالم انسانیت کے لئے صحیفہ ہدایت ہے، مگر چونکہ اس نعمت و ہدایت کا نفع صرف مؤمنین اور متقین نے حاصل کیا اس لئے کسی جگہ اس کو ان کے ساتھ مخصوص کر کے بھی بیان کر دیا گیا۔ دوسری بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مؤمنین کے لئے یا پورے عالم کے لئے نعمت کبریٰ اور احسان عظیم ہونے کی تشریح و توضیح ہے۔

یہ بات ایسی ہے کہ اگر آجکل کا انسان روحانیت فراموش اور مادیت کا پرستار نہ ہوتا تو یہ مضمون کسی توضیح و تشریح کا محتاج نہیں تھا، عقل سے کام لینے والا انسان اس احسان عظیم کی حقیقت سے خود واقف ہوتا، مگر ہو یہ رہا ہے کہ آج کا انسان دنیا کے جانوروں میں ہوشیار ترین جانور سے زیادہ کچھ نہیں رہا، اس کو احسان و انعام صرف وہ چیز نظر آتی ہے جو اس کے پیٹ اور نفسانی خواہشات کا سامان مہیا کرے، اس کے وجود کی اصل حقیقت جو اس کی روح ہے اس کی خوبی اور خرابی سے وہ یکسر غافل ہو گیا ہے، اس لئے اس تشریح کی ضرورت ہوئی، کہ انسان کو پہلے تو یہ بتلایا جائے کہ اس کی حقیقت صرف چند ہڈیوں اور گوشت پوست کا مجموعہ نہیں، بلکہ حقیقت انسان وہ روح ہے جو اس کے بدن کے ساتھ متعلق ہے، جب تک یہ روح اس کے بدن میں ہے اس وقت تک انسان، انسان ہے، اس کے حقوق



انسانیت قائم ہیں، خواہ وہ کتنا ہی ضعیف و کمزور، سب دم کیوں نہ ہو، کسی کی مجال نہیں کہ اس کی جائیداد اور اموال پر قبضہ کر سکے، یا اس کے حقوق سلب کر سکے، لیکن جس وقت یہ روح اس کے بدن سے الگ ہو گئی، تو خواہ وہ کتنا ہی قوی اور پہلوان ہو، اور اس کے اعضاء سب اپنی اصلی حیثیت میں ہوں وہ انسان نہیں رہا، اس کا کوئی حق خود اپنی جائیداد و اموال میں باقی نہیں رہا۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں آتے ہیں اس لئے کہ وہ انسانی روح کی صحیح تربیت کر کے انسان کو حقیقی انسان بنائیں، تاکہ اس کے بدن سے جو اعمال و افعال صادر ہوں وہ انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں، وہ درندے اور زہریلے جانوروں کی طرح دوسرے انسانوں کو ایذا دے اور تکلیف دینا نہ پھرے، اور خود اپنے بھی انجام کو سمجھ کر آخرت کی دائمی زندگی کا سامان مہیا کرے، ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے زمرۃ انبیاء میں امامت و سیادت منکاسب حاصل ہے، انسان کو صحیح انسان بنانے میں بھی آپ کی شان تمام انبیاء علیہم السلام سے بہت ممتاز ہے، آپ نے اپنی مکی زندگی میں صرف یہی کام افراد سازی کا انجام دیا، اور انسانوں کا ایسا معاشرہ تیار کر دیا جس کا مقام فرشتوں کی صفوں سے آگے ہے، اور زمین و آسمان نے اس سے پہلے ایسے انسان نہیں دیکھے، ان میں سے ایک ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ معجزہ نظر آتا ہے، ان کے بعد کے لئے بھی آپ نے جو تعلیمات اور ان کے رواج دینے کے طریقے چھوڑے ہیں اس پر پورا عمل کرنے والے اسی مقام کو پا سکتے ہیں جو صحابہ کرامؓ نے پایا ہے، یہ تعلیمات سارے عالم کے لئے ہیں، اس لئے آپ کا وجود باجوڑ پورے عالم انسان کے لئے احسانِ عظیم ہے، گو اس سے پورا نفع مومنین ہی نے اٹھایا ہے۔

واقعہ احد میں مسلمانوں کو عارضی آیت اَوْ کَمَا آصَابَکُمُ الْاَیۡۃُ، سابقہ آیات میں کسی جگہ اس مضمون شکست اور زخم و قتل کے مصداق کا ذکر آچکا ہے، یہاں پھر اس کی تاکید مزید توضیح کے ساتھ بیان پیش آنے کے بعض اسباب اور حکمتیں کی گئی ہے، کیونکہ مسلمانوں کو اس واقعہ سے سخت کلفت تھی یہاں تک کہ بعض حضرات کی زبان پر یہ بھی آیا اَنِّیْ هٰذَا کہ یہ مصیبت ہم پر کہاں سے آپڑی، جب کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جہاد ہیں۔

آیت مذکورہ میں اذل تو یہ بات یاد دلانی کہ جتنی مصیبت تم پر آج پڑی ہے تم اس سے دُگنی اپنے مخالف پر اس سے پہلے غزوۂ بدر میں ڈال چکے ہو، کیونکہ غزوۂ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے، اور غزوۂ بدر میں مشرکین کے ستر سردار مارے گئے تھے اور ستر گرفتار ہو کر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے، اس بات کے یاد دلانے سے ایک تو یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ تکلیف و پریشانی کا احساس گھٹ جائے کہ جس شخص کی دُگنی جیت ہر چکی ہو اگر ایک دفعہ



آدھی باروشکت بھی ہو جائے تو زیادہ غم اور تعجب نہیں ہونا چاہئے۔

دوسرا اصل مقصد آیت کے آخری جملہ قُلْ هُوَ مِنِّي وَعِنْدِي أَنفُسُكُمْ میں بتلایا کہ یہ تکلیف مصیبت درحقیقت دشمن کی قوت و کثرت کے سبب سے نہیں، بلکہ تمہاری اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب سے ہے، کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں تم سے کوتاہی ہو گئی۔

اس کے بعد کی آیت فَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ یہ جو کچھ ہوا حق تعالیٰ کے اذن و مشیت سے ہوا، جس میں بہت سی حکمتیں مستور ہیں، جن میں سے بعض کا بیان پہلے آچکا ہے، اور ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین مخلصین کو بھی دیکھ لیں اور منافقین کو بھی، یعنی مومنین کا اخلاص اور منافقین کی منافقت ایسی واضح ہو جائے کہ ہر دیکھنے والا دیکھ سکے یہاں اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے مراد یہی ہے کہ دنیا میں جو دیکھنے کی صورت متعارف ہے اس صورت میں دیکھ لیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں، چنانچہ یہ حکمت اس طرح واضح ہو گئی کہ اس شدت کے وقت منافقین الگ ہو کر کھڑے ہوئے، اور مخلص مومن معرکہ میں ڈٹے رہے، اور ایک وجہ تسلی یہ بھی ہے کہ جو مسلمان اس معرکہ میں شہید ہو گئے ہیں ان کو حق تعالیٰ نے وہ انعامات دیئے ہیں کہ دوسروں کو ان پر رشک آنا چاہئے، اس مناسبت سے اس کے بعد کی آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا میں شہداء کے خاص فضائل بیان فرمائے گئے ہیں۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں | اس آیت میں شہداء کے خاص فضائل کا بیان ہے، اور احادیث صحیحہ کے خاص فضائل اور درجات میں اس کی بڑی تفصیل وارد ہوئی ہے۔ امام شریعت نے فرمایا ہے، کہ شہداء کے بھی درجات اور حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے روایات حدیث میں جو مختلف صورتیں آئی ہیں، وہ مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں۔

یہاں شہداء کی پہلی فضیلت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ مرنے نہیں، بلکہ دائمی زندگی کے مالک ہو گئے ہیں، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بظاہر ان کا مرنے اور قبر میں دفن ہونا تو مشاہد اور محسوس ہے، پھر قرآن کی متعدد آیات میں ان کو مردہ نہ کہنے اور نہ سمجھنے کی جو ہدایت آئی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر کہا جائے کہ حیات برزخی مراد ہے، تو وہ ہر شخص مومن و کافر کو حاصل ہے، کہ مرنے کے بعد اس کی روح زندہ رہتی ہے، اور قبر کے سوال و جواب کے بعد مومنین صالحین کے لئے سامانِ راحت اور کفار فجار کے لئے قبر کا عذاب قرآن و سنت سے ثابت ہے تو یہ حیات برزخی جب سب کے لئے عام ہے تو شہداء کی کیا خصوصیت ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی اسی آیت نے یہ بتلایا ہے کہ شہداء کو اللہ کی طرف سے



جنت کا رزق ملتا ہے، اور رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس دنیا سے منسلک ہوتے ہی شہید کے لئے رزق جنت جاری ہو جاتا ہے، اور ایک خاص قسم کی زندگی اسی وقت سے اس کو مل جاتی ہے، جو عام مردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے (قربلی)

اب رہا کہ وہ استیاز کیا ہے؟ اور وہ زندگی کیسی ہے؟ اس کی حقیقت سوائے خالق کائنات کے نہ کوئی جان سکتا ہے نہ جاننے کی ضرورت ہے، البتہ بسا اوقات ان کی حیات خاص کا اثر اس دنیا میں بھی ان کے ابدان پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی وہ صحیح سالم باقی رہتے ہیں (قربلی) جس کے بہت سے واقعات مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

شہداء کی پہلی فضیلت اس آیت میں ان کی ممتاز دائمی حیات ہے، دوسری یہ کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق ملتا ہے، تیسری فضیلت فَرِحْنِ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ میں یہ بیان کی گئی کہ وہ ہمیشہ خوش خرم رہیں گے، ان نعمتوں میں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں جو خوشی فضیلت یہ ہے وَلَا يَسْتَبِشُّونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ، یعنی وہ اپنے جن متعلقین کو دنیا میں چھوڑ گئے تھے ان کے متعلق بھی ان کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر نیک عمل اور جہاد میں مصروف رہیں تو ان کو بھی یہاں آکر یہی نعمتیں اور درجات عالیہ ملیں گے۔

اور سدی نے بیان فرمایا کہ شہید کا جو کوئی عزیز دوست مرنے والا ہوتا ہے شہید کو پہلے سے اس کی اطلاع کر دی جاتی ہے، کہ فلاں شخص اب تمھارے پاس آ رہا ہے، وہ اس سے ایسا خوش ہوتا ہے جیسے دنیا میں کسی دو رافقہ دوست سے بعد مدت ملاقات کی خوشی ہوتی ہے۔ اس آیت کی شان نزول جو ابو داؤد نے باسناد صحیح حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ جب واقعہ احد میں تمھارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے جسم میں رکھ کر آزاد کر دیا وہ جنت کی نہروں اور باغات کے پھلوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں، اور پھر ان قندیلوں میں آجاتے ہیں جو ان کے لئے عرش رحمن کے نیچے معلق ہیں، جب ان لوگوں نے اپنی راحت و عیش کی زندگی دیکھی تو کہنے لگے کہ رہا رہے متعلقین دنیا میں ہمارے مرنے سے غمگین ہیں، کیا کوئی ہمارے حالات کی خبر ان کو پہنچا سکتا ہے، تاکہ وہ ہم پر غم نہ کریں، اور وہ بھی جہاد میں کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم تمھاری یہ خبر ان کو پہنچائے دیئے ہیں اس پر یہ آیت نازل فرمائی گئی۔ (قربلی)



الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا آصَابَهُمُ الْقَرْحُ

جن لوگوں نے حکم مانا اللہ کا اور رسول کا بعد اس کے پہنچ چکے تھے ان کو زخم

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۴۶﴾ الَّذِينَ قَالَ

جو ان میں نیک ہیں اور پرہیزگار ان کو ثواب بڑا ہے جن کو کہا

لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

لوگوں نے کہ مکہ والے آدمیوں نے جمع کیا ہے سامان تمہاری مقابلہ کو سو تم ان سے ڈرو تو

فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿۱۴۷﴾

اور زیادہ ہوا ان کا ایمان اور بولے کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے

فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ دِيَارِهِمْ فَأَتَىٰ خَصْمَتَهُمُ الْيَهُودَ

پھر چلے آئے مسلمان اللہ کے احسان اور فضل کے ساتھ کچھ نہ پہنچیں ان کو بُرائی

وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَهُ وَابْتِغَاءَ وَجْهِهِ وَاللَّهُ دُوْفُضِلْ عَظِيمٌ ﴿۱۴۸﴾ إِنَّمَا

اور تابع ہوئے اللہ کی مرضی کے اور اللہ کا فضل بڑا ہے یہ جو ہے

ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَ

سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے سو تم ان سے مت ڈرو اور

خَافُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۱۴۹﴾

مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو

## خلاصہ تفسیر

جن لوگوں نے اللہ و رسول کے کہنے کو جبکہ ان کو تعاقب کفار کے لئے بلایا گیا، قبول کر لیا

بعد اس کے کہ ان کو (ابھی تازہ) زخم (لڑائی میں) لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں (اور

واقع میں سب ہی ایسے ہیں) ان کے لئے (آخرت میں) ثواب عظیم ہے، یہ ایسے (مخلص) لوگ

ہیں کہ (بعض) لوگوں نے (یعنی عبدالمعین والوں نے جو) ان سے (را کر) کہا کہ ان لوگوں (یعنی

اہل مکہ نے) تمہارے (مقابلہ کے) لئے (بڑا) سامان جمع کیا ہے، سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا

چاہئے تو اس (خبر) نے ان کے (جوش) ایمان کو اور زیادہ کر دیا اور (نہایت سہتلائی سے یہ) کہہ



ذکریات کو ختم کر دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ مشکلات کے لئے کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے (اسی سپرد کرنے کو توکل کہتے ہیں) پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے (یعنی ثواب اور نفع تجارت سے) بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگوار سی پیش نہیں آئی، اور وہ لوگ (اس واقعہ میں) رضائے حق کے تابع رہے (اس کی بدولت اپنی دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے (مسلمانو!) اس سے زیادہ کوئی (قابل اندیشہ) بات نہیں کہ یہ مجبر (فعلاً) شیطان ہے کہ اپنے (ہم مذہب) دوستوں سے رتم کو ڈرا (ناچاہ) تاہم سو تم ان سے کبھی مت ڈرنا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

## معارف مسائل

**رابطہ آیات اور شان نزول** | اوپر غزوہ اُحد کے قصہ کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اسی غزوہ سے متعلق ایک دوسرے غزوہ کا ذکر ہے جو غزوہ حمرہ الاسد کے نام سے مشہور ہے، حمرہ الاسد مدینہ طیبہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک مقام کا نام ہے۔ واقعہ اس غزوہ کا یہ ہے کہ جب کفار مکہ اُحد کے میدان سے واپس ہو گئے، تو راستے میں جائے اس پر افسوس ہوا کہ ہم غالب آجانے کے باوجود خواہ مخواہ واپس لوٹ آئے، ہمیں چاہئے تھا کہ ایک بار کر کے سب مسلمانوں کو ختم کر دیتے، اور اس خیال نے کچھ ایسا اثر کیا کہ پھر واپس مدینہ کی طرف لوٹنے کا ارادہ ہونے لگا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر رعب ڈال دیا، اور سیدھے مکہ مکرمہ کو ہوئے، لیکن بعض مسافروں سے جو مدینہ کی طرف جا رہے تھے یہ کہہ گئے کہ تم جا کر کسی طرح مسلمانوں کے دل میں ہمارا رعب جماؤ، کہ وہ پھر لوٹ کر آرہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ بات معلوم ہو گئی، اس لئے آپ ان کے تعاقب میں حمرہ الاسد تک پہنچے (ابن جریر کذا فی الروح)

تفسیر قرطبی میں ہے کہ اُحد کے دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مجاہدین میں اعلان فرمایا کہ ہمیں مشرکین کا تعاقب کرنا ہے، مگر اس میں صرف وہی لوگ جاسکیں گے جو کل کے معرکہ میں ہمارے ساتھ تھے، اس اعلان پر دو سو مجاہدین کھڑے ہو گئے۔

اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ کون ہے جو مشرکین کے تعاقب میں جائے تو ستر حضرات کھڑے ہو گئے، جن میں ایسے لوگ بھی تھے جو گذشتہ کل کے معرکہ میں شدید زخمی ہو چکے تھے، دوسروں کے ہمارے چلتے تھے، یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرکین کے تعاقب میں روانہ ہوئے، مقام حمرہ الاسد پر



پہونچے تو وہاں کعثیم بن مسعود ملا، اس نے خبر دی کہ ابوسفیان نے اپنے ساتھ مزید لشکر جمع کر کے پھر یہ طے کیا ہے کہ پھر مدینہ پر چڑھائی کریں اور اہل مدینہ کا ہتھیار کر دیں، زخم خوردہ ضعیف صحابہؓ اس خبر و حشت اثر کو سن کر ایک زبان ہو کر بولے کہ ہم اس کو نہیں جانتے حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے، اور وہی بہتر مددگار ہے۔

اس طرف تو مسلمانوں کو مرحوب کرنے کے لئے یہ خبر دی گئی، اور مسلمان اس سے متاثر نہیں ہوئے، دوسری طرف مُعَبَّدُ خُزَاعِی بنی خزاعہ کا ایک آدمی مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا تھا یہ اگرچہ مسلمان نہ تھا مگر مسلمانوں کا خیر خواہ تھا، اس کا قبیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف تھا، اس لئے جب راستہ میں مدینہ سے ٹوٹے ہوئے ابوسفیان کو دیکھا کہ وہ اپنے لوٹنے پر بھینسا رہا ہے اور پھر واپسی کی فکر میں ہے تو اس نے ابوسفیان کو بتایا کہ تم دھوکے میں ہو کہ مسلمان کمزور ہو گئے، میں ان کے بڑے لشکر کو حمرآہ الاسد میں چھوڑ کر آیا ہوں جو پورے ساز و سامان سے تمھارے تعاقب میں نکلا ہے، ابوسفیان پر اس کی خبر نے رعب ڈال دیا۔ اس واقعہ کا بیان مذکورہ تین آیتوں میں فرمایا گیا ہے، پہلی آیت میں ارشاد ہو کہ غزوہ اُحُد میں زخم خوردہ ہونے اور مشقتیں برداشت کرنے کے باوجود جب ان کو دوسرے جہاد کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو وہ اس کے لئے بھی تیار ہو گئے، اس مقام پر ایک امر قابل غور ہے وہ یہ کہ یہاں جن مسلمانوں کی تعریف بیان کی جا رہی ہے ان کے دو وصف بیان کئے گئے، ایک تَوْمِنُ بَعْدَ مَا آصَابَهُمُ الْقَدَرُ، یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر تیار ہونے والے وہ لوگ ہیں جن کو اُحُد میں زخم پہونچ چکے تھے، اور ان کے سر نامور بہادر شہید ہو چکے تھے، اور ان کے جسم بھی زخموں سے چور تھے، لیکن جب ان کو دوسری دفعہ بلایا گیا تو وہ فوراً جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔

دوسرا وصف لَئِنْ تَنَافَعُوا فِي مَعْنَى وَاتَّقُوا میں بیان کیا گیا ہے، کہ یہ لوگ علی جد و جہاد و رجاں نشاری کے عظیم کارناموں کے ساتھ یہ حضرات احسان و تقویٰ کی صفات کمال سے بھی آراستہ تھے، اور یہ مجموعہ ہی ان کے اجر عظیم کا سبب ہے۔

اس آیت میں لفظ مَنْهُمْ سے یہ شبہ نہ کیا جاتے کہ یہ سب لوگ احسان و تقویٰ کے حامل نہیں، بلکہ ان میں سے بعض تھے، اس لئے کہ یہاں حرف مِنْ "بعض کے لئے" نہیں بلکہ بیانیہ ہے جس پر خود اسی آیت کے ابتدائی الفاظ لَئِنْ تَنَافَعُوا شاہد ہیں کیونکہ یہ استجاب و اطاعت بغیر احسان و تقویٰ کے ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے اکثر مفسرین نے اس جگہ مِنْ کو بیانیہ قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب لوگ جو احسان



رتقوی کی صفات سے آراستہ تھے ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

کسی کام کے لئے صرف جدوجہد | البتہ اس خاص عنبران سے ایک اہم فائدہ یہ حاصل ہوا کہ کوئی کام کتنا  
اور جان نثاری کافی نہیں جیتک | ہی نیک ہوا اور اس کے لئے کوئی شخص کتنی ہی جان نثاری دکھائے  
اخلاص نہ ہو | اللہ کے نزدیک وہ موجب اجر اسی وقت ہوگی، جب کہ اس کے ساتھ

احسان و تقویٰ بھی ہو، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ عمل خالص اللہ کے لئے ہو، ورنہ محض جان نثاری  
اور بہادری کے واقعات تو کفار میں بھی کچھ کم نہیں۔

حکم رسولؐ اور حقیقت | اس واقعہ میں شرکین کے تعاقب میں جانے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
حکم خدا ہے | نے دیا تھا، قرآن کی کسی آیت میں مذکور نہیں، مگر اس آیت میں جب ان

لوگوں کی اطاعت شعاری کی مدح فرمائی تو اس حکم کو اللہ اور رسول دونوں کی طرف منسوب کر کے  
الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالرَّسُولِ فرمایا گیا، جس نے واضح طور پر ثابت کر دیا کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیتے ہیں وہ اللہ کا حکم بھی ہوتا ہے، اگرچہ اللہ کی کتاب میں مذکور نہ ہو۔  
جو بے دین حدیث کا انکار کرتے ہیں، اور رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد کی بتلاتے ہیں

رمعاذ اللہ ان کے سمجھنے کے لئے یہ جملہ بھی کافی ہے، کہ رسولؐ کے حکم کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہی  
حکم قرار دیا جس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ رسولؐ خود بھی اپنی صواب دید پر مصالحت کے مطابق  
کچھ احکام دے سکتے ہیں اور ان کا وہی درجہ ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے دیئے ہوئے احکام کا  
احسان کی تعریف | احسان کی تعریف حدیث جبریل کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
نے اس طرح فرمائی ہے:

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ | ”یعنی تم اپنے پروردگار کی عبادت اس

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرُوكَ | طرح کر دے گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو،

اور اگر یہ حالت پیدا نہ ہو تو کم از کم یہ حالت ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔“

تقویٰ کی تعریف | تقویٰ کی تعریف متعدد تعبیرات سے کی گئی، لیکن سب زیادہ جامع تعریف  
وہ ہے جو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوال کرنے پر  
فرمائی، حضرت عمرؓ نے پوچھا تھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ  
امیر المؤمنین! کبھی آپ کا ایسے رستہ پر بھی گذر ہوا ہو گا جو کانٹوں سے پر ہو، حضرت عمرؓ  
نے فرمایا، کئی بار ہوا ہے، حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا، ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا،  
حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دامن سمیٹ لئے اور نہایت احتیاط سے چلا، حضرت ابی بن کعبؓ  
نے فرمایا کہ بس تقویٰ ایسی کا نام ہے، یہ دنیا ایک خارستان ہے، گناہوں کے کانٹوں



بھری پڑی ہے، اس نئے دنیا میں اس طرح چلنا اور زندگی گزارنا چاہئے کہ دامن گناہوں کے کانٹوں سے نہ لپکے، اسی کا نام تقویٰ ہے، جو سب زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

يَقُولُ الْمَرْءُ قَائِدِي وَمَسَارِي  
وَتَقْوَى اللَّهِ أَفْضَلُ مَا اسْتَفَادَا

یعنی لوگ اپنے دنیوی قائدے اور مال کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، حالانکہ تقویٰ سب سے بہتر سرمایہ ہے۔

دوسری آیت میں اس جہاد کے لئے بڑھنے والے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی مزید توصیف و تعریف اس طرح کی گئی:

الَّذِينَ قَالُوا لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ  
إِيمَانًا نَاطَ يَعْنِي يَہ وہ حضرات ہیں کہ جب ان لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف دشمنوں نے بڑا سامان اکٹھا کیا ہے، ان سے ڈرو جنگ کا ارادہ نہ کرو، تو اس خبر نے ان کا جوش ایمان اور بڑھا دیا، وجہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت جب ان حضرات نے قبول کی تھی تو پہلے ہی دن سے محسوس کر لیا تھا کہ ہم نے جس راستہ پر سفر شروع کیا ہے وہ خطرات سے پُر ہے، قدم قدم پر مشکلات و موانع پیش آئیں گے، ہمارا راستہ روکا جائے گا، اور ہماری انقلابی تحریک کو مٹانے کے لئے مسلح کوششیں کی جائیں گی، اس لئے جب یہ حضرات اس قسم کی مشکلات کو دیکھتے تھے تو ایمان کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی تھی، اور پہلے سے زیادہ جانفشانی اور فداکاری کے ساتھ کام کرنے لگتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ان حضرات کا ایمان تو اسلام لانے کے اوّل روز ہی بے کامل تھا، لہذا ان دونوں آیتوں میں ایمان کی زیادتی سے ایمان کی صفات اور ایمان کے ثمرات کی زیادتی مراد ہے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر تیار ہو جانے والے صحابہ کی اس حالت کو بھی اس جگہ خصوصیت کے ساتھ بیان کیا، کہ اس جہاد کے سفر میں تمام راستہ یہ جملہ اُن کے ورد زبان رہا حُبُّكَ اللَّهُ وَنَعْمَ الْوَكِيلُ، اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔

یہاں یہ بات خصوصیت سے قابل غور ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ سے زیادہ تو دنیا میں کسی کا توکل و اعتماد اللہ تعالیٰ پر نہیں ہو سکتا، لیکن آپ کی صورت توکل یہ نہ تھی، کہ اسباب ظاہرہ کو چھوڑ کر بیٹھے رہتے اور کہتے کہ ہیں اللہ تعالیٰ کافی ہے۔



وہ بیٹھے بٹھائے ہیں غلبہ عطا فرما دے گا، نہیں، بلکہ آپؐ صحابہ کرام کو جمع کیا، زحمت خوردہ لوگوں کے دلوں میں نئی روح پیدا فرمائی، جہاد کے لئے تیار کیا، اور نکل کھڑے ہوئے، جتنے اسباب و ذرائع اپنے اختیار میں تھے وہ سب مہیا اور استعمال کرنے کے بعد فرمایا کہ ہمیں اللہ کافی ہے، یہی وہ صحیح توکل ہے جس کی تعلیم قرآن میں دی گئی، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل کیا اور کرایا، اسباب ظاہرہ و نہیویہ بھی خدا تعالیٰ کا انعام ہیں، ان کو ترک کر دینا اس کی ناشکری ہے، ترک اسباب کر کے توکل کرنا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، کوئی مغلوب الحال ہو تو وہ معذور سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ صحیح بات یہی ہے کہ سب بر توکل زانوئے اُشتر بہ بند

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک واقعہ میں اسی آیت حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو شخصوں کا مقدمہ آیا آپؐ نے ان کے درمیان فیصلہ فرمایا، یہ فیصلہ جس شخص کے خلاف تھا اس نے فیصلہ نہایت سکون سے سنا، اور یہ کہتے ہوئے چلے لگا کہ حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا اس شخص کو میرے پاس لاؤ، اور فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَكُونُ عَلَى الْعَجْزِ وَ	یعنی اللہ تعالیٰ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے
لَكِنَّ عَلَيْكَ بِالْكَفِّسِ قِيَادًا	کو ناپسند کرتا ہے بلکہ تم کو چاہئے کہ تمام
غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ وَ	ذرائع خستیار کر دیکھو بھی عاجز ہو جاؤ اس
نِعْمَ الْوَكِيلُ	وقت کہو جہی اللہ و نعم الوکیل

دوسری آیت میں ان حضرات صحابہؓ کے اقدام جہاد اور حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کہنے کے فوائد و ثمرات اور برکات کا بیان ہے، فرمایا ہے:

فَأَنْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمَسَّ مِنْهُمْ شَتْوٌ وَاشْتَبَوْا رِضْوَانِ اللَّهِ  
یعنی یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے، کہ انہیں کوئی ناگواری و راءہ پیش آنی اور یہ لوگ رضائے الہی کے تاج رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو تین نعمتیں عطا کیں، پہلی نعمت تو یہ کہ کافروں کے قلوب میں رعب و ہیبت ڈال دی، اور وہ لوگ بھاگ گئے، جس کی وجہ سے یہ حضرات قتل و قتال سے محفوظ رہے، اس نعمت اللہ تعالیٰ نے نعمت ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا، اور دوسری نعمت اللہ تعالیٰ نے یہ عطا فرمائی کہ ان حضرات کو حرام الاسد کے بازار میں تجارت کا موقع



ملا اور اس سے منافع حاصل ہوئے اس کو لفظ فضل سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسری نعمت جو ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے وہ رضا سے الہی کا حصول ہے، جو اس جہاد میں ان حضرات کو خاص انداز میں حاصل ہوئی۔

حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ کے جو فوائد و برکات قرآن کریم نے بیان فرمائے وہ کچھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے، بلکہ جو شخص بھی جذبہ ایمانی کے ساتھ اس کا ورد کرے وہ یہ برکات حاصل کرے گا۔

مشارح و علماء نے حسْبُنَا اللَّهُ و نِعْمَ الْوَكِيلُ پڑھنے کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس آیت کو ایک ہزار مرتبہ جذبہ ایمان و انقیاد کے ساتھ پڑھا جائے اور دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ رد نہیں فرماتا، هجوم افکار و مصائب کے وقت حسْبُنَا اللَّهُ و نِعْمَ الْوَكِيلُ کا پڑھنا مجرب ہے۔

چوتھی آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لئے مشرکین کے دوبارہ لوٹنے کی خبر دینے والا اصل میں شیطان ہے، جو تم کو اپنے اولیاء یعنی ہم مذہب کفار سے ڈرانا چاہتا ہے، تو گویا اصل عبارت میں يَخَوِّفُ کا ایک مفعول محذوف ہے، یعنی يَخَوِّفُكُمْ اور دوسرا مفعول اَوْلِيَاءُ مذکور ہے۔

پھر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کو ایسی خبروں سے ہرگز ڈرنا نہیں چاہئے، البتہ مجھ سے ڈرتے رہنا ضروری ہے، یعنی میری اطاعت کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے ہر مؤمن کو ڈرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ ہو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

خوفِ خدا سے مراد کیا ہے | اس آیت میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور دوسری آیت میں ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں، يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِمَّنْ قَوْلِهِمْ (۵۰:۱۶) مگر بعض اکابر نے فرمایا کہ خوفِ خدا رونے اور آنسو پونچھنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ سے ڈرنے والا رہنا ہے جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس پر اللہ کی طرف سے عذاب کا خطرہ ہو۔

ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابو بکر بن قواک بیمار تھے، میں اُن کی عیادت کو گیا، مجھے دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے کہا کہ گھبرائیے نہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا و عافیت دیں گے، وہ فرمانے لگے کہ کیا تم یہ سمجھے کہ میں موت کے خوف سے روتا ہوں، بات یہ نہیں، مجھے مابعد الموت کا خوف ہے کہ وہاں کوئی عذاب نہ ہو (قرطبی)

وَلَا يَحْزَنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنُ

اور غم میں نہ ڈالیں تجھ کو وہ لوگ جو دوڑتے ہیں کفر کی طرف وہ نہ



يُضِرُّ وَاللَّهُ شَيْءًا يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِطًّا فِي

بگاڑیں گے اللہ کا کچھ اللہ چاہتا ہے کہ ان کو فائدہ نہ دے آخرت

الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٤٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرُوا

میں اور ان کے لئے عذاب ہے بڑا جنہوں نے مول لیا

الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرَّ وَاللَّهُ شَيْءًا وَلَهُمْ عَذَابٌ

کفر کو ایمان کے بدلے وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ اور ان کے لئے عذاب

أَلِيمٌ ﴿١٥٠﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهَا تَأْتِي

ہے دردناک اور یہ نہ سمجھیں کافر کہ ہم جو ہمت دیتے ہیں ان

لَهُمْ خَيْرٌ لَّا نَفْسِهِمْ إِنَّمَا نَمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا

کو کچھ بھلا ہے ان کے حق میں ہم تو ہمت دیتے ہیں ان کو تاکہ ترقی کریں وہ گناہ میں

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٥١﴾

اور ان کے لئے عذاب ہے رسوا کرنی والا

رابطہ آیات | سابقہ آیات میں منافقین کی بے وفائی، بدخواہی کا ذکر تھا مذکورہ آیتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہے، کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور شکستہ خاطر نہ ہوں وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، آخری آیت میں اس خیال کا جواب ہے کہ بظاہر تو دنیا میں یہ کفار پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں تو ان کو مقہور و مغضوب کیسے سمجھا جائے؟

## خلاصہ تفسیر

اور آپ کے لئے وہ لوگ موجب غم نہ ہوئے چاہیں جو جلدی سے کفر کی باتوں میں جا پڑتے ہیں، (جیسے منافقین کہ ذرا مسلمانوں کا پلہ ہلنا دیکھا تو کھلم کھلا کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ واقعات مذکورہ میں معلوم ہو چکا ہے) یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے (اس لئے آپ کو یہ غم تو ہونا نہیں چاہئے کہ ان کی حرکتوں سے اللہ کے دین کو ضرر پہنچ جائے گا، اور اگر آپ کو خود ان کافروں کا غم ہو کہ یہ بد نصیب کیوں جہنم کی طرف جا رہے ہیں تو بھی آپ غم نہ کریں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو (مکرمی طور پر) منظور ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہ دے (اس لئے ان سے موافقت کی امید رکھنا صحیح نہیں،



اور رنج دیں ہوتا ہے جہاں امید ہو) اور دانگے لئے صرف آخرت کی نعمتوں سے محرومی ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو سزائے عظیم بھی ہوگی (اور جن طرح یہ لوگ دین اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے اسی طرح) یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان (کو چھوڑ کر اس) کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے (خواہ منافق ہوں یا کھلے کافر اور خواہ پاس کے ہوں یا دور کے) یہ لوگ (بھی) اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے اور ان کو (بھی پہلے لوگوں کی طرح) دوزخ سزا ہوگی، اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا ان کو (عذاب سے) ہمت دینا (کچھ) ان کے لئے بہتر (اور مفید) ہے (ہرگز نہیں بلکہ) ہم ان کو اس لئے ہمت دے رہے ہیں (جس میں زیادت عمر کی وجہ سے) ان کو جہنم میں اور ترقی ہو جائے (تاکہ یکبارگی پوری سزا ملے) اور دنیا میں اگر سزا نہ ہوئی تو کیا ہے آخرت میں تو، ان کو تو بین آئین سزا ہوگی

## معارف ومسائل

کفار کی دنیوی عیش و عشرت بھی | یہاں کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کافروں کو  
درحقیقت عذاب ہی کی تکمیل ہے | مہلت اور عمر دراز اور عافیت و راحت کے سامان اس  
لئے دیئے ہیں کہ وہ اپنے جرم میں اور بڑھتے جائیں تو پھر کفار بے قصور ہوئے، کیونکہ  
مقصود آیت کا یہ ہے کہ کفار کی اس چند روزہ مہلت اور عیش و عشرت سے مسلمان  
پر نشان نہ ہوں، کیونکہ باوجود کفر و عصیان کے ان کو دنیوی قوت، طاقت، سامان دنیا  
یہ بھی اُن کے عذاب ہی کی ایک صورت ہے، جس کا احساس آج نہیں اس دنیا سے جانے  
کے بعد ہوگا کہ یہ دنیا کا سامان راحت جو انھوں نے گناہوں میں خرچ کیا، درحقیقت  
جہنم کے انگارے تھے، جیسا کہ آیتوں میں خود حق تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ مَا يُرِيْلُ اللّٰهُ  
لِيُعَذِّبَ بِكُمْ دِيْنَهَا (۵۵:۹)، یعنی کفار کے اموال اور عیش و عشرت ان کے لئے کوئی فخر کرنے کی چیز  
نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے عذاب ہی کی ایک قسط ہے، جو ان کے عذابِ آخرت بڑھانے  
کا سبب ہے۔

مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو جب تک

يَبَيِّنُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ

کہ جُدا نہ کر دے نایاک کو پاک سے اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے



عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَّشَاءُ ۚ فَآمِنُوا

غیب کی لیکن اللہ چھانت لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے، سو تم یقین لاؤ

بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَتَقْوُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۷۹﴾

اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم یقین پر رہو اور بد ہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے

**رابط آیات** پچھلی آیت میں اس شبہ کا جواب تھا کہ جب کفار اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن اور مردود ہیں تو دنیا میں ان کو اموال و جائداد اور عیش و عشرت کے سامان کیوں حاصل ہیں، مذکورہ آیت میں اس کے بالمقابل اس شبہ کا ازالہ ہے کہ مومن مسلمان جو اللہ کے مقبول بندے ہیں ان پر تکالیف و مصائب کیوں آتے ہیں، مقبولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ راحتیں اور سامانِ راحت ان کو ملتا

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو کہ کفر و ایمان اور حق و باطل اور مومن و منافق میں اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے الحامات و نبوی کے اعتبار سے کوئی امتیاز اور فرق نہیں بلکہ مسلمانوں پر شدائد و مصائب کا نازل ہوتے رہنا اس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مومن مخلص) سے ممتاز نہ کر دیا جائے (اور یہ تمیز و تلبین مصائب و مشکلات ہی کے پیش آنے پر پوری طرح ہو سکتی ہے اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مومن و کافر اور حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ حوادث و مصائب ڈال کر ہی یہ امتیاز حاصل کیا جائے، اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس کا اعلان فرما سکتے ہیں کہ فلاں مومن مخلص ہے اور فلاں منافق، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں حرام، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (بمقتضائے حکمت) ایسے امور غیبیہ پر تم کو (بلا واسطہ) ابتلا و امتحان کے) مطلع نہیں کرنا چاہتے، لیکن ہاں جس کو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں اور (ایسے حضرات) وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (بلا واسطہ) حوادث بھی غیبی خبروں پر مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرمالتے ہیں، (اور تم پیغمبر ہو نہیں، اس لئے ایسے امور کی تمہیں اطلاع نہیں دی جاسکتی، البتہ ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے مخلص و منافق کا فرق خود بخود واضح ہو جائے، اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا میں کافروں پر عذاب نازل نہ ہونا بلکہ عیش و عشرت ملنا اور مسلمانوں پر بعض مصائب و شدائد نازل ہونا میں تقاضائے حکمت ہے، یہ باتیں کسی کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتیں پس اب تم (ایمان کے پسندیدہ



اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ کرو، بلکہ اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تم کو اجر عظیم ملے۔

## معارف مسائل

مؤمن و منافق میں امتیاز وحی کے | اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ مؤمن مخلص اور منافق میں امتیاز کے بجائے عملی طور پر کرنے کی حکمت لئے حق تعالیٰ ایسے حالات حوادث و مشکلات کے پیدا فرماتے ہیں جن سے عملی طور پر منافقین کا نفاق کھل جائے، اور یہ امتیاز اگرچہ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ بذریعہ وحی منافقین کے نام متعین کر کے بتلادیا جائے، مگر بمقتضائے حکمت ایسا نہیں کیا گیا اللہ تعالیٰ کے افعال کی پوری حکمتیں تو اسی کو معلوم ہیں، یہاں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلادیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں احتیاط کے لئے کوئی ایسی واضح حجت نہ ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کر لیں، وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو، ہم تو چکے سچے مسلمان ہیں۔

بخلاف اس پر عملی امتیاز کے جو مصائب کے بتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق بھاگ کھڑے ہوئے عملی طور پر ان کا نفاق کھل گیا، اب ان کا یہ منہ نہیں رہا کہ مؤمن و مخلص ہونے کا دعویٰ کریں اور اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری اختلاط بھی قطع ہو ورنہ دل میں اختلاف کے باوجود ظاہری اختلاط رہتا تو وہ بھی مضرب ہوتا۔ امور غیب پر کسی کو مطلع کر دیا | اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امور غیب پر بذریعہ وحی اطلاع دیتے تو وہ علم غیب نہیں ہر شخص کو نہیں دیتے، البتہ اپنے انبیاء کا انتخاب کر کے ان کو دیتے ہیں اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو انبیاء بھی علم غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے کیونکہ وہ علم غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو، دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو جس سے کسی ذرے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیب بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علم غیب نہیں ہے بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں جن کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ انبیاء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا، مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ (۴۹:۱۱)



وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ

اور نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ نے انکو دی ہے اپنے فضل سے کہ بخل

خَيْرٌ لَهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ

بہتر ہے ان کے حق میں بلکہ یہ بہت بُرا ہے ان کے حق میں اطوق بنا کر ڈالا جائیگا ان کے گلوں میں وہ مال جس میں بخل کیا تھا

الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ مِيرَاثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

قیامت کے دن اور اللہ وارث ہے آسمان اور زمین کا اور اللہ جو تم کرتے ہو

خَيْرٌ ۝ لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ

سو جانتا ہے بیشک اللہ نے سنی ان کی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم

أَغْنِيَاءُ مَسْئَلُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْآنبيَاءَ بِغَيْرِ حَتِّ لَا وَ

مال دار اب لکھ رکھیں گے ہم ان کی بات اور جو خون کئے ہیں انہوں نے انبیاء کے ناحق اور

نَقُولُ ذُقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ آيِدِيكُمْ

کہیں گے کہ کچھ عذاب جلتی آگ کا یہ بدلہ اس کا ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بچھا

وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ

اور اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو

عَهْدَ إِلَيْنَا إِلَّا نُونُ مِن لِّرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِينَا بَقَرَبَانٍ تَأْكُلُهُ

کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک نہ لائے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے

النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّن قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي

اس کو آگ تو کہہ تم میں آچکے کئے رسول مجھ سے پہلے نشانیاں لے کر اور یہ بھی

قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِنْ كَذَّبُوكَ

جو تم نے کہا پھر ان کو کیوں قتل کیا تم نے اگر تم سچے ہو پھر اگر یہ تجھ کو جھٹلا دیں

فَقَدْ كَذَّبَ رَسُولٌ مِّن قَبْلِكَ جَاءُوكَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ

تو پہلے تجھ سے جھٹلائے گئے بہت رسول جو لائے نشانیاں اور صحیفے

الْكِتَابِ الْمُنِيرِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَٰئِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا

اور کتاب روشن ہر جی کو چکھنی ہے موت اور ہم کو



تَوَفُّونَ أَجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَمَنْ زُحِرَ عَنْ النَّارِ وَ

پورے بدلے ملیں گے قیامت کے دن پھر جو کوئی دُور کیا گیا دوزخ سے اور

أَدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَاوَتْ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿١٨٥﴾

داخل کیا گیا جنت میں اس کا کام تو بن گیا، اور نہیں زندگی دنیا کی مگر پوچھنی دھوکہ کی

تَسْتَبْلُونَ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَسْتُمْ عَنْ الَّذِينَ أُوتُوا

البتہ تمہاری آزمائش ہوگی مالوں میں اور جانوں میں اور البتہ سنو گے تم اگلی کتاب

الْكِتَابِ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ

والوں سے اور مشرکوں سے بدگوئی بہت اور اگر

تَصْبِرُوا وَاصْبِرُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾

تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو یہ بہت کے کام ہیں

**رابط آیات** | سورة آل عمران کے شروع میں یہودیوں کی بُری خصلتوں اور شرارتوں کا ذکر تھا یہاں سے پھر اسی کی طرف عود کیا گیا، آیات مذکورہ سب اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں اور میان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور مسلمانوں کے لئے نصائح کا ذکر ہے۔

## خُلاصۂ تفسیر

اور ہرگز نہ خیال کریں ایسے لوگ جو (ضروری مواقع میں) ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات اُن کے لئے کچھ اچھی ہوگی، (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بُری ہے (کیونکہ انجام اس کا یہ ہوگا کہ) وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنا سے جائیں گے اس (مال) کا رسانپ بنا کر جس میں انھوں نے بخل کیا تھا اور (بخل کرنا یوں بھی حماقت ہے کہ) اخیر میں (جب سب مر جاویں گے) سب آسمان و زمین اور جو کائنات اُن کے اندر ہیں سب، اللہ ہی کا رہ جاوے گا (لیکن اس وقت یہ مال اللہ کے لئے ہو جانے سے تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا، کیونکہ تم نے اپنے اختیار سے نہیں دیئے، اور جب انجام کار سب اللہ ہی کا ہوتا ہے تو عقل کی بات یہ ہے کہ ابھی اپنے اختیار سے دید و تاکہ ثواب کے مستحق بنو) اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کچھ خرچ کرو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کرو)۔



میشک اللہ نے سن لیا ہے اُن (گستاخ) لوگوں کا قول جنہوں نے (استہزاء) یوں کہا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ مخلص ہے اور ہم مالدار ہیں، (اور صرف اس سنے پر اکتفاء نہیں کیا جاوے گا بلکہ ہم ان کے کہے ہوئے کو ان کے نامہ اعمال میں) لکھ کر دیں گے اور (اسی طرح) ان کا انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنا بھی (ان کے نامہ اعمال میں لکھا جاوے گا) اور ہم (ان پر سزا جاری کرنے کے وقت جتانے کے لئے) کہیں گے کہ (لو) چکھو آگ کا عذاب، (اور ان کو زحمتی بچنے کے لئے اس وقت یہ بھی کہا جاوے گا کہ) یہ (عذاب) اُن اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کر نیوالے نہیں وہ (یہود) ایسے لوگ ہیں کہ (بالکل جھوٹ تراش کر) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو (بواسطہ انبیاء سابقین) حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر (کی دعویٰ) پر اعتقاد (ان کے پیغمبر ہونے کا) نہ لادیں جب تک ہمارے سامنے معجزہ (خاص) نذر دنیا زخا و نذی کا ظاہر نہ کرے، کہ اس کو (آسمانی) آگ کھا جاوے (پہلے بعض انبیاء علیہم السلام کا یہ معجزہ ہوا ہے کہ کوئی چیز جاندار یا بے جان اللہ کے نام کی نکال کر کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دی، غیب سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اس چیز کو جلا دیا، یہ علامت قبولِ صدقات کی ہوتی تھی، مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ خاص معجزہ ظاہر نہیں فرمایا، اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، حق تعالیٰ اس کا جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ) آپ فرمادیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل (معجزات وغیرہ) لے کر آئے، اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو، سو تم نے ان کو کبھی قتل کیا تھا اگر تم (اس امر میں) سچے ہو سو اگر یہ (کفار) لوگ آپ کی تکذیب کریں تو (غم نہ کیجئے کیونکہ) بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں، تکذیب کی جا چکی ہے، جو معجزات لے کر آئے تھے اور (چھوٹے چھوٹے) صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر (جب کفار کی یہ عادت ہی ہے کہ انبیاء کی تکذیب کیا کرتے ہیں تو پھر آپ کو کیا غم ہے)۔

(تم میں) ہر جان (دار) کو موت کا مزہ پکھنا ہے اور (مرنے کے بعد) تم کو پوری پاداش تمہاری (بھلائی بُرائی کی) قیامت ہی کے روز ملے گی را اگر دنیا میں کافروں پر کسی سزا کا ظہور نہ ہو تو اس سے تکذیب کرنے والوں کو خوشی کا اور تصدیق کرنے والوں کو غم کا کوئی موقع نہیں آگے اس پاداش کی تفصیل ہے، تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا (اسی طرح جو جنت سے جدار ہا اور دوزخ میں بھیجا گیا پورا ناکام وہ ہوا) اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف (ایسی چیز ہے جیسے) دھوکہ کا سودا (ہوتا) ہے جس کی ظاہری آب و تاب کو دیکھ کر خریدار بھٹس جاتا ہے، بعد میں اس کی تسلی



کھل جاتی ہے تو افسوس کرتا ہے اسی طرح دنیا کی ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا کر آخرت سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

را بھی کیا ہے (البتہ آگے آگے) اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں کے نقصان میں اور اپنی جانوں کے نقصان میں اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی ان لوگوں سے (بھی) جو تم سے پہلے (آسمانی کتاب دینے گئے ہیں) یعنی اہل کتاب سے، اور ان ان لوگوں سے (بھی) جو کہ مشرک ہیں اور اگر (ان مواقع پر) صبر کرو گے اور (خلافت شرع امور کے) پرہیز رکھو گے تو (تمہارے لئے) اچھا ہو گا، کیونکہ یہ (صبر و تقویٰ) تاکیدِ احکام میں سے ہے۔

## معارف و مسائل

مذکورہ سات آیتوں میں سے پہلی آیت میں بخل کی مذمت اور اس پر وعید مذکور ہے۔  
 بخل کی تعریف اور اس پر سزا کی تفصیل | بخل کے معنی شرعی یہ ہیں کہ جو چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کسی پر واجب ہو اس کو خرچ نہ کرے، اسی لئے بخل حرام ہے، اور اس پر جہنم کی وعید شدید ہے، اور جن مواقع میں خرچ کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے، وہ اس بخل حرام میں داخل نہیں، البتہ معنی عام کے اعتبار سے اس کو بھی بخل کہہ دیا جاتا ہے، اس قسم کا بخل حرام نہیں، مگر خلافت اولیٰ ہے۔

بخل ہی کے معنی میں ایک دوسرا لفظ بھی احادیث میں آیا ہے، یعنی شح، اس کی تعریف یہ ہے کہ اپنے ذمہ جو خرچ کرنا واجب تھا وہ ادا نہ کرے، اس پر مزید یہ کہ مال بڑھانے کی حرص میں مبتلا ہے، تو وہ بخل سے بھی زیادہ شدید جرم ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یعنی شح و ایسا نہ کسی مسلمان کے قلب میں جمع نہیں ہو سکتے“ (قرطبی)

لَا يَجْمَعُ شَحٌّ وَ إِيْمَانٌ فِي قَلْبٍ  
 رَجُلٍ مُّسْلِمٍ أَبَدًا، رواه النسائي  
 عن ابی ہریرۃؓ

بخل کی جو سزا اس آیت میں ذکر کی گئی ہے کہ قیامت کے روز جس چیز کے دینے میں بخل کیا اس کا طوق بنا کر اس کے گھلے میں ڈالا جائے گا، اس کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ:  
 ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے کوئی مال عطا



فرمایا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گھلے کا طوق بنا دیا جائے گا وہ اس شخص کی باپھیں پکڑے گا، اور کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔  
(نسائی از تفسیر قرطبی)

دوسری آیت میں یہود کی ایک سخت گستاخی پر تنبیہ اور سزا کا ذکر ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ و صدقات کے احکام قرآن سے بتلائے تو گستاخ یہودیہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ فقیر و محتاج ہو گیا اور ہم مالدار ہیں جب ہی تو ہم سے مانگتا ہے (نعوذ باللہ منہ) ظاہر یہ ہے کہ اس یہودہ قول کے موافق ان کا اعتقاد تو نہ ہوگا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے کہا ہوگا کہ اگر قرآن کی یہ آیات صحیح ہیں تو ان کے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ فقیر و محتاج ہو، ان کا یہ لغو استدلال تو بدایہ باطل ہونے کی وجہ سے قابلِ جواب نہ تھا، کیونکہ حق تعالیٰ کا حکم صدقات کا اپنے نفع کے لئے نہیں خود اسباب مال کے نفع دینی اور دنیوی کے لئے ہے، مگر اس کو کہیں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کا عنوان اس لئے دیدیا گیا کہ جس طرح قرض کی ادائیگی ہر شریف آدمی کے لئے ضروری اور یقینی ہوتی ہے، اسی طرح جو قدر انسان دیتا ہے اس کی جزاء اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ ایسی قرار دیتے ہیں جیسے کسی کا قرض دینا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق اور مالک جانتا ہے، اس کو ان الفاظ سے کبھی وہ شبہ نہیں ہو سکتا جو گستاخ یہودیوں کے اس قول میں ہے اس لئے قرآن کریم نے اس شبہ کا جواب تو دیا نہیں، صرف اُن کی اس گستاخی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور آپ کا استہزاء کرنے کے متحدہ شدید جرائم کی سزا میں یہ فرمایا کہ ہم ان کے گستاخانہ کلمات کو لکھ کر رہیں گے تاکہ قیامت کے روز ان پر حجت تمام کر کے عذاب دیا جائے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔

پھر یہود کی اس گستاخی کے ذکر کے ساتھ ان کا ایک دوسرا جرم یہ بھی ذکر کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے انبیاء کی صرف تکذیب و استہزاء ہی نہیں کیا، بلکہ قتل کر ڈالنے سے بھی باز نہیں رہے، تو ایسے لوگوں سے کسی نبی و رسول کی تکذیب یا استہزاء پر کیا تعجب ہو سکتا ہے کفر و معصیت پر دل سے راضی یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ہونا بھی ایسا ہی عظیم گناہ ہے قرآن کے مخاطب یہود مدینہ میں، اور قتلِ انبیاء کا واقعہ ان کے بہت پہلے حضرت یحییٰ اور زکریا علیہما السلام کے زمانے کا ہے، تو اس آیت میں قتلِ انبیاء کا جرم ان مخاطبین کی طرف کیسے منسوب کیا گیا، وجہ یہ ہے کہ یہود مدینہ اپنے سابق یہودیوں



کے اس فعل پر راضی اور خوش تھے، اس لئے یہ خود بھی قاتلین کے حکم میں شمار کئے گئے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا اپنی تفسیر میں کہ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر اور معصیت میں داخل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد اس کی مزید توضیح کرتا ہے: آپؐ نے فرمایا کہ جب زمین پر کوئی گناہ کیا جاتا ہے تو جو شخص وہاں موجود ہو مگر اس گناہ کی مخالفت کرے اور اس کو برا سمجھے تو وہ ایسا ہے گویا یہاں موجود نہیں، یعنی وہ ان کے گناہ کا شریک نہیں، اور جو شخص اگرچہ اس مجلس میں موجود نہیں مگر ان کے اس فعل سے راضی ہے وہ باوجود غائب ہونے کے ان کا شریک گناہ سمجھا جائے گا۔ انتہی

اس آیت کے اخیر اور تیسری آیت میں ان گستاخوں کی سزایہ بتلائی ہے کہ ان کو دوزخ میں ڈال کر کہا جائے گا کہ اب آگ میں جلنے کا مزہ چکھو جو تمھارے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہے، اللہ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں۔

چوتھی آیت میں انہی یہود کا ایک افتراء و بہتان کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے یہ حیلہ پیش کیا کہ پچھلے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ صدقات کے مال کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دیئے جاتے تھے اور آسمانی آگ ان کو آکر جلا دیتی تھی، یہی علامت صدقات کی قبولیت کی ہوتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی امت کو حق تعالیٰ نے یہ خاص امتیاز عطا فرمایا تھا کہ اموال صدقات آسمانی آگ کی نذر کرنے کے بجائے مسلمان فقیروں و محتاجوں کو دیئے جاتے ہیں، چونکہ پچھلے انبیاءؑ کے طرز مذکور کے یہ طرز خلاف تھا، اس لئے اس کو مشرکین نے بہانہ بنایا کہ اگر آپؐ نہیں ہوتے تو آپؐ کو بھی یہ معجزہ عطا ہوتا کہ آسمانی آگ اموال صدقات کو کھا جاتی، اس پر مزید یہ جرات کی کہ اللہ تعالیٰ پر یہ بہتان باندھا کہ اس نے ہم سے یہ عہد لیا ہے کہ ہم اس شخص پر ایمان نہ لائیں جس سے یہ معجزہ آسمانی آگ کے آنے اور مال صدقہ کو جلانے کا صادر ہو۔

چونکہ یہود کا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل اور باطل تھا کہ اللہ نے ان سے یہ عہد لیا ہے، اس کا جواب دینے کی تو ضرورت نہ تھی، ان کو انہی کے مسئلہ قول سے مغلوب کرنے کے لئے یہ ارفاضہ فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایسا عہد لیا ہے تو پھر جن انبیاءؑ سابقین نے تمھارے کہنے کے مطابق یہ معجزہ بھی دکھلایا تھا کہ آسمانی آگ مال صدقہ کو کھا گئی، تو تم ان پر تو ایمان لاتے، مگر ہوا یہ کہ تم نے ان کی بھی تکذیب ہی کی، بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگرچہ یہود کا یہ دعویٰ اور مطالبہ قطعاً غلط تھا، لیکن اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ہو جاتا تو شاید ایمان لے آتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ



کے علم میں تھا کہ یہ لوگ محض عناد اور ہٹ دھرمی سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں اگر ان کے کہنے کے مظاہرہ معجزہ ہو بھی جاتا، جب بھی یہ ایمان نہ لاتے۔

پانچویں آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے، کہ ان کی تکذیب آپؐ غمگین نہ ہوں، کیونکہ یہ معاملہ تو بس انبیاءؑ کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔

فکر آخرت سائے غموں کا | پچھی آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اگر کبھی کسی جگہ کافروں علاج اور شبہات کا جواب | کو غلبہ ہی ہو جائے اور دنیا کی عیش و عشرت پوری پوری مل جائے اور مسلمانوں کو اس کے برعکس کچھ مصائب و مشکلات اور اسباب دنیا کی تنگی بھی پیش آجائے، تو یہ کوئی تعجب کی بات ہے نہ غمگین ہونے کی، کیونکہ اس حقیقت سے کسی مذہب و مشرب والے کو اور کسی فلسفہ والے کو انکار نہیں ہو سکتا، کہ دنیا کی بچہ و راحت دونوں چند روزہ ہیں، کوئی جاندار موت سے نہیں بچ سکتا، اور دنیا کی راحت و مصیبت اکثر تو دنیا ہی میں حالات بدل کر ختم ہو جاتی ہیں، اور بالفرض دنیا میں نہ بدلی تو موت پر سب کا خاتمہ ہو جانا یقینی ہے عقل مند کا کام اس چند روزہ راحت و رنج کی فکر میں پڑے رہنا نہیں، بلکہ مابعد الموت کی فکر کرنا ہے، کہ وہاں کیا ہو گا؟

دوران بقا، چو باد صحران بگذشت | تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

اسی لئے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا، اور پھر آخرت میں اپنے عمل کی جزاء و سزا پائے گا، جو شدید بھی ہوگی اور مدید بھی، تو عقلمند کو فکر اس کی کرنی چاہئے، اس کی رُو سے کامیاب صرف وہ شخص ہے جس کو دوزخ سے چھٹکارا مل جائے اور جنت میں داخل ہو جائے، خواہ ابتداء ہی، جیسا کہ صلحاء و عباد کے ساتھ معاملہ ہوگا، یا کچھ سزا بھگتنے کے بعد جیسا کہ گنہگار مسلمانوں کے ساتھ ہوگا، مگر مسلمان سب کے سب آخر کا جہنم سے نجات پا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت کی راحتوں اور نعمتوں کے مالک بن جائیں گے، بخلاف کفار کے کہ ان کا دائمی ٹھکانا جہنم ہے، وہ اگر دنیا کی چند روزہ راحت پر مغرور ہوں، تو دھوکا ہی دھوکا ہے، اسی لئے آخر آیت میں فرمایا کہ دنیا کی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے، کیونکہ عموماً یہاں کی لذتیں آخرت کی شدید کلفتوں کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور یہاں کی تکالیف بیشتر آخرت کے لئے ذخیرہ ہو جاتی ہیں۔

اہل حق کو اہل باطل سے ایذا میں پہنچنا ایک | ساتویں آیت ایک خاص واقعہ میں نازل ہوئی ہے، قدرتی امر ہے اور سب کے علاج صبر و تقویٰ ہے | جس کا ذکر اجمالی ابھی مذکور الصدر دوسری آیت میں

آچکا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن کریم میں جب آیت مَن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ



قَرْضًا حَسَنًا (۲۴۵:۱۲) نازل ہوئی، جس میں ایک بلیغ عنوان میں صدقہ و خیرات اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا ہے، اور اس بلیغ عنوان میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ یہاں دو گے اس کا بدلہ آخرت میں ایسا یقینی ہو کر ملے گا جیسے کسی کا قرض ادا کیا جاتا ہے۔

ایک جاہل یا معاند یہودی نے اس کو سن کر یہ الفاظ کہے اِنَّ اللّٰهَ فَقِيرٌ وَتَحَنُّ اَغْنِيَاءُ حضرت صدیق اکبرؓ کو اس کی گستاخی پر غصہ آیا اور یہودی کے ایک طمانچہ رسید کیا، یہودی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، تَشْتَبُونَ بِغِيٍّ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ اَلَا يَجْعَلُ لَكُم مَّا لَكُمْ يَوْمَ الدِّينِ كَيْلًا جان و مال کی مشربانیوں سے اور کفار و مشرکین اور اہل کتاب کی بدزبانی کی ایذاؤں سے گھبراننا نہیں چاہئے، یہ سب ان کی آزمائش ہے، اور اس میں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ صبر سے کام لیں اور اپنے اصل مقصد تقویٰ کی تکمیل میں مصروف رہیں اُن کی جواب دہی کی فکر میں نہ پڑیں۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ اَوْثَرُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ

اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کر دے گے لوگوں

وَلَا تَكْفُرُوْنَ فَنَسَبُوْهُ وَاَوْثَرُ اَعْيُنُهُمْ وَاَشْتَرُوْا بِهِ

اور نہ چھپاؤ گے پھر پھینک دیا انھوں نے وہ عہد اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید کیا اس کے

ثَمَنًا قَلِيْلًا فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ لَا تَحْسِبَنَّ الَّذِينَ

بدلے تھوڑا مول سو کیا بڑا ہے جو خریدتے ہیں، تو نہ سمجھے کہ جو لوگ خوش

يَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُحْسَدُ وَاِيْمًا لَمْ يَفْعَلُوْا

ہوتے ہیں اپنے کئے پر اور تعریف چاہتے ہیں کہ بنائے گئے پر سو

فَاِنْ تَحْسَبَنَّاهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۹۰﴾

تو سمجھ ان کو کہ جھوٹ گئے عذاب سے اور ان کے لئے عذاب ہے دردناک

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۹۱﴾

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان کی اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے،

رابط آیات | جیسے پچھلی آیات میں یہودیوں کے افعالِ بد اور بُری خصلتوں کا بیان تھا، مذکورہ پہلی آیت میں ان کے ایک ایسے بُرے عمل کا ذکر ہے، اور وہ ہے عہد و پیمان کی خلاف ورزی، کیونکہ اہل کتاب اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام جو قورات



میں آئے ہیں وہ اُن کی اشاعت عام کریں گے، اور کسی حکم کو اپنی نفسانی غرض سے چھپائیں گے نہیں اہل کتاب نے یہ عہد توڑ دیا، احکام کو چھپایا، اور پھر دلیری یہ کی کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا، اور اپنے اس فعل کو قابلِ تعریف قرار دیا۔

## خُلاصۂ تفسیر

(یہ حالت بھی قابلِ ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (کتب سابقہ میں) اہل کتاب کے یہ عہد لیا یعنی ان کو حکم فرمایا اور انھوں نے قبول کر لیا کہ اس کتاب کے (سب مضامین) عام لوگوں کے روبرو بیان کر دینا اور اس (کے کسی مضمون) کو (دنیوی غرض سے) پوشیدہ نہ رکھنا، سو اُن لوگوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک دیا، (یعنی اس پر عمل نہ کیا) اور اس کے مقابلہ میں (دنیا کا) کم حقیقت معاوضہ لے لیا سو بُری چیز ہے جس کو وہ لوگ لے رہے ہیں (کیونکہ انجام اس کا سزا دے دوزخ ہے)

(اے مخاطب) جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار (بد) پر خوش ہوتے ہیں اور جو (نیک) کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ (دنیا میں) خاص طور کے عذاب سے بچاؤ (اور حفاظت) میں رہیں گے (ہرگز نہیں بلکہ دنیا میں بھی کچھ سزا ہوگی) اور (آخرت میں بھی) ان کو دردناک سزا ہوگی۔

اور اللہ ہی کے لئے (خاص) ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

## معارف و مسائل

علم دین کو چھپانا حرام اور بغیر عمل کئے اس پر مدح و تعریف کا انتظار (اہتمام) مذموم ہے

مذکورہ تین آیتوں میں علماء اہل کتاب کے دو جرم اور ان کی سزا کا بیان ہے، اور یہ کہ ان کو حکم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جو احکام آئے ہیں ان کو سب کے سامنے

بے کم و کاست بیان کریں گے، اور کسی حکم کو چھپائیں گے نہیں، مگر انھوں نے اپنی دنیوی اغراض اور طمع نفسانی کی خاطر اس عہد کی پروا نہ کی، بہت سے احکام کو لوگوں سے چھپایا۔ دوسرے یہ کہ وہ نیک عمل کرتے تو ہیں نہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر عمل کے اُن کی تعریف کی جائے۔

احکامِ تورات کو چھپانے کا واقعہ تو صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ



منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے ایک بات پوچھی کہ کیا یہ تورات میں ہے ان لوگوں نے چھپایا، اور جو تورات میں تھا اس کے خلاف بیان کر دیا، اور اپنے اس عمل بد پر خوش ہوتے ہوئے واپس آئے کہ ہم نے خوب دھوکا دیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں ان لوگوں کے لئے وعید ہے۔

اور دوسرا معاملہ نہ کئے ہوئے عمل پر تعریف و مدح کے خواہشمند ہیں یہ ہے کہ منافقین یہود کا ایک طریقہ عمل یہ بھی تھا کہ جب کسی جہاد کا وقت آتا تو بہانے کر کے گھر میں بیٹھ جاتے، اور اس طرح جہاد کی مشقت سے بچنے پر خوشیاں مناتے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آتے تو آپ کے سامنے جھوٹی قسمیں کھا کر عذر بیان کر دیتے، اور اس کے طالب ہوتے تھے کہ ان کے اس عمل کی تعریف کی جائے (رواہ البخاری)

قرآن کریم نے ان دونوں چیزوں پر ان کی مذمت فرمائی، جس سے معلوم ہوا کہ علم دین اور احکام خدا اور رسول کو چھپانا حرام ہے، مگر یہ حرمت اسی طرح کے چھپانے کی ہے جو یہود کا عمل تھا، کہ اپنی دنیوی اغراض سے احکام خداوندی کو چھپاتے تھے، اور اس پر لوگوں سے مال وصول کرتے تھے، اور اگر کسی دینی اور شرعی مصلحت سے کوئی حکم عوام پر ظاہر نہ کیا جائے تو وہ اس میں داخل نہیں، جیسا کہ امام بخاری نے ایک مستقل باب میں اس مسئلہ کو بحوالہ احادیث بیان فرمایا ہے کہ بعض اوقات کسی حکم کے اظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس خطرہ کی بناء پر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

اور کوئی نیک عمل کرنے کے بعد بھی اس پر مدح و ثناء کا انتظار و اہتمام کرے تو عمل کرنے کے باوجود بھی قواعد شرعیہ کی رُو سے مذموم ہے اور نہ کرنے کی صورت میں تو اور بھی زیادہ مذموم ہے، اور طبعی طور پر یہ خواہش ہونا کہ میں بھی فلاں نیک کام کروں اور نیک نام ہوں وہ اس میں داخل نہیں، جبکہ اس نیک نامی کا اہتمام نہ کرے۔ (بیان القرآن)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

بے شک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات دن کا آنا جانا اس میں

لَايَةٍ لِّلَّذِينَ أُولِيَ الْأَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَ

نشانیوں ہیں عقل والوں کو وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور

مَعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَ

بیٹھے اور کر دھڑ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش



الْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ سُبْحَنَكَ فَقِنَا عَذَابَ

میں کہتے ہیں اے رب ہمارے تو نے یہ عجیب نہیں بنایا تو پاک ہے سب عیور گسور ہم کو بچا دوزخ

النَّارِ ۱۹ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخُلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا

کے عذاب ہے اے رب ہمارے جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا سو اس کو رسوا کر دیا اور ہمیں

لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۲۰ رَبَّنَا إِنَّنا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي

کوئی گنہگاروں کا مددگار اے رب ہمارے ہم نے سنا ایک بھارتے والا بھارتا ہے

لِلَّذِينَ آمَنُوا بِرَبِّكُمْ فَاْمَنَّاتُ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا

ایمان لانے کو کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر سو ہم ایمان لے آئے اے رب ہمارے اب بخش دے

ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۲۱ رَبَّنَا

گناہ ہمارے اور دُور کر دے ہم سے بُرائیاں ہماری اور موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ اے رب ہمارے

وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۲۲

اور دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے رسولوں کے واسطے اور رسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن

إِنَّكَ لَا تَخْلِفُ الْمِيعَادَ ۲۳

بے شک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا

رابطہ آیات چونکہ اوپر مختصاً سے توحید مفہوم ہوئی، اگلی آیت میں توحید پر دلیل لاتے

ہیں، اور اس کے ساتھ توحید کے کامل اقتضاء پر عمل کرنے والوں کی فضیلت

بیان فرماتے ہیں، جس میں اشارۃً دوسروں کو بھی ترغیب ہے اس اقتضاء پر عمل کرنے کی، اوپر

جو کفار سے ایذا نہیں پہنچنے کا مضمون تھا، آیت آئندہ کو اس سے بھی مناسبت ہے، اس طرح کہ

مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عناداً یہ درخواست کی کہ صفار پہاڑ کو سونے کا

بنادیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حق کے دلائل تو بہت ہیں، ان میں کیوں نہیں فکر کرتے۔

اور ان لوگوں کی یہ درخواست تحقیق حق کے لئے نہ تھی، بلکہ عناداً تھی جس سے درخواست

پورا ہونے پر بھی ایمان نہ لاتے۔

## خُلاصۂ تفسیر

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے



آنے جانے میں دلائل (توحید کے موجود) ہیں اہل عقل (سلیم) کے (ہستدلال کے) لئے جن کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور یہی حالت ان کے عاقل ہونے کی علامت بھی ہے) کیونکہ عقل کا اقتضار دفع مضرت و تحصیل منفعت ہے اور اس پر اس حالت کا مجموعہ وال ہے وہ حالت یہ ہے کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور اس زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی، اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوت عقلیہ سے) غور کرتے ہیں (اور غور کا جو نتیجہ ہوتا ہے یعنی حدوث ایمان یا تجدید و تقویت ایمان اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں حکمتیں رکھی ہیں جن میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس مخلوق سے خالق تعالیٰ کے وجود پر استدلال کیا جاوے) ہم آپ کو (لا یعنی پیدا کرنے سے) مستزہ سمجھتے ہیں (اس لئے ہم نے استدلال کیا اور توحید کے قائل ہوئے) سو ہم کو (موجود و مؤمن ہونے کی وجہ سے) عذاب و دوزخ سے بچالیجئے (جیسا کہ شرعاً اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی عاقل سے یہ اقتضای ضعیف ہو جاوے اور چندے عذاب ہونے لگے، ایک عرض تو ان لوگوں کی یہ تھی اور وہ اسی مضمون ایمان کے مناسب اور معروضات بھی کرتے ہیں جو آگے آتے ہیں) اے ہمارے پروردگار (ہم اس لئے عذاب و دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں کہ) بیشک آپ جس کو (بطور اصل جزاء کے) دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا، (مراد اس سے کافر ہے) اور ایسے بے انصافوں کا (جن کی اصلی جزاء دوزخ و جزا کی جاوے) کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں (اور آپ کا وعدہ ہے اہل ایمان کے لئے رسوا نہ کرنے کا بھی اور نصرت کرنے کا بھی، پس ایمان لا کر ہماری درخواست ہے کہ کفر کی اصلی جزاء سے بچائیے، ایمان کا اصل مقتضای یعنی دوزخ سے نجات مرتب فرمائیے)۔

اے ہمارے پروردگار ہم نے (جیسے مصنوعات کی دلالت سے عقلی استدلال کیا اسی طرح ہم نے) ایک (حق کی طرف) پکارنے والے کو (مراد اس سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں بواسطہ یا بلا واسطہ) سنا کہ وہ ایمان لانے کے لئے اعلان کر رہے ہیں کہ (اے لوگو) تم اپنے پروردگار (کی ذات و صفات) پر ایمان لاؤ سو ہم (اس دلیل نقلی سے استدلال کر کے بھی) ایمان لے آئے (اس درخواست میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول بھی ضمناً آگیا، پس ایمان کے دونوں جزو یعنی اعتقاد توحید و اعتقاد رسالت کامل ہو گئے)۔

اے ہمارے پروردگار پھر اس کے بعد ہماری یہ درخواست ہے کہ (ہمارے بڑے) گناہوں کو بھی معاف فرمادیجئے اور ہماری (چھوٹی) بدیوں کو ہم سے (معاف کر کے) زائل



کر دیجئے اور (ہمارا انجام بھی جس پر مدار ہے درست کیجئے اس طرح کہ) ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ (شامل رکھ کر) موت دیجئے (یعنی نیکی پر خاتمہ ہو)۔

اے پروردگار اور جس طرح ہم نے اپنی مضر توں سے محفوظ رہنے کے لئے درخواست کی ہر جیسے دوزخ و رسوائی اور ذنوب و سیئات، اسی طرح ہم اپنے منافع کی دعا کرتے ہیں کہ ہم کو وہ چیز (یعنی ثواب و جنت) بھی دیجئے جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے (کہ مؤمنین و ابرار کو حب عظیم ملے گا) اور (یہ ثواب و جنت ہم کو اس طرح دیجئے کہ ثواب ملنے سے پہلے بھی) ہم کو قیامت کے روز سوا نہ کیجئے (جیسا کہ بعض کو اڈل سزا ہوگی پھر جنت میں جاویں گے، مطلب یہ کہ اول ہی سے جنت میں داخل کر دیجئے اور) یقیناً آپ (تو) وعدہ خلافی نہیں کرتے (لیکن ہم کو یہ خوف ہے کہ جن کے لئے وعدہ ہے یعنی مؤمنین و ابرار کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا نخواستہ ہم ان صفات سے موصوف نہ رہیں جن پر وعدہ ہے، اس لئے ہم آپ سے یہ التجائیں کرتے ہیں کہ ہم کو اپنے وعدہ کی چیزیں دیجئے، یعنی ہم کو ایسا کر دیجئے اور ایسا ہی رکھئے جس سے ہم وعدہ کے مخاطب و محل ہو جاویں)۔

## معارف مسائل

**آیت کا شان نزول** | اس آیت کے شان نزول سے متعلق ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور محدث ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ عطاء بن ابی رباحؓ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جو سب سے زیادہ عجیب چیز آپ نے دیکھی ہو وہ مجھے بتلایئے، اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: آپ کی کس شان کو پوچھتے ہو؟ اُن کی تو ہر شان عجیب ہی تھی، اُن ایک واقعہ عجیب سناؤ ہوں، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات میرے پاس تشریف لائے، اور لحاف میں میرے ساتھ داخل ہو گئے، پھر فرمایا کہ اجازت دو کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں، بستر سے اُٹھے، وضو فرمایا، پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور قیام میں اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک پر بہہ گئے، پھر رکوع فرمایا اور اس میں بھی روئے، پھر سجدہ کیا، اور سجدہ میں بھی اسی قدر روئے پھر سر اٹھایا، اور مسلسل روئے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی، حضرت بلالؓ آئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دی، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضور اس قدر کیوں گریہ فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیئے ہیں، آپ نے فرمایا تو کیا میں شکر گزار بندہ



۱۔ بنوں؟ اور شکریہ میں گریہ و زاری کیوں نہ کر دیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے آج کی شب مجھ پر یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی ہے: **إِنَّمَا فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْاٰیۃ**۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: بڑی تباہی ہے اس شخص کے لئے جس نے ان آیتوں کو پڑھا اور ان میں غور نہیں کیا، لہذا آیت پر غور و فکر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل مسائل پر غور کرنا ہے۔

**خلق السموات والارض** | پہلا یہ کہ خلق السموات والارض سے کیا مراد ہے؟ خلق مصدر ہے جس کے معنی ایجاد و اختراع کے ہیں، معنی یہ ہوئے کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیاں ہیں، اس لئے اس میں تمام وہ مخلوقات اور مصنوعات باری تعالیٰ بھی داخل ہو جاتی ہیں جو آسمان اور زمین کے اندر ہیں، پھر ان مخلوقات میں قسم قسم کی مخلوقات ہیں جن میں ہر ایک کے خواص و کیفیات علیحدہ علیحدہ ہیں، اور ہر مخلوق اپنے خالق کی پوری طرح نشان دہی کر رہی ہے، پھر اگر زیادہ غور کیا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ السموات میں تمام رفعتیں داخل ہیں، اور الارض میں تمام پستیاں داخل ہیں، سو جس طرح اللہ تعالیٰ رفعتوں کا خالق ہے اسی طرح پستیوں کا بھی خالق ہے۔

**اختلاف لیل ونهار** | دوسرا یہ کہ اختلاف لیل و نهار سے کیا مراد ہے؟ لفظ اختلاف اس جگہ کی مختلف صورتیں عربی کے اس محاورہ سے ماخوذ ہے، کہ اختلف فلان فلاناً، یعنی وہ شخص فلاں شخص کے بعد آیا، پس اختلاف اللیل والنهار کے معنی یہ ہوئے کہ رات جاتی ہے اور دن آتا ہے، اور دن جاتا ہے تو رات آتی ہے۔

اختلاف کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اختلاف سے زیادتی و کمی مراد لی جائے سردیوں میں رات طویل ہوتی ہے اور دن چھوٹا ہوتا ہے، اور گرمیوں میں اس کے برعکس ہوتا ہے، اسی طرح رات و دن میں تفاوت ملکوں کے تفاوت سے بھی ہوتا ہے، مثلاً جو ممالک قطب شمالی سے قریب ہیں ان میں دن زیادہ طویل ہوتا ہے، بہ نسبت ان شہروں کے جو قطب شمالی سے دور ہیں، اور ان امور میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مسلہ پر روشن دلیل ہے۔

**لفظ آیات کی تحقیق** | تیسرا امر یہ ہے کہ لفظ آیات کے کیا معنی ہیں؟ آیات، آیہ کی جمع ہے، اور یہ لفظ چند معانی کے لئے بولا جاتا ہے، آیات، معجزات کو بھی کہا جاتا ہے، اور قرآن مجید کی آیات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے تیسرے معنی دلیل اور نشانی کے بھی ہیں، یہاں پر بھی تیسرے معنی مراد ہیں، یعنی ان امور میں اللہ کی بڑی نشانیاں قدرت کے دلائل ہیں۔



چوتھا اور اولوالالباب کے معنی سے متعلق ہے، الباب، لب کی جمع ہے، جس کے معنی مغز کے ہیں، اور ہر چیز کا مغز اس کا خلاصہ ہوتا ہے، اور اسی سے اس کی خاصیت و فوائد معلوم ہوتے ہیں، اسی لئے انسانی عقل کو لب کہا گیا ہے، کیونکہ عقل ہی انسان کا اصلی جوہر ہے، اولوالالباب کے معنی ہیں عقل والے۔

عقل والے صرف وہی لوگ ہیں | اب یہاں یہ مسئلہ غور طلب تھا کہ عقل والوں سے کون لوگ مراد جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے اور ہیں، کیونکہ ساری دنیا عقلمند ہونے کی مدعی ہے، کوئی بوقوف ہر حال میں اس کا ذکر کرتے ہیں بھی اپنے آپ کو بے عقل تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، اس لئے قرآن کریم نے عقل والوں کی چند ایسی علامات بتلائی ہیں جو درحقیقت عقل کا صحیح معیار ہیں، پہلی علامت اللہ پر ایمان ہے، غور کیجئے تو محسوسات کا علم کان، آنکھ، ناک، زبان، وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے، جو بے عقل جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے، اور عقل کا کام یہ ہے کہ علامات و قرائن اور دلائل کے ذریعہ کسی ایسے نتیجہ تک پہنچ جائے جو محسوس نہیں ہے، اور جس کے ذریعہ سلسلہ اسباب کی آخری کڑی کو پایا جاسکے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کائنات عالم پر غور کیجئے، آسمان اور زمین اور ان میں سمائی ہوئی تمام مخلوقات اور ان کی چھوٹی بڑی چیزوں کا مستحکم اور حیرت انگیز نظام عقل کو کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتا ہے، جو علم و حکمت اور قوت و قدرت کے اعتبار سے سب زیادہ بالاتر ہو، اور جس نے ان تمام چیزوں کو خاص حکمت سے بنایا ہو، اور جس کے ارادہ اور مشیت سے یہ سارا نظام چل رہا ہو، اور وہ ہستی ظاہر ہے کہ اللہ جل شانہ ہی کی ہو سکتی ہے، کسی عارف کا قول ہے ۵

ہر گیا ہے کہ از زمین روید

وحدہ لا شریک لہ گوید

انسانی ارادوں اور تدبیروں کے فیصل ہونے کا ہر جگہ اور ہر وقت مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس کو اس نظام کا چلانے والا نہیں کہا جاسکتا، اس لئے آسمان اور زمین کی پیدائش اور ان میں پیدا ہونے والی مخلوقات کی پیدائش میں غور و فکر کرنے کا نتیجہ عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی اطاعت و ذکر ہے، جو اس سے غافل ہے وہ عقلمند کہلانے کا مستحق نہیں، اس لئے قرآن کریم نے عقل والوں کی یہ علامت بتلائی: **الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ**، یعنی عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کریں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہوئے، مراد یہ ہے کہ ہر حالت اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں



مشغول ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ آج کی دنیا نے جس چیز کو عقل اور عقلمندی کا معیار سمجھ لیا ہے، وہ محض ایک دھوکا ہے، کسی نے مال و دولت سمیٹ لینے کو عقلمندی قرار دیدیا، کسی نے مشینوں کے کل پرزے بنانے یا برق اور بھاپ کو اصل پاؤں سمجھ لینے کا نام عقلمندی رکھ دیا، لیکن عقل سلیم کی بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے انبیاء و رسلؑ لے کر آئے کہ علم و حکمت کے ذریعے سلسلہ اسباب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرتے ہوئے درمیانی مراحل کو نظر انداز کیا، خام مواد سے مشینوں تک اور مشینوں سے برق اور بھاپ کی قوت تک تھیں سائنس نے پہنچایا، عقل کا کام یہ ہے کہ ایک قدم اور آگے بڑھو، تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو کہ اصل کام نہ پانی یا لوہے کا ہے، نہ مشین کا، نہ اس کے ذریعہ پیدا کی ہوئی اسٹیم کا، بلکہ کام اس کا ہے جس نے آگ اور پانی اور ہوا پیدا کی، جس کے ذریعہ یہ برق و بھاپ بھارے ہاتھ آئے ہیں۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقان

مصلحت را تہمتے بر آہوئے چہین بستہ اند

اس کو ایک عامیانہ محسوس مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک جنگل کا رہنے والا جاہل انسان جب کسی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، اور یہ دیکھے کہ ریل جیسی عظیم الشان سواری ایک سرخ جھنڈی کے دکھانے سے رک جاتی ہے، اور سبز کے دکھانے سے چلنے لگتی ہے تو اگر وہ یہ کہے کہ یہ سرخ اور سبز جھنڈی بڑے پاور اور طاقت کی مالک ہے کہ اتنی طاقت والے انجن کو رک دیتی اور چلا دیتی ہے، تو علم و عقل والے اس کو احمق کہیں گے، اور بتلائیں گے کہ طاقت ان جھنڈیوں میں نہیں، بلکہ اس شخص کے پاس ہے جو انجن میں بیٹھا ہوا ان جھنڈیوں کو دیکھ کر روکنے یا چلانے کا کام کرتا ہے، لیکن جس کی عقل کچھ اس سے زیادہ ہے وہ کچھ گھا کہ انجن ڈرائیور کو یا دریا طاقت کا مالک سمجھنا بھی غلطی ہے، کیونکہ درحقیقت اس کی طاقت کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ایک قدم بڑھ کر اس طاقت کو انجن کے کل پرزوں کی طرف منسوب کرے گا، لیکن ایک فلاسفر یا سائنس دان اس کو بھی یہ کہہ کر بہ وقت بتلائے گا کہ بے حس کل پرزوں میں کیا رکھا ہے، اصل طاقت اس بھاپ اور اسٹیم کی ہے، جو انجن کے اندر آگ اور پانی کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے، لیکن حکمت و فلسفہ یہاں آکر ٹھک جاتا ہے، انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کہ ظالم جس طرح جھنڈیوں کو یا ڈرائیور کو یا انجن کے کل پرزوں کو طاقت اور پاور کا مالک سمجھ بیٹھا اس جاہل کی غلطی تھی، اسی طرح بھاپ اور اسٹیم کو طاقت کا



مالک سمجھ لیتا بھی تیری فلسفیانہ غلطی ہے، ایک قدم اور آگے بڑھانا کہ تجھے اس الجھی ہوئی ڈور کا ہرا ہاتھ آئے، اور سلسلہ اسباب کی آخری کڑی تک تیری رسائی ہو جائے کہ دراصل ان ساری طاقتوں اور پاوروں کا مالک وہ ہے جس نے آگ اور پانی پیدا کئے، اور یہ سلیم تیار ہوئی۔  
 اس تفصیل سے آپے معلوم کر لیا کہ عقل والے کہلانے کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پہچانیں، اور ہر وقت ہر حالت میں اس کو یاد کریں، اسی لئے اولی الالباب کی صفت قرآن کریم نے یہ بتلائی الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ اس لئے حضرات فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کوئی انتقال سے قبل یہ وصیت کر چکا کہ میرا مال عقلاً کو دیدیا جائے، تو کس کو دیدیا جائے گا؟ اس کے جواب میں حضرات فقہاء کرام نے تحریر فرمایا کہ ایسے عالم زاہد اس مال کے مستحق ہوں گے جو دنیا طلبی اور غیر ضروری مادی وسائل سے دور ہیں، کیونکہ صحیح معنی میں وہی عقلاء ہیں (درمختار کتاب الوصیۃ)  
 اس جگہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت میں ذکر کے علاوہ کسی اور عبادت کی کثرت کا حکم نہیں دیا گیا، لیکن ذکر کے متعلق ارشاد ہے کہ اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا (۲۱: ۳۳) وجہ اس کی یہ ہے کہ ذکر کے سوا سب عبادت کے لئے کچھ شرائط اور قواعد ہیں، جن کے بغیر وہ عبادات ادا نہیں ہوتیں، بخلاف ذکر کے کہ اس کو انسان کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے، با وضو ہو یا بے وضو ہر حالت میں اور ہر وقت انجام دے سکتا ہے، اس آیت میں شاید اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے۔

آیت مذکورہ میں عقل والوں کی دوسری علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی تخلیق و پیدائش میں تفکر کرتے ہیں: يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ، الْآيَةُ یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ اس تفکر سے کیا مراد ہے، اور اس کا کیا درجہ ہے؟ فکر اور تفکر کے لفظی معنی غور کرنے اور کسی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ہیں، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر عبادت ہے اسی طرح فکر بھی ایک عبادت ہے، فرق یہ ہے کہ ذکر تو اللہ جل شانہ کی ذات و صفات کا مطلوب ہے، اور فکر و تفکر اسکی مخلوقات میں مقصود ہے، کیونکہ ذات و صفات الہیہ کی حقیقت کا ادراک انسان کی عقل سے بالاتر ہے، اس میں غور و فکر اور تدبر و تفکر بجز حیرانی کے کوئی نتیجہ نہیں رکھتا، عارف رومیؒ نے فرمایا ہے

دور بیسنان بارگاہ الست  
غیر ازیں پئے نبر وہ اند کہ ہست



بلکہ بعض اوقات حق جل شانہ کی ذات و صفات میں زیادہ غور و فکر انسان کی ناقص عقل کے لئے گمراہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے اکابر اہل معرفت کی وصیت ہے کہ تفکر مؤاخریٰ ایت اللہ لا تفکر مؤاخریٰ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نشانیوں میں غور و فکر کرو مگر خود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں غور و فکر نہ کرو، کہ وہ تمہاری رسائی سے بالاتر ہے، آفتاب کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھا جاسکتا ہے، مگر خود آفتاب کو کوئی دیکھنا چاہے تو آنکھیں خیر ہو جاتی ہیں، ذات و صفات کے مسئلہ میں تو بڑے بڑے ماہر فلاسفہ اور جہانوں کی سیر کرنے والے ارباب معرفت نے آخر کار یہی نصیحت کی ہے کہ

نہ ہر جائے مرکب تو اں تاختن

کہ جاہا سپر باید انداختن

البتہ غور و فکر اور عقل کی دوڑ دھوپ کا میدان مخلوقات الہیہ ہیں جن میں صحیح غور و فکر کا لازمی نتیجہ ان کے خالق جل شانہ کی معرفت ہے، اتنا عظیم الشان وسیع و عریض آسمان اور اس میں آفتاب و مہتاب اور دوسرے ستارے جن میں کچھ ثوابت ہیں جو دیکھنے والوں کو اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، کوئی بہت آہستہ حرکت ہو تو اس کا علم پیدا کرنے والے ہی کو ہے اور انہی ستاروں میں کچھ سیارات ہیں جن کے دورے نظام شمسی و قمری وغیرہ کے انداز میں نہایت محکم و مضبوط قانون کے تحت مقرر اور متعین ہیں، نہ ایک سیکنڈ ادھر ہوتے ہیں، نہ ان کی مشینری کا کوئی پرزہ ہلستا ہے، نہ ٹوٹتا ہے، نہ کبھی ان کو کسی درکشاپ میں بھیجنے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اس کی مشینری کبھی رنگ و روغن چاہتی ہے، ہزاروں سال سے ان کے مسلسل دورے اسی نظام محکم اور معین اوقات کے ساتھ چل رہے ہیں، اسی طرح زمین کا پورا کرہ، اس کے دریا اور پہاڑ، اور دونوں میں طرح طرح کی مخلوقات درخت اور جانور اور زمین کی جہم میں چھپی ہوئی معدنیات، اور زمین و آسمان کے درمیان چلنے والی ہوا، اور اس میں پیدا ہونے اور برسنے والی برق و باران اور اس کے مخصوص نظام یہ سب کے سب سوچنے، سمجھنے والے کے لئے کسی ایسی ہستی کا پتہ دیتے ہیں، جو علم و حکمت اور قوت و قدرت میں سب سے بالاتر ہے، اور اسی کا نام معرفت ہے، تو یہ غور و فکر معرفت الہیہ کا سبب ہونے کی وجہ سے بہت بڑی عبادت ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: تفکر ساعة حیوة من قیام لیلة (ابن کثیر) یعنی ایک گھنٹہ کی عبادت قدرتی غور کرنا پوری رات کی عبادت سے بہتر اور زیادہ مفید ہے۔

اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس غور و فکر کو افضل عبادت فرمایا ہے (ابن کثیر)



حسین بن عامرؓ نے فرمایا کہ میں نے بہت سے صحابہ کرامؓ سے سنا ہے، سب یہ فرماتے تھے کہ ایمان کا نور اور روشنی تفکر ہے۔

حضرت ابوسلمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں گھر سے نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نگاہ پڑتی ہے میں کھلی آنکھوں دیکھتا ہوں کہ اس میں میرے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اور اس کے وجود میں میرے لئے عبرت حاصل کرنے کا سامان موجود ہے (ابن کثیر) اسی کو بعض عارفین نے فرمایا کہ ۵

ہر گیا ہے کہ از زمین روید

وحدہ لا شریک لہ گوید

حضرت سفیان بن عیینہؒ کا ارشاد ہے کہ غور و فکر ایک نور ہے جو تیرے دل میں داخل ہو رہا ہے۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص کثرت سے غور و فکر کرے گا تو حقیقت سمجھ لے گا اور جو سمجھ لے گا اس کو علم صحیح حاصل ہو جائے گا، اور جس کو علم صحیح حاصل ہو گیا وہ ضرور عمل بھی کرے گا (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ ایک بزرگ کا گذر ایک عابد زاہد کے پاس ہوا، جو ایسی جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اُن کے ایک طرف قبرستان تھا اور دوسری طرف گھروں کا کوڑا کباڑ وغیرہ تھا، گذرنے والے بزرگ نے کہا کہ دنیا کے دو خزانے تمہارے سامنے ہیں ایک انسانوں کا خزانہ جس کو قبرستان کہتے ہیں، دوسرا مال و دولت کا خزانہ جو فضلات اور گندگی کی صورت میں ہے یہ دونوں خزانے عبرت کے لئے کافی ہیں (ابن کثیر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے قلب کی اصلاح و نگرانی کے لئے شہر سے باہر کسی ویرانہ کی طرف بھل جاتے تھے، اور وہاں پر پہنچ کر کہتے ابن اہلک یعنی تیرے لئے والے کہاں گئے؟ پھر خود ہی جواب دیتے کُلُّ شَیْءٍ هَآئِلٌ إِلَّا وَجْهَهُ (۸۸: ۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے (ابن کثیر) اس طرح تفکر کے ذریعہ آخرت کی یاد اپنے قلب میں مستحضر کرتے تھے۔

حضرت بشر حافیؒ نے فرمایا کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت میں تفکر کرتے تو اس کی معصیت و نافرمانی نہ کر سکتے۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے ضعیف الخلق آدمی! تو جہاں بھی ہو خدا سے ڈر اور دنیا میں ایک مہمان کی طرح بسر کر، اور مساجد کو اپنا گھر بنالے، اور اپنی آنکھوں



کو خوفِ خدا سے رونے کا اور جسم کو صبر کا اور قلب کو تفکر کا عادی بنادے، اور کل کے رزق کی فکر کرے۔

آیت مذکورہ میں اسی فکر و تفکر کو عقلمند انسان کا اعلیٰ وصف بیان فرمایا ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کر کے حق تعالیٰ کی معرفت اور دنیا کی ناپائیداری کا علم حضوری حاصل کر لینا افضل عبادت اور نور ایمان ہے، اسی طرح آیات الہیہ کو دیکھنے اور برتنے کے باوجود خود ان مخلوقات کی ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اُلجھ کر رہ جانا اور ان کے ذریعہ مالکِ حقیقی کی معرفت حاصل نہ کرنا سخت نادانی اور نا سمجھ بچوں کی سی حرکت ہے، مولانا جامیؒ نے اسی کو فرمایا ہے ۵

ہمہ اندر ز من ترا زین است

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

اور اسی بے بصیرتی کو حضرت مجذوبؒ نے اس طرح بیان فرمایا ۵

کچھ بھی مجنوں جو بصیرت تجھے حاصل ہو جائے

تو نے لیل جسے سمجھا ہے وہ محل ہو جائے

بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کائناتِ عالم کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تو بقدر اس کی غفلت کے اس کے قلب کی بصیرت مٹ جاتی ہے، آج کی سائنٹفک اور حیرت انگیز ایجادات اور ان میں اُلجھ کر رہ جانے والے موجدین کی خدا تعالیٰ اور اپنے انجامِ کار سے غفلت حکماء کے اس مقولہ کی کھلی شہادت ہے کہ سائنس کی ترقیات جوں جوں خدا تعالیٰ کی کمالِ صنعت کے رازوں کو کھولتی جاتی ہیں، اتنا ہی وہ خدا شناسی اور

حقیقت آگاہی سے اندھے ہوتے جاتے ہیں، بقول اکبر مرحوم ۵

بھول کر بیٹھا ہے یورپ آسمانی باپ کو

بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

قرآن کریم نے ایسے ہی بے بصیرت لکھے پڑھے جاہلوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے

وَكَايِنَ مِنَ الْآيَةِ وَالْآسَرِ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ عَلَيْهِمْ أَهْمٌ مِّمَّا مَعِيَ صُورَتٌ ۝

یعنی آسمان اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں اُن کی حقیقت

و صنعت اور ان کے صانع کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات و مصنوعات میں غور و فکر کر کے اس کی عظمت

و قدرت کا احضار ایک اعلیٰ عبادت ہے، اُن سے کوئی عبرت حاصل نہ کرنا سخت نادانی ہے



آیت مذکورہ کے آخری جملے نے آیات قدرت میں غور و فکر کا نتیجہ بتلایا ہے، رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا رَیْبًا ۚ یعنی حق تعالیٰ کی عظیم اور غیر محصور مخلوقات میں غور و فکر کرنے والا اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے فضول و بیکار پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کی خلقت میں ہزاروں حکمتیں مضمر ہیں، ان سب کو انسان کا خادم اور انسان کو محنت و دم کائنات بن کر انسان کو اس غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ساری کائنات تو اس کے فائدہ کے لئے بنی ہے، اور انسان خدا تعالیٰ کی طاعت و عبادت کے لئے پیدا ہوا ہے، یہی اس کا مقصد زندگی ہے، اس کے بعد غور و فکر اور تفکر و تدبیر کے نتیجے میں وہ لوگ اس حقیقت پر پہنچے کہ کائنات علم فضول و بیکار پیدا نہیں کی گئی، بلکہ یہ سب خالق کائنات کی عظیم قدرت و حکمت کے روشن دلائل ہیں۔

آگے ان لوگوں کی چند درخواستوں اور دعاؤں کا ذکر ہے جو انھوں نے اپنے رب کو پہچان کر اس کی بارگاہ میں پیش کیں۔

پہلی درخواست یہ ہے کہ فَقِنَّا عَذَابَ النَّارِ یعنی ہمیں جہنم کے عذاب سے بچائیے۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ ہمیں آخرت کی رسوائی سے بچائیے، کیونکہ جن کو آپ نے جہنم میں داخل کر دیا اس کو سارے جہان کے سامنے رسوا کر دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ میدانِ حشر کے اندر رسوائی ایک ایسا عذاب ہو گا کہ آدمی یہ خواہش کرے گا کہ کاش! اسے جہنم میں ڈال دیا جائے اور اس کی بدکاریوں کا چرچا اہلِ حشر کے سامنے نہ ہو۔

تیسری درخواست یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف سے آنے والے منادی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کو سنا، اور اس پر ایمان لائے تو آپ ہمارے بڑے گناہوں کو معاف فرمادیں، اور ہمارے عیوب اور برائیوں کا کفارہ فرمادیں اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ موت دیں، یعنی ان کے زمرہ میں شامل فرمائیں۔

یہ تین درخواستیں تو عذاب اور تکلیف اور مضرت سے بچنے کے لئے تھیں، آگے چوتھی درخواست فوائد اور منافع حاصل کرنے کے متعلق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ جو وعدہ آپ نے جنت کی نعمتوں کا فرمایا ہے وہ ہمیں اس طرح عطا فرمائیے کہ قیامت میں رسوائی بھی نہ ہو، یعنی اول مواخذہ اور بذنامی، بعد میں معافی کی صورت کے بجائے اول ہی سے معافی فرمادیجئے، آپ تو وعدہ خلافتی نہیں کیا کرتے، مگر اس عرض و معروض کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اس قابل بنا دیجئے کہ ہم یہ وعدہ حاصل کرنے کے مستحق ہو جائیں، اور پھر اس پر قائم رہیں، یعنی خاتمہ ایمان اور عمل صالح پر ہو۔



فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ

پھر قبول کی ان کی دعا، ان کے رب نے کہیں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی کم

مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أَنشَأَ بَعْضُكُم مِّنْ بَعْضٍ فَأَلِزِينَ هَاجِرُونَ

میں سے مرد ہو یا عورت تم آپس میں ایک ہو پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور

أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَوْدُوا فِي سَبِيلِي وَقَتَلُوا وَقُتِلُوا

نکلے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے

لَا كُفْرَانَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَهُمْ جَنَّتِ تَجْرِي

ابستہ دور کروں گا میں ان سے برائیاں ان کی اور داخل کروں گا ان کو باغوں میں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ تَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَ لَا

نیچے بہتی ہیں نہریں یہ بدل ہے اللہ کے ہاں سے اور اللہ کے ہاں ہے

حَسَنُ الثَّوَابِ ۝ (۱۹۵) لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي

اچھا بدلہ تجھ کو دھوکا نہ دے چلا پھرنا کافروں کا شہروں

الْبِلَادِ ۝ (۱۹۶) مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ

میں یہ ناکارہ ہے تھوڑا سا پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت بُرا

الْيَهَادُ ۝ (۱۹۷) لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّتٌ تَجْرِي

ٹھکانا ہے لیکن جو لوگ ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہیں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نَزِلًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَ

نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں جہان ہے اللہ کے ہاں سے اور

مَّا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْكَافِرِينَ ۝ (۱۹۸) وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

جو اللہ کے ہاں ہے سو بہتر ہے نیک بخنوں کے واسطے اور کتاب والوں میں بعض وہ ہیں

لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ

جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور جو اترا بختماری طرف اور جو اترا ان کی طرف

خَشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْكُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ذَلِكُمْ

عاجزی کرتے ہیں اللہ کے آگے نہیں خریدتے اللہ کی آیتوں پر بول کھوڑا یہی ہیں



لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ زِدْ لَهُمْ سَرِيعَ الْحِسَابِ (۱۹۹)

جن کے لئے مزدوری ہے ان کے رب کے ہاں بیشک اللہ جلد دیتا ہے حساب

**رابطہ آیات** | سابقہ آیات میں مومنین صالحین کی چند دعاؤں کا ذکر تھا، مذکورہ پہلی آیت میں ان دعاؤں کی قبولیت اور ان کے اعمال صالحہ کے اجر عظیم کا بیان ہے، دوسری تیسری آیتوں میں یہ ہدایت ہے کہ کفار کے ظاہری عیش و عشرت مال و دولت اور دنیا میں چلنے پھرنے سے مسلمانوں کو کوئی دھوکہ نہ ہونا چاہئے، کہ وہ چند روزہ ہے، اور پھر عذاب دائمی۔

چوتھی آیت میں پھر تقویٰ شعار مسلمانوں کے لئے جنت کی لازوال نعمتوں کا وعدہ ہے، پانچویں میں خصوصیت سے ان مسلمانوں کے اجر عظیم کا ذکر ہے جو پہلے اہل کتاب میں سے تھے پھر مسلمان ہو گئے۔

## خُلاصۂ تفسیر

سو قبول کر لیا ان کی دعاؤں کو ان کے رب نے اس وجہ سے کہ میری عادت مستحکم ہے کہ میں کسی شخص کے (نیک) کام کو جو متم میں سے کام کرنے والا ہوا کثرت نہیں کرتا کہ اس کا بدلہ نہ دیا جائے) خواہ وہ (کام کرنے والا) مرد ہو یا عورت (دونوں کے لئے ایک ہی قانون ہے کیونکہ تم (دونوں) آپس میں ایک دوسرے کے جزد ہو) اس لئے حکم بھی دونوں کا ایک سا ہی ہے، پس جب انھوں نے ایمان قبول کر کے ایک بڑا نیک عمل کیا، اور اس پر مرتب ہونے والے اثرات کی درخواست کی تو میں انکی دعا و درخواست کو اپنی عادت مستحکم کے مطابق منظور کر لیا اور جب ہم ایمان پر ایسے ثمرات عطا فرماتے ہیں، تو جن لوگوں نے (ایمان کے ساتھ اور اعمال شاقہ بھی کئے جیسے ہجرت یعنی ترک وطن کیا اور وہ بھی ہنسی خوشی، سیر و سیاحت کیلئے نہیں، بلکہ اس طرح کہ) اپنے گھروں سے (تنگ کر کے) نکالے گئے اور (اس کے سوا طح طرح کی تکلیفیں) بھی دیئے گئے (دریائیں یعنی ہجرت اور وطن سے نکالنا اور مختلف قسم کی ایذا میں سب) میری راہ میں (یعنی میرے دین کے سبب ان کو پیش آئیں اور ان سب کو انھوں نے برداشت کیا) اور (اس سے بڑھ کر انھوں نے یہ کام کیا کہ) جہاد (بھی) کیا اور (بہت سے ان میں) شہید (بھی) ہو گئے، اور آخر تک جہاد سے نہ ہٹے، تو ایسے محنت کے اعمال پر ثمرات اور نعمتیں کیوں نہ ملیں گی) ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں (جو میرے حقوق کے متعلق ہو گئی ہوں) معاف کر دوں گا اور ضرور ان کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے



(مخلّات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی (ان کو یہ بدلے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس (یعنی اس کے قبضہ قدرت میں) اچھا عوض ہے) (مذکورہ آیات میں مسلمانوں کی کھلفتوں کا بیان اور اس کا انجام نیک مذکور تھا، آگے کافروں کے عیش و آرام اور اس کے انجام بد کا ذکر ہے، تاکہ مسلمانوں کی تسلی ہو اور بد عمل لوگوں کو اصلاح اور توبہ کی توفیق ہو)۔

لَا يَخْشَىٰ ذَٰلِكَ (اے طالب حق) تجھ کو ان کافروں کا (کسب عاشر یا تفریحات کے لئے پہلنا پھرنایا لٹا میں نہ ڈال دے) (اس حالت کی کچھ وقعت کرنے لگے، یہ چند روزہ بہار ہی (کیونکہ مرتے ہی اس کا نام و نشان بھی نہ رہے گا، اور) پھر (انجام یہ ہوگا کہ) ان کا تھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا اور وہ بُری ہی آرام گاہ ہے، لیکن (ان میں سے بھی) جو لوگ خدا سے ڈریں (اور مسلمان و مسرمانہ پر دار ہو جائیں) ان کے لئے بہشتی باغات ہیں جن کے (مخلّات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یہ (ان کی) مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے، اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں رجن کا ابھی ذکر ہوا یعنی بہشتی باغ اور نہریں وغیرہ) یہ نیک بندوں کے لئے بدرجہا بہتر ہیں (کفار کی چند روزہ عیش و مسرت سے)۔

مذکورہ آیات دعا سے پہلے اہل کتاب کی بُری خصلتوں اور ان کے عذاب و انجام بد کا مسلسل ذکر آیا ہے، آگے ان لوگوں کا ذکر ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان صالح ہو گئے، اس لئے قرآن کی عام عادت کے مطابق بدکرداروں کے قبائح کے بعد نیکو کاروں کی مدائح کا ذکر ہے) ذَٰلِكَ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ اور بانیقین بعضے لوگ اہل کتاب میں سے ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کتاب کے ساتھ بھی (اعتقاد رکھتے ہیں) جو تمہارے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب کے ساتھ بھی (اعتقاد رکھتے ہیں) جو ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی تورات اور انجیل اور خدا کے ساتھ جو اعتقاد رکھتے ہیں تو) اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے (بھی) ہیں (اس لئے اس اعتقاد میں حدود سے تجاوز نہیں کرتے کہ اللہ پر اولاد کی تہمت لگائیں یا احکام میں افتراء کریں، اور تورات و انجیل کے ساتھ جو اعتقاد رکھتے ہیں تو اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلہ میں دنیا کا) کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (اور اس میں کچھ دیر بھی نہ لگے گی، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب (کتاب) کرے گا، (اور حساب کتاب کرتے ہی سب کا دینا لینا بے باقی کر دیں گے)۔



## معارف مسائل

ہجرت اور شہادت سے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرض وغیرہ حقوق العباد کی معافی کا وعدہ نہیں

لَا كَيْفَ لَنَنْعِظَهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ كَمَا نَحْتَ خِلَاصَةً تَفْسِيرِ میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ اللہ کے حقوق میں جو کوتاہیاں اور گناہ ہوئے وہ معاف ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں قرض اور دین کا مستثنیٰ ہونا بیان فرمایا ہے، اس کی معافی کا ضابطہ یہی ہے کہ خود یا اس کے وارث ان حقوق کو ادا کر دیں یا معاف کرا دیں، اور کسی شخص پر حق تعالیٰ خاص فضل فرما دیں اور اصحاب حق کو اس سے راضی کر کے معاف کرا دیں یہ اور بات ہے، اور بعض کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا

اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو اور ڈرتے رہو

اللَّهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾

اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو

۲۰۰  
ع  
۱۱

رابط آیات یہ سورۃ آل عمران کی آخری آیت ہے مسلمانوں کے لئے چند اہم وصیتوں پر مشتمل ہے، گویا پوری سورت کا خلاصہ ہے،

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو (مکالیف پر) خود صبر کرو اور رجب کفار سے مقابلہ ہو تو) مقابلہ میں صبر کرو اور (احتمالِ مقابلہ کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کہ حدودِ شرعیہ سے نہ نکلو، تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں لازمی اور ضروری اور بعض اوقات دنیا میں بھی)۔

## معارف مسائل

اس آیت میں تین چیزوں کی وصیت مسلمانوں کو کی گئی ہے، صبر، مصابرو، رابطہ، اور چوتھی چیز تقویٰ ہے جو ان تینوں کے ساتھ لازم ہے۔



صبر کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں، اور اصطلاح قرآن و سنت میں نفس کو خلاف طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے، جس کی تین قسمیں ہیں:

اول: صبر علی الطاعات، یعنی جن کاموں کا اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے، ان کی پابندی طبیعت پر کتنی بھی شاق ہو اس پر نفس کو جمائے رکھنا۔

دوسرے: صبر عن المعاصی، یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے وہ نفس کیلئے کتنی ہی مرغوب و لذیذ ہوں نفس کو اس سے روکنا۔

تیسرے صبر علی المصائب، یعنی مصیبت و تکلیف پر صبر کرنا حد سے زائد پریشان نہ ہونا، اور سب تکلیف و راحت کو حق تعالیٰ کی طرف سے سمجھ کر نفس کو بے قابو نہ ہونے دینا۔

مصابرت اسی لفظ صبر سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا، رابطہ، یہ لفظ رابط سے بنا ہے جس کے اصلی معنی باندھنے کے ہیں، اور اسی وجہ سے رابطہ اور رابطہ کے معنی گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لئے جاتے ہیں، قرآن کریم میں اسی معنی کے لئے آیا ہے، وَمِنْ رِبَاطِ الْغَیْلِ (۶۰:۸) اصطلاح قرآن و حدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے:

اول اسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لئے جنگی گھوڑے اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے، تاکہ دشمن اسلامی سرحد کی طرف رخ کرنے کی جرأت نہ کرے۔

دوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی سے دوسری نماز کے انتظار میں رہے، یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے فضائل بے شمار ہیں، ان میں سے چند یہاں لکھے جاتے ہیں:

رابط یعنی اسلامی سرحد کی حفاظت کے لئے جنگ کی تیاری کے ساتھ وہاں کی حفاظت کا انتظام قیام کرنے کو رابطہ اور رابطہ کہا جاتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ کسی جنگ کا خطرہ سامنے نہیں، سرحد مامون و محفوظ ہے، محض حفظ و تقدم کے طور پر اس کی نگرانی کرنا ہے، ایسی حالت میں تو یہ بھی جائز ہے کہ آدمی وہاں اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہنے بسنے لگے، اور زمین کی کاشت و غیرہ سے اپنا معاش پیدا کرتا رہے، اس حالت میں اگر اس کی اصل نیت حفاظت سرحد کی ہے، رہنا بسنا اور کسب معاش اس کے تابع ہے تو اس شخص کو بھی رابطہ فی سبیل اللہ کا ثواب ملے گا، خواہ کبھی جنگ نہ کرنا پڑے، لیکن جس کی اصل نیت حفاظت سرحد نہ ہو بلکہ اپنا گزارہ ہی مقصد ہو خواہ اتفاقی طور پر سرحد کی حفاظت کی بھی نہ ہو بہت آجائے یہ شخص رابطہ فی سبیل اللہ نہیں ہوگا۔



دوسری صورت یہ ہے کہ سرحد پر دشمن کے حملہ کا خطرہ ہے، ایسی حالت میں عورتوں بچوں کو دھال رکھنا درست نہیں، صرف وہ لوگ رہیں جو دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں (قرطبی)

ان دونوں صورتوں میں رباط کے فضائل بے شمار ہیں، صحیح بخاری میں حضرت سہیل بن سعد ساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں ایک دن کا رباط تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اور صحیح مسلم میں بروایت سلمانؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن رات کا رباط ایک مہینہ کے مسلسل روزے اور تمام شب عبادت میں گزارنے سے بہتر ہے، اور اگر وہ اسی حال میں مر گیا تو اس کے عمل رباط کا روزہ ثواب ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا رزق جاری رہے گا اور وہ شیطان سے مامون و محفوظ رہے گا۔

اور ابو داؤد نے بروایت فضالہ بن عبید نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے، بجز رباط کے کہ اس کا عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہتا ہے، اور قبر میں حساب و کتاب لینے والوں سے مامون و محفوظ رہتا ہے۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ عمل رباط ہر صدقہ جاریہ سے بھی زیادہ افضل ہے، کیونکہ صدقہ جاریہ کا ثواب تو اسی وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک اس کے صدقہ کئے ہوئے مکان، زمین یا تصانیف کتب یا وقف کی ہوئی کتابوں وغیرہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں، جب یہ فائدہ منقطع ہو جائے تو ثواب بھی بند ہو جاتا ہے، مگر رباط فی سبیل اللہ کا ثواب قیامت تک منقطع ہونے والا نہیں، وجہ یہ ہے کہ سب مسلمانوں کو اعمال صالحہ پر قائم رہنا جب ہی ممکن ہو جبکہ وہ دشمن کے حملوں سے محفوظ ہوں تو ایک رباط کا عمل تمام مسلمانوں کے اعمال صالحہ کا سبب بنتا ہے، اسی لئے قیامت تک اس کے عمل رباط کا ثواب بھی جاری رہے گا، اور اس کے علاوہ وہ جتنے نیک کام دنیا میں کیا کرتا تھا ان کا ثواب بھی بغیر عمل کئے، ہمیشہ جاری رہے گا، جیسا کہ ابن ماجہ میں باسناد صحیح حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

مَنْ مَاتَ مُرَاطِبًا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُجِرَ  
عَلَيْهِ أَجْرُ عَمَلِهِ الصَّالِحِ الَّذِي كَانَتْ  
يَعْمَلُهُ وَأُجِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ وَأَمِنَ  
مِنَ الْفَتَنِ وَبَعَثَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ  
إِمْنًا مِنَ الْقَزَعِ

(از تفسیر قرطبی)

جو شخص حالت رباط میں مر جائے تو وہ جو کچھ عمل صالح دنیا میں کیا کرتا تھا ان سب اعمال کا ثواب برابر جاری رہے گا، اور اس کا رزق بھی جاری رہے گا اور شیطان سے (یا سوال قبر) محفوظ رہے گا، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کو ایسا مطمئن اٹھائیں گے کہ محشر کا کوئی خوف اس پر نہ ہوگا۔



اس روایت میں جو فضائل مذکور ہیں ان میں شرط یہ ہے کہ حالت رباط ہی میں اس کی موت آجائے، مگر بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ بھی اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹ گیا تو یہ ثواب پھر بھی جاری رہے گا۔

حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کی کمزور سرحد کی حفاظت اخلاص کے ساتھ ایک دن رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں کرنے کا ثواب تئیس سال کے مسلسل روزوں اور شب بیداری سے افضل ہے، اور رمضان میں ایک دن کا رباط افضل و اعلیٰ ہے ایک ہزار سال کے صیام و قیام سے (اس لفظ میں راوی نے کچھ تردد کا اظہار کیا ہے) پھر فرمایا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیح سالم اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹا دیا تو ایک ہزار سال تک اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا، اور نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی اور اس کے عمل رباط کا اجر قیامت تک جاری رہے گا۔ (قرطبی)

نماز جماعت کی پابندی ایک | ابوسلمہ بن عبدالرحمنؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد دوسری کے انتظار میں رہنا بھی رباط فی سبیل اللہ ہے۔  
نے فرمایا کہ میں تمہیں وہ چیز بتاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیں اور تمہارے درجات بلند کریں، وہ چیزیں یہ ہیں، وضو کو مکمل طور پر کرنا باوجود دے کہ سردی یا کسی زخم درد وغیرہ کے سبب اعضاء وضو کا دھونا مشکل نظر آ رہا ہو، اور مسجد کی طرف کثرت سے جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار، پھر فرمایا، ذلکم الرباط (یعنی یہی رباط فی سبیل اللہ ہے)

امام قرطبیؒ نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس حدیث کی رو سے امید ہے کہ جو شخص ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کی پابندی کرے اس کو بھی اللہ تعالیٰ وہ ثواب عطا فرمادیں گے جو رباط فی سبیل اللہ کے لئے احادیث میں مذکور ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اول تو مسلمانوں کو صبر کا حکم دیا گیا ہے جو ہر وقت ہر حال میں ہر جگہ ہو سکتا ہے، اور اس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے، دوسرا حکم مصائب کا جو کفار سے مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت ہوتا ہے، تیسرا حکم م رابطہ کا جو کفار سے مقابلہ کا احتمال اور خطرہ لاحق ہونے کے وقت ہوتا ہے، اور سب آخر میں تقویٰ کا حکم ہے جو ان سب کاموں کی روح اور قبولیت اعمال کا دار ہے، یہ مجموعہ تقریباً تمام احکام شرعیہ پر حاوی ہے، حق تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق کامل عطا فرمائیں۔ واللہ الحمد اولہ و آخرہ ۛ

سورۃ آل عمران تمام شد



# سُورَةُ النِّسَاءِ

سُورَةُ النِّسَاءِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ مِائَتٌ وَبَعُودُونَ وَأَرْبَعَةٌ وَعِشْرُونَ رُكُوعًا،

سورة نساء مدینہ میں نازل ہوئی اور اس میں ایک سو چھیتر آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

شرع اللہ کے نام سے جو بحد مہربان نہایت رحم والا ہے

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ

اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَ

اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلانے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں اور

اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ

ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطے سوال کرتے ہو آپس میں اور خیر دار ہو قرابت والوں سے بیشک اللہ

عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝ ۱ وَأَتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا

تم پر نگہبان ہے اور دے ڈالو یتیموں کو ان کا مال اور بدل نہ لو

الْخَبِيثَاتِ بِالطَّيِّبَاتِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ ۚ

برے مال کو اچھے مال سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں کے ساتھ

إِنَّهُ كَانَ حَوبًا كَبِيرًا ۝ ۲

یہ ہے بڑا وبال

رابط آیات و سورت | سورة آل عمران کی آخری آیت تقویٰ پر ختم ہوئی ہے اور یہ سورت بھی



حکم تقویٰ سے شروع ہو رہی ہے، پہلی سورت میں بعض غزوات اور مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے اور غزوات کے سلسلہ میں مالی غنیمت حاصل ہونے پر خیانت کی مذمت، اور بعض دیگر امور کا ذکر تھا، اس سورت کے شروع میں اپنوں سے میل جول یعنی حقوق العباد سے متعلق احکام ہیں مثلاً یتیموں کے حقوق، رشتہ داروں اور بیویوں کے حقوق وغیرہ، لیکن حقوق کچھ تو ایسے ہیں جو قانون انضباط میں آسکتے ہیں، اور ان کی ادائیگی بزور قانون کرائی جاسکتی ہے، جیسے عام معاملہ بیع و شراء، اجارہ و مزدوری کے ذریعہ پیدا ہونے والے حقوق، جو باہمی معاہدات اور صلح کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں، اگر کوئی فریق مقررہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو بزور حکومت بھی دلوں گے جاسکتے ہیں، لیکن اولاد، والدین، شوہر اور بیوی و یتیم بچے جو اپنی تحویل میں ہوں، اور دوسرے رشتہ داران کے باہمی حقوق جو ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی کا مدار، ادب، احترام، دلداری، ہمدردی اور قلبی خیر خواہی پر ہے، اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کانٹے میں تولی نہیں جاسکتیں، اور معاہدات کے ذریعہ بھی ان کی پوری تعیین مشکل ہے، لہذا ان کی ادائیگی کے لئے بجز خوف خدا اور خوف آخرت کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، جس کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ تقویٰ کی طاقت حکومت اور قانون کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس سورت کو امر بالتقویٰ سے شروع فرمایا، اور ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّ بَعْدَ الَّذِي نَسِيتُمْ لِقَاءَ رَبِّكُمْ، یعنی اے لوگو! اپنے رب کی مخالفت سے ڈرو، اور شاید یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو خطبہ نکاح میں پڑھا کرتے تھے، اور خطبہ نکاح میں اس کا پڑھنا منسوخ ہے، اس میں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ خطاب يَا أَيُّهَا النَّاسُ کے ذریعہ فرمایا گیا ہے، جس میں تمام انسان شامل ہیں، مرد ہوں یا عورتیں، اور نزول قرآن کے وقت موجود ہوں یا آئندہ قیامت تک پیدا ہوں، پھر حکم اتَّقُوا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے لفظ رب کو اختیار کیا گیا، جس میں امر تقویٰ کی علت اور حکمت کی طرف اشارہ فرمادیا کہ جو ذات تمہاری پرورش کی کفیل ہے اور جس کی شان ربوبیت کے مظاہر انسان اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس کی مخالفت اور سرکشی کس قدر خطرناک ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی رب تعالیٰ کی ایک خاص شان کا ذکر فرمایا کہ اس نے اپنی حکمت و رحمت سے ہم سب کو پیدا کیا، پھر پیدا کرنے اور موجود کرنے کی مختلف صورتیں ہو سکتی تھیں ان میں سے ایک خاص صورت کو اختیار فرمایا، کہ سب انسانوں کو ایک ہی انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کر کے سب کو اخوة و برادری کے ایک مضبوط رشتہ میں



ہاں مرد یا، علاوہ خوف خدا و آخرت کے اس رشتہ اخوة کا بھی یہی تقاضی ہے کہ باہمی ہمدردی و خیر خواہی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں، اور انسان انسان میں ذات پات کی اونچ نیچ، نسلی اور لونی یا لسانی امتیازات کو شرافت و رذالت کا معیار نہ بنایا جائے، اس لئے فرمایا:

الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً، یعنی "اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے، آدم سے اس طرح پیدا فرمایا کہ پہلے ان کی بیوی حضرت حوا کو پیدا کیا، پھر اس جوڑے کے ذریعہ بہت سے مرد اور عورتیں پیدا فرمائیں۔"

غرض یہ پوری آیت ان احکام کی تمہید ہے جو آگے اس سورت میں آنے والے ہیں، اس تمہید میں ایک طرف تو پروردگار عالم کے حقوق سامنے رکھ کر اس کی مخالفت سے روکا گیا، دوسری طرف تمام افراد انسانی کو ایک باپ کی اولاد بتلا کر ان میں محبت اور باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات کو بیدار کیا گیا تاکہ اہل قرابت و شہیوں اور زوجین کے درمیان باہمی حقوق کی ادائیگی دل سے ہو سکے۔

اس کے بعد پھر اتَّقُوا اللَّهَ کا دوبارہ اعلان کیا ایک خاص عنوان سے فرمایا: وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَنْصَارَ حَقَّ، یعنی "اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام پر تم دوسروں سے اپنے حقوق طلب کرتے ہو، اور جس کی قسمیں دے کر دوسروں سے اپنا مطلب نکالتے ہو، آخر میں فرمایا: وَالْأَنْصَارَ حَقَّ، یعنی قرابت کے تعلقات خواہ باپ کی طرف سے ہوں خواہ ماں کی طرف سے، ان کی نگہداشت اور ادائیگی میں کوتاہی کرنے سے بچو۔

دوسری آیت میں یتیم بچوں کے حقوق کی تاکید اور ان کے اموال کی حفاظت کے احکام ہیں، مختصر تفسیر ان دونوں آیتوں کی یہ ہے:

## خُلاصۂ تفسیر

اے لوگو! اپنے پروردگار کی مخالفت سے (ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا، (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی زوجہ حوا کو) پیدا کیا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیل گئیں اور تم سے مکرر تاکید کے لئے کہا جاتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو، (جس مطالبہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ خدا سے ڈر کر میراثی ویدے، سوجب دوسروں کو خدا کی مخالفت سے ڈرنے کو



مہتے ہو، تو معلوم ہوا کہ تم اس ڈرنے کو ضروری سمجھتے ہو تو تم بھی ڈرو، اور راقول تو تمام احکام الہیہ میں مخالفت سے بچنا اور ڈرنا ضرور ہے، لیکن اس مقام پر ایک حکم خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے (قرابت کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب (کے حالات) کی اطلاع رکھتے ہیں (اگر مخالفت کرو گے مستحق سزا ہو گے) اور جن بچوں کا باپ مر جائے ان کے (ملوک) مال انہی کو پہنچائے رہو (یعنی انہی کے خرچ میں لگاتے رہو) اور (جب تک تمہارے قبضہ میں ہو) تم ان کے مال میں شامل کرنے کے لئے ان کی، اچھی چیز سے بُری چیز کو مت بدلو (یعنی ایسا مت کرو کہ ان کی اچھی چیز تو نکال لی جاوے اور بُری چیز ان کے مال میں ملا دی جاوے) اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں کے رہنے تک (البتہ جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے تو بقدر حق خدمت اپنے گزارہ کے لئے ان کے مال سے لینا درست ہے جیسا آگے آدے گا، وَمَنْ كَانَ فِیْئِذَا اِیْسٰی کَارِوَالِیْ کرنا کہ بُری چیز ان کے مال میں شامل کر دی یا بلا ضرورت ان کے مال سے منفعہ ہوا، بڑا گناہ ہے جس کی وعید آگے آئیگی اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی بِالْغَلٰۤیۡ)۔

## معارف مسائل

یہ پہلا حکم ہے جو تمہید کے بعد ارشاد فرمایا گیا اور تمام تعلقات قرابت کی نگہداشت پر حاوی اور شامل ہے۔  
 صلہ رحمی کے معنی اور لفظ ارحام، رحم کی جمع ہے، رحم بچہ والی کو کہتے ہیں، جس میں ولادت سے اس کے فضائل پہلے ماں کے پیٹ میں بچہ رہتا ہے، چونکہ ذریعہ قرابت یہ رحم ہی ہے، اس لئے اس سلسلے کے تعلقات وابستہ رکھنے کو صلہ رحمی اور رشتہ داری کی بنیاد پر جو فطری طور پر تعلقات پیدا ہو گئے، ان کی طرف سے بے توجہی دے بے التفاتی برتنے کو قطع رحمی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

احادیث شریفہ میں صلہ رحمی پر بہت زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشادِ نبویؐ ہے:-

مَنْ أَحَبَّ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ

یعنی جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے رزق

وَيُسْأَلَهُ فِي أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ

میں کشادگی پیدا ہو اور اس کی عمر دراز ہو

رَحِمَهُ (مشکوٰۃ، ص ۱۹۱)

تو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔

اس حدیث سے صلہ رحمی کے دو بڑے اہم فائدے معلوم ہو گئے، کہ آخرت کا ثواب تو ہے ہی،

دنیا میں بھی صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق کی تنگی دور ہوتی ہے، اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔

عبداللہ بن سہام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لاتے اور میں حاضر ہوا تو آپ کے وہ مبارک کلمات جو سب سے پہلے میرے کانوں میں



پڑے، یہ تھے، آپ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ  
وَأَطِيعُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْأَرْحَامَ  
وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ  
تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ (مشکوٰۃ ص ۱۱۷)

گوگو! ایک دوسرے کو کثرت سے سلام  
کیا کرو، اللہ کی رضا جوئی کے لئے لوگوں  
کو کھانا کھلایا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، اور  
ایسے وقت میں نماز کی طرف سبقت کیا کرو

جبکہ عام لوگ نیند کے مزے میں ہوں، یاد رکھو! ان امور پر عمل کر کے تم حفاظت اور سلامتی  
کے ساتھ بغیر کسی رکاوٹ کے جنت میں پہنچ جاؤ گے۔

ایک اور حدیث میں ذکر ہے کہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے اپنی ایک  
باندی کو آزاد کر دیا تھا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا:  
لَوْ أُعْطِيَتْهَا أَخْرَاجُ النَّاسِ لَأَعْطَيْتُهَا (مشکوٰۃ ص ۱۱۷) اگر تم اپنے ماموں کو دیدہ بیکیں تو زیادہ  
ثواب ہوتا۔

اسلام میں غلام باندی کو آزاد کرنے کی بہت ترغیب ہے، اور اسے بہترین کارِ ثواب قرار  
دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود صلہ رحمی کا مرتبہ اس سے بہر حال اعلیٰ ہے۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت یہ ہے، آپ نے فرمایا:

الْصَّدَقَةُ عَلَى الْمِسْكِينِ صَدَقَةٌ  
وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحْمِ ثَلَاثَانِ،  
صَدَقَةٌ وَصَلَةٌ۔ (مشکوٰۃ ص ۱۱۷)

یعنی کسی محتاج کی مدد کرنا صرف صدقہ  
ہی ہے، اور اپنے کسی عزیزِ قریب کی مدد  
کرنا دو اموروں پر مشتمل ہے، ایک صدقہ اور  
دوسرا صلہ رحمی۔

صرف مصرف کے تبدیل کرنے سے دو طرح کا ثواب مل جاتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں قطع رحمی کے حق میں جو شدید ترین وعیدیں روایات حدیث میں مذکور  
ہیں اس کا اندازہ دو حدیثوں سے بخوبی ہو سکتا ہے، آپ کا ارشاد ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَالِحٌ»  
(مشکوٰۃ ص ۳۱۹)

جو آدمی حقوقِ قرابت کی رعایت نہیں کرتا  
وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

«لَا تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلَى قَالِحٍ»  
(مشکوٰۃ ص ۳۲۰)

اُس قوم پر اللہ کی رحمت نہیں آتریگی  
جس میں کوئی قطع رحمی کرنے والا موجود ہو۔

انہی میں پھر دلوں میں اوارِ حقوق کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا یعنی اللہ تعالیٰ تم پر نگراں ہے جو تمھارے دلوں اور



ارادوں سے باخبر ہے، اگر رسمی طور پر شرما شرمی بے دلی سے کوئی کام بھی کر دیا مگر دل میں جذبہ  
ایشاء و خدمت نہ ہو تو قابل قبول نہیں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی وجہ بھی معلوم  
ہو گئی کہ وہ سب پر ہمیشہ نگران ہے، قرآن کریم کا یہ عام اسلوب ہے کہ قانون کو محض دنیا کی  
حکومتوں کے قانون کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ تربیت و شفقت کے انداز میں بیان کرتا ہے  
قانون کے بیان کے ساتھ ساتھ ذہنوں اور دلوں کی تربیت بھی کرتا ہے۔

یتیموں کے حقوق اور ان کے اموال کی حفاظت | پہلی آیت میں مطلقاً قرابت کی حفاظت اور اس کے حقوق ادا کرنے کی تاکید عام انداز میں بیان فرمانے کے بعد دوسری آیت میں یتیموں کے

اموال کی حفاظت کا حکم، اور ان میں کسی قسم کی خورد برد کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ یتیم بچے کا  
نگران اور ولی عموماً اس کا کوئی رشتہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی حق قرابت کی  
ادائیگی سے ہے۔

پہلے جملہ میں ارشاد ہے: وَاتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یتیموں کے  
مال انہی کو پہنچاؤ یتیم کے لفظی معنی اکیلے اور منفرد کے ہیں، اسی لئے جو موتی سیپ میں تنہا  
ایک ہو، اس کو ڈر یتیم کہا جاتا ہے، اصطلاح شرع میں اس بچہ کو یتیم کہا جاتا ہے جس کا باپ  
مر گیا ہو، اور جانوروں میں اس کو یتیم کہا جاتا ہے جس کی ماں مر گئی ہو، (قاموس) بالغ ہونے  
کے بعد شرعی اصطلاح میں اس کو یتیم نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں تصریح ہے  
لَا يَتِيمٌ بَعْدَ اِحْتِلَامٍ، یعنی بلوغ کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی (مشکوٰۃ شریف، ص ۲۸۳)  
یتیم بچوں کی ملکیت میں اگر کچھ مال ہے جو ان کو کسی نے ہبہ کیا ہو، یا کسی کی میراث میں  
ان کو پہنچ گیا ہو تو یتیم کے ساتھ اس کے مال کی حفاظت بھی اس شخص کے ذمہ ہے جو یتیم کا  
ولی ہے، خواہ اس ولی کا تقرر اس کے مرنے والے باپ نے خود کر دیا ہو، یا حکومت کی جانب  
سے کوئی ولی مقرر کیا گیا ہو، ساتھ ہی ولی میں یہ بھی لازم ہے کہ یتیم کے ضروری اخراجات  
تو اس کے مال سے پورے کرے، لیکن اس کا مال بالغ ہونے سے پہلے اس کے قبضہ میں نہ  
وے، کیونکہ وہ نا سمجھ بچہ ہے، کہیں ضائع کر دے گا، تو آیت کے اس جملے میں جو ارشاد فرمایا  
کہ یتیموں کے مال ان کو پہنچاؤ اس کی توضیح آگے پانچویں آیت میں آتی ہے، جس میں بتلایا گیا  
کہ ان کے مال ان کو اس وقت پہنچاؤ جب دیکھ لو کہ وہ بالغ ہو گئے، اور ان کو اپنے نفع و  
نقصان اور بھلے برے کی تمیز پیدا ہو گئی۔

اس لئے اس آیت میں یتیموں کے اموال ان کو پہنچانے کا مطلب یہ ہوا کہ ان اموال  
کی حفاظت کرو، تاکہ اپنے وقت پر یہ مال ان کو پہنچا دے جا سکیں، اس کے علاوہ اس جملے میں



اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ولی یتیم کی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یتیم کے مال کو خود نہ کھائے یا خود ضائع نہ کرے، بلکہ اس کے فرائض میں سے یہ بھی ہے کہ اس کی حفاظت کر کے اس قابل بنائے کہ بالغ ہونے کے بعد اس کو مل سکے۔

دوسرے جملہ میں ارشاد ہے: وَلَا تَسْبِدْ كَوَالِ الْيَتِيمِ بِالْأَمْوَالِ الَّتِي لَهَا، یعنی "اچھی چیز کا بُری چیز سے تباہ و برباد مت کرو، بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ یتیم کے مال کی تعداد تو محفوظ رکھتے تھے مگر اس میں جو اچھی چیز نظر آتی وہ خود لے لی اور اس کی جگہ اپنی خراب چیز رکھ دی، عمدہ بکری کے بدلہ میں لاغر بکری اس کے مال میں لگا دی، یا کھرے نقد کے بدلے میں کھوٹا رکھ دیا، یہ بھی چونکہ مال یتیم میں خیانت ہے اور ممکن تھا کہ کسی شخص کا نفس یہ حیلہ تراشے کہ ہم نے تو یتیم کا مال لیا نہیں بلکہ بدلا ہے، اس لئے قرآن کریم نے صراحتاً اس کی ممانعت فرمادی، اس ممانعت میں جس طرح یہ داخل ہے کہ خود اپنی خراب چیز دے کر اچھی چیز لیں، اسی طرح یہ بھی داخل ہے کہ کسی دوسرے شخص سے تباہ و برباد کا ایسا معاملہ کر لیں جس میں یتیم بچے کا نقصان ہو۔

تیسرے جملہ میں ارشاد فرمایا: وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمُ الَّتِي آتَاكُمُ، یعنی "یتیموں کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھا جاؤ، ظاہر ہے کہ اس کا مقصد تو یتیم کے مال کو ناجائز طور پر کھا جانے کی ممانعت ہے، خواہ اپنے مال میں ملا کر کھا جائے یا علیحدہ رکھ کر کھائے، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ یتیموں کا مال اپنے مال میں شامل رکھا، اس میں سے خود بھی کھایا یتیم کو بھی کھلا دیا، اس صورت میں جداگانہ حساب نہ ہونے کی وجہ سے ایک دیندار متبع شریعت کو بھی یہ دھوکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی گناہ نہیں، اس لئے خاص طور سے اپنے اموال کے ساتھ ملا کر کھانے کی حرمت کا ذکر اور اس پر تنبیہ فرمادی کہ یا تو یتیم کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو، اور علیحدہ خرچ کرو جس میں کسی زیادتی کا خطرہ ہی نہ رہے، یا پھر ملا کر رکھو تو ایسا حساب رکھو جس میں یہ یقین ہو کہ یتیم کا مال تمہارے ذاتی خرچ میں نہیں آیا، اس کی تشریح سورۃ بقرہ کے رکوع ۲۷ میں گزر چکی ہے، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ

اس طرز بیان میں اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ یتیموں کے مال میں خورد و برد کرنے والے عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس اپنے مال بھی موجود ہوتے ہیں، تو اس عنوان سے ان کو عار و دلائل گئی کہ اپنا حلال مال موجود ہوتے ہوئے یتیموں کا مال حرام طور پر کھا جانا بڑی شرم کی بات ہے۔

آیت میں مال یتیم کے کھانے کی ممانعت کا ذکر ہے، اس لئے کہ مال کا سب بڑا اہم



فائدہ کھانا ہے، لیکن محاورہ میں مال کے ہر تصرف کو کھانا بولا جاتا ہے، خواہ استعمال کر کے ہو یا کھا کر، قرآن کریم نے بھی اسی محاورے پر لاکھا کلموں فرمایا ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف داخل ہے، لہذا یتیم کے مال کو کسی بھی طریقہ سے ناجائز طور پر خرچ کرنا حرام ہوا۔  
آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا اِنَّهُ كَانَ مُحَوَّبًا لِّكَرَاهٍ لِّفِظَ حَوْبٍ، بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما حبشی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں بڑا گناہ، عربی زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی کے لئے بولا جاتا ہے، معنی یہ ہوئے کہ مال یتیم میں کسی قسم کا ناجائز تصرف خواہ حفاظت کی کمی سے ہو یا خراب چیز کے بدلہ میں اچھی چیز لے کر ہو، یا اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کا مال کھانے سے ہو، بہر حال یہ بہت بڑا گناہ ہے، اور یتیم کے مال کو کھانے کی سخت وعید اس رکوع کے ختم پر آرہی ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ

اور اگر ڈرو کہ نہ انصاف کر سکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو

مِّنَ النِّسَاءِ مِثْنًا وَثَلَاثَ وَرُبْعًا ۚ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا

خوش آدیں دو دو تین تین چار چار پھر اگر ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کر سکو گے

فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ ۖ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ

تو ایک ہی نکاح کر دیا لونڈی جو اپنا مال ہے اس میں امید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو گے

## خُلاصہ تفسیر

**رابط آیت** | ماقبل کی آیت میں یتامیٰ کی حق تلفی کی ممانعت تھی کہ اولیاء کو ان کے اموال خورد برد کرنا حرام ہے، اس آیت میں بھی ایک دوسرے عنوان سے اس حکم کا اعادہ ہے کہ جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہیں ان سے اس خیال سے نکاح نہ کریں کہ اپنے اختیار کی لڑکی ہے، جتنا چاہیں گے ہر مہتر کر دیں گے، اور جو اموال ان کی ملک میں ہیں وہ بھی اپنے قبضہ میں آجائیں گے۔

غرض قرآن کریم کی اس آیت نے صراحت بتلادیا کہ مال یتیم پر قبضہ کرنے کا ہر حیلہ اور بہانہ ناجائز ہے، اور اولیاء کا فرض ہے کہ وہ دیانتداری سے اُن کے حقوق کی نگہداشت کریں، چنانچہ فرمایا:



اور اگر تم کو اس بات کا احتمال (میں) ہو (اور یقین ہو تو بدرجہ اولیٰ) کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں ربا بت ان کے ہر کے (انصاف کی رعایت) نہ کر سکو گے تو ان سے نکاح مت کر (بلکہ) اور (حلال) عورتوں سے جو تم کو (اپنی کسی مصلحت کے عتبار سے) پسند ہوں نکاح کر لو (کیونکہ وہ مجبور نہیں، آزادی سے اپنی رضا ظاہر کر سکتی ہیں، اور یہ نکاح اس قید کے ساتھ ہو کہ جو ایک عورت سے زیادہ کرنا چاہے تو ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو، ایک صورت یہ کہ ایک ایک مرد) دو دو عورتوں سے (نکاح کر لے) اور (دوسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) تین تین عورتوں سے (نکاح کر لے) اور (تیسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) چار عورتوں سے (نکاح کر لے) پس اگر تم کو (غالب) احتمال اس کا ہو کہ (کئی بیبیاں کر کے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بی بی کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کر دیا (اگر دیکھو کہ ایک کے حقوق بھی ادا نہ ہوں گے تو) جو لونڈی (حسب قاعدہ شرعیہ) تمہاری ملک میں ہو وہی ہی اس امر مذکور میں (یعنی ایک بی بی کے رکھنے یا صرف لونڈی پر بس کرنے میں) زیادتی (دو بے انصافی) نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے (کیونکہ ایک صورت میں تو کوئی تعداد نہیں جس میں برابری کرنا پڑے، دوسری صورت میں بی بی کے حقوق سے بھی کم حقوق ہیں مثلاً ہر نہیں صحبت کا حق نہیں تو اندیشہ اور کم ہے)

## معارف مسائل

یتیم لڑکیوں کی حق تلفی کا السداد [زمانہ جاہلیت میں جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جو شکل و صورت سے اچھی بھی جاتیں یا ان کی ملکیت میں کوئی مال جائیداد ہوتی تو ان کے اولیاء ایسا کرتے تھے کہ خود ان سے نکاح کرتے یا اپنی اولاد سے ان کا نکاح کر دیتے تھے، جو چاہا کم سے کم ہر معتسر کر دیا، اور جس طرح چاہا ان کو رکھا، کیونکہ وہی ان کے ولی اور نگراں ہوتے تھے، ان کا باپ موجود نہ ہوتا تھا جو ان کے حقوق کی پوری نگرانی کر سکتا، اور ان کی ازدواجی زندگی کے ہر پہلو پر نظر اور فلاح و بہبود کا مکمل انتظام کر کے ان کا نکاح کر دیتا۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص کی ولایت میں ایک یتیم لڑکی تھی، اور اس کا ایک باغ تھا جس میں یہ لڑکی بھی شریک تھی، اس شخص نے اس یتیم لڑکی سے خود اپنا نکاح کر لیا، اور بجائے اس کے کہ اپنے پاس سے ہر وغیرہ دیتا اس کے باغ کا حصہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا



مَا لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ، یعنی اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے خود اپنا نکاح کرنے میں تم انصاف پر قائم نہ رہو گے، بلکہ ان کی حق تلفی ہو جائے گی، تو تمہارے لئے دوسری عورتیں بہت ہیں، ان میں جو تمہارے لئے حلال اور پسند ہیں ان سے نکاح کر لو۔

**نکاح نابالغ کا مسئلہ** | اس آیت میں یتامی سے مراد یتیم لڑکیاں ہیں، اور اصطلاح شرع میں یتیم اسی لڑکی یا لڑکے کو کہا جاتا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو، اس لئے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یتیم لڑکی کے ولی کو یہ بھی اختیار ہے کہ بحالت صغریٰ بلوغ سے پہلے ہی اس کا نکاح کر دے، البتہ لڑکی کی مصلحت اور آئندہ فلاح و بہبود پیش نظر ہے، ایسا نہ ہو جیسے بہت سی برادر یوں میں رائج ہے، کہ بڑی لڑکی کا نکاح چھوٹے بچے سے کر دیا، عمروں کا تناسب نہ دیکھا، یا لڑکے کے حالات و عادات کا جائزہ نہ لیا ویسے ہی نکاح کر دیا۔ اور وہ بالغ لڑکیاں جن کے باپ مر چکے ہیں، اگرچہ بالغ ہو جانے کی بناء پر خود مختار ہیں لیکن لڑکیاں شرم و حیا کی بناء پر عادتاً بالغ ہونے کے بعد بھی اپنے نکاح کے معاملہ میں خود کچھ نہیں بولتیں، اولیاء اور وارث جو کچھ کر دیں اسی کو قبول کر لیتی ہیں، اس لئے ان کے اولیاء پر بھی لازم ہے کہ ان کی حق تلفی سے پرہیز کریں۔

بہر حال اس آیت میں یتیم لڑکیوں کے ازدواجی حقوق کی پوری نگہداشت کا حکم مذکور ہے، مگر عام حکومتوں کے قانون کی طرح اس کے نافذ کرنے کی ذمہ داری براہ راست حکومت پر ڈالنے کے بجائے خود عوام کو خدا تعالیٰ کے خوف کا حوالہ دے کر حکم دیا گیا کہ اگر تمہیں اس میں بے انصافی کا خطرہ ہو تو پھر یتیم لڑکیوں سے شادی کے خیال کو چھوڑ دو، دوسری عورتیں تمہارے لئے بہت ہیں، ان سے نکاح کر دو۔

ساتھ ہی ذمہ داران حکومت کا بھی یہ فریضہ ہے کہ اس کی نگرانی کریں، کسی جگہ حق تلفی ہوتی نظر آئے تو بزور قانون حقوق ادا کرائیں۔

قرآن میں تعدد ازواج اور اسلام ایک مرد کے لئے متعدد بیبیاں رکھنا اسلام سے پہلے بھی تقریباً سے پہلے اقوام عالم میں اس کا رواج دنیا کے تمام مذاہب میں جائز سمجھا جاتا تھا، عرب، ہندوستان، ایران، مصر، بائبل وغیرہ ممالک کی ہر قوم میں کثرت ازواج کی رسم جاری تھی، اور اس کی فطری ضرورتوں سے آج بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دورِ حاضر میں یورپ نے اپنے متقدمین کے خلاف تعدد ازواج کو ناجائز کرنے کی کوشش کی، تو اس کا نتیجہ بے نکاحی و اشتادوں کی صورت میں برآمد ہوا، بالآخر فطری قانون غالب آیا، اور اب وہاں کے اہل بصیرت حکماء خود اس کو رواج دینے کے حق میں ہیں، مسٹر ڈیون پورٹ جو ایک مشہور عیسائی فاضل ہے، تعدد ازواج کی حمایت



میں انجیل کی بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے :

”ان آیتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں، بلکہ خدا نے اس میں خاص برکت دی ہے۔“

اسی طرح پادری نکسن اور جان ملٹن اور اپزک ٹیلر نے پُر زور الفاظ میں اس کی تائید کی ہے، اسی طرح ویدک تعلیم غیر محدود تعدد ازواج کو جائز رکھتی ہے، اور اس سے دس دس، تیرہ تیرہ، ستائیس ستائیس بیویوں کو ایک وقت میں جمع رکھنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔ کرسن جو ہندوؤں میں واجب التعلیم اور تارمانے جاتے ہیں ان کی سینکڑوں بیبیاں تھیں جو مذہب اور قانون عفت و عصمت کو قائم رکھنا چاہتا ہو، اور زنا کاری کا انسداد ضروری جانتا ہو اس کے لئے کوئی چارہ نہیں کہ تعدد ازواج کی اجازت دے، اس میں زنا کاری کا بھی انسداد ہے، اور مردوں کی بہ نسبت عورتوں کی جو کثرت بہت سے علاقوں میں پائی جاتی ہے اس کا بھی علاج ہے، اگر اس کی اجازت نہ دی جائے تو داسشتہ اور پیشہ ور کسی عورتوں کی شرائط ہوگی، یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں تعدد ازواج کی اجازت نہیں ان میں زنا کی کثرت ہے، یورپین اقوام کو دیکھ لیجئے ان کے یہاں تعدد ازواج پر تو پابندی ہے، مگر بطور دستاویز جتنی بھی عورتوں سے مرد زنا کرتے ہیں اس کی پوری اجازت ہے، کیا تماشہ ہے کہ نکاح ممنوع اور زنا جائز۔

غرض اسلام سے پہلے کثرت ازواج کی رسم بغیر کسی تحدید کے رائج تھی، ممالک اور مذہب کی تاریخ سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کسی مذہب اور کسی قانون نے اس پر کوئی حد نہ لگائی تھی، نہ یہود و نصاریٰ نے، نہ ہندوؤں اور آریوں نے اور نہ پارسیوں نے۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی یہ رسم بغیر تحدید کے جاری رہی، لیکن اس غیر محدود کثرت ازواج کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ اول اول تو حرص میں بہت سے نکاح کر لیتے تھے، مگر پھر ان کے حقوق ادا نہ کر سکتے تھے، اور یہ عورتیں ان کے نکاح میں ایک قیدی کی حیثیت زندگی گزارتی تھیں پھر جو عورتیں ایک شخص کے نکاح میں ہوتیں ان میں عدل و مساوات کا کہیں نام و نشان نہ تھا جس سے دبستگی ہوئی اس کو نوازا گیا، جس سے رنج پھر گیا اس کے کسی حق کی پرواہ نہیں۔

اسلام نے تعدد ازواج پر ضروری پابندی لگائی، اور چارہ سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں حبیح کرنا حرام قرار دیا، اور جو عورتیں ایک ہی وقت میں نکاح کے اندر ہیں ان میں مساوات کا قانون جاری کیا، حقوق کا نہایت موکد حکم اور اس کی خلاف ورزی پر وعید شدید سنائی،

آیت مذکورہ میں ارشاد ہوا، **فَاِنَّكُمْ حَرَامًا لِّمَا لَکَ بَ نَکَاحُ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰی وَ ثَلٰثَ وَ رُبْعًا**



یعنی جو حلال عورتیں تھیں پسند ہوں ان سے نکاح کر سکتے ہو، دو دو تین تین، چار چار۔  
آیت میں مَا حَلَّاب کا لفظ آیا ہے، حسن بصری، ابن جبیر اور ابن مالک نے مَا حَلَّاب  
کی تفسیر مَا حَلَّ سے فرمائی ہے، یعنی جو عورتیں تمھارے لئے حلال ہیں۔  
اور بعض حضرات نے مَا حَلَّاب کے لفظی معنی کے اعتبار سے پسندیدہ کا ترجمہ کیا ہے،  
مگر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، یہ مراد ہو سکتی ہے کہ جو عورتیں طبعی طور پر تھیں پسند ہوں  
اور تمھارے لئے شرعاً حلال بھی ہوں۔

اس آیت میں ایک طرف تو اس کی اجازت دی گئی کہ ایک سے زائد دو، تین، چار،  
عورتیں نکاح میں جمع کر سکتے ہیں، دوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد  
کر دی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت نکاح میں جمع نہیں کی جاسکتیں۔  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان نے اس ستر آئی تخصیص اور پابندی کو اور زیادہ  
واضح کر دیا، اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص غیلان بن اسلمہ ثقفی مسلمان ہوئے، اُس  
وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں، اور وہ بھی مسلمان ہو گئی تھیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ  
وسلم نے حکم ستر آئی کے مطابق ان کو حکم دیا کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کر لیں، باقی کو  
طلاق دے کر آزاد کر دیں، غیلان بن اسلمہ ثقفی نے حکم کے مطابق چار عورتیں رکھ کر باقی سے  
علحدگی اختیار کر لی (مشکوٰۃ شریف ص ۲۴، بحوالہ ترمذی وابن ماجہ) مسند احمد میں اسی  
روایت کے تسکملہ میں ایک اور واقعہ بھی مذکور ہے، اس کا ذکر کرنا بھی فائدہ سے خالی نہیں،  
کیونکہ اس کا تعلق بھی نسوانی حقوق سے ہے، وہ یہ کہ:-

غیلان بن اسلمہ نے حکم شرعی کے مطابق چار عورتیں رکھ لی تھیں، مگر فاروق اعظمؓ کے  
زمانہ خلافت میں انھوں نے ان کو بھی طلاق دیدی، اور اپنا کل مال مسلمان اپنے بیٹوں میں تقسیم  
کر دیا، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کو حاضر کر کے فرمایا کہ تم نے ان  
عورتوں کو اپنی میراث سے محروم کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے جو سراسر ظلم ہے، اس لئے فوراً ان  
کی طلاق سے رجعت کرو اور اپنا مال بیٹوں سے واپس لو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھو کہ تمہیں  
سخت سزا دی جائے گی۔

قیس بن الحارث اسدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں جب مسلمان ہوا تو میرے نکاح  
میں آٹھ عورتیں تھیں، میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان  
میں سے چار رکھ لو باقی کو طلاق دیدو۔ (ابو داؤد، ص ۳۰۴)  
اور مسند امام شافعی میں نوفل بن معاویہ دیمی کا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ جب مسلمان



ہوئے تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بھی ایک عورت کو طلاق دینے کا حکم دیا، یہ واقعہ مشکوٰۃ شریف (ص ۲۷۲) میں بھی شرح السنۃ سے نقل کیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے اس تعامل سے آیت قرآنی کی مراد بالکل واضح ہو گئی کہ چار سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم | حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہمراہ رحمت و ہرکت کے لئے تعددِ ازدواج ہے، تبلیغ احکام اور تزکیۂ نفوس اور ابلاغ قرآن آپ کا سب سے بڑا

مقصدِ بعثت تھا، آپ نے اسلام کی تعلیمات کو قولاً و عملاً دنیا میں پھیلا دیا، یعنی آپ بتاتے بھی تھے اور کرتے بھی تھے، پھر چونکہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی کی رہبری کی ضرورت نہ ہو، نماز باجماعت سے لے کر بیویوں کے تعلقات، آل و اولاد کی پرورش اور پاخانہ پیشاب اور طہارت تک کے بارے میں آپ کی قولی اور فعلی ہدایات سے کتب حدیث بھر پور ہیں، اندرون خانہ کیا کیا کام کیا، بیویوں سے کیسے میل جول رکھا، اور گھر میں آکر مسائل پوچھنے والی خواتین کو کیا کیا جواب دیا، اس طرح کے سینکڑوں مسائل ہیں جن سے ازدواجِ مطہرات کے ذریعہ ہی امت کو رہنمائی ملی ہے، تعلیم و تبلیغ کی دینی ضرورت کے پیش نظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کثرتِ ازدواج ایک ضروری امر تھا، صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے احکام و مسائل، اخلاق و آداب اور سیرت نبوی سے متعلق دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں جو کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایات کی تعداد تین سو پچیس تک پہنچی ہوئی ہے، حافظ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین (ص ۹ ج ۱) میں لکھا ہے کہ اگر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فتاویٰ جمع کئے جائیں جو انھوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد دیئے ہیں، تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا روایت و روایت اور فقہ و فتاویٰ میں جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں، ان کے شاگردوں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسلسل اڑتالیس سال تک علم دین پھیلا یا۔

بطور مثال دو مقدس بیویوں کا مجمل حال لکھ دیا ہے، دیگر ازدواجِ مطہرات کی روایات بھی مجموعی حیثیت سے کافی تعداد میں موجود ہیں، ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تبلیغ کا لفع صرف ازدواجِ مطہرات سے پہنچا۔

انبیاء اسلام کے مقاصدِ بلند اور پورے عالم کی انفرادی و اجتماعی، خانگی اور ملکی اصلاحات کی فکروں کو دنیا کے شہوت پرست انسان کیا جانیں، وہ تو سب کو اپنے اوپر قیاس کر سکتے ہیں



اسی کے نتیجے میں کئی صدی سے یورپ کے ملحدین اور مستشرقین نے اپنی ہٹ دھرمی سے فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدد ازدواج کو ایک خالص جنسی اور نفسانی خواہش کی پیداوار قرار دیا ہے اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ہوشمند منصف مزاج کبھی بھی آپ کی کثرت ازدواج کو اس پر محمول نہیں کر سکتا۔

آپ کی معصوم زندگی قریش مکہ کے سامنے اس طرح گزری کہ بچپن سال کی عمر میں ایک بن رسیدہ صاحب اولاد بیوہ (جس کے دو شوہر فوت ہو چکے تھے) سے عقد کر کے عمر کے بچپن سال تک انہی کے ساتھ گزارا کیا، وہ بھی اس طرح کہ مہینہ مہینہ گھر چھوڑ کر غار خراہ میں مشغول عبادت رہتے تھے، دوسرے نکاح جتنے ہوئے پچاس سالہ عمر شریف کے بعد ہوئے، یہ پچاس سالہ زندگی اور عنفوان شباب کا سارا وقت اہل مکہ کی نظروں کے سامنے تھا، کبھی کسی دشمن کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرنے کا موقع نہیں ملا جو تقویٰ و طہارت کو مشکوک کر سکے، آپ کے دشمنوں نے آپ پر ساحر، شاعر، مجنون، کذاب، مفری جیسے الزامات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن آپ کی معصوم زندگی پر کوئی ایسا حرف کہنے کی جرأت نہیں ہوئی جس کا تعلق جنسی اور نفسانی جذبات کی بے راہ روی سے ہو۔

ان حالات میں کیا یہ بات غور طلب نہیں ہے کہ جوانی کے پچاس سال اس زہد و تقویٰ اور لذائذ دنیا سے یک سوئی میں گزارنے کے بعد وہ کیا داعیہ تھا جس نے آخر عمر میں آپ کو متعدد نکاحوں پر مجبور کیا، اگر دل میں ذرا سا بھی انصاف ہو تو ان متعدد نکاحوں کی وجہ اس کے سوا نہیں بتلائی جاسکتی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اور اس کثرت ازدواج کی حقیقت کو بھی سن لیجئے، کہ کس طرح وجود میں آئی۔

بچپن سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر شریف ہونے تک تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی زوجہ رہیں، ان کی وفات کے بعد حضرت سودہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نکاح ہوا، مگر حضرت سودہ تو آپ کے گھر تشریف لے آئیں اور حضرت عائشہ رضی صغریٰ کی وجہ سے اپنے والد کے گھر ہی رہیں، پھر چند سال کے بعد سلمہ میں مدینہ منورہ میں حضرت عائشہ رضی کی رخصتی عمل میں آئی، اُس وقت آپ کی عمر چوٹن سال ہو چکی ہے، اور دوبارہ اس عمر میں آکر جمع ہوتی ہیں، یہاں سے تعدد ازدواج کا معاملہ شروع ہوا، اس کے ایک سال بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، پھر کچھ ماہ بعد حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اور صرف اٹھارہ ماہ آپ کے نکاح میں رہ کر وفات پائی، ایک قول کے مطابق تین ماہ آپ کے نکاح میں زندہ رہیں، پھر سلمہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا



سے نکاح ہوا، پھر شہر میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اس وقت آپ کی عمر شریف اٹھاون سال ہو چکی تھی، اور اتنی بڑی عمر میں آکر چار بیویاں جمع ہوئیں حالانکہ امت کو جس وقت چار بیویوں کی اجازت ملی تھی اس وقت ہی آپ کم از کم چار نکاح کر سکتے تھے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، ان کے بعد شہر میں حضرت حمیرہ رضی اللہ عنہا سے، اور شہر میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے اور پھر مکہ میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے پھر اسی سال حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

**خلاصہ :-** یہ کہ چونکہ سال کی عمر تک آپ نے صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارا کیا، یعنی پچیس سال حضرت خدیجہ کے ساتھ اور چار پانچ سال حضرت سودہ کے ساتھ گزارے پھر اٹھاون سال کی عمر میں چار بیویاں جمع ہوئیں، اور باقی ازواج مطہرات دس سال کے اندر حرم نبوت میں آئیں۔ اور یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ان سب بیویوں میں صرف ایک ہی عورت ایسی تھیں جن سے کنوارے بن میں نکاح ہوا، یعنی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ان کے علاوہ باقی سب ازواج مطہرات بیوہ تھیں جن میں بعض کے دو دو شوہر پہلے گذر چکے تھے، اور یہ تعداد بھی آخر عمر میں آکر جمع ہوئی ہے۔

حضرات صحابہ مرد اور عورت سب آپ پر جاں نثار تھے، اگر آپ چاہتے تو سب بیویاں کنواریں جمع کر لیتے، بلکہ ہر ایک ایک دو دو ہینہ کے بعد بدلنے کا بھی موقع تھا، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ نیز یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق نبی تھے، نبی صاحب ہوا و ہوس نہیں ہوتا، جو کچھ کرتا ہے اذنِ الہی سے کرتا ہے، نبی ماننے کے بعد ہر اعتراض ختم ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص آپ کو نبی ہی نہ مانے اور یہ الزام لگائے کہ آپ نے محض شہوت پرستی کی وجہ سے اپنے لئے کثرتِ ازدواج کو جائز رکھا تھا تو اس شخص سے کہا جائے گا کہ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنے حق میں کثرتِ ازدواج کے معاملہ میں اس پابندی کا اعلان کیوں فرماتے جس کا ذکر قرآن کریم کی آیت لَا یَجْعَلُ لِّلنِّسَاءِ مِنْ بَعْدِیْ مَوْجُوْدَہِ، اپنے حق میں اس پابندی کا اعلان اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ نے جو کچھ کیا اپنے رب کے اذن سے کیا۔

تعددِ ازدواج کی وجہ سے تعلیم اور تبلیغی فوائد جو امت کو حاصل ہوئے، اور جو احکام امت تک پہنچے اس کی جزئیات اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا احصاء دشوار ہے، کتبِ احادیث اس پر شاہد ہیں، البتہ بعض دیگر فوائد کی طرف یہاں ہم اشارہ کرتے ہیں۔

علیہ السلام ستاون سال - محمد تقی عثمانی ۱۳۲۶/۲/۱۴ - علیہ السلام ۲۹ پر گزشتہ عبارت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں مکہ میں چار ازدواج مطہرات آچکی تھیں، حضرت سودہ، حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت زینب بنت جحش، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پچیس سال تھی۔ محمد تقی عثمانی ۱۳۲۶/۲/۱۴



حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ نے ان سے نکاح کر لیا تھا، وہ اپنے سابق شوہر کے بچوں کے ساتھ آپ کے گھر تشریف لائیں، ان کے بچوں کی آپ نے پرورش کی، اور اپنے عمل سے بتا دیا کہ کس پیار و محبت سے سوتیلی اولاد کی پرورش کرنی چاہیے، آپ کی بیویوں میں صرف یہی ایک بیوی ہیں جو بچوں کے ساتھ آئیں، اگر کوئی بھی بیوی اس طرح کی نہ ہوتی تو عملی طور پر سوتیلی اولاد کی پرورش کا خانہ خالی رہ جاتا اور امت کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہ ملتی، ان کے بیٹے حضرت عمر بن ابی سلمہؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پاتا تھا، ایک بار آپ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے پیالے میں ہر جگہ ہاتھ ڈالتا تھا، آپ نے فرمایا: **مَسَّيْتُ إِلَيْهِ وَكُلُّ يَسْمِينِيكَ وَكُلُّ مَسَّيْتُ إِلَيْكَ**، (اللہ کا نام لے کر کھا، داپنے ہاتھ سے کھا اور سامنے سے کھا)، (بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۶۳)

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ایک جہاد میں قید ہو کر آئی تھیں، دوسرے قیدیوں کی طرح یہ بھی تقسیم میں آگئیں، اور ثابت بن قیسؓ یا ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں ان کو لگا دیا گیا، لیکن انھوں نے اپنے آقا سے اس طرح معاملہ کر لیا کہ اتنا اتنا مال تم کو دیدوں گی مجھے آزاد کر دو، یہ معاملہ کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، اور مالی امداد چاہی، آپ نے فرمایا اس سے بہتر بات نہ بتا دوں؟ وہ یہ کہ میں بخاری طرف سے مال ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں، انھوں نے بخوشی منظور کر لیا، تب آپ نے ان کی طرف سے مال ادا کر کے نکاح فرمایا، ان کی قوم کے سینکڑوں افراد حضرات صحابہؓ کی ملکیت میں آچکے تھے، کیونکہ وہ سب لوگ قیدی ہو کر آئے تھے جب صحابہؓ کو پتہ چلا کہ جویریہؓ آپ کے نکاح میں آگئی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے پیش نظر سب نے اپنے اپنے غلام باندی آزاد کر دیئے، سبحان اللہ حضرات صحابہؓ کرام کے ادب کی کیا شان تھی، اس جذبے کے پیش نظر کہ یہ لوگ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال والے ہو گئے، ان کو غلام بنا کر کیسے رکھیں، سب کو آزاد کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس واقعہ کے متعلق فرماتی ہیں۔

فَلَقَدْ اَعْتُوْا بِتَزْوِجِهِ اَيَّاهَا  
بِاَنَّهُ اَهْلُ بَيْتٍ مِّنْ بَنِي الصُّطَلٰى  
فَمَا اَعْلَمُ امْرَاَةً اَعْظَمَ بَرَكَةً  
عَلٰى قَوْمِهَا مِنْهَا۔

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویریہؓ سے نکاح کر لینے سے بنوالمصطلق کے تو گھرانے آزاد ہوئے، میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لئے بڑی برکت والی ثابت ہوئی ہو۔“

حضرت اُمّ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے ساتھ ابتداء اسلام ہی میں مکہ میں



اسلام قبول کیا تھا، اور پھر دونوں میاں بیوی ہجرت کر کے قافلہ کے دوسرے افراد کے ساتھ حبشہ چلے گئے تھے، وہاں ان کا شوہر نصرانی ہو گیا، اور چند دن کے بعد مر گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے واسطے سے ان کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا، جسے انھوں نے قبول کر لیا، اور وہیں حبشہ میں نجاشی ہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا، دلچسپ بات یہ ہے کہ حضرت اُمّ حبیبہؓ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں، اور حضرت ابوسفیان اس وقت اس گروہ کے سرخیل تھے، جس نے اسلام دشمنی کو اپنا سب سے بڑا مقصد قرار دیا تھا، اور وہ مسلمانوں کو اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ازیت دینے اور انھیں فنا کے گھاٹ اتار دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، جب ان کو اس نکاح کی اطلاع ہوئی تو بلا خست یا ران کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، **هُوَ الْفَعْلُ لَا يَجِدُكُمْ أَنْفَعُ**، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو انہیں ان کی ناک نہیں کاٹی جا سکتی، مطلب یہ کہ وہ بلند ناک والے معزز ہیں ان کو ذلیل کرنا آسان نہیں، ادھر تو ہم ان کو ذلیل کرنے کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں اور ادھر ہماری لڑائی ان کے نکاح میں چلی گئی۔

فرض اس نکاح نے ایک نفسیاتی جنگ کا اثر کیا، اور اسلام کے مقابلہ میں کفر کے قائد کے حوصلے پست ہو گئے، اس نکاح کی وجہ سے جو سیاسی فائدہ اسلام اور مسلمانوں کو پہنچا اس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ خدا کے مددبر اور حکیم رسول، صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فائدہ کو ضرور پیش نظر رکھا ہوگا۔

یہ چند باتیں لکھی گئی ہیں، ان کے علاوہ سیرت پر عبور رکھنے والے حضرات کو بہت کچھ حکمتیں آپ کے تعدد و ازدواج میں مل سکتی ہیں، اس سلسلے میں سیدی حکیم الامت قدس سرہ کے رسالے ”کثرت ازواج لصاحب المعراج“ کا دیکھنا بھی مفید ہوگا۔

یہ تفصیل ہم نے ملحدین و مستشرقین کے پھیلاتے ہوئے پُر فریب جال کو کاٹنے کے لئے لکھی ہے، کیونکہ ان کے اس وایم تزویر میں بہت سے وہ تعلیم یافتہ اور ناواقف مسلمان بھی پھنس جاتے ہیں جو سیرت نبویؐ اور تاریخ اسلام سے بے خبر ہیں، اور اسلامیات کا علم مستشرقین ہی کے کتابوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اگر متعدد بیویوں میں مساوات اور عدل پر قدرت نہ ہو تو صرف ایک بیوی پر کفایہ کیا جائے

چار بیویوں تک کی اجازت دے کر فرمایا **فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُعَدِلُوا فَوَاحٍ شَأْنُ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ**، یعنی اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی پر بس کرو، یا جو کثیر شرعی اصول کے مطابق تمہاری ملک ہو اس سے گزارہ کر لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے جبکہ



شریعت کے مطابق سب بیویوں میں برابری کر سکے اور سب کے حقوق کا لحاظ رکھ سکے، اگر اس پر قدرت نہ ہو تو ایک ہی بیوی رکھی جائے، زمانہ جاہلیت میں یہ ظلم عام تھا کہ ایک ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا تھا جس کا ذکر چند احادیث کے حوالہ سے اس آیت کے ضمن میں پہلے گزرا ہے۔ اور بیویوں کے حقوق میں مساوات اور عدل کا مطلق خیال نہ تھا، جس کی طرف زیادہ میلان ہو گیا اس کو ہر حیثیت سے نوازنے اور خوش رکھنے کی فکر میں لگ گئے، اور دوسری بیویوں کے حقوق نظر انداز کر ڈالتے، قرآن کریم نے عات صاف فرمادیا کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو یا کنیز سے گزارہ کرلو، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملوک کنیز جس کا ذکر آیت میں ہے اس کی خاص شرائط ہیں جو عموماً آجکل مفقود ہیں، اس لئے اس زمانے میں کسی کو ملوک شرعی کنیز کہہ کر بے نکاح رکھ لینا حرام ہے اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم نے چار عورتیں تک نکاح میں رکھنے کی اجازت دیدی، اور اس حد کے اندر جو نکاح کئے جائیں گے وہ صحیح اور جائز ہوں گے، لیکن متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں ان میں عدل و مساوات قائم رکھنا واجب ہے، اور اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم ہے، اس لئے جب ایک سے زائد نکاح کا ارادہ کرو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لو، کہ سب کے حقوق عدل و مساوات کے ساتھ پورا کرنے کی قدرت بھی ہے یا نہیں، اگر یہ احتمال غالب ہو کہ عدل و مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو ایک سے زائد نکاح پر امتداع کرنا اپنے آپ کو ایک عظیم گناہ میں مبتلا کرنے پر اقسام ہے اس سے باز رہنا چاہئے، اور اس حالت میں صرف ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چار سے زائد عورتوں سے کسی نے بیک وقت یعنی ایک ہی ایجاب و قبول میں نکاح کر لیا تو وہ نکاح سرے سے باطل ہے، کیونکہ چار سے زائد نکاح کا کسی کو حق نہیں، اور چار کے اندر جو نکاح کئے جائیں وہ نکاح تو بہر حال ہو جائیں گے، لیکن بیویوں میں عدل و مساوات قائم نہ رکھی تو سخت گناہ ہوگا، اور جس کی حق تلفی ہو رہی ہو قاضی کی عدالت میں دعویٰ کر کے اپنا حق وصول کر سکے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب بیویوں کے درمیان پوری مساوات و عدل کی سخت تاکید فرمائی ہے، اور اس کے خلاف کرنے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں، اور خود اپنے عمل کے ذریعے بھی اس کو واضح فرمایا ہے، بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان معاملات میں بھی مساوات فرماتے تھے جن میں مساوات لازم نہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور انصاف نہ کر سکے تو وہ قیامت میں اس طرح



اٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۷۸)

البتہ یہ مساوات ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً ثقہ میں برابری، شب بامشی میں برابری، رہا وہ امر جو انسان کے اختیار میں نہیں، مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہو جائے، تو اس غیر اختیاری معاملہ میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا:

”یا اللہ یہ میری برابر والی تقسیم ہے، اُن چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے، میرے اختیار میں نہیں ہے اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا“

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيمَا اَمْلِكُ  
فَلَا تَلُمْنِيْ فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا  
اَمْلِكُ

ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دوسرا کیسے قادر ہو سکتا ہے، اس لئے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملہ کا ذکر اس طرح فرمایا:

”خورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کر سکو گے“

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا  
بَيْنَ الْفَسَادِ (۱۲۹: ۴)

جس میں بتلادیا کہ میلان قلب اور محبت ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، اس میں برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیر اختیاری معاملہ کی اصلاح کے لئے بھی ارشاد فرمایا: وَلَا تَمِيلُوْا اَكْلَ الْبَيْتِ، یعنی اگر کسی ایک بڑی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دوسری بڑی سے کئی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں، اس آیت کے جملے فَإِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةٌ میں جس عدل و مساوات کا بیان ہے یہ وہی امور اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں بے اعتدالی گناہ عظیم ہے، اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک زائد نکاح نہ کرے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب | مذکورہ بالا تفصیل و تشریح کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے بعض لوگ سورۃ نسا کی آیت مذکورہ اور اس آیت (۱۲۹: ۴) کو ملانے سے

ایک عجیب مغالطہ میں مبتلا ہو گئے، وہ یہ کہ آیت سورۃ نسا میں تو یہ حکم دیا گیا کہ اگر عدل و مساوات قائم نہ رکھنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی نکاح پر بس کرو، اور اس دوسری آیت میں قطعی طور پر یہ واضح کر دیا کہ عدل و مساوات ہو ہی نہیں سکتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زائد نکاح مطلقاً جائز



نہ رہے، لیکن ان کو سوچنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ جل شانہ کا مقصود ان تمام آیات میں ایک زائد نکاح کو رد کرنا ہی ہوتا تو بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ فَاَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنً وَثُلَاتَ وَرُبْعَ، (یعنی نکاح کرو جو پسند آئیں تم کو عورتیں دو دو، تین تین، چار چار) اور پھر اس ارشاد کے کیا معنی کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَا تَعْتَدُوْا (یعنی اگر تمہیں بے انصافی کا خطرہ ہو) کیونکہ اس صورت میں تو بے انصافی یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔

اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی اور قولی بیان اور مسلسل تعامل بھی اس پر شاہد ہے کہ ایک سے زائد نکاح کو کسی وقت اسلام میں نہیں روکا گیا۔ بات وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ سورہ نساء کی پہلی آیت میں امور اختیار کے عدل و مساوات کا ذکر ہے، اور دوسری آیت میں محبت اور قلبی میلان میں عدم مساوات پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے، اس لئے دونوں آیتوں میں نہ کوئی تعارض ہے، اور نہ ان آیات میں مطلقاً تعدد وارد و واج کی ممانعت کی کوئی دلیل ہے۔

آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا اِذَا نَكَحْتُمُوْا اُنْثٰى فَصَلُّوْا عَلَیْهَا اس آیت میں دو کلمے ہیں، ایک کلمہ اِذَا یہ لفظ اِذَا سے مشتق ہے، جو قرب کے معنی میں ہے، اور دوسرا لفظ اِذَا ہے، عَالِ یَعُوْلُ، مَا نَ یَعْمَلُ کے معنی میں ہے، جس کے معنی میلان کے ہیں، اور یہاں ناجائز میلان اور ظلم و جور کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ تم کو بتلایا گیا ہے (یعنی عدل نہ کر سکنے کی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرنا یا باندی کے ساتھ گزارہ کر لینا) یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تم ظلم کرنے سے بچ سکو گے، اور زیادتی و تعدی کے مواقع ختم ہو جائیں گے۔ یہاں ایک شبہ یہ ہے کہ جب ایک بیوی ہوگی تو ظلم کا بالکل کوئی موقع نہ ہوگا، پھر لفظ اِذَا بڑھا کر یہ کیوں فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، بلکہ یہ فرمانا چاہئے کہ تم بالکل اس ظلم سے بچ جاؤ گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ اِذَا بڑھا کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ ایک بیوی کو بھی ظلم و ستم کا تختہ بنائے رکھتے ہیں، اس لئے ظلم کا راستہ بند کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ظلم کا خطرہ کم ہو جائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ جاؤ گے، اور ظلم و جور سے مکمل رہائی اس وقت ہوگی جبکہ ایک بیوی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ ہے، اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کجی پر صبر کیا جائے۔



وَاتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ

دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے مہر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو

نَفْسًا فِكْلًا هَنِئًا مَرِيًّا ۝

اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا

**رابطہ آیات** | گذشتہ آیت میں کثرت ازواج کی وجہ سے جو عورتوں پر ظلم ہوتا تھا اس کا ازالہ تھا اس آیت میں عورتوں کے ایک خاص حق کا ذکر ہے، اور اس میں جو ظلم و جور ہوتا تھا اس کا ازالہ ہے اور یہ حق مہر ہے۔

## خُلاصۃ تفسیر

تم لوگ بیبیوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں اگر وہ بیبیاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کوئی جزو راہ سببی حکم نکل کا بھی ہے) تو اس حالت میں تم اس کو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔

## معارف و مسائل

مہر کے متعلق عرب میں کئی قسم کے ظلم ہوتے تھے: ایک یہ کہ مہر جو لڑکی کا حق ہے اس کو نہ دیا جاتا تھا، بلکہ لڑکی کے اولیاء شوہر سے وصول کر لیتے تھے، جو سراسر ظلم تھا، اس کو دفع کرنے کے لئے قرآن کریم نے فرمایا، **وَاتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ**، یعنی ”رد عورتوں کو ان کے مہر“ اس کے مخاطب شوہر بھی ہیں کہ وہ اپنی بی بی کا مہر خود بی بی کو دیں اور دوسروں کو نہ دیں، اور لڑکیوں کے اولیاء بھی مخاطب ہیں کہ اگر لڑکیوں کے مہر ان کو وصول ہو جائی تو یہ لڑکیوں ہی کو دیدیں، ان کی اجازت کے بغیر اپنے تصرف میں نہ لائیں۔ دوسرا ظلم یہ بھی تھا کہ اگر کبھی کسی کو مہر دینا بھی پڑ گیا تو بہت تلخی کے ساتھ، بادل ناخواستہ نادان سمجھ کر لیتے تھے، اس ظلم کا ازالہ آیت مذکورہ کے اس لفظ تَحْلَةٍ سے فرمایا گیا، کیونکہ تَحْلہ لغت میں اس دینے کو کہتے ہیں جو خوش دلی کے ساتھ دیا جائے۔

غرض اس آیت میں یہ تعلیم نسر مائی گئی کہ عورتوں کا مہر ایک حق واجب ہے، اس کی ادائیگی ضروری ہے، اور جس طرح تمام حقوق واجبہ کو خوش دلی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے اسی طرح مہر کو بھی سمجھنا چاہئے۔



تیمبرِ ظلم مہر کے بارے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ بہت سے شوہر یہ سمجھ کر کہ بیوی ان سے مجبور ہے مخالفت کر نہیں سکتی، دباؤ ڈال کر ان سے مہر معاف کر لیتے تھے، جس سے درحقیقت معافی نہ ہوتی تھی، مگر وہ یہ سمجھ کر بیفکر ہو جاتے تھے کہ مہر معاف ہو گیا۔

اس ظلم کے انسداد کے لئے آیت مذکورہ میں ارشاد فرمایا، فَإِنَّ لِّلْمُنَّ كُفْلَهُنَّ مِمَّا كَفَّتْ لِنَفْسٍ أَفْكَوهُنَّ مَتَرِيًّا، یعنی اگر وہ عورتیں خوش دلی کے ساتھ اپنے مہر کا کوئی حصہ تمھیں دیدیں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، تمھارے لئے مبارک ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جبر و اکراہ اور دباؤ کے ذریعہ معافی حاصل کرنا تو کوئی چیز نہیں، اس سے کچھ معاف نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ بالکل اپنے اختیار اور رضامندی سے کوئی حصہ مہر کا معاف کر دیں یا لینے کے بعد تمھیں واپس کر دیں تو وہ تمھارے لئے جائز ہے، اور درست ہے۔

یہ مظالم مذکورہ زمانہ جاہلیت میں بہت زیادہ تھے، جن کا انسداد قرآن حکیم نے اس آیت میں فرمایا، افسوس ہے کہ جاہلیت کے زمانہ کی یہ باتیں مسلمانوں میں اب بھی موجود ہیں، مختلف قبیلوں اور علاقوں میں ان مظالم میں سے کوئی نہ کوئی ظلم ضرور پایا جاتا ہے، ان سب مظالم سے بچنا لازم ہے۔

آیت شریفہ میں جو یہ قید لگائی طیب نفس کی کہ خوشی سے تمھاری بیویاں اگر مہر کا کچھ حصہ تم کو دیدیں یا تم سے وصول ہی نہ کریں تو تم اس کو کھا سکتے ہو، اس میں ایک بہت بڑا راز ہے، بات یہ ہے کہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ کسی کا ذرا سا مال بھی کسی دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک کہ طیب نفس سے اجازت نہ ہو، بطور قاعدہ کاتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”خبردار ظلم نہ کرو، اور اچھی طرح سے سمجھو کہ کسی شخص کا مال (دوسرے شخص کیلئے) حلال نہیں، جب تک کہ اس کے نفس کی خوشی سے حاصل نہ ہو۔“

آلَا تَنْظُرُونَ إِلَّا لَا يَحِلُّ مَالٌ  
أَمْرٌ إِلَّا بِطَيِّبِ نَفْسٍ مِّنْهُ  
(مشکوٰۃ شریفہ ص ۲۵۵)

یہ ایک عظیم اصول ہے، اور اس کے ماتحت بہت سے جزئیات آ جاتے ہیں۔  
ذکر حاضر میں چونکہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مہر ملنے والا نہیں ہے، اگر سوال کروں یا معاف نہ کروں تو بددلی یا بد مزگی پیدا ہوگی، اس لئے بادل نا خواستہ معاف کر دیتی ہیں، اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں، سید می حضرت عظیم الامت قدس سرہ فرماتے تھے کہ صحیح معنی میں طیب نفس سے معاف کرنے کا پتہ اُس صورت میں چل سکتا ہے کہ مہر کی رقم بیوی کے حوالہ کر دی جائے اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے بغیر کسی دباؤ کے دیدے، یہی طیب نفس بہنوں اور بیٹیوں کی



میراث میں بھی لینا چاہئے، اکثر یہ ہوتا ہے کہ ماں یا باپ کے فوت ہو جانے پر لڑکے ہی پورے مال پر قابض ہو جاتے ہیں، اور لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے، اگر کسی کو بہت دینداری کا خیال ہو تو بہنوں سے معافی مانگ لیتا ہے، وہ چونکہ یہ سمجھتی ہیں کہ حصہ کسی حال میں ملنے والا نہیں، اس لئے اپنی مرضی کے خلاف معاف کرنے کو کہہ دیتی ہیں، پھر باپ کی وفات پر اس کی بیوی کا حصہ بھی نہیں دیا جاتا، خصوصاً سوتیلی ماں کو تو دیتے ہی نہیں، یہ سب حقوق دبا لیتا ہے، اگر کوئی طیب نفس سے معاف کر دے تو معاف ہو سکتا ہے، جس کی علامت اوپر گزر چکی۔

سیدی حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلہ میں طیب نفس کا ذکر ہے، طیب قلب نہیں فرمایا، اس لئے کہ کسی کا مال حلال ہونے کے لئے اس کے دل کی خوشی کافی نہیں، جو لوگ رشوت یا سود دیتے ہیں بہت سے ظاہری منافع سوچ کر اور عقلی طور پر آمدنی کا حساب لگا کر خرچ کر دیتے ہیں، مگر یہ خوشی معتبر نہیں، اگر نفس سے پوچھا جائے تو وہ اس خرچ پر قطعاً راضی نہ ہوگا، اسی وجہ سے طیب نفس کو فیصل قرار دیا گیا۔

مساجد و مدارس یا اور کس ضرورت کے لئے اگر چندہ کیا جائے اس میں بھی دیے والے کے طیب نفس کا خیال رکھنا لازم ہے، پچاسیت، چودھری، سردار، وفد کے دباؤ سے اگر کوئی شخص چندہ دے اور طیب نفس نہ ہو تو اس چندہ کو کام میں لگانا حلال نہیں، بلکہ اس کو واپس کیا جائے گا۔

آیت میں جو لفظ صدقات آیا ہے صدقہ ریفح الصاد و ضم الذال، کی جمع ہے صدقۃ اور صدق عورتوں کے مہر کو کہا جاتا ہے، ملا علی قاری مرقاة شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں: وَ سُبْحٰنَہٗ لَا تَنَالُہٗ یَظْہُرُ بِہٖ صَدَقٌ مِّیلُ الرَّجُلِ اِلٰی الْمَرْأَةِ، یعنی مہر کو صدق اور صدقہ اس لئے کہتے ہیں کہ "صدق" کے اس مادہ میں سچ کے معنی ہیں، اور مہر سے بھی چونکہ شوہر کا اپنی بیوی کی طرف سچا میلان ظاہر ہوتا ہے اس لئے اس مناسبت سے مہر کو صدق کہنے لگے۔

اور ھَنَیْئًا اور ھَرِیْئًا دونوں فعیل کے وزن پر صفت کے الفاظ ہیں، ھَنَیْئًا مِنْ ھَنَیْئًا وَ ھَرِیْئًا ھَرِیْئًا لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مشقت و تکالیف کے بغیر حاصل ہو جائے جب یہ طعام کی صفت واقع ہو تو اس کے معنی خوشگوار طعام کے ہوتے ہیں، یعنی ایسا طعام جو کسی مشقت کے بغیر خلق سے اتر جائے، اور آسانی سے ہضم ہو کر جزو بدن بن جائے۔

مَرِیْئًا مِنْ مَرِیْئًا ھَرِیْئًا ای ھَنَیْئًا کا لفظ بھی مذکورہ معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، (قاموس) غرض دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، اسی وجہ سے حضرت تھانویؒ نے ان دونوں لفظوں کا ترجمہ خوشگوار کے الفاظ سے کیا ہے اور حضرت شاہ عبد القادرؒ نے "چٹا پچٹا" کے الفاظ استعمال کئے ہیں



وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ

اور مت پکڑا اور بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گزارے کا سبب اور ان کو

فیہما وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝۶ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ

اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو اور کہو ان سے بات معقول ، اور سدھاتے رہو یتیموں کو

حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا

جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالے کر دو

إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۚ

ان کے مال ان کا اور کھانہ جائز یتیموں کا مال ضرورت زیادہ اور حاجت پہلے کہیں نہ ہو جائیں

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ

اور جس کو حاجت نہ ہو تو مال یتیم سے بچتا ہے اور جو کوئی محتاج ہو تو کھا دے موافق

بِالسَّعَرِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْرِكُوا

دستور کے پھر جب ان کو حوالہ کر دو ان کے مال تو گواہ کر لو

عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝۷

اس پر اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو۔

**رَبطِ آیات** | گزشتہ آیات میں یتیموں کے مال ان کو سپرد کر دینے اور عورتوں کے مہر ان کو ادا کرنے

کا حکم گذر چکا ہے جس سے بظاہر یہ مستفاد ہو سکتا ہے کہ یتیموں اور عورتوں کا مال بہر حال ان کے

حوالہ کر دینا چاہئے خواہ ان کو معاملات کا سلیقہ بھی نہ ہو اور وہ اموال کی حفاظت پر بھی قادر

نہ ہوں اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ان آیات میں فرمایا ہے کہ کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کرو

اور ان کی جانچ کرتے رہو جب اموال کی حفاظت اور ان کے مصارف کی سوجھ بوجھ ان کے اندر

محسوس ہونے لگے تو اموال ان کے سپرد کر دو۔

## خُلاصۃ تفسیر

داور اگر یتیم بالغ ہو جائیں جن کا مفتقی مال کا سپرد کر دینا ہے جیسا آگے آتا ہے لیکن

کم عقل ہوں تو (تم ان) کم عقلوں کو اپنے (یعنی ان کے) وہ مال مت دو جن کو خدا تعالیٰ نے



(ایسے کام کا پیدا کیا ہے کہ ان کو) تمھارے (سب کے) لئے مایہ زندگی بنایا ہے (مطلب یہ کہ مال قدر  
 کی چیز ہے، ان کو ابھی مت دو کہ بے قدری کر کے اڑا دیں گے) اور ان مالوں میں (سے) ان کو  
 کھلاتے رہو پہناتے رہو اور ان سے معقول بات کہتے رہو (یعنی ان کو تسلی کرتے رہو کہ مال  
 تمھارا ہے، تمھاری خیر خواہی کی وجہ سے ابھی تمھارے ہاتھ میں نہیں دیا، ذرا سمجھ دار ہو جاؤ گے  
 تو تم ہی کو دیدیا جائے گا) اور جب مال سپرد کرنے کے لئے ہوشیاری دیکھنا ضرور ہے تو  
 تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری و تمیز داری کی باتوں میں) آزمایا کرو (کیونکہ  
 بالغ ہونے کا وقت تو سپردگی مال کا وقت ہے، تو آزمائش پہلے سے چاہئے، مثلاً کچھ کچھ  
 سود اسلف اس سے منگالیا، اور دیکھا کہ کیسے سلیقہ سے خرید کر لائے، یا کوئی چیز فروخت کی  
 دیدی، اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا) یہاں تک کہ (ان کو آزمایا جائے) کہ جب وہ  
 نکاح (کی عمر) کو پہنچ جاویں (یعنی بالغ ہو جاویں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے)  
 پھر (بعد بلوغ و آزمائش) اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی حفاظت و رعایت مصالح  
 مال کا سلیقہ اور انتظام ان میں پاؤ) تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو، (اور اگر ہنوز سلیقہ  
 یا انتظام نہ معلوم ہو تو چندے اور حوالہ نہ کیا جائے) اور ان اموال (یتامی) کو ضرورت  
 سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جاویں گے (پھر ان کو حوالہ کرنا پڑے گا) جلدی  
 جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو اور (اگر اس طرح نہ اڑا دیں، بلکہ تھوڑا کھانا چاہیں تو اس کا یہ  
 حکم ہے کہ) جو شخص (اس مال سے) مستغنی ہو (یعنی اس کے پاس بھی بقدر کفایت موجود ہے  
 گو صاحب نصاب نہ ہو) سو وہ تو اپنے کو بالکل (تھوڑا کھانے سے بھی) بچائے، اور جو  
 شخص حاجت مند ہو تو وہ مناسب مقدار سے (یعنی جس میں حاجات ضروریہ رفع ہو جاویں)  
 کھالے (برت لے) پھر جب (بعد وجود شرائط یعنی بلوغ و رشد مذکور کے) ان کے اموال ان  
 کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے اموال ان کو دیدینے) پر گواہ بھی کر لیا کرو،  
 شاید کسی وقت کچھ اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آویں، اور دیوں تو، اللہ تعالیٰ ہی حساب  
 لینے والا کافی ہے (اگر خیانت نہ کی ہو تو گواہوں کا نہ ہونا بھی مضر نہیں، کیونکہ اصل حساب  
 جن کے متعلق ہے وہ تو اس کی صفائی جانتے ہیں اور اگر خیانت کی ہے گواہوں کا ہونا کوئی  
 نافع نہیں، کیونکہ جن سے حساب کا سابقہ ہے وہ اس کا ملوث ہونا جانتے ہیں، صرف  
 ظاہری انتظام کے لئے گواہوں کا ہونا مصلحت ہے)



## معارف و مسائل

مال سرمایہ زندگی ہے اور ان آیات میں ایک طرف تو مال کی اہمیت اور انسانی معاش میں اس کا بڑا دخل اس کی حفاظت لازمی ہے ہونا بیان شدہ کہ اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا، دوسری طرف حفاظت اموال کے متعلق ایک عام کوتاہی کی اصلاح فرمائی گئی، وہ یہ کہ بہت سے آدمی طبعی محبت سے مغلوب ہو کر ناجذبہ کار نابالغ بچوں اور نادان فاق عورتوں کو اپنے اموال حوالہ کر دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ مال کی بربادی اور بہت جلد افلاس و تنگدستی ہوتی ہے۔

عورتوں بچوں اور کم عقلوں کو اموال سپرد نہ کئے جائیں قرآن مجید کی اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ اپنا پورا مال کم عقل بچوں عورتوں کے سپرد کر کے خود ان کے محتاج نہ بنو، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوام اور منتظم بنایا ہے، تم مال کو خود اپنی حفاظت میں رکھ کر بقدر ضرورت ان کے کھلانے پہنانے پر خرچ کرتے رہو، اور اگر وہ مال کو اپنے قبضہ میں لینے کا مطالبہ بھی کریں تو ان کو معقول بات کہہ کر سمجھا دو جس میں دشمنی بھی نہ ہو اور مال بھی ضائع نہ ہونے پائے، مثلاً یہ کہہ دو کہ یہ سب تمھارے ہی لئے رکھا ہے، ذرا تم ہوشیار ہو جاؤ گے تو تمھیں دیدیا جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس تفسیر پر آیت کا مفہوم ان سب عورتوں، بچوں اور کم عقل ناجذبہ کار لوگوں کو شامل ہے، جن کو مال سپرد کر دینے پر مال میں نقصان کا خطرہ ہے، خواہ وہ اپنے بچے ہوں یا یتیم بچے، اور خواہ وہ مال ان بچوں اور یتیموں کا اپنا ہو یا اولیاء کا ہو۔ یہی تفسیر حضرت ابو موسیٰ اشعرؓ سے بھی منقول ہے، اور امام تفسیر حافظ طبرسیؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ پچھلی اور اگلی آیتوں کا سیاق اگرچہ اس حکم کو بھی یتیم بچوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا رجحان پیدا کر سکتا ہے، لیکن الفاظ کا عموم اپنی جگہ ہے، جس میں یتیم اور غیر یتیم سب بچے داخل ہیں اور شاید اس جگہ **أَمْوَالُكُمْ** بصیغہ خطاب فرمانے میں یہی حکمت ہو کہ وہ اپنے اموال کو بھی شامل ہے، اور یتیموں کے اموال کو بھی، جب تک ان میں ہوشیاری نہ آئے ان کی ذمہ داری میں ہونے کی وجہ سے گویا انہی کے اموال ہیں اور اس سے پہلی آیت میں **وَأَمْوَالُكُمْ** فرما کر اصل حقیقت کو واضح بھی کر دیا گیا ہے کہ یتیموں کے مال انہی کو دینا ہے جس کے بعد کوئی مغالطہ باقی نہیں رہ سکتا۔

مال کی حفاظت ضروری امر ہے اور اس کو ضائع کرنا گناہ ہے، اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے کوئی شخص مقتول ہو جائے تو شہید ہے جیسا کہ جان کی حفاظت کرتے ہوئے



مقتول ہونے پر شہادت کا اجر موعود ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ

اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جو شخص  
مقتول ہو گیا وہ شہید ہے (یعنی ثواب کے اعتبار سے)  
شہیدوں میں شمار ہے ۴

بخاری صفحہ ۲۲۷، جلد ۱

مسلم صفحہ ۸۱، جلد ۱

نیز ارشاد فرمایا:

نِعْمًا بِالْمَالِ الصَّالِحِ لِلرَّجُلِ

”نیک آدمی کے لئے اس کا اچھا اور پاکیزہ  
مال بہترین متاع حیات ہے“

الصَّالِحِ (مشکوٰۃ ص ۳۲۶)

نیز ارشاد فرمایا:

لَا بَأْسَ بِالْغِنَى لِمَنِ اتَّقَى اللَّهَ

”جو شخص اللہ عزوجل سے ڈرتا ہو اس کی  
مال داری میں دین کا کوئی حرج نہیں“

عَزَّ وَجَلَّ (مشکوٰۃ ص ۲۵۱)

آخر کی ان دونوں حدیثوں میں یہ بات بتائی ہے کہ صالح اور متقی آدمی کا مال پاس رکھنا اس کے حق میں مضر نہیں ہے، کیونکہ ایسا شخص اللہ سے خوف کھاتے ہوئے اپنے مال کو گناہوں میں خرچ کرنے سے بچے گا، بہت سے اولیاء اللہ اور صوفیاء زاہدین سے جو مال کی بُرائی منقول ہے، وہ اپنی لوگوں کے حق میں ہے جو گناہوں میں خرچ کر کے اپنے کمائے ہوئے مال کو آخرت کے عذاب کا ذریعہ بناتے ہیں، اور چونکہ انسان طبعی طور پر مال دار ہونے کے بعد اسراف اور دیگر معاصی سے محفوظ رہنے کی فکر چھوڑ دیتا ہے، اس لئے مال سے دور رہنے کو محبوب سمجھا گیا ہے، بقدر ضرورت تھوڑا بہت کمایا اور اللہ کا نام لیا، اور مال کے حساب سے اپنی جان بچائی، یہ پرانے بزرگوں کا طرز تھا، دور حاضر میں لوگوں میں دین و ایمان کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، دنیوی ساز و سامان کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے ہیں، اور معمولی سی تکلیف ہی نہیں بلکہ ظاہری فیشن کے خلاف ورزی ہو جانے پر دین چھوڑنے کو تیار ہو جاتے ہیں، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے مال حلال کسب کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کی زیادہ اہمیت ہے، اسی طرح کے لوگوں کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُونَ مَكْفَرًا

”یعنی تنگدستی انسان کو بعض اوقات کافر بنا سکتی ہے“

(مشکوٰۃ ص ۲۲۹)

حضرت سفیان ثوری نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا: کان المال فیما مضیٰ

بکرمہ، فاما اليوم فهو نثر من المؤمن، یعنی زمانہ سابق میں مال کو پاس رکھنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن آج یہ مال مؤمن کی ڈھال ہے۔



نیز انہوں نے فرمایا: مَنْ كَانَ فِي يَدِهِ مِنْ هَذِهِ شَيْئًا فَلْيُصْلِحْهُ فَإِنَّهُ زَمَانٌ  
 إِنَّ احْتِاجَ كَانَ اَدَلًّی مِنْ یَبْدُلِ دِیْنُکَ، "یعنی جس کے پاس درہم و دنانیر میں سے کچھ موجود  
 ہو اسے چاہئے کہ اس مال کو مناسب طریقہ پر کام میں لائے، کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے کہ اگر کچھ حاجت  
 پیش آگئی تو انسان سب سے پہلے حاجت پوری کرنے کے لئے اپنے دین ہی کو خرچ کرے گا"  
 مطلب یہ ہے کہ حاجت پورے کرنے کی اہمیت دین پر چلنے سے زیادہ ہو گئی (مشکوٰۃ ص ۲۹۱)  
 نابالغوں کی سمجھ اور صلاحیت | پہلی آیت میں جب یہ معلوم ہو گیا کہ جب تک معاملات میں نابالغوں  
 کی ہوشیاری ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ان کو اموال سپرد  
 نہ کئے جائیں، اس لئے دوسری آیت میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اور پھر امتحان کر کے  
 ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے احکام دیئے گئے، ارشاد ہوا:

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا ابْتَلَوُا الْبِكَاحَ، "یعنی بالغ ہونے سے پہلے ہی چھوٹے چھوٹے  
 معمولی معاملات خرید و فروخت ان کے سپرد کر کے ان کی صلاحیت کا امتحان لیتے رہو،  
 یہاں تک کہ جب وہ نکاح کے قابل یعنی بالغ ہو جائیں،" تو اب خاص طور سے اس کا اندازہ  
 لگاؤ کہ وہ اپنے معاملات میں ہوشیار ہو گئے یا نہیں، جب ہوشیاری محسوس کر لو تب ان کے  
 اموال ان کے سپرد کر دو۔

مُخْلَصًا یہ کہ بچوں کی مخصوص طبیعت اور ان میں عقل و ہوش کے نشوونما کے اعتباراً  
 سے ان کے تین درجے کر دیئے گئے، ایک بلوغ سے پہلے، دوسرا بلوغ کے بعد، تیسرا ہوشیاری  
 کے بعد، بلوغ سے پہلے بچوں کے اولیاء کو یہ حکم ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کی کوشش کریں  
 معاملات میں ان کو ہوشیار کرنے کے لئے چھوٹے چھوٹے معاملات خرید و فروخت  
 کے ان کے ہاتھ سے کرائیں، آیت میں وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ کا یہی مطلب ہے۔ اس سے  
 امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نابالغ بچے جو معاملات خرید و فروخت  
 اپنے ولی کی اجازت سے کریں وہ صحیح اور نافذ ہیں۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ جب وہ بالغ اور نکاح کے قابل ہو جائیں تو اب معاملات اور تجربہ  
 کے اعتبار سے ان کے احوال کی جانچ کرو، اگر دیکھو کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے لگے ہیں، اور  
 معاملات سلیقہ سے کرتے ہیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

بلوغ کی عمر | اس آیت میں جہاں بلوغ کا حکم بیان فرمایا گیا وہاں قرآن کریم نے اس  
 بارے میں کہ بچے کا بالغ ہونا کس عمر میں سمجھا جائے گا قیاد ابْتَلُوا الْبِكَاحَ فرما کر اس کی طرف  
 اشارہ کر دیا کہ اصل بلوغ کسی عمر کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ اس کا مدار ان آثار پر ہے جو بالغوں



کو پیش آتے ہیں ان آثار کے اعتبار سے جس وقت بھی وہ نکاح کے قابل ہو جائیں بالغ سمجھے جائیں گے خواہ عمر تیرہ چودہ سال ہی کی ہو البتہ اگر کسی بچے میں آثار بلوغ نمودار ہی نہ ہوں تو عمر کے اعتبار سے اس کو بالغ قرار دیا جائے گا جس میں فقہاء کا اختلاف ہے، بعض نے لڑکے کے لئے اٹھارہ سال اور لڑکی کے لئے سترہ سال معسر کے ہیں، اور بعض نے دونوں کے لئے پندرہ سال قرار دیے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے مذہب میں فتویٰ اس قول پر ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں پندرہ سال کی عمر پوری ہونے پر شرعاً بالغ قرار دیئے جائیں گے، خواہ آثار بلوغ پائے جائیں یا نہیں۔

ہوشیاری کیونکر معلوم ہوگی؟ اس سلسلہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ جب ہم ان میں ہوشیاری محسوس اَلَمْ يَجْعَلْ لَهُمُ احْسَنَ مِنْ شَرِّهِ کر داس وقت ان کے اموال ان کو سپرد کر دو، اس ہوشیاری کی کیا معاد ہے؟ قرآن مجید نے اس آخری معاد کی کوئی صراحت نہیں فرمائی اس لئے بعض فقہاء اس طرف گئے کہ جب تک پوری ہوشیاری محسوس نہ کی جائے اس وقت تک ان کے اموال ان کے سپرد نہ کئے جائیں گے، بلکہ بدستور سابق ولی کی حفاظت و امانت میں رہیں گے، خواہ ساری عمر اسی حالت میں گزر جائے۔

اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس جگہ عدم ہوشیاری سے وہ مراد ہے جو بچپن کے اثر سے ہو، اور بالغ ہونے کے دس سال بعد تک بچپن کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اس لئے پندرہ سال عمر بلوغ اور دس سال سن رشد و ہوشیاری بھی مکمل پچیس سال کی عمر ہو جانے پر وہ رشد و ہوشیاری ضرور حاصل ہوگی جس کے حاصل ہونے میں بچپن اور کم عمری حائل تھی، اور قرآن کریم نے لفظ رشد اکمرہ لاکر اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے کہ مکمل ہوشیاری اور دانشمندی شرط نہیں، کسی قدر ہوشیاری بھی اس کے لئے کافی ہے، کہ ان کے اموال ان کو دیدیئے جائیں، اس لئے پچیس سال تک انتظار کر کے اگر مکمل ہوشیاری نہ بھی آئے تب بھی ان کے اموال ان کو دیدیئے جائیں گے، رہی مکمل ہوشیاری اور دانشمندی، سو یہ بعض لوگوں میں عمر بھر نہیں آتی، وہ ہمیشہ سیدھے بھولے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو اپنے اموال سے محروم نہ کیا جائے گا، ہاں اگر کوئی بالکل پاگل اور جنون ہی ہو سو اس کا حکم علیحدہ ہے کہ وہ ہمیشہ نابالغ بچوں کے حکم میں رہتا ہے، اور اس کے اموال کبھی اس کے حوالہ نہ کئے جائیں گے، جب تک اس کا جنون زائل نہ ہو جائے، اگرچہ ساری عمر اس جنون میں گزر جائے۔

یتیموں کے مال بے جا جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اس آیت میں اس بات کی ہدایت دی گئی ہے کہ خرچ کرنے کی ممانعت یتیموں کے مال ان کو اس وقت تک حوالہ نہ کر دو جب تک ان میں کسی قدر ہوشیاری اور تجربہ نہ آجائے، اور اس کے لئے ظاہر ہے کہ مزید کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا۔



اس حالت میں یہ امکان تھا کہ اولیاء یتیم کی طرف سے کوئی ایسی زیادتی ہو جس سے یتیم کا نقصان ہو، اس لئے آگے اس آیت میں ارشاد فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ أَوْ يَدَارِئَكُمْ بِهَا أَنْ يَكُونَ بَيْنَكُمْ يَوْمَئِذٍ سُلْطَانٌ  
اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہو جائیں گے تو ان کو دینا پڑے گا، جلدی جلدی اڑا کر  
مت کھا ڈالو، اس میں اولیاء یتیم کو دو چیزوں سے روکا گیا، ایک ان کے مال میں اسراف  
یعنی ضرورت سے زائد خرچ کرنے سے، دوسرے اس بات سے کہ ان کا مال ضرورت پیش  
آنے سے پہلے جلد جلد خرچ کرنے لگیں، اس خیال سے کہ عنقریب یہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کا  
مال ان کو دینا پڑے گا، ہمارا اختیار ختم ہو جاتا ہے گا۔

یتیم کا دل اس کے مال میں سے آخر آیت میں اس کا ضابطہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی یتیم بچے کی  
ضرورت سمجھ لے سکتا ہے تربیت اور اس کے مال کی حفاظت میں اپنا وقت اور محنت  
خرچ کرتا ہے کیا اس کو یہ حق ہے کہ یتیم کے مال میں سے اپنا حق الخدمت کچھ لیلے، چنانچہ فرمایا  
وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ، یعنی جو شخص حاجت مند نہ ہو اپنی ضرورت کا محفل کسی  
دوسرے ذریعہ سے کر سکتا ہو، اس کو چاہئے کہ یتیم کے مال میں سے حق الخدمت نہ لیا کرے، کیونکہ  
یہ خدمت اس کے ذمہ فرض ہے، اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں، پھر فرمایا:

وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ، یعنی جو ولی یتیم، فقیر محتاج ہو اور دوسرا  
کوئی ذریعہ معاش نہ رکھتا ہو وہ یتیم کے مال میں سے ایک مناسب مقدار کھا سکتا ہے جس سے  
حاجات ضروریہ پوری ہو جائیں۔

مال سپرد کرتے وقت گواہ بنانا | آخر میں ارشاد فرمایا، فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهَدُوا  
عَلَيْهِمْ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا، یعنی جب آزمائش کے بعد یتیموں کے اموال ان کے سپرد  
کرنے لگو تو چند ثقہ اور نیک لوگوں کو گواہ بنالیا کرو، تاکہ آئندہ کسی نزاع اور جھگڑے کی  
صورت پیدا نہ ہو، اور یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حساب میں ہر چیز ہے۔

اوقات اور دوسری ٹکلی | آیت کے سابق سے ایک فقہی ضابطہ اور اصول معلوم ہو گیا، کہ جو لوگ  
اور مٹی خدات کا معاوضہ | اوقات کے بنگراں ہیں، یا مساجد و مدارس کے منتظم ہیں، یا مسلم حکومتوں  
کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، یا ایسی ہی دوسری ٹکلی اور مٹی خدمات جن کا انجام دینا فرض کفایہ  
ہے ان پر مامور ہیں ان حضرات کے لئے بھی اعلیٰ اور افضل یہ ہے کہ اگر اپنے پاس اتنا اثاثہ ہو،  
اور وہ اپنے بچوں کے ضروری اخراجات پورے کر سکتے ہوں تو ان اداروں سے اور حکومت کے  
بیت المال سے کچھ بھی نہ لیں، لیکن اگر اپنے پاس گزارہ کے لئے مال موجود نہ ہو اور کسب اوقات



ان کاموں میں مشغول ہو جاتے ہوں تو بقدر ضرورت ان اداروں سے مال لے لینے کا اختیار ہے، مگر قدر ضرورت کا لفظ پیش نظر رہے، بہت سے لوگ ضابطہ کے طور پر کاغذی خانہ پرسی کے لئے اپنا مالانہ کچھ حصہ معسر کر لیتے ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے اس سے کہیں زیادہ بے احتیاطی کے ساتھ اپنی ذات پر اور بال بچوں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں، اس بے احتیاطی کا مداوی بجز ثواب الہی کے کچھ نہیں جس کی طرف آیت کے اخیر لکڑے میں وَكَفَى بِاللّٰهِ حَيِّبًا، فرما کر جملہ عوام و خواص کو توجہ دلا دی گئی ہے جسے اللہ کے محاسبہ کا خیال ہو وہی ناجائز مال سے بچ سکتا ہے، وَاللّٰهُ التَّوَفِّيقُ۔

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ س وَ

مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ میں ماں باپ اور قرابت والے اور

لِّلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ

عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ میں ماں باپ اور قرابت والے تھوڑا ہو یا

مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا أَحْضَرَ الْقِسْمَةَ

بہت ہو حصہ مقرر کیا ہوا ہے ، اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت

أُولَئِیَ الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالسَّالِکِیۡنَ فَارْزُقُوْهُم مِّنْهُ وَ

رشتہ دار اور یتیم اور محتاج تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور

قُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِیۡنَ كُوۡتِرَ کُوۡا

کہہ دو ان کو بات معقول ، اور چاہئے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑی

مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّیَّةً ضِعْفًا خَافُوۡا عَلَیْهِمْ فَلِیَتَّقُوا اللّٰهَ

اپنے پیچھے اولاد طعیف تو اپرا اندیشہ کریں یعنی ہمارے پیچھے ایسا ہی حال ان کا ہوگا، تو چاہئے کہ ڈریں اللہ سے

وَلِیَقُولُوا قَوْلًا سَدِیۡدًا ۝ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمْوَالَ

اور کہیں بات سیدھی ، جو لوگ کھاتے ہیں مال

الْیَتٰمٰی طُلُمًا اِنَّمَا یَاۡكُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا وَّ

یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور

سَیَصْلَوۡنَ سَعِیۡرًا ۝

عنقریب داخل ہوں گے آگ میں



**رابطہ آیات** | سورہ نساہ میں اول ہی عام انسانی حقوق خصوصاً عائلی زندگی سے متعلق حقوق کا بیان چل رہا ہے، اس سے پہلی آیت میں یتیموں کے حقوق کا بیان تھا، مذکورہ چار آیتوں میں بھی عورتوں اور یتیموں کے خاص حقوق متعلقہ وراثت کا بیان ہے۔

پہلی آیت میں جاہلیت کی اس رسم کو طہل کیا گیا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کو میراث کا مستحق ہی نہیں مانا جاتا تھا، اس آیت نے ان کو اپنے شرعی حصہ کا مستحق قرار دے کر ان کے حق میں کمی کرنے اور نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت کی، پھر چونکہ مستحقین میراث کا ذکر آیا تھا اور ایسے موقع پر تقسیم کے وقت غیر مستحقین فقراء اور یتیم بچے بھی حاضر ہو جایا کرتے ہیں تو دوسری آیت میں ان کے ساتھ حسن سلوک اور مراعات کا حکم ارشاد فرمایا، لیکن جسکے وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی آیت میں بھی احکام ایٹامی کے سلسلہ میں اسی مضمون کی تاکید ہے۔

## خلاصہ تفسیر

مردوں کے لئے بھی (خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار اپنے مرنے کے وقت، چھوڑ جاویں، اور (اس طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان عورتوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار اپنے مرنے کے وقت، چھوڑ جاویں خواہ وہ (چھوٹی ہوئی) چیز قلیل ہو یا کثیر ہو (سب میں سے ملے گا اور حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مستحق ہے، اور جب (داروں میں ترکہ کے) تقسیم ہونے کے وقت (یہ لوگ) موجود ہوں (یعنی دور کے) رشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ (اس توقع سے کہ شاید ہم کو بھی کچھ مل جائے) رشتہ دار تو ممکن ہے کہ گمان استحقاق سے اور دوسرے لوگ بامید خیر خیرات کے) تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں (جن) قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دید و اور ان کے ساتھ خوبی (اور نرمی) سے بات کرو (وہ بات رشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ سمجھا دو کہ تمہارا حصہ شرع سے اس میں نہیں ہے، ہم معذور ہیں، اور دوسروں سے یہ کہ دے کر احسان نہ جتلاؤ) اور (یتامی کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑا کریں (جاویں تو ان بچوں) کی ان (لوگوں) کو فکر ہو کہ دیکھتے ان کو کوئی آزار نہ دے، تو ایسا ہی دوسرے کے بچوں کے لئے بھی خیال رکھنا چاہئے، کہ ہم ان کو آزار نہ دیں) سو اس بات کو سوچ کر، ان لوگوں کو چاہئے کہ (یتامی کے معاملہ میں) خدا تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں (یعنی فعلاً آزار و ضرر



نہ پہنچائیں) اور (قولا بھی اُن سے) موقع کی بات کہیں (اس میں تسلی اور دل جوئی کی بات بھی آگئی) اور تعلیم و تادیب کی بات بھی آگئی، غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اصلاح کریں، بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (دبتر تھے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے مشکم میں (دورخ کی) آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی انجام اس کھانے کا یہ ہونے والا ہے) اور اس انجام کے مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں، کیونکہ (عقرب (ہی دورخ کی) جلتی راگ) میں داخل ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)۔

## معارف مسائل

والدین اور دیگر اقرباء کے | اسلام سے پہلے عرب اور عجم کی قوموں میں انسان کی صنفِ ضعیف، اموال میں حق میراث | یتیم بچے اور صنفِ نازک عورتیں ہمیشہ طرح طرح کے ظلم و ستم کا شکار رہے ہیں، اول تو ان کا کوئی حق ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی حق مان بھی لیا گیا تو مردوں سے اس کا وصول کرنا اور اس کا محفوظ رکھنا کسی کی قدرت میں نہ تھا۔

اسلام نے سب سے پہلے ان کو حقوق و ملائ سے پھر ان حقوق کی حفاظت کا مکمل انتظام کیا، قانونِ وراثت میں بھی عام اقوامِ دنیا نے معاشرہ کے ان دونوں ضعیف اجزاء کو ان کے فطری اور راجبی حقوق سے محروم کیا ہوا تھا۔

عرب نے تو اصول ہی بنا لیا تھا کہ وراثت کا سبھی صرف وہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہو، اور دشمنوں کا مقابلہ کر کے اس کا مال غنیمت جمع کرے (روح المعانی ص ۲۱۰ ج ۲)

ظاہر ہے کہ یہ دونوں صنفِ ضعیف بچے اور عورتیں اس اصول پر نہیں آ سکتیں، اس لئے ان کے اصول وراثت کی رو سے صرف جوان بالغ لڑکا ہی وارث ہو سکتا تھا، لڑکی مطلقاً وارث نہ بھی جاتی تھی، خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اور لڑکا بھی اگر نابالغ ہو تو وہ بھی مستحق وراثت نہ تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک واقعہ پیش آیا کہ اوس بن ثابتؓ کا انتقال ہوا اور دو لڑکیاں ایک لڑکا نابالغ اور ایک بیوی وارث چھوڑے، مگر عرب کے قدیم دستور کے مطابق ان کے دو چچا زاد بھائیوں نے آکر محرم کے پورے مال پر قبضہ کر لیا اور اولاد اور بیوی میں سے کسی کو کچھ نہ دیا، کیونکہ ان کے نزدیک عورت تو مطلقاً مستحق وراثت نہ بھی جاتی تھی خواہ بالغ ہو یا نابالغ، اس لئے بیوی اور دونوں لڑکیاں تو یوں محروم ہو گئیں، اور لڑکا بوجہ نابالغ ہونے کے محروم کر دیا گیا، لہذا پورے مال کے وارث دو چچا زاد بھائی ہو گئے۔

اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے یہ بھی چاہا کہ یہ چچا زاد بھائی جو پورے ترکہ پر قبضہ



کر رہے ہیں تو ان دونوں لڑکیوں سے شادی بھی کر لیں تاکہ ان کی فکر سے فراغت ہو، مگر انھوں نے یہ بھی قبول نہ کیا تب اوس بن ثابتؓ کی بیوہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض حال کیا، اور اپنی اور اپنے بچوں کی بیکسی اور محرومی کی شکایت کی، اس وقت تک چونکہ قرآن حکیم میں آیت میراث نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دینے میں توقع فرمایا، آپ کو اطہان تھا کہ وحی الہی کے ذریعہ اس ظالمانہ قانون کو ضرور بدل جائے گا، چنانچہ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی:

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا

اور اس کے بعد دوسری آیت وراثت نازل ہوئی جس میں حصوں کی تفصیلات ہیں، اور اس سورت کا دوسرا رکوع ان تفصیلات پر مشتمل ہے جسٹور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام قرآنی کے مطابق کل ترکہ کا آٹھواں حصہ بیوی کو دے کر باقی سب مال مرحوم کے لڑکے اور لڑکیوں کو اس طرح تقسیم کر دیا کہ اس کا آدھا لڑکے کو اور آدھے میں دونوں لڑکیاں برابر کی شریک رہیں، اور چچا زاد بھائی بمقابلہ اولاد کے چونکہ اقرب نہ تھے اس لئے ان کو محروم کیا گیا۔ (روح المعانی)

استحقاق میراث | اس آیت نے وراثت کے چند احکام کے ضمن میں قانون وراثت کا ضابطہ کا ضابطہ بیان فرما دیا ہے۔

مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ، ان دو لفظوں نے وراثت کے دو بنیادی اصول بتلا دیئے، ایک رشتہ ولادت، جو اولاد اور ماں باپ کے درمیان ہے، اور جس کو لفظ ذالین سے بیان کیا گیا ہے، دوسرے عام رشتہ داری جو لفظ اقربون کا مفہوم ہے، اور صحیح یہ ہے کہ لفظ "اقربون" ہر قسم کی قرابت اور رشتہ داری کو حاوی ہے، خواہ وہ رشتہ باہمی ولادت کا ہو جیسے اولاد اور ماں باپ میں، یا دوسری طرح کا جیسے عام خاندانی رشتوں میں یا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق سے پیدا ہوئے ہیں، لفظ "اقربون" سب پر حاوی ہے، لیکن والدین کو ان کی اہمیت کی وجہ سے بطور خاص جدا کر دیا گیا، پھر اس لفظ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مطلق رشتہ داری وراثت کے لئے کافی نہیں، بلکہ رشتہ میں اقرب ہونا شرط ہے، کیونکہ اگر اقربیت کو معیاری شرط نہ بنایا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت پوری دنیا کی تمام انسانی آبادی پر تقسیم کرنا ضروری ہو جائے گا، کیونکہ سب ایک ماں باپ آدم و حوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، دور قریب کا کچھ نہ کچھ رشتہ سب میں موجود ہے، اور یہ اول تو امکان سے باہر



ہے اور دوسرے اگر کسی طرح کو شش کر کے اس کا انتظام کر بھی لیا جائے تو متروکہ مال جزیرہ لا تجزئ بن کر ہی تقسیم ہو سکے گا جو کسی کے کام نہ آئے گا، اس لئے ضروری ہوا کہ جب وراثت کا مدار رشتہ داری پر ہو تو اصولی یہ بنایا جائے کہ اگر نزدیک و دور کے مختلف رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کے ہوتے ہوئے ابعاد کو حصہ نہ دیا جائے، ہاں اگر کچھ رشتہ دار ایسے ہوں جو بیک وقت سب کے سب اقرب قرار دیئے جائیں، اگرچہ وجوہ اقربیت ان میں مختلف ہوں تو پھر یہ سب سب حق وراثت ہوں گے، جیسے اولاد کے ساتھ ماں باپ یا بیوی وغیرہ، کہ یہ سب اقرب ہیں اگرچہ اقربیت کی وجوہ مختلف ہیں۔

نیز ایک اور بات اسی لفظ اقربوں نے یہ بتلانی کہ جس طرح مردوں کو مستحق وراثت سمجھا جاتا ہے اسی طرح عورتوں اور بچوں کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ رشتہ اولاد کا یا ماں باپ کا ہو یا دوسری قسم کے رشتے ہر ایک میں رشتہ داری کی حیثیت لڑکے اور لڑکی میں یکساں ہے، جس طرح لڑکا ماں باپ سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح لڑکی بھی انہی سے پیدا ہوئی ہے جب حق وراثت کا مدار رشتہ پر ہوا تو چھوٹے بچے یا لڑکی کو محروم کرنے کے کوئی معنی نہیں رہتا پھر قرآن کریم کے اسلوب کو دیکھئے کہ لِلرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ کو جمع کر کے مختصر لفظوں میں ان کے حق کا بیان ہو سکتا تھا، اس کو اختیار نہیں کیا، بلکہ مردوں کے حق کو جس تفصیل سے بیان کیا ہے اسی تفصیل و تشریح کے ساتھ عورتوں کا حق جدا گانہ بیان فرمایا، تاکہ دونوں کے حقوق کا مستقل اور اہم ہونا واضح ہو جائے۔

نیز اسی لفظ اقربوں سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میت کے رشتہ میں قریب تر ہو گا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہو گا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنا لیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کر سکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی اجتہادی ہو گا، کیونکہ فقر و حاجت کوئی دائمی چیز نہیں اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں درجات بھی ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعویدار نکل آیا کریں گے اور فیصلہ کرنے والوں کو ان کا فیصلہ مشکل ہو گا۔

یتیم پوتے کی وراثت اگر اس قرآنی اصول کو سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ کا مسئلہ جو آجکل بلاوجہ ایک نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے، وہ خود بخود ایک قطعی فیصلہ



کے ساتھ حل ہو جاتا ہے کہ اگرچہ یتیم پوچھا بہ نسبت بیٹے کے ضرور نیکو زیادہ ہو، لیکن اقربوں کے قانون کی رو سے وہ مستحق وراثت نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بیٹے کی موجودگی میں اقرب نہیں، البتہ اس کی ضرورت رفع کرنے کے لئے دوسرے انتظامات کئے گئے ہیں جن میں سے ایک ایسا ہی انتظام اٹھلی آیت میں آ رہا ہے۔

اس مسئلہ میں موجودہ دور کے مغرب زدہ متجددین کے علاوہ کسی نے بھی ختم کلام نہیں کیا، ساری امت آج تک قرآن و حدیث کی تصریحات سے یہی سمجھتی آئی ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہ ملے گی، خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مر گیا ہو۔

متوفی کی ملکیت میں جو کچھ ہو | اس آیت میں مِمَّا قَلَّ مِنْهُ آوْكَادٌ فرما کر ایک دوسری جاہلانہ رسم سب میں وراثت کا حق ہے | کی اصلاح فرمائی گئی ہے، وہ یہ کہ بعض قوموں میں بعض اقسام مال کو بعض خاص وارثوں کے لئے مخصوص کر لیا جاتا تھا، مثلاً گھڑا اور تلوار وغیرہ اسلحہ، یہ سب صرف نوجوان مردوں کا حق تھا، دوسرے وارثوں کو ان سے محروم کر دیا جاتا تھا، قرآن کریم کی اس ہدایت نے بتا دیا کہ میت کی ملکیت میں جو چیز بھی تھی، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہر چیز میں ہر وارث کا حق ہے، کسی وارث کو کوئی خاص چیز بغیر تقسیم کے خود رکھ لینا جائز نہیں۔

میراث کے مقررہ حصے | آخر آیت میں جو ارشاد فرمایا لِصِّبَاءَ مَقْرُوضًا، اس سے یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کی جانب سے شدیں | مختلف وارثوں کے جو مختلف حصے قرآن نے مقرر فرمائے ہیں، یہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی، یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں۔

وراثت ایک جبری ملک ہے اس میں | اور اسی لفظ مَقْرُوضًا سے ایک اور مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مالک ہو نیوالے کی رضامندی شرط نہیں | وراثت کے ذریعہ جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے، ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے، نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے، بلکہ اگر وہ زبان سے بصراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا ہے دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدہ کے مطابق کسی دوسری کو ہبہ کر دے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کر دے۔

محروم الارث رشتہ داروں | میت کے رشتہ داروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو ضابطہ کی دلداری ضروری ہے | شرعی کے ماتحت اس کی میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ فرائض کی تفصیلات کا علم ہر شخص کو نہیں ہوتا، عام طور پر ہر رشتہ دار خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کو بھی میراث میں سے حصہ ملے، اس لئے وہ رشتہ دار جو شرعی ضابطہ میراث کے



تحت محروم قرار دیے گئے ہیں، تقسیم میراث کے وقت ان کا دل افسردہ اور رنجیدہ ہو سکتا ہے خصوصاً جب کہ تقسیم میراث کے وقت وہ موجود بھی ہوں، اور بالخصوص جبکہ ان میں کچھ یتیم اور مسکین جاہل بھی ہوں، ایسی حالت میں جب کہ دوسرے رشتہ دار اپنا اپنا حصہ لے جا رہے ہوں، اور یہ کھڑے دیکھ رہے ہوں، ان کی حسرت و اس اور دل شکنی کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر کبھی یہ کیفیت گزری ہو۔

اب قرآنی نظام کی خوبی و خوش سہولتی کو دیکھئے کہ ایک طرف تو خود قرآن ہی کا بتایا ہوا عادلانہ ضابطہ یہ ہے کہ اقرب کے مقابلہ میں ابعد کو محروم کیا جائے، دوسری طرف محروم ہونے والے ابعد کی حسرت اور دل شکنی بھی گوارا نہیں کی جاتی، اس کے لئے ایک مستقل آیت میں یہ ہدایت کی گئی،

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ یعنی جو دور کے رشتہ دار اور یتیم مسکین میراث میں حصہ پائے محروم ہو رہے ہوں، اگر وہ تقسیم میراث کے وقت موجود ہوں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ اس مال میں سے باختر یا خود کچھ حصہ ان کو بھی دیدیں جو ان کے لئے ایک قسم کا صدقہ اور موجب ثواب ہے، اور ایسے وقت میں جب کہ ایک مال بغیر کسی سعی و عمل کے محض خدا تعالیٰ کے دین سے انھیں مل رہا ہو تو صدقہ خیرات فی سبیل اللہ کا خود بھی داعیہ دل میں ہونا چاہئے، جیسا کہ اس کی ایک نظیر دوسری آیت میں مذکور ہے، کُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۚ یعنی اپنے باغ کا پھل کھاؤ جب کہ وہ پھل دینے لگے، اور جس روز پھل کاٹو تو اس کا حق نکال کر فقراء و مساکین کو دیدو ۚ (یہ آیت سورۃ النعام ۱۳۱ میں آرہی ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دور کے رشتہ دار یتیم مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا کوئی حصہ ضابطہ شرعی سے اس میراث میں نہیں ہے تو ان کے جمع ہو جانے سے تم تنگدل نہ ہو، بلکہ جو مال خدا تعالیٰ نے تمہیں بلا محنت عطا فرمایا ہے اس میں سے بطور شکرانہ کچھ عطا کر دو، اور غنیمت جانو کہ خرچ کا ایک اچھا موقع مل رہا ہے، اس موقع پر ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دیدینے سے ان دور کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہو جائے گا، اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آگیا، اس کے چچاؤں اور بھوپھیوں کو چاہئے کہ اس کو اپنے اپنے حصہ سے بخوشی کچھ دیدیں۔

آخر آیت میں فرمایا وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا اگر یہ لوگ اس طرح تھوڑا دینے پر بھی راضی نہ ہوں بلکہ دوسروں کے برابر حصہ کا مطالبہ کرنے لگیں تو چونکہ ان کا یہ مطالبہ قانون



شرع کے خلاف اور غیر منصفانہ ہے، اس لئے ان کا مطالبہ پورا کرنے کی تو گنجائش نہیں، لیکن اس پر بھی ان کو کوئی ایسی بات نہیں کہی جائے جس سے ان کی دل شکنی ہو، بلکہ معقول طور پر ان کو سمجھایا جائے کہ شرعی قاعدہ سے میراث میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، ہم نے جو کچھ دیا ہے وہ محض تبرعاً دیا ہے، اور ایک بات یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ ان لوگوں کو تبرعاً جو دیا جائے گا مجموعی مال میں سے نہیں، بلکہ بالغین و رشاء میں سے جو حاضر ہوں وہ اپنے حصہ میں سے دیں، نابالغ اور غائب کے حصہ میں سے دینا درست نہیں۔

اللہ سے ڈرتے ہوئے | تیسری آیت میں عام مسلمانوں کو خطاب عام ہے، کہ اس کا پورا اہتمام کریں میراث تقسیم کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جائے، اور ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کریں جس میں اولاد کے حصہ پر کوئی ناگوار اثر پڑتا ہو، اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت یا تصرف کرتے ہوئے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دوسرے وارثوں کو نقصان پہنچ جانے کا خطرہ ہے تو آپ پر لازم ہے کہ اس کو ایسی وصیت یا ایسے تصرف سے روکیں، جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو اپنا پورا مال یا آدھا مال صدقہ کرنے سے روک دیا، اور صرف ایک تہائی مال کو صدقہ کرنے کی اجازت دیدی (مشکوٰۃ باب الوصایا، ص ۲۶۵) کیونکہ پورا مال یا آدھا مال صدقہ کر دیا جاتا تو وارثوں کا حصہ ختم یا کم ہو جاتا۔

نیز اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا دینے کا بڑا اہتمام کریں، اس میں ادنیٰ کوتاہی کو راہ نہ دیں، اور دوسروں کے یتیم بچوں کے حالات کو اپنے بچوں اور اپنی محبت کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھیں، اور اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ لوگ اچھا معاملہ کریں، اور وہ پریشان نہ ہوں، کوئی ان پر ظلم نہ کرے تو ان کو چاہئے کہ دوسرے کی اولاد یتامی کے ساتھ ہی معاملہ کریں۔

یتیم کا مال ظلماً کھانا پیٹیں | چوتھی آیت میں یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنے والوں کے انکار سے بھرتا ہے لئے وعید شدید کا بیان ہے، کہ جو شخص ناجائز طور پر یتیم کا مال کھاتا ہو وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔

اس آیت نے یتیم کے مال کو جہنم کی آگ قرار دیا ہے، بہت سے مفسرین نے اس کو تشبیہ اور کنایہ پر محمول کیا ہے، یعنی یتیموں کا مال ناجائز کھانا ایسا ہے جیسے کوئی پیٹ میں آگ بھرے، کیونکہ اس کا انجام بالآخر قیامت میں ایسا ہی ہونے والا ہے، مگر اہل تحقیق کا قول



یہ ہے کہ آیت میں کوئی مجاز اور کنایہ نہیں ہے، بلکہ جو مال یتیم کا ناجائز طریقہ سے کھایا جائے وہ حقیقت میں آگ ہی ہے، اگرچہ اس وقت اس کی صورت آگ کی معلوم نہ ہوتی ہو، جیسے کوئی شخص دیا سلائی کو کہے کہ یہ آگ ہے، یا سنکھیا کو کہے کہ قاتل ہے، تو ظاہر ہے کہ دیا سلائی کو ہاتھ میں لینے سے ہاتھ نہیں جلتا، اور سنکھے کو ہاتھ میں لینے سے بلکہ منہ میں رکھنے سے بھی کوئی آدمی نہیں مرتا، البتہ ذرا سی رگوں کھلنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جس نے دیا سلائی کو آگ کہا تھا وہ صحیح کہا تھا، اسی طرح حلق کے نیچے اترنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سنکھیا کو قاتل کہنے والا سچا تھا، قرآن کریم کے عام اطلاقات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ انسان جو عمل نیک یا بد کر رہا ہے یہی عمل جنت کے درخت اور پھل پھول ہیں یا جہنم کے انگکالے ہیں، اگرچہ ان کی صورت یہاں اور ہے، مگر قیامت کے روز اپنی شکلوں میں متشکل ہو کر سامنے آئیں گی، قرآن کریم کا ارشاد ہے: **وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا**، یعنی قیامت کے روز وہ اپنے کئے ہوئے کو موجود پائیں گے، یعنی جو عذاب و ثواب ان کو نظر آئے گا وہ حقیقت میں ان کا اپنا عمل ہوگا۔

بعض روایات میں ہے کہ یتیم کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ پیٹ کے اندر سے آگ کی لپٹیں اس کے منہ، ناک، اور کانوں، آنکھوں سے نکل رہی ہوں گی۔

اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک قوم قیامت کے روز اس طرح اٹھائی جائے گی کہ ان کے منہ آگ سے بھر ٹک رہے ہوں گے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ کون لوگ ہوں گے، آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن میں نہیں پڑھا **إِنَّ الَّذِينَ قَاتَلُوا بِأَمْوَالِ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا** (ابن کثیر ۴/۵۶ ج ۱)

آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کا مال جو ناحق کھایا جائے وہ درحقیقت جہنم کی آگ ہوگی گو اس وقت اس کا آگ ہونا محسوس نہ ہو، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں شدید حسیاسط کے لئے واضح ہدایات دی ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تیس تم کو خاص طور پر دو ضعیفوں کے مال سے بچنے کی تنبیہ کرتا ہوں، ایک عورت،

اور دوسرے یتیم۔

**أَخْذِجْ مَالِ الضَّعِيفَيْنِ الْمَرْأَةِ وَالْيَتِيمِ**

(ابن کثیر، ص ۴۵۶ ج ۱)

سورۃ نسا کے اول رکوع میں شروع سے آخر تک عموماً یتامی ہی کے احکام ہیں، یتامی کے اموال کی نگہداشت رکھنے، ان کے مال کو اپنا مال نہ بنالینے، ان کے وراثت میں



ملے ہوئے اموال سے ان کو حصہ دینے کا حکم فرمایا، اور بڑا ہو جانے کے ڈر سے ان کا مال اڑا دینے میں جلدی کرنا، یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے مہر کم کر دینا، یا ان کے مال پر قبضہ کر لینا وغیرہ، ان سب امور کی ممانعت فرمائی۔

آخر میں فرمایا کہ ناحق یتیم کا مال کھانا پیٹ میں آگ کے انگارے بھرنا ہے، کیونکہ اس کی پاداش میں موت کے بعد اس طرح کے لوگوں کے پیٹوں میں آگ بھری جائے گی، لفظ یتیم استعمال استعمال فرمایا ہے اور یتیم کا مال کھانے پر وعید سنائی گئی ہے، لیکن یتیم کے مال کا ہر استعمال کھانے پینے میں ہو یا برتنے میں سب حرام اور باعث عتاب و عذاب ہے، کیونکہ محاورے میں کسی کا مال ناحق کھالینا ہر استعمال کو شامل ہوتا ہے۔

جب کوئی شخص وفات پا جاتا ہے تو اس کے مال کے ہر حصہ اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے ساتھ ہر وارث کا حق متعلق ہو جاتا ہے، اس کے نابالغ بچے یتیم ہوتے ہیں، ان بچوں کے ساتھ عموں ہر گھر میں ظلم و زیادتی کا برتاؤ ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص جو ان بچوں کے باپ کی وفات کے بعد مال پر قابض ہوتا ہے خواہ ان بچوں کا چچا ہو یا بڑا بھائی ہو یا والدہ ہو یا اور کوئی ولی یا وصی ہو، اکثر ان امور کے مرتکب ہو جاتے ہیں جن کی ممانعت اس رکوع میں کی گئی ہے، اول تو ساہماں سال مال کو تقسیم کرتے ہی نہیں، ان بچوں کی روٹی پکڑے پر تھوڑا بہت خرچ کرتے رہتے ہیں پھر بدعات، رسومات اور فضولیات میں اسی مال مشترک سے خرچ کئے چلے جاتے ہیں، اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے ہیں، اور سرکاری کاغذات میں نام بدلو کر اپنے بچوں کا نام لکھواتے ہیں، یہ وہ باتیں ہیں جن سے کوئی ہی گھر خالی رہتا ہوگا۔

مدرسوں اور یتیم خانوں میں جو چندہ یتیموں کے لئے آتا ہے اس کو یتیموں پر خرچ نہ کرنا بھی ایک صورت یتیم کا مال ہضم کرنے کی ہے۔

**مسئلہ:** میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں، ان کو حساب میں لگائے بغیر بونہی صدقہ کر دیتے ہیں، بعض علاقوں میں تانبے پیتل کے برتن مال کو تقسیم کئے بغیر فقیروں کو دیدیتے ہیں، حالانکہ ان سب میں نابالغوں اور غیر حاضر وارثوں کا بھی حق ہوتا ہے، پہلے مال بانٹ لیں، جس میں سے مرنے والے کی اولاد، بیوی، والدین، بہنیں، جس جس کو شرعاً حصہ پہنچتا ہو اس کو دیدیں، اس کے بعد اپنی خوشی سے جو شخص چاہے مرنے والے کی طرف سے خیرات کریں، یا مل کر کریں تو صرف بالغین کریں، نابالغ کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں، اور جو وارث غیر حاضر ہو اس کے حصہ میں اس کی اجازت کے بغیر بھی تصرف درست نہیں۔



**مسئلہ:** میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازہ کے اوپر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے، اس کو میت کے مال سے خریدنا جائز نہیں، کیونکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص اپنی طرف سے خرچ کر دے تو جائز ہے، بعض علاقوں میں نماز جنازہ پڑھانے والے امام کے لئے کفن ہی کے کپڑے میں سے مصلیٰ تیار کیا جاتا ہے، اور پھر یہ مصلیٰ امام کو دیدیا جاتا ہے یہ خرچ بھی کفن کی ضرورت سے فاضل ہے، ورثہ کے مشترک مال میں اس کا حشر یہ نا جائز نہیں۔

**مسئلہ:** بعض جگہ میت کے غسل کے لئے نئے برتن خریدے جاتے ہیں، پھر ان کو توڑ دیا جاتا ہے، اول تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ گھر کے موجودہ برتنوں کا غسل دیا جاسکتا ہے، اور اگر خریدنے کی ضرورت پڑ جائے تو توڑنا جائز نہیں، اول تو اس میں مال ضائع کرنا ہے، اور پھر ان سے یتیموں کا اور غائب وارثوں کا حق واجب ہے۔

**مسئلہ:** ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع اور صرفہ و خیرات کچھ جائز نہیں، اس طرح کے صدقہ و خیرات کرنے سے مردے کو کوئی ثواب نہیں پہنچتا، بلکہ ثواب سمجھ کر دینا اور بھی زیادہ سخت گناہ ہے، اس لئے کہ مورث کے مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا حق ہے، اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں، اس مشترک مال میں سے دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کا مال چرا کر میت کے حق میں صدقہ کر دیا جائے، پہلے مال تقسیم کر دیا جائے، اس کے بعد اگر وہ وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ خیرات کریں تو ان کو خیر ہے۔

تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر مشترک ترکہ میں سے صدقہ خیرات نہ کریں، اس لئے کہ جو ان میں یتیم ہیں ان کی اجازت تو معتبر ہی نہیں، اور جو بالغین ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دل سے اجازت دیں، ہو سکتا ہے وہ لحاظ کی وجہ سے اجازت دینے پر مجبور ہوں، اور لوگوں کے طعنوں کے خوف سے کہ اپنے مردہ کے حق میں دو پیسے تک خرچ نہ کئے، اس عار سے بچنے کے لئے بادل ناخواستہ بامی بھر لے۔ حالانکہ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جب کہ دینے والا طیب خاطر سے دے رہا ہو، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

یہاں ہم ایک بزرگ کا واقعہ نقل کرتے ہیں، جس سے مسئلہ اور زیادہ واضح ہو جائیگا۔ یہ بزرگ ایک مسلمان کی عبادت کے لئے تشریف لے گئے، تھوڑی دیر مریضی کے پاس بیٹھے تھے کہ اس کی روح پرواز کر گئی، اس موقع پر جو چراغ جل رہا تھا انھوں نے فوراً اسے



بھادیا، اور اپنے پاس پیسے دے کر تیل منگایا، اور روشنی کی، لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا جب تک یہ شخص زندہ تھا یہ چراغ اس کی ملکیت تھی، اور اس کی روشنی استعمال کرنا درست تھا، اب یہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تو اس کی ہر چیز میں وارثوں کا حق ہو گیا، لہذا سب وارثوں کی اجازت ہی سے ہم یہ چراغ استعمال کر سکتے ہیں، اور وہ سب یہاں موجود نہیں ہیں لہذا اپنے پیسوں سے تیل منگا کر روشنی کی۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِ كَرِ مِثْلَ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ

ہم تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانَتْ

بھرا اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ تو ان کیلئے ہے دو تہائی اس مال سے جو چھوڑا اور اگر

وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ

ایک ہی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے، اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے

مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَرَثَةٌ

اس مال سے جو چھوڑا اگر میت کے اولاد ہے اور اگر اس کے اولاد نہیں اور وارث ہیں

أَبَوُهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ

اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی بھرا اگر میت کے کسی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ أَبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ

بعد وصیت کے جو کر مرا یا بعد ادائے قرض کے بھائے باپ اور بیٹے تم کو

لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةٌ مِّنَ اللَّهِ ۚ

معلوم نہیں کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے،

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝۱۱

بیشک اللہ خبردار ہے حکمت والا

رابط آیات | پچھلے رکوع میں لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأُخْرُ میں میراث کا تحقیق

رکھنے والے لوگوں کا اجمالاً ذکر تھا، اس رکوع میں انہی مستحقین میراث کی بعض اقسام کی تفصیل

مذکور ہے، اور ان کے مختلف حالات کے اعتبار سے ان کے حصص بیان کئے گئے ہیں، اس



سلسلہ کی کچھ تفصیل سورت کے آخر میں آرہی ہے، اور باقی ماندہ حصوں کو احادیث کے اندر بیان کیا گیا ہے، فقہاء نے نصوص شرعیہ سے اس کی تمام تفصیلات اخذ کر کے مستقبل فن "فرائض" کی شکل میں مدون کر دیے ہیں۔

مندرجہ آیت میں اولاد اور والدین کے حصص بیان کئے گئے ہیں، اور اس کے ساتھ میراث کے کچھ اور مسائل بھی مذکور ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے (میراث پانے) کے باب میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر (یعنی) لڑکا لڑکی ایک ایک یا کئی کئی ملی جلی ہوں تو ان کے حصوں میں باہم یہ نسبت ہوگی کہ ہر لڑکے کو دو ہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا (اور اگر (اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑا ہے (اور اگر دو لڑکیاں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے، کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا، تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے نہ گھٹتا، پس جب دوسری بھی لڑکی ہے، تب تو تہائی سے کسی طرح گھٹ نہیں سکتا اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں، پس اس کا بھی ایک تہائی ہوگا، دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین لڑکیوں میں مشبہ تھا کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی کل مل جاوے، اس لئے فرمایا کہ گو لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں مگر دو تہائی سے نہ بڑھے گا) اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو رکل ترکہ کا) نصف ملے گا (اور پہلی صورت میں ایک ثلث بچا ہوا، اور دوسری صورت کا ایک نصف بچا ہوا دوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے، یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر اسی کو دید یا جاوے گا، جیسا کہ کتب فرائض میں مذکور ہے) اور ماں باپ (کو میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں، ایک صورت تو ان) کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ (مقرر) ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہو (خواہ مذکر یا مؤنث، خواہ ایک یا زیادہ اور بقیہ میراث اولاد اور دوسرے خاص خاص ورثہ کو ملے گی، اور پھر بھی بچ جاوے تو پھر سب کو دی جاوے گی) اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور (شر) اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں (یہ دوسری صورت ہے، اور صرف) اس لئے کہا کہ بھائی بہن بھی نہ ہو، جیسا آگے آتا ہے، تو اس صورت میں، اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور باقی دو تہائی باپ کا، اور چونکہ صورت مفروضہ میں یہ ظاہر تھا، اس لئے تصریح کی جا



نہیں ہوتی) اور اگر میت کے ایک زیادہ بھائی یا بہن (کسی قسم کے) ہوں (خواہ ماں باپ دونوں میں شریک جس کو عینی کہتے ہیں، خواہ صرف باپ ایک ماں الگ الگ جس کو غلاتی کہتے ہیں خواہ صرف ماں ایک باپ الگ الگ جس کو اخپانی کہتے ہیں، غرضیکہ کسی طرح کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں اور اولاد نہ ہو اور ماں باپ ہوں اور یہ تیسری صورت ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کو (حرکہ کا) چھٹا حصہ ملے گا (اور باقی باپ کو ملے گا۔ یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جاوے یا دین (اگر ہو تو اس کو بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے) تمھارے اصول و فروع جمع ہیں تم (ان کے متعلق) پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کونسا شخص تم کو (دنوی یا اخروی) نفع پہنچانے میں (باعتبار توقع کے) نزدیک تر ہے (یعنی اگر تمھاری رائے پر یہ قصہ رکھا جائے تو غالب احوال تم لوگ تقسیم میں مدار ترجیح و تفضیل کا اس شخص کے نفع رسائی پر رکھتے) اور اس مدار کے یقین کا خود کوئی طریقہ کسی کے پاس نہیں ہے تو اس کا مدار تجویز ٹھہرانا ہی صحیح نہ تھا پس جب نفع میں مدار بننے کی قابلیت نہ تھی اس لئے دوسرے مصالح اور اسرار کو گو وہ تمھارے ذہن میں نہ آویں اس حکم کا مبنی اور مدار ٹھہرا کر) یہ حکم منجانب اللہ معتبر کر دیا گیا (اور یہ امر بالیقین مسلم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں (پس جو حکمتیں انھوں نے اپنے علم سے اس میں مرعی رکھی ہیں وہی قابل اعتبار ہیں، اس لئے تمھاری رائے پر نہیں رکھا)۔

## معارف و مسائل

حقوق مقدمہ علی المیراث | شریعت کا اصول یہ ہے کہ مرنے والے کے مال سے پہلے شریعت کی مطابقت اس کے کفن و دفن کے اخراجات پورے کئے جائیں، جن میں نہ فضول خرچی ہو نہ کجوسی ہو، اس کے بعد اس کے قرضے ادا کئے جائیں، اگر قرضے اتنے ہی ہوں جتنا اس کا مال ہے یا اس کے بھی زیادہ تو نہ کسی کو میراث ملے گی نہ کوئی وصیت نافذ ہوگی، اور اگر قرضوں کے بعد مال بچ جائے یا قرضے بالکل ہی نہ ہوں تو اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو اور وہ کسی گناہ کی وصیت نہ ہو، تو اب جو مال موجود ہے اس کے ایک تہائی میں سے اس کی وصیت نافذ ہو جائے گی، اگر کوئی شخص پورے مال کی وصیت کر دے تب بھی تہائی مال ہی میں وصیت معتبر ہوگی۔ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنا مناسب بھی نہیں ہے، اور وارثوں کو محروم کرنے کی نیت وصیت کرنا گناہ بھی ہے۔

ادارہ دین کے بعد ایک تہائی میں وصیت نافذ کر کے شرعی وارثوں میں تقسیم کر دیا جائے



جس کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، اگر وصیت نہ کی ہو تو اوارہ دین کے بعد پورا مال میراث میں تقسیم ہوگا۔

اولاد کا حصہ | جیسا کہ گذشتہ رکوع میں گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم الاقرب فالاقرب کے اصول پر ہوگی، مرنے والے کی اولاد اور اس کے والدین چونکہ اقرب ترین ہیں، اس لئے ان کو ہر حال میں میراث ملتی ہے، یہ دونوں رشتے انسان کے قریب ترین اور بلا واسطہ رشتے ہیں، دوسرے رشتے بالواسطہ ہوتے ہیں، قرآن شریف میں پہلے انہی کے حصے بیان فرمائے، اور اولاد کے حصے شروع فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

يُؤْتِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلَّذِ كَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ، یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس نے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو میراث کا ستم بھی بنادیا اور ہر ایک کا حصہ بھی مقرر کر دیا اور یہ اصول معلوم ہو گیا کہ جب مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصے میں جو مال آئے گا اس طرح تقسیم ہوگا کہ ہر لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دو گنا مل جائے، مثلاً کسی نے ایک لڑکا دو لڑکیاں چھوڑے تو مال کے چار حصے کر کے چل لڑکے کو اور چل لڑکی ہر لڑکی کو دیدیا جائے گا۔

لڑکیوں کو حصہ دینے | قرآن مجید نے لڑکیوں کو حصہ دلانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ لڑکیوں کے حصہ کو اصل قرار دے کر اس کے اعتبار سے لڑکوں کا حصہ بتلایا، اور بجائے

فَالْأُنثَيَيْنِ مِثْلُ حَظِّ الذَّكَرِ (دو لڑکیوں کو ایک لڑکے کے حصہ کے بقدر)، فرمانے کے لفظ گورِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (لڑکے کو دو لڑکیوں کے حصہ کے بقدر) کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔

جو لوگ بیٹوں کو حصہ نہیں دیتے، اور وہ یہ سمجھ کر بادلِ ناخوشہ شرمِ شرعی معاف کر دیتی ہیں کہ ملنے والا تو ہے ہی نہیں تو کیوں بھائیوں سے بڑائی لیں ایسی معافی شرعاً معافی نہیں ہوتی، ان کا حق بھائیوں کے ذمہ واجب رہتا ہے، یہ میراث دہانے والے سخت گنہگار ہیں، ان میں بعض بچپانے ناپا لگ بھی ہوتی ہیں، ان کو حصہ نہ دینا دوہرا گناہ ہے، ایک گناہ وارث شرعی کے حصہ کو دہانے کا اور دوسرا یتیم کے مال کو کھانے کا۔

اس کے بعد مزید تشریح فرماتے ہوئے لڑکیوں کا حصہ یوں بیان فرمایا:

فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثُ مَا تَرَكَ، یعنی اگر زینہ اولاد نہ ہوں اور صرف لڑکیاں ہوں اور ایک سے زائد ہوں تو ان کو مالِ موروث سے دو تہائی مال ملے گا، جس میں سب لڑکیاں برابر کی شریک ہوں گی، اور باقی ایک تہائی دوسرے ورثاء مثلاً میت کے والدین، بیوی یا شوہر وغیرہ میراث کے حق داروں کو ملے گا، دو لڑکیاں اور دو سے زائد سب



دو تہائی میں شریک ہوں گی۔

دو لڑکیوں سے زائد کا حکم تو قرآن کریم کی آیت میں صراحتاً مذکور ہے، جیسا کہ فوق الثنتین کے الفاظ اس پر دلالت کر رہے ہیں، اور لڑکیاں دو ہوں تو اس کا حکم بھی وہی ہے جو دو سے زیادہ کا حکم ہے، اس کا ثبوت حدیث شریف میں مذکور ہے،

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى جِئْنَا مَرْءَةً قِيْلَ لَهَا لَصَارِي الْأَسْوَافِ فَجَاءَتْ الْمَرْءَةُ بِابْنَتَيْنِ لَهَا فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَاتَانِ بِنَتَا ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ قُتِلَ مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ وَقَدْ اسْتَفَاءَ عَنْهُمَا مَا لَهُمَا وَمِثْرَاهُمَا كُلُّهُ وَلَمْ يَدَعْ مَالًا إِلَّا أَخَذَا فَمَا تَرَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَوْلَ اللَّهِ لَا تُنْكَحَانِ أَبَدًا إِلَّا لَهُمَا مَالٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْضِي اللَّهُ فِي ذَلِكَ وَقَالَ تَزَلَّتْ سُورَةُ النِّسَاءِ يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ" الْآيَةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْعُوا لِي الْمَرْءَةَ وَصَاحِبَتَهَا، فَقَالَ لِعَوْنِهَا اعْطِيَهُمَا الثُّلُثَيْنِ وَاعْطِيَا مَتْنَهُمَا الثَّمَنُ وَمَا بَقِيَ فَلَكَ، (ابوداؤد كتاب الفرائض وبعناه في الترمذي ابواب الفرائض)

ترجمہ

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلے، اتنے میں ہمارا گدرا سواف میں ایک انصاری عورت پر ہوا، وہ عورت اپنی دو لڑکیوں کو لے کر آئی اور کہنے لگی، کہ اے اللہ کے رسول! یہ دونوں لڑکیاں ثابت بن قیس (میرے شوہر) کی ہیں، جو آپ کے ساتھ غزوہ احد میں شہید ہو گئے ہیں، ان لڑکیوں کا چچا ان کے پوسے مال اور ان کی پوری میراث پر خود قابض ہو گیا ہے، اور ان کے واسطے کچھ باقی نہیں رکھا، اس معاملہ میں آپ کیا فرماتے ہیں، خدا کی قسم ان لڑکیوں کے پاس مال نہ ہوگا تو کوئی شخص ان کو نکاح میں رکھنے کے لئے بھی تیار نہ ہوگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ منکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تیرے حق میں فیصلہ فرما دے گا، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پھر جب سورۃ نساء کی یہ آیت "يُؤْصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ" نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عورت اور اس کے دیور کو لڑکیوں کا وہ چچا جس نے

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى جِئْنَا مَرْءَةً قِيْلَ لَهَا لَصَارِي الْأَسْوَافِ فَجَاءَتْ الْمَرْءَةُ بِابْنَتَيْنِ لَهَا فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَاتَانِ بِنَتَا ثَابِتِ بْنِ قَيْسٍ قُتِلَ مَعَكَ يَوْمَ أُحُدٍ وَقَدْ اسْتَفَاءَ عَنْهُمَا مَا لَهُمَا وَمِثْرَاهُمَا كُلُّهُ وَلَمْ يَدَعْ مَالًا إِلَّا أَخَذَا فَمَا تَرَى يَا رَسُولَ اللَّهِ قَوْلَ اللَّهِ لَا تُنْكَحَانِ أَبَدًا إِلَّا لَهُمَا مَالٌ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَدْعُوا لِي الْمَرْءَةَ وَصَاحِبَتَهَا، فَقَالَ لِعَوْنِهَا اعْطِيَهُمَا الثُّلُثَيْنِ وَاعْطِيَا مَتْنَهُمَا الثَّمَنُ وَمَا بَقِيَ فَلَكَ، (ابوداؤد كتاب الفرائض وبعناه في الترمذي ابواب الفرائض)



سارے مال پر قبضہ کر لیا تھا) بلاؤ، آپ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی حصہ دو، ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے وہ تم خود رکھ لو۔ اس حدیث میں جس مسئلہ کا ذکر ہے اس میں آپ نے دو لڑکیوں کو بھی دو تہائی حصہ دے دیا جس طرح دوسے زیادہ کا یہی حکم خود قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں منصوص ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَالَّذِينَ كَانَتْ لَهُمْ أَزْوَاجٌ فَلَهُمَا النِّصْفُ یعنی اگر مرنے والے نے اپنی اولاد میں صرف ایک لڑکی چھوڑی اور اولاد میں نہ بالکل نہ ہو، تو اس کو اس کے والد یا والدہ کے چھوڑے ہوئے مال موروث کا آٹھواں حصہ ملے گا، باقی دوسرے ورثہ لے لیں گے۔ اس کے بعد خداوند قدوس نے مرنے والے کے ماں باپ کا حصہ بتایا، اور تین والدین کا حصہ

والدین کا حصہ حالتیں ذکر فرمائیں۔

اول یہ کہ والدین دونوں زندہ چھوڑے ہوں اور اولاد بھی چھوڑی، خواہ ایک ہی لڑکا یا لڑکی ہو، اس صورت میں ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصہ ملے گا، دیگر ورثہ اولاد اور بیوی یا شوہر لے لیں گے اور بعض حالات میں کچھ بچا ہوا پھر والد کو پہنچ جاتا ہے، جو اس کے لئے مقررہ چھٹے حصہ کے علاوہ ہوتا ہے علم فرائض کی اصطلاح میں اس طرح کے استحقاق کو استحقاق تحصیل کہتے ہیں۔

دوسری حالت یہ بتائی کہ مرنے والے کی اولاد اور بھائی بہن نہ ہوں، اور ماں باپ موجود ہوں اس صورت میں مال موروث کا تہائی ۳/۱ ماں کو اور باقی دو تہائی والد کو مل جائیں گے، یہ اس صورت کا حکم ہے جب کہ مرنے والے کے ورثہ میں اس کا شوہر یا اس کی بیوی بھی موجود نہ ہو، اگر شوہر یا بیوی موجود ہے تو سب سے پہلے ان کا حصہ الگ کیا جاوے گا اور باقی میں ۳/۱ والدہ کو اور ۳/۲ والد کو مل جائے گا۔

تیسری حالت یہ ہے کہ مرنے والے کی اولاد تو نہ ہوں لیکن بھائی بہن ہوں جن کی تعداد دو ہو، خواہ دو بھائی ہوں، خواہ دو بہنیں ہوں، یا دو سے زیادہ ہوں، اس صورت میں ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور اگر او کوئی وارث نہیں تو بقیہ ۵ حصہ باپ کو مل جائیں گے، بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی سے ماں کا حصہ کم ہو گیا، لیکن بھائی بہن کو بھی کچھ نہ ملے گا، کیونکہ باپ بہ نسبت بھائی بہن کے اقرب ہے، جو بچے گا باپ کو مل جائے گا، اس صورت میں ماں کا حصہ ۱/۲ کے بجائے ۱/۳ ہو گیا، فرائض کی اصطلاح میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں، اور یہ بہن بھائی جن کی وجہ سے والدین کا حصہ کٹ رہا ہے، خواہ حقیقی ہوں خواہ باپ شریک ہوں، خواہ ماں شریک ہوں ہر صورت میں ان کے وجود سے ماں کا حصہ گھٹ جائے گا، بشرطیکہ ایک سے زیادہ ہوں۔

حصص مقررہ بیان کرنے کے بعد فرمایا: الْبَاءُ وَكُمُ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَلَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ



اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةٌ مِّنَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا یعنی اولاد اور ماں باپ کے یہ حصے خداوند عالم نے اپنے طور پر مقرر کر دیئے ہیں، اور اللہ کو سب کچھ معلوم ہے، اور وہ حکیم ہے جو حصے مقرر کئے گئے ہیں ان میں بڑی حکمتیں ہیں، اگر تمہاری رائے پر تقسیم میراث کا قصہ رکھا جاتا تو مدار تقسیم تم لوگ نفع رساں ہونے کو بناتے، لیکن نفع رساں کون ہوگا؟ اور سب سے زیادہ نفع کس سے پہنچ سکتا ہے؟ اس کا یقینی علم حاصل کرنا تمہارے لئے مشکل تھا، اس لئے بجائے نافع ہونے کے اقربیت کو مدار حکم بنایا۔

قرآن کریم کی اس آیت نے بتا دیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے، اس میں کسی کو رائے ذنی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں، اور تمہیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے، تمہارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے، اور جو کچھ حکم دہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمہیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہو سکتی، اگر تقسیم میراث کا مسئلہ خود تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا، تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کر پاتے، اور میراث کی تقسیم میں بے اعتدالی ہو جاتی، اللہ جل شانہ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو، اور میت کا سرمایہ منصفانہ طریقہ سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ

اور تمہارا حصہ آدھا مال جو کہ چھوڑ دے تمہاری عورتیں اگر وہ ہوان کے اولاد

فَاِنْ كَانَ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمْ الرَّبْعُ مِمَّا تَرَكَنَّ مِنْ اٰبَعْدٍ وَصِيَّةٍ

اور اگر ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے جو تمہاری ہے اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد وصیت کے

يُوصِيْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرَّبْعُ مِمَّا تَرَكَتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ

جو کہ گئیں یا بعد قرض کے اور عورتوں کے لئے جو تمہاری مال ہے اس میں سے جو چھوڑ دے اگر نہ ہو تمہارے

لَكُمْ وَلَدٌ اِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّلُثُ مِمَّا تَرَكَتُمْ

اولاد اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو کچھ کہ تم نے چھوڑا

مِّنْ اٰبَعْدٍ وَصِيَّةٍ يُوصِيْنَ بِهَا اَوْ دَيْنٍ

بعد وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے



## خُلاصۂ تفسیر

**رابط آیات** | یہاں تک اُن مستحقین میراث کے حصص کا بیان تھا جن کا میت کے ساتھ نسب اور ولادت کا رشتہ تھا، مذکورہ آیت میں بعض دوسرے مستحقین کا ذکر ہے، اور میت سے ان کا رشتہ نسب کا نہیں، بلکہ ازدواج کا ہے، جس کا بیان یہ ہے:

اور تم کو آدمی ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جاویں، اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ واحد نہ کثیر) اور اگر ان بیبیوں کے کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو اس صورت میں تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا یہ کل دو صورتیں ہوں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے ورثاء کو ملے گا لیکن ہر صورت میں یہ میراث وصیت کے قدر مال نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جائیں یا دین (اگر ہو تو اس کے نکالنے کے بعد ملے گی) اور بیبیوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جو تم چھوڑ جاؤ (خواہ وہ ایک ہو یا کئی ہوں تو وہ چوتھائی سب میں برابر بٹ جاوے گا) اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو (نہ مذکر نہ مؤنث نہ واحد نہ کثیر) اور اگر تمہارے کچھ اولاد ہو (خواہ ان بیبیوں سے یا اور عورت سے) تو اس صورت میں (ان کو) (خواہ وہ ایک ہو یا کئی) تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا (یہ بھی دو صورتیں ہیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے ورثاء کو ملے گا، لیکن یہ میراث وصیت کے قدر مال نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین (اگر ہو تو اس کے بھی نکالنے کے بعد ملے گی)۔

## معارف مسائل

**شوہر اور بیوی کا حصہ** | مندرجہ بالا سطور میں شوہر اور بیوی کے حصوں کی تعبیر کی گئی ہے، اور پہلے شوہر کا حصہ بتایا، شاید اس کو مقدم کرنے کی وجہ یہ ہو کہ اس کی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے، کیونکہ عورت کی وفات کے بعد شوہر دوسرے گھر کا آدمی ہو جاتا ہے، اگر اپنے میکہ میں عورت کا انتقال ہوا ہو اور اس کا مال دیں ہو تو شوہر کا حصہ دینے سے گریز کیا جاتا ہے، گویا اس زیادتی کا سد باب کرنے کے لئے شوہر کا حصہ پہلے بیان فرمایا، اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ فوت ہونے والی عورت نے اگر کوئی بھی اولاد نہ چھوڑی ہو تو شوہر کو بعد اواب دین والی عورت کے مرحومہ کے کُل کا نصف ملے گا، اور باقی نصف میں دوسرے ورثاء مثلاً مرحومہ کے والدین، بھائی، بہن، حسب قاعدہ حصہ پائیں گے۔ اور اگر مرنے والی نے اولاد چھوڑی ہو، ایک ہو یا دو ہوں، یا اس سے زائد ہوں، لڑکا



ہو یا لڑکی ہو، اس شوہر سے ہو جس کو چھوڑ کر ذات پائی ہے، یا اس سے پہلے کسی اور شوہر سے ہو، تو اس صورت میں موجودہ شوہر کو مرحومہ کے مال سے ادا، دین و انفاذ وصیت کے بعد کل مال کا چوتھائی ملے گا، اور بقیہ عین چوتھائی حصے دوسرے ورثاء کو ملیں گے۔ یہ شوہر کے حصہ کی تفصیل تھی۔

اور اگر میاں بیوی میں سے مرنے والا شوہر ہے، اور اس نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو ادا، دین و انفاذ وصیت کے بعد بیوی کو مرنے والے کے کل مال کا چوتھائی ملے گا، اور اگر اس نے کوئی اولاد چھوڑی ہے، خواہ اس بیوی سے ہو یا کسی دوسری بیوی سے تو اس صورت میں بعد ادا، دین و وصیت کے آٹھواں حصہ ملے گا، اگر بیوی ایک سے زائد ہے تو بھی مذکورہ تفصیل کے مطابق ایک بیوی کے حصہ میں جتنی میراث آئے گی وہ ان سب بیویوں میں تقسیم کی جائے گی، یعنی ہر عورت کو چوتھائی اور آٹھواں حصہ نہیں ملے گا، بلکہ سب بیویاں چوتھائی اور آٹھویں حصہ میں شریک ہوں گی، اور ان دونوں حالتوں میں شوہر بیوی کو ملنے کے بعد جو کچھ ترکہ بچے گا وہ ان کے دوسرے ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

**مسئلہ:** یہ دیکھنا چاہئے کہ بیوی کا مہر ادا ہو گیا ہے یا نہیں، اگر بیوی کا مہر ادا نہ کیا ہو تو دوسرے قرضوں کی طرح اولاً کل مال سے دین مہر ادا ہو گا، اس کے بعد ترکہ تقسیم ہو گا، اور مہر لینے کے بعد عورت اپنی میراث کا حصہ بھی میراث میں حصہ دار ہونے کی وجہ سے وصول کرے گی، اور اگر میت کا مال اتنا ہے کہ مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا تو بھی دوسرے دیون کی طرح پورا مال دین مہر میں عورت کو دیدیا جائے گا، اور کسی وارث کو کچھ حصہ نہ ملے گا۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتُ

اور اگر وہ مرد کہ جس کی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا عورت ہو ایسی ہی اور اس میت کے ایک بھائی ہے یا بہن ہے

فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الشُّدُّ مِمَّا كَانُوا أَكْثَرُ مِنْ ذَلِكَ

تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے، اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو

فَهُمْ شَرُكَاءُ فِي الثَّلَاثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ

سب شریک ہیں ایک تہائی میں بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا

دَيْنٍ غَيْرِ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝۱۴

قرض جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو، یہ حکم ہے اللہ کا اور اللہ ہے سب کچھ جاننے والا نحل کر نیوالا



## خلاصہ تفسیر

**رابطہ آیت** | نسب اور ازدواج سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں ان کے مختصر حقوق بیان کرنے کے بعد اب ایسے میت کے ترکہ کا حکم بیان کیا جا رہا ہے جس نے اولاد یا والدین نہ چھوڑے ہوں اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت، ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں (یعنی باپ داؤد) اور نہ فروع ہوں (یعنی اولاد اور بیٹے کی اولاد) اور اس (میت) کے ایک بھائی یا ایک بہن (اخویاتی) ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے) زیادہ ہوں (مثلاً دو ہوں یا اور زیادہ) تو وہ سب ہتائی میں (برابر) شریک ہوں گے اور ان میں مذکور دو نمونہ کا برابر حصہ ہے اور بقیہ میراث دوسرے ورثہ کو، اور اگر کوئی اور نہ ہو تو پھر انہی کو ہی جائے گی، یہ دو صورتیں ہوتیں، اور دونوں صورتوں میں یہ میراث (وصیت کے قدر مال) نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جاوے (یا اگر دین (ہو تو اس کے بھی نکالنے کے بعد) ملے گی) بشرطیکہ وصیت کرنے والا (کسی وارث) کو ضرر نہ پہنچائے (نہ ظاہر نہ ارادۂ ظاہر) یہ کہ مثلاً ثلث سے زیادہ وصیت کرے، تو وہ وصیت میراث پر مقدم نہ ہوگی، اور ارادۂ یہ کہ رہے ثلث کے اندر، لیکن نیست یہ ہو کہ وارث کو کم ملے، یہ ظاہر نافذ ہو جاوے گی، لیکن گناہ ہو گا) یہ (جس قدر یہاں تک مذکور ہوا) حکم کیا گیا ہے خدا تعالیٰ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں کہ کون کونسا ہے کون نہیں مانتا اور نہ ماننے والوں کو جو فوراً سزا نہیں دیتے، تو وجہ یہ کہ (حکیم (بھی) ہیں۔

## معارف و مسائل

**کلامہ کی میراث** | ان سطور میں کلامہ کی میراث بیان کی گئی ہے، کلامہ کی بہت سی تعریضیں کی گئی ہیں، جو علامہ فسطوی نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کی ہیں، مشہور تعریف یہی ہے جو خلاصہ تفسیر میں مذکور ہے، کہ جس مرنے والے کے اصول اور فروع نہ ہوں وہ کلامہ ہے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ کلامہ اصل میں مصدر ہے جو کلام کے معنی میں ہے، اور کلام کے معنی ہیں تھک جانا، جو ضعف پر دلالت کرتا ہے، باپ بیٹے والی قرابت کے سوا قرابت کو کلامہ کہا گیا، اس لئے کہ وہ قرابت باپ بیٹے کی قرابت کی نسبت سے کمزور ہے۔ پھر کلامہ کا اطلاق اس مرنے والے پر بھی کیا گیا جس نے نہ اولاد چھوڑی اور نہ والد اور







ضابطہ میں ادائے دین انفاذ وصیت سے مقدم ہے، اگر تمام مال ادائے دیون میں لگ جائے تو نہ وصیت نافذ ہوگی نہ میراث چلے گی، اس رکوع میں تینوں جگہ جہاں جہاں وصیت کا ذکر آیا ہے وہاں وصیت کا ذکر دین سے پہلے کیا گیا ہے، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وصیت کا حق دین سے مقدم ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو رفع کرتے ہوئے فرمایا

”یعنی آپ حضرات یہ آیت تلاوت کرتے

ہیں ”من بعد وصیتہ توصون بہا“ اور دین

اس میں گو لفظ وصیت مقدم ہے، لیکن عملی

طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس

کو دین کے بعد رکھا ہے“

اَنْكُمْ تَقْرَءُونَ هَذِهِ الْآيَةَ

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ تَوْصُونَ بِهَا

اَوْ دِيْنٍ وَلَٰكِنْ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى بِالْاَدْيَانِ

قَبْلَ الْوَصِيَّتِ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

تاہم یہ نکتہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اگر عملاً وصیت مؤخر ہے، تو لفظاً اس کو دین سے

پہلے کیوں بیان کیا گیا، صاحب روح المعانی اس بارہ میں لکھتے ہیں:

وَقَدْ يُنَبِّهُ الْوَصِيَّةُ عَلَى الدَّيْنِ ذِكْرًا مَّعَ أَنَّ الدَّيْنَ مُقَدَّمٌ عَلَيْهَا حُكْمًا

لَا ظَهَرَ كَمَالُ الْعِنَايَةِ بِتَنْفِيذِهَا لِكُونِهَا مَطْنَةً لِلتَّفَرُّيطِ فِي أَذَائِهَا الْخِيَارِ

آیت میں دین پر وصیت کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ میراث کی طرح بغیر کسی عوض کے

ملتی ہے، اور اس میں رشتہ دار ہونا بھی ضروری نہیں، اس لئے وارثین کی جانب سے اس کو

نافذ کرنے میں کوتاہی ہونے یا دیر ہو جانے کا قومی اندیشہ تھا، اپنے مورث کا مال کسی کے پاس

جاتا ہوا دیکھنا اس کو ناگوار ہو سکتا تھا، اس لئے شانِ وصیت کا اہتمام فرماتے ہوئے دین پر

اس کو مقدم کیا گیا، پھر یہ بھی بات ہے کہ قرض کا ہر میث پر ہونا ضروری نہیں، اور اگر

زندگی میں رہا ہو تو موت تک اس کا باقی رہنا بھی ضروری نہیں، اور اگر موت کے وقت موجود

بھی چوب بھی چونکہ اس کا مطالبہ حق دار کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے ورثہ بھی انکار نہیں کر سکتے

اس وجہ سے اس میں کوتاہی کا احتمال بہت کم ہے، بخلاف وصیت کے کہ جب میث مال

چھوڑتا ہے تو اس کا یہ بھی دل چاہتا ہے کہ صدقہ جاریہ کے طور پر اپنے مال کا حصہ کسی کا خیر

میں صرف کر جائے، یہاں چونکہ اس مال میں کسی کی طرف سے مطالبہ نہیں ہوتا، اس لئے

وارثوں کی طرف سے کوتاہی کا امکان تھا، جس کا سد باب کرنے کے لئے بطور خاص ہر جگہ

وصیت کو مقدم کیا گیا۔

مسئلہ: اگر دین اور وصیت نہ ہو تو تجہیز و تکفین کے بعد بچا ہوا مکمل مال

وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا۔



**مَسْئَلہ :** وارث کے حق میں وصیت کرنا باطل ہے، اگر کسی نے اپنے لڑکے، لڑکی، شوہر یا بیوی کے لئے یا اور کسی ایسے شخص کے لئے وصیت کی جس کو میراث میں حصہ ملنے والا ہے تو اس وصیت کا کچھ اعتبار نہیں، وارثوں کو صرف میراث کا حصہ ملے گا، اس سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِرَاسِثٍ

اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق دیدیا ہے پس کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت

(مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد، ص ۲۶۵) معتبر نہیں۔

ہاں اگر دیگر وارث اجازت دیدیں تو جس وارث کے لئے وصیت کی ہے، اس کے حق میں وصیت نافذ کر کے باقی مال شرعی طریقہ پر تقسیم کیا جائے جس میں اس وارث کو بھی اپنے حصہ کی میراث ملے گی، بعض روایات حدیث میں **إِلَّا أَنْ يَتَّخِذَ الْوَرَثَةُ كَهَيْئَةِ الْيَتَامَىٰ** کا استثناء بھی مذکور ہے، (کا ذکر صاحب الہدایۃ)

**غیر مضاف کی تفسیر** | کلام کی میراث کے خاتمہ پر یہ بتانے کے بعد کہ یہ میراث وصیت اور ذین کا بعد نافذ ہوگی، لفظ **غیر مضاف** فرمایا، یہ قید اگرچہ صرف اسی جگہ مذکور ہے، لیکن اس سے پہلے جو دو جگہ وصیت اور ذین کا ذکر ہے وہاں پر بھی معتبر اور معمول یہ ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ مرنے والے کے لئے وصیت یا ذین کے ذریعہ وارثوں کو نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے، وصیت کرنے یا اپنے اوپر قرض کا فرضی اقرار کرنے میں وارثوں کو محروم کرنے کا ارادہ ہونا اور اس ارادہ پر عمل کرنا سخت ممنوع ہے، اور گناہ کبیرہ ہے۔

ذین یا وصیت کے ذریعہ ضرر پہنچانے کی کئی صورتیں ممکن ہیں، مثلاً یہ کہ قرض کا جھوٹا اقرار کر لے، کسی دوست وغیرہ کو دلانے کے لئے، یا اپنے مخصوص مال کو جو اس کا اپنا ذاتی ہے یہ ظاہر کر دے کہ فلاں شخص کی امانت ہے، تاکہ اس میں میراث نہ چلے، یا ایک ہتھالی سے نامکمال کی وصیت کرے، یا کسی شخص پر اپنا قرض ہو اور وہ وصول نہ ہوا ہو، لیکن جھوٹ یہ کہہ دے کہ اس سے قرض وصول ہو گیا، تاکہ وارثوں کو نہ مل سکے، یا مرض الوفا میں ایک ہتھالی سے زیادہ کسی کو ہبہ کر دے۔

یہ صورتیں ضرر پہنچانے کی ہیں، ہر مؤثر جو دنیا سے جا رہا ہے اُسے زندگی کے آخری لمحات میں اس طرح کے اصرار سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

مقررہ حصوں کے مطابق | میراث کے حصے بیان کرنے کے بعد اللہ پاک نے ارشاد فرمایا تقسیم کرنے کی تاکید **وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ**، یعنی جو کچھ حصے مقرر کئے گئے، اور ذین اور



وصیت کے بارے میں جو تاکید کی گئی اس سب پر عمل کرنا ہنایت ضروری ہے، اللہ پاک کی طرف سے ایک عظیم وصیت اور مہتمم بالشان حکم ہے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا، پھر مزید تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا **وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** یعنی اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے اور اس نے اپنے علم سے ہر ایک کا حال جانتے ہوئے حقے مقرر فرمائے، جو احکام مذکورہ پر عمل کرے گا اللہ کے علم سے اس کی یہ نیکی باہر نہ ہوگی، اور جو خلاف ورزی کرے گا اس کی یہ بدکرداری بھی اللہ کے علم میں آئے گی، جس کی پاداش میں اس سے مواخذہ کیا جائے گا۔

نیز جو کوئی مرنے والا دین یا وصیت کے ذریعہ سے ضرر پہنچائے گا اللہ کو اس کا بھی علم ہے، اس کے مواخذہ سے بے خوف نہ رہو، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلاف ورزی کرنے پر اس دنیا میں سزا نہ دے، اس لئے کہ وہ حلیم ہے، خلاف ورزی کرنے والے کو یہ دھوکا نہ لگنا چاہئے کہ میں بچ گیا۔

**تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يُطِيعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ يَدْخُلْهُ**

یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اس کو داخل کرے گا

**جَنَّتِ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ**

جنوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی ہے

**الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ يَتَعَدَّ**

بڑی مراد ملنی اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نکل جائے

**حُدُوْدِكَ يَدْخُلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِِيْنٌ ۝۱۴**

اس کی حدوں سے ڈالے گا اس کو آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔

## خُلاصۂ تفسیر

میراث کے مذکورہ احکام بیان کرنے کے بعد ان دو آیتوں میں ان احکام کو **رَبِطِ آيَاتٍ** ماننے اور ان پر عمل کرنے کی فضیلت اور نافرمانی کرنے کی بری عاقبت کا بیان ہے، جس سے احکام مذکورہ کی اہمیت مقصود ہے۔

یہ سب احکام مذکورہ (متعلقہ میراث یا مع احکام یتامی کے) خداوندی ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا (یعنی ان ضابطوں کی پابندی کرے گا)



اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں (فوراً) داخل کر دیں گے جن کے (مخلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جاوے گا، (یعنی پابندی کو ضروری بھی نہ سمجھے گا اور یہ حالت کفر کی ہے) اس کو دوزخ کی آگ میں داخل کریں گے، اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

## معارف مسائل

قرآن کریم کا یہ اسلوب ہے کہ احکام و عقائد کے بیان کے بعد تتمہ کے طور پر ماننے والوں کے لئے ترغیب اور ان کی فضیلت کا ذکر ہوتا ہے، اور نہ ماننے والوں کے لئے ترہیب و سزا اور ان کی مذمت مذکور ہوتی ہے۔

یہاں بھی چونکہ احکام کا ذکر تھا اس لئے آخر کی ان دو آیات میں اطاعت کرنے والوں اور نافرمانوں کے نتائج کا ذکر کر دیا گیا۔

## مجموعہ احکام میراث

مسلمان کا فر کا وارث اگرچہ میراث کی تقسیم نہی قرابت پر رکھی گئی ہے، لیکن اس میں سے بعض نہیں بن سکتا چیزیں مستثنیٰ ہیں، اول یہ کہ مورث اور وارث دو مختلف دین والے نہ ہوں لہذا مسلمان کسی کا فر کا اور کا فر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوگا، خواہ ان میں آپس میں کوئی بھی نہی رشتہ ہو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (مشکوٰۃ ص ۲۳۳)

”یعنی مسلمان کا فر کا اور کا فر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا“

یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب کہ پیدائش کے بعد ہی سے کوئی شخص مسلم یا کافر ہو، لیکن اگر کوئی شخص پہلے مسلمان تھا، پھر العیاذ باللہ اسلام سے پھر گیا اور مرتد ہو گیا، اگر ایسا شخص مر جائے یا مقتول ہو جائے، تو اس کا وہ مال جو اسلام کے زمانہ میں کسب کیا تھا، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، اور جو ارتداد کے بعد کمایا ہو وہ بیت المال میں حبیع کر دیا جائے گا۔

لیکن اگر عورت مرتد ہو گئی تو اس کا کل مال خواہ زمانہ اسلام میں حاصل ہوا ہو یا زمانہ ارتداد میں، اس کے مسلمان وارثوں کو ملے گا، لیکن خود مرتد مرد ہو یا عورت اس کو نہ کسی



مسلمان سے میراث ملے گی نہ کسی مرتد سے۔

قاتل کی میراث | اگر کوئی شخص ایسے آدمی کو قتل کرے جس کے مال میں اس کو میراث پہنچتی ہو تو یہ قاتل اس شخص کی میراث سے محروم ہوگا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **اَلْقَاتِلُ لَا يَرِثُ** (مشکوٰۃ، ص ۲۶۳) "یعنی قاتل وارث نہیں ہوگا۔" البتہ قاتل خطا کی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں (تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے)۔

پیٹ میں جو بچہ ہے | اگر کسی شخص نے اپنی کچھ اولاد چھوڑی، اور بیوی کے پیٹ میں بھی بچہ ہے، اس کی میراث | تو یہ بچہ بھی وارثوں کی فہرست میں آئے گا، لیکن چونکہ یہ بچہ چلانا دشوار ہے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، یا ایک سے زیادہ بچے ہیں، اس لئے بچہ پیدا ہونے تک تقسیم میراث ملتوی رکھنا مناسب ہوگا، اور اگر تقسیم کرنا ضروری ہی ہو تو مرد دست ایک لڑکا یا ایک لڑکی فرض کر کے دونوں کے اعتبار سے دو صورتیں فرض کی جائیں، ان دونوں صورتوں میں سے جس صورت میں ورثاء کو کم ملتا ہو وہ ان میں تقسیم کر دیا جائے، اور باقی اس حل کے لئے رکھا جائے۔

معتدہ کی میراث | جس شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی اور طلاق رجعی ہے، پھر طلاق سے رجوع اور عدت ختم ہونے سے پہلے وفات پا گیا، تو یہ عورت میراث میں حصہ پاوے گی، اس لئے کہ نکاح باقی ہے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفا میں بیوی کو طلاق دیدی، اگرچہ طلاق بائن یا مغلطہ ہی ہو، اور عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے مر گیا، تب بھی وہ عورت اس کی وارث ہوگی، اور عورت کو وارث بنانے کی وجہ سے دو عدتوں میں سے جو سب سے زیادہ دراز ہو اسی کو اختیار کیا جائے گا، جس کی مختصر شرح یہ ہے کہ:

عدت طلاق تین حیض ہے، اور عدت وفات چار مہینہ دس دن ہے، ان دونوں میں جو عدت زیادہ دنوں کی ہو اسی کو عدت قرار دیا جائے گا، تاکہ جہاں تک ممکن ہو عورت کو حصہ مل سکے۔

اور اگر کسی شخص نے مرض الوفا سے پہلے بائن یا مغلطہ طلاق دیدی اور اس کے چند دن بعد عورت کی عدت میں وہ فوت ہو گیا، تو اس صورت میں اس کو میراث میں سے حصہ نہیں ملے گا، البتہ اگر طلاق رجعی دی ہے تو وہ وارث ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی عورت نے شوہر کے مرض وفات میں خود سے خلع کر لیا تو وارث نہیں ہوگی، اگرچہ اس کا شوہر اس کی عدت کے دوران مر جائے۔



عصبات کی میراث | فرائض کے مقررہ حصے بارہ ورثہ کے لئے طے شدہ ہیں، اور ان وارثوں کو اصحاب الفروض کہا جاتا ہے، جن کی تفصیل کسی قدر اوپر گذر چکی، اگر اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو، یا اصحاب الفروض کے حصے دیدینے کے بعد کچھ مال بچ جائے تو وہ عصبہ کو دیدیا جاتا ہے، اور بعض مرتبہ ایک ہی شخص کو دونوں حیثیتوں سے مال مل جاتا ہے، بعض صورتوں میں میت کی اولاد اور میت کا والد بھی عصبہ ہو جاتے ہیں، دادا کی اولاد یعنی چچا اور باپ کی اولاد یعنی بھائی بھی عصبہ ہو جاتے ہیں۔

عصبات کی کئی قسمیں ہیں، جن کی تفصیلات فرائض کی کتابوں میں موجود ہیں، یہاں ایک مثال دکھائی جاتی ہے، مثلاً زید فوت ہو گیا، اور اس نے اپنے پیچھے چار وارث چھوڑے، بیوی، لڑکی، ماں اور چچا، تو اس کے مال کے مکمل چوبیس حصے کئے جائیں گے، جن میں سے آدھا یعنی بارہ حصے لڑکی کو، ایک حصہ سے تین حصے بیوی کو، ایک حصہ سے چار حصے ماں کو، اور بقیہ پانچ حصے جو بچے وہ عصبہ ہونے کی حیثیت سے چچا کو ملیں گے۔

مسئلہ :- عصبات اگر نہ ہوں تو اصحاب فرائض سے جو مال بچے وہ ان کے حصوں کے مطابق اپنی کو دیدیا جاتا ہے، اور اس کو علم فرائض کی اصطلاح میں زد کہتے ہیں۔ البتہ شوہر اور بیوی پر زد نہیں ہوتا، کسی حال میں ان کو مقررہ حصے سے زیادہ نہیں دیا جاتا۔  
مسئلہ :- اگر اصحاب فروض میں سے کوئی نہ ہو، اور عصبات میں بھی کوئی نہ ہو تو ذی الارحام کو میراث پہنچ جاتی ہے، ذی الارحام کی فہرست طویل ہے، نو آسے، نو آسیا، بہنوں کی اولاد، پھوپھیاں، ماتمیں، خالہ، یہ لوگ ذی الارحام کی فہرست میں آتے ہیں، اور اس مسئلہ میں تفصیل ہے، جس کا یہ محل نہیں، یہاں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر

أَرْبَعَةٌ مِّنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَامْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ

چار مرد اپنوں میں سے پھر اگر وہ گواہی دیں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک

يَتَرَفَعَنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ۝۱۵ وَالَّذِينَ

کہ اٹھالیوے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ ان کے لئے کوئی راہ اور جو

يَأْتِيَنَّكُمْ فَادَّهِنُوا لَهُم مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَأَمْسِكُوهُمْ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ

دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دہ پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کریں تو ان کا



## عَنْهَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا رَحِيمًا ①

خیال چھوڑ دو بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

## خلاصہ تفسیر

**رَبِّ آیات** | ماقبل کی آیات میں اُن بے اعتدالیوں کی اصلاح کی گئی ہے جو زمانہ جاہلیت میں یتیموں کے حق میں اور عوارس کے سلسلہ میں ہوتی تھیں، یہ لوگ عورتوں پر بھی ظلم و ستم ڈھاتے تھے، اور ان کے معاملہ میں رسوم قبیلہ میں مستلما تھے، جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے ان سے نکاح کر لیتے تھے۔

اگلی آیات میں ان معاملات کی اصلاح فرماتے ہیں، اور اگر کسی عورت سے کوئی ایسا قصور سرزد ہو جائے جو شرعاً قصور ہو اس پر تادیب کی اجازت دیتے ہیں، اور اصلاح و تادیب کا یہ مضمون بھی اگلے دو تین رکوع تک چلا گیا ہے۔

اور جو عورتیں بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تمہاری (منکوحہ) بیبیوں میں سے سو تم لوگ ان عورتوں (کے اس فعل) پر چار آدمی اپنوں میں سے (یعنی مسلمان، آزاد، عاقل، بالغ، مذکر) گواہ کر لو تاکہ ان کی گواہی پر حکام سزائے آئندہ جاری کریں) سو اگر وہ گواہی دیدیں تو انکی سزا یہ ہے کہ تم ان کو (بحکم حاکم) گھروں کے اندر (سیاستہ) مقید رکھو یہاں تک کہ (یا تو) موت ان کا خاتمہ کر دے، (اور) یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ (یعنی حکم ثانی) تجویز فرماویں (بعد میں جو حکم ثانی اس سلسلہ میں تجویز ہوا اس کا ذکر معارف و مسائل میں آ رہا ہے) اور (سزائے زنا میں کچھ زین منکوحہ کی تخصیص نہیں، بلکہ) جو ان سے دو شخص بھی وہ بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تم میں سے (یعنی بالغ عاقل مسلمانوں میں سے) تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ پھر (بعد اذیت پہنچانے کے) اگر وہ دونوں (گزمشتہ سے) توبہ کر لیں اور (آئندہ کے لئے اپنی) اصلاح کر لیں، (یعنی پھر ایسا فعل ان سے سرزد نہ ہو) تو ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کرو (کیونکہ) بلا مشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں رحمت والے ہیں (اس لئے اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا معاف کر دی، پھر تم کو بھی ان کے درپے آزار نہ ہونا چاہئے)۔

## معارف و مسائل

ان آیات میں ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں سزا تجویز کی گئی ہے جن سے فاش



یعنی زنا کا صدور ہو جائے، پہلی آیت میں فرمایا کہ جن عورتوں سے ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کے ثبوت کے لئے چار گواہ مرد طلب کئے جائیں، یعنی جن حکام کے پاس یہ معاملہ پیش کیا جائے ثبوت زنا کے لئے وہ چار گواہ طلب کریں جو شہادت کی اہلیت رکھتے ہوں، اور گواہی بھی مردوں کی ضروری ہے، اس سلسلہ میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

زنا کے گواہوں میں شریعت نے دو طرح سے سختی کی ہے، چونکہ یہ معاملہ بہت اہم ہے جس سے عزت اور عفت مجروح ہوتی ہے، اور خاندانوں کے تنگ و عار کا مسئلہ سامنے آ جاتا ہے، اولاً تو یہ شرط لگائی کہ مرد ہی گواہ ہوں، عورتوں کی گواہی کا اعتبار نہیں کیا گیا، ثانیاً چار مردوں کا ہونا ضروری قرار دیا، ظاہر ہے کہ یہ شرط بہت سخت ہے، جس کا وجود میں آنا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے یہ سختی اس لئے اختیار کی گئی کہ عورت کا شوہر یا اس کی والدہ یا بیوی بہن ذاتی پر خاش کی وجہ سے خواہ مخواہ الزام نہ لگائیں، یا دوسرے بدخواہ لوگ دشمنی کی وجہ سے الزام اور بہمت لگانے کی جرأت نہ کر سکیں، کیونکہ اگر چار افراد سے کم لوگ زنا کی گواہی دیں تو ان کی گواہی نامعتبر ہے، ایسی صورت میں مدعی اور گواہ سب جھوٹے قرار دیئے جاتے ہیں، اور ایک مسلمان پر الزام لگانے کی وجہ سے ان پر "حدّ قدّرت" جاری کر دی جاتی ہے۔

سورۃ نور میں واضح طور پر ارشاد فرمایا: **اَوْ لَا جَاءُوكَ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ** **فَاِذْ كُنْتُمْ بَيْنَ يَدَيْهِمْ قَالُوا لَا بَشَإِئِنَّآ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ** **عَلَّمَ اللّٰهُ لَهُمُ الْكُذْبَ يُنْفَخُ** (۱۳:۲۳) جس کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ چار گواہ نہ لاسکیں وہ جھوٹے ہیں۔

بعض اکابر نے چار گواہوں کی ضرورت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس معاملہ میں چونکہ دو افراد ملوث ہوتے ہیں مرد اور عورت، تو گویا کہ یہ ایک ہی معاملہ تقدیراً دو معاملوں کے حکم میں ہے، اور ہر ایک معاملہ دو گواہوں کا تقاضا کرتا ہے، لہذا اس کے لئے چار گواہ ضروری ہوں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اگر وہ دونوں توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کے تعرض مت کرو، اس کا مطلب یہ ہے کہ سزا دینے کے بعد اگر انھوں نے توبہ کر لی تو پھر انھیں ملامت مت کرو، اور مزید سزا مت دو، یہ مطلب نہیں کہ توبہ سے سزا بھی معاف ہو گئی، اس لئے کہ یہ توبہ سزا کے بعد مذکور ہے، جیسا کہ فاء کی تفریح سے ظاہر ہے، ہاں اگر توبہ نہ کی ہو تو سزا کے بعد بھی ملامت کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم کی ان دو آیتوں میں زنا کے لئے کوئی متعین حد بیان نہیں کی گئی، بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ان کو تکلیف پہنچاؤ، اور زنا کار عورتوں کو گھروں میں بند کر دو۔



تکلیف پہنچانے کا بھی کوئی خاص طریقہ نہیں بتلایا گیا، اور حکام کے صواب و ید پر اس کو چھوڑ دیا گیا، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں ایذا دینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو زبان سے عار دلائی جائے اور شرمندہ کیا جائے اور ہاتھ سے بھی جوتے وغیرہ کے ذریعہ ان کی حرمت کی جائے، حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی بطور تمثیل کے معلوم ہوتا ہے، اصل بات وہی ہے کہ یہ معاملہ حکام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

نزول کے اعتبار سے قرآن کریم کی ان دو آیتوں کی ترتیب یہ ہے شروع میں تو ان کو ایذا دینے کا حکم نازل ہوا اور اس کے بعد خاص طور سے عورتوں کے لئے یہ حکم بیان کیا گیا کہ ان کو گھر دلوں میں مجبوس رکھا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مر جائے، اس کی زندگی ہی میں آئینوالا حکم آجائے گا تو بطور حد کے اسی کو نافذ کر دیا جائے گا۔

چنانچہ بعد میں وہ سبیل بیان کر دی گئی جس کا اللہ جل شانہ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما "سبیل" کی تفسیر فرماتے ہیں "يَعْنِي الرِّجْمَ لِلذَّانِبِ وَالْجُلْدُ لِلْبَكْرِ" کہ شادی شدہ کے حق میں زنا کی حد اس کو سنگسار کر دینا ہے اور غیر شادی شدہ کے لئے اس کو کوڑے مارنا (بخاری، کتاب التفسیر، ص ۶۵۷)۔

مرفوع احادیث میں بھی اس "سبیل" کا بیان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وضاحت کے ساتھ ثابت ہے، اور شادی شدہ، غیر شادی شدہ ہر ایک کے لئے الگ الگ حکم بیان کیا گیا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ قبیلہ ازڈ کی ایک عورت پر زنا کی حد جاری فرمائی تھی، اور یہ دونوں چونکہ شادی شدہ تھے، اس لئے ان کو سنگسار کر دیا گیا تھا، نیز ایک یہودی کو بھی زنا کی وجہ سے رجم کیا گیا تھا، اور اس کے حق میں یہ فیصلہ توراۃ کے حکم پر کیا گیا تھا۔

غیر شادی شدہ کا حکم خود قرآن کریم کی سورۃ نور میں مذکور ہے،

الذَّانِبَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةٍ	زنا کار عورت اور زنا کار مرد میں ہر ایک کو سو کوڑے مارو (۲۴: ۱۳)
---	---

شروع میں رجم کے حکم کے لئے قرآن کریم کی آیت بھی نازل کی گئی تھی، لیکن بعد میں اس کی تلاوت منسوخ کر دی گئی، البتہ حکم باقی رکھا گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ بَعَثَ مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ فَكَانَ	اللہ تعالیٰ نے محمد علیہ السلام کو نبی برحق بنا کر بھیجا اور ان پر کتاب بھی نازل کر دی
--	---



مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى آيَةً  
الرَّجْمِ رَجَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَجَمْنَا  
بَعْدَهُ وَالرَّجْمُ فِي كِتَابِ اللَّهِ  
حَقٌّ عَلَى مَنْ رَزَى إِذَا أَحْصَيْنَ  
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ الْخ

(بخاری مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۰۹)

جو کچھ وحی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی،  
اس میں رجم کی آیت بھی تھی، رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی  
ان کے بعد رجم کیا، رجم کا حکم اس شخص کے  
لئے ثابت ہے جو زنا کرے اور وہ فاسق  
ہو، خواہ مرد ہو یا عورت۔

خلاصہ یہ کہ ان آیات میں جو جس فی البیوت اور ایذا کا حکم ہے وہ شرعی حد  
نازل ہونے پر منسوخ ہو گیا، اور اب حد زنا تو کوڑے یا رجم پر عمل کرنا لازم ہو گا، مزید تفصیل  
انشاء اللہ تعالیٰ سورۃ نور کی تفسیر میں بیان ہوگی۔

غیر فطری طریقہ سے | قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ  
قضاء شہوت کا حکم | میرے نزدیک "الَّذَٰنِ یَاْتِیَانِہَا" کا مصداق وہ لوگ ہیں جو غیر فطری

طریقہ پر قضاء شہوت کرتے ہیں، یعنی مرد استلذاذ بالمثل کے مرتکب ہوتے ہیں۔  
قاضی صاحب کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اسی قول کو لیا ہے، الفاظ قرآن مجید

میں چونکہ لفظ "الَّذَٰنِ یَاْتِیَانِہَا" موصول اور صلہ دونوں مذکر کے الفاظ ہیں، اس لئے ان  
حضرات کا یہ قول بعید نہیں ہے، گو جن حضرات نے زانی اور زانیہ مراد لیا ہے، انھوں نے  
بطور تغلیب مذکر کا یہ صیغہ زانیہ کے لئے بھی شامل رکھا ہے، تاہم موقع کی مناسبت سے  
استلذاذ بالمثل کی حرمت و شدت اور اس کی جزاء و تعزیر کا ذکر اس جگہ بے جا نہ ہو گا۔  
احادیث و آثار سے اس سلسلہ میں جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس میں سے بطور نمونہ کچھ نقل

کیا جاتا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ  
أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ قَالَ لَعَنَ اللَّهُ سَبْعَةً  
مِنْ خَلْقِهِ مِنْ قَوْمٍ سَبَعٌ مِنْهُمْ  
وَرَدَّ اللَّعْنَةَ عَلَى وَاحِدٍ مِنْهُمْ  
ثَلَاثًا وَلَعَنَ كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ  
لَعْنَةً تُكْفِيهِ قَالِ مَلْعُونٌ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت  
ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے  
سات قسم کے لوگوں پر سات آسمانوں  
کے اوپر سے لعنت بھیجی ہے، اور ان  
سات میں سے ایک پر تین دفعہ لعنت  
بھیجی ہے اور باقی پر ایک دفعہ، فرمایا



مَنْ عَمِلَ عَمَلٌ قَوْمِ لُوطٍ، مَلْعُونٌ  
مَنْ عَمِلَ عَمَلٌ قَوْمِ لُوطٍ، مَلْعُونٌ  
مَنْ عَمِلَ عَمَلٌ قَوْمِ لُوطٍ الْحَدِّ  
(الترغیب والترہیب)

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ  
عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
قَالَ أَرْبَعَةٌ يَصْبَحُونَ فِي غَضَبِ  
اللَّهِ وَيَمُتُونَ فِي سَخَطِ اللَّهِ  
قُلْتُ مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ  
الْمُتَشَبِّهُونَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ  
وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ  
وَالَّذِي يَأْتِي الْبَهِيمَةَ وَالَّذِي  
يَأْتِي الرِّجَالَ (الترغیب والترہیب)

ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے  
ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل کرتا ہے  
ملعون ہے وہ شخص جو قوم لوط والا عمل  
کرتا ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت  
ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا کہ چار آدمی صبح کے وقت اللہ جل  
جلتہ کے غضب میں ہوتے ہیں، اور شام کو بھی  
اللہ جل شانہ ان سے ناراض ہوتے ہیں  
میں نے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے  
فرمایا وہ مرد جو عورتوں کی طرح بنتے ہیں  
اور وہ عورتیں جو مردوں کی طرح بنتی ہیں  
اور وہ شخص جو چوپایہ کے ساتھ غیر فطری

حرکت کرتا ہے اور وہ مرد جو مرد سے قصا ر شہوت کرتا ہے

وَعَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا  
قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَسَلَّمَ مَنْ وَجَدَ ثَمُوهَ يَعْمَلُ  
عَمَلِ قَوْمِ لُوطٍ فَأَقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَ  
الْمَفْعُولَ بِهِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے  
روایت ہے، فرمایا، رسول اللہ صلی  
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کو تم قوم  
لوط کی طرح غیر فطری حرکت کرتا ہوا  
دیکھ لو تو فاعل اور مفعول دونوں کو

مار ڈالو

(الترغیب والترہیب)

حافظ زکی الدین نے ترغیب و ترہیب میں لکھا ہے کہ چار خلفاء حضرت ابوبکر صدیق  
حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ اور ہشام بن عبدالملک نے اپنے زمانوں میں  
غیر فطری حرکت والوں کو آگ میں جلا ڈالا تھا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے محمد بن المنکدر کی روایت سے ایک واقعہ بھی لکھا ہے  
کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں عرب  
کے ایک علاقہ میں ایک مرد ہے جس کے ساتھ عورت والا کام کیا جاتا ہے۔  
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں صحابہ کرام کو جمع کیا، اور ان میں حضرت علیؓ



بھی تشریف لائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کا ارتکاب سوائے ایک قوم کے کسی نے نہیں کیا، اور اللہ جل شانہ نے اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ آپ سب کو معلوم ہے، میری رائے ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا جائے، دوسرے صحابہ کرامؓ نے بھی اس پر اتفاق کر لیا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے آگ میں جلا دینے کا حکم دیدیا۔

مذکورہ روایات میں قوم نوط کے عمل کا حوالہ بار بار آیا ہے، حضرت نوط علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم کفر و شرک کے علاوہ اس بدترین اور غیر فطری حرکت کی بھی عادی تھی، اور جب حضرت نوط علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا ان پر اثر نہ ہوا تو اللہ جل شانہ کے حکم سے فرشتوں نے اس قوم کی بستیوں کو زمین سے اٹھا لیا، اور اوندھا کر کے زمین پر پھینک دیا، جس کا ذکر سورۃ اعراف میں آئے گا، انشاء اللہ۔

مندرجہ بالا روایات استلذاذ بالجنس سے متعلق تھیں، روایات میں عورتوں کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے پر بھی شدید ترین وعیدیں آئی ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ جل شانہ اس مرد کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو مرد یا عورت کیساتھ غیر فطری فعل کرے۔  
 خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ جل شانہ حق بیان کرنے میں شرم نہیں کرتے، یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائے، (پھر

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَنْظُرُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ إِلَى رَجُلٍ أَوْ امْرَأَةٍ فِي دُبْرِهَا (الترغيب والترهيب)  
 عَنْ خَزِيمَةَ بِنْتِ ثَابِتٍ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْخَوِّ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ لَا تَأْتُوا النِّسَاءَ فِي أَدْبَارِهِنَّ (الترغيب والترهيب)

فرمایا) عورتوں کے پاس غیر فطری طریقہ سے مت آیا کرو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے وہ شخص ملعون ہے جو غیر فطری طریقہ سے بیوی کے ساتھ جماع کرتا ہے۔  
 حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے روایت ہے کہ

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَلْعُونٌ مَنْ أَتَى امْرَأَةً فِي دُبْرِهَا (الترغيب والترهيب)  
 وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ



قَالَ مَنْ أَنَّىٰ خَافُضًا أَوْ امْرُءَةً  
فِي دُبُرِهَا أَوْ كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ فَقَدْ  
كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
جو مرد حیض کی حالت میں بیوی کے ساتھ  
جماع کرتا ہے یا غیر فطری طریقہ سے اس  
کے ساتھ جماع کرتا ہے، یا کسی کا ہن کے

پاس جاتا ہے اور غیب سے متعلق اس کی خبر کی تصدیق کرتا ہے، تو ایسے لوگ اس دین کے  
منکر ہو گئے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

اس قبیلہ فعل کے لئے کسی معین حد کے معتر کرنے میں تو فقہاء کا اختلاف ہے جس کی  
تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، تاہم اس کے لئے شدید سے شدید سزائیں منقول ہیں مثلاً  
آگ میں جلا دینا، دیوار گرا کر کھل دینا، اونچی جگہ سے پھینک کر سنگسار کر دینا، تلوار سے قتل کر دینا  
وغیرہ۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو ان کی ہے جو کرتے ہیں بُرا کام جہالت سے پھر

يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ

توبہ کرتے ہیں جلدی سے تو ان کو اللہ معاف کر دیتا ہے اور اللہ سب

اللَّهُ عَلَيْهِمُ أَحْكِمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ

کچھ جاننے والا ہے حکمت والا اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں بُرے

السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا أَحْضَرَ أَحَدُهُمُ الْمَوْتَ قَالَ إِنِّي تُبْتُ

کام یہاں تک کہ جب سامنے آ جاوے ان میں سے کسی کے موت تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں

الْثَّنَّ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كَفَارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا

اب اور نہ ایسوں کی توبہ جو کہ مرتے ہیں حالت کفر میں ان کے لئے تو ہم نے تیار کیا

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ہے عذاب دردناک۔

رابطہ آیات | ماقبل کی آیت میں توبہ کا ذکر آیا تھا، اب ان دو آیتوں میں قبول توبہ کی شرائط  
اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کی صورتیں بتلاتے ہیں۔



## خلاصہ تفسیر

توبہ جس کا قبول کرنا حسب وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو اپنی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ (صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو) کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں (یعنی قبل حضور موت جس کے معنی آگے آتے ہیں) توبہ کر لیتے ہیں، سو ایسوں پر تو خدا تعالیٰ (قبول توبہ کے ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول کر لیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں (کہ کس نے دل سے توبہ کی) حکمت والے ہیں (کہ دل سے توبہ نہ کرنے والے کو نصیحت نہیں کرتے) اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو (برابر) گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی کھڑی ہوئی (حضور موت) کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں، تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں (پس نہ تو ایسوں کی توبہ قبول) اور نہ ان لوگوں کی (توبہ یعنی ایمان لانا ایسے وقت کا مقبول ہے) جن کو حالت کفر پر موت آجاتی ہے، ان (کافر) لوگوں کے لئے ہم نے ایک دوزخ (یعنی عقوبت دوزخ) تیار کر رکھی ہے۔

## معارف و مسائل

کیا قصد و خستہ سے یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں لفظ **بِجَهَالَةٍ** کا وارد ہوا ہے اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ انجانی اور نادانی سے گناہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی، جان بوجھ کر کرے تو توبہ قبول نہیں ہوگی، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے جو تفسیر اس آیت کی بیان فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ **جہالۃ** سے اسی جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ اس کو گناہ کے گناہ ہونے کی خبر نہ ہو، یا گناہ کا قصد و ارادہ نہ ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کو گناہ کے انجام بد اور آخری عذاب غفلت اس گناہ پر اقدام کا سبب ہو گئی، اگرچہ گناہ کو گناہ جانتا ہو، اور اس کا قصد و ارادہ بھی کیا ہو۔

دوسرے الفاظ میں جہالت کا لفظ اس جگہ حماقت و بیوقوفی کے معنی میں ہے، جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں مذکور ہوا ہے، اس کی نظیر سورہ یوسف میں ہے: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا تھا: **هَلْ عِلْمُكُمْ مَا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ** (۱۲: ۸۹) اس میں بھائیوں کو جاہل کہا گیا ہے، حالانکہ انہوں نے جو کام کیا وہ کسی خطا یا نسیان سے نہیں بلکہ قصد و ارادہ سے جان بوجھ کر کیا تھا، مگر اس فعل کے انجام سے غفلت کے سبب ان کو جاہل کہا گیا ہے۔

ابو العالیہ اور قتادہ نے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر متفق تھے کہ محل



ذَنْبٍ أَصَابَهُ عَبْدٌ فَهُوَ جَهَالَةٌ عَمْدًا كَانَ أَوْ غَيْرَهُ" یعنی بندہ جو گناہ کرتا ہے خواہ بلا قصد ہو یا بالقصد بہر حال جہالت ہے۔

امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا: كُلُّ عَامِلٍ بِتَعَصُّبِهِ اللَّهُ فَمَنْ جَاهِلٌ حِينَ عَمَلِهِا، یعنی جو شخص کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے وہ یہ کام کرتے ہوئے جاہل ہی ہے۔ اگرچہ صورت میں بڑا عالم اور باخبر ہو (ابن کثیر)

اور ابو حیانؒ نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے حدیث میں ارشاد ہے: لَا يَزْنِي الزَّانِي تَوَهُؤًا مِّنِّي، یعنی زنا کرنے والا مومن ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا، مراد یہ ہے کہ جس وقت وہ اس فعل بد میں مبتلا ہوا ہے اس وقت وہ ایمانی تقاضہ سے دور جا پڑا۔ اسی لئے حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ: أُمُورُ الدُّنْيَا كُلُّهَا جَهَالَةٌ، یعنی دنیا کے وہ سارے کام جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اطاعت سے خارج ہوں سب کے سب جہالت ہیں۔ اور وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا تھوڑی دیر کی لذت کو ہمیشہ باقی رہنے والی لذت پر ترجیح دے رہا ہے، اور جو اس تھوڑی دیر کی لذت کے بدلہ میں ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب شدید خریدے وہ عاقل نہیں کہا جاسکتا، اس کو ہر شخص جاہل ہی کہے گا، اگرچہ وہ اپنے فعل بد کو جانتا ہو، اور اس کا قصد و ارادہ بھی کر رہا ہو۔

**خُلاصہ** یہ ہے کہ انسان کوئی گناہ قصداً کرے یا خطاءً دونوں حالت میں گناہ جہالت ہی سے ہوتا ہے، اسی لئے صحابہؓ و تابعینؒ اور تمام اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہو اس کی بھی توبہ قبول ہو سکتی ہے (بحر محیط)

آیت مذکورہ میں ایک بات قابل غور یہ ہے کہ اس میں قبولِ توبہ کے لئے یہ شرط بتلائی ہے کہ قریب زمانہ میں ہی توبہ کر لے، توبہ کرنے میں دیر نہ کرے، اس میں قریب کا کیا مطلب ہے، اور کتنا زمانہ قریب میں داخل ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر ایک حدیث میں خود اس طرح بیان فرمائی ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغْرَغْ - حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ اُس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس پر موت اور نزعِ روح کا غرغہ طاری نہ ہو جائے۔

اور محدث ابن مردودیؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو بندہ مومن موت سے ایک مہینہ پہلے اپنے گناہ سے توبہ کرے، یا ایک دن یا ایک گھڑی پہلے توبہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ



قبول فرمائیں گے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ سچی توبہ کی گئی ہو (ابن کثیر)  
خلاصہ یہ کہ میں قَرِيب کی تفسیر جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی،  
اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پوری عمر کا زمانہ قریب ہی میں داخل ہے، موت سے پہلے پہلے  
جو توبہ کر لی جائے قبول ہوگی، البتہ غرغرة موت کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔

اس کی توضیح جو حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن میں بیان فرمائی  
ہے کہ موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں، ایک تو یاس و ناامیدی کی جب کہ انسان ہر دوا  
دندہ بیکر عاجز ہو کر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالت یاس بالیاء سے تعبیر  
کیا گیا ہے، دوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزع روح شروع ہو جائے اور غرغرة کا  
وقت آجائے، اس حالت کو یاس بالباء کہا جاتا ہے، پہلی حالت یعنی حالت یاس تک تو موت  
قَرِيب کے مفہوم میں داخل ہے، اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے، مگر دوسری حالت یعنی  
حالت یاس کی توبہ مقبول نہیں، جب کہ فرشتے اور عالم آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے  
آجائیں، کیونکہ وہ میں قَرِيب کے مفہوم میں داخل نہیں۔

اس آیت میں میں قَرِيب کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی  
ساری عمر اس ایک قلیل زمانہ ہے، اور موت جس کو وہ بعید سمجھ رہا ہے اس کے بالکل قریب  
قریب کی یہ تفسیر جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی ہے، دوسری  
آیت میں خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ فرما دیا ہے، جس میں یہ بتلایا ہے کہ موت  
کے وقت کی توبہ مقبول نہیں۔

خلاصہ مضمون آیت کا یہ ہو گیا کہ جو شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے خواہ چنانچہ  
بوجھ کر قصد و ارادہ سے کرے یا غلط و ناواقفیت کی بناء پر کرے، وہ بہر حال جہالت ہی  
ہوتا ہے، ہر ایسے گناہ سے انسان کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے بشرطیکہ  
موت سے پہلے پہلے سچی توبہ کر لے۔

اپنے ذمہ لے لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے جس کا  
پورا ہونا یقینی ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی فرض واجب یا کسی کا حق لازم نہیں ہوتا، پہلی  
آیت میں تو اس توبہ کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک قابل قبول ہے، دوسری آیت میں  
اس توبہ کا بیان ہے جو قابل قبول نہیں۔

اس میں بیان فرمایا ہے کہ اُن لوگوں کی توبہ قابل قبول نہیں جو عمر بھر جرات کے  
ساتھ گناہ کرتے رہے اور جب موت سر پر آپہنچی اور نزع روح شروع ہو گیا، موت کے



فرشتے سامنے آگئے، اُس وقت کہنے لگے کہ ہم اب توبہ کرتے ہیں، انھوں نے فرصتِ عمر گنوا کر توبہ کا وقت کھودیا، اس لئے ان کی توبہ مقبول نہیں ہوگی، جیسے فرعون اور آل فرعون نے غرق ہونے کے وقت پکارا کہ ہم رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لاتے ہیں، تو ان کو جواب ملا کہ کیا اب ایمان لاتے ہو جب ایمان لانے کا وقت گزر چکا؟

اور یہی مضمون آیت کے آخری جملہ میں ارشاد فرمایا کہ اُن لوگوں کی توبہ بھی قابل قبول نہیں جن کو حالتِ کفر پر موت آگئی، اور عین نزعِ روح کے وقت ایمان کا اقرار کیا، یہ اقرار و ایمان بے وقت اور بے سود ہے، ان کے لئے عذاب تیار کر لیا گیا ہے۔

**توبہ کی تعریف اور حقیقت** | دونوں آیتوں کی لفظی تفسیر کے بعد ضروری بات یہ باقی رہتی ہے کہ توبہ کی تعریف کیا ہے؟ اور اس کی کیا حقیقت اور کیا درجہ ہے؟

امام سنن نے احتیاء العلوم میں فرمایا کہ گناہوں پر اقدام کے تین درجے ہیں: پہلا یہ کہ کسی گناہ کا کبھی ارتکاب نہ ہو، یہ تو فرشتوں کی خصوصیت ہے یا انبیاء علیہم السلام کی، دوسرا درجہ یہ ہے کہ گناہوں پر اقدام کرے، اور پھر اُن پر اصرار جاری رہے، کبھی اُن پر ندامت اور ان کے ترک کا خیال نہ آئے، یہ درجہ شیاطین کا ہے، تیسرا مقام بنی آدم کا ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر ندامت ہو، اور آئندہ اس کے ترک کا پختہ عزم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سرزد ہونے کے بعد توبہ نہ کرنا یہ خالص شیاطین کا کام ہے اس لئے باجماع امت توبہ فرض ہے، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۚ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يَكْفِرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ	”یعنی ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو سچی توبہ، تو کچھ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کا کفارہ کر دیں اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کر دیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں“
--	--

کریم الکرماء اور رحیم الرحماء کی بارگاہِ رحمت کی شان دیکھئے کہ انسان ساری عمر اسی کی نافرمانی میں مبتلا رہے، مگر موت سے پہلے سچے دل سے توبہ کر لے تو صرف یہی نہیں کہ اس کا قصور معاف کر دیا جائے بلکہ اس کو اپنے محبوب بندوں میں داخل کر کے جنت کا وارث بنا دیا جاتا ہے۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

النَّاسُ بِحُبِّبِ اللَّهِ وَالنَّاسِ بِحُبِّبِ النَّاسِ	”یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا اللہ کا محبوب“
--	---



مِنَ الذَّنْبِ مَن لَّا ذَنْبَ لَهُ

(ابن ماجہ)

ہے، اور جس نے گناہ سے توبہ کر لی وہ ایسا ہو گیا کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ جب بندہ کسی گناہ سے توبہ کرے اور وہ اللہ کے نزدیک مقبول ہو جائے، تو صرف یہی نہیں کہ اس پر مواخذہ نہ ہو، بلکہ اس کو فرشتوں کے لکھے ہوئے نامہ اعمال سے بٹا دیا جاتا ہے، تاکہ اس کی رسوائی بھی نہ ہو۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ توبہ سچی اور توبۃ النصوح ہو، جس کے تین رکن ہیں، اول اپنے گنہگار پر ندامت اور ہشامی، حدیث میں ارشاد ہے: **إِنَّمَا التَّوْبَةُ الْقَبُولُ**، یعنی توبہ نام ہی ندامت کا ہے، دوسرا رکن توبہ کا یہ ہے کہ جس گناہ کا ارتکاب کیا ہے اس کو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کو بھی اس سے باز رہنے کا پختہ عزم و ارادہ کرے۔

تیسرا رکن یہ ہے کہ ملامتی مافات کی فکر کرے، یعنی جو گناہ سرزد ہو چکا ہے اس کا جتن تدارک اس کے قبضہ میں ہے اس کو پورا کرے، مثلاً نماز روزہ فوت ہوا ہے تو اس کو قضا کرے فوت شدہ نمازوں اور روزوں کی صحیح تعداد یاد نہ ہو، تو غور و فکر سے کام لے کر تخمینہ متعین کرے پھر ان کی قضا کرنے کا پورا اہتمام کرے، بیک وقت نہیں کر سکتا تو ہر نماز کے ساتھ ایک نماز قضا عمری کی پڑھ لیا کرے، ایسے ہی متعثر اوقات میں روزوں کی قضا کا اہتمام کرے، فرض زکوٰۃ ادا نہیں کی تو گزشتہ زمانہ کی زکوٰۃ بھی یک مشت یا تدریجاً ادا کرے، کسی انسان کا حق لے لیا ہے تو اس کو واپس کرے، کسی کو تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے، لیکن اگر اپنے گنہگار پر ندامت نہ ہو، یا ندامت تو ہو مگر آئندہ کے لئے اس گناہ کو ترک نہ کرے، تو یہ توبہ نہیں ہے، گو ہزار مرتبہ زبان سے توبہ توبہ کہا کرے۔

توبہ ہر لب سبھ بر کھن دل پُر از ذوقِ گناہ

معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ماسا

جب کسی انسان نے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق توبہ کر لی تو وہ ہر طرح کا گناہ کر چکنے

کے باوجود اللہ کا محبوب بندہ بن گیا۔

اور اگر پھر بقاضائے بشریت کبھی اس سے گناہ کا ارتکاب ہو گیا، تو پھر فوراً توبہ کی تجدید

کرے، بارگاہِ غفور کریم سے ہر دفعہ توبہ قبول کرنے کی امید رکھے،

ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست

صد بار اگر توبہ مشقتی باز آ



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا

لے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ

اور نہ روکے رکھو ان کو اس واسطے کہ لے لو ان سے کچھ اپنا دیا ہوا مگر یہ کہ وہ کریں

بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ

بے حیائی عروج اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو

فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝۱۹

شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی

وَأِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ لَّوَأْتَيْتُمُ

اور اگر بدلتا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور دے چکے ہو

أَحَدَهُنَّ قِنَظًا ۖ فَلَا تَأْخُذْ بِمَا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُ وَنَهُ

ایک کو بہت سامان تو مت پھیر لو اس میں سے کچھ کیا لیا جاتے ہو اس کو

بُكْتَانًا ۚ إِنَّهَا مُبِينٌ ۝۲۰ وَكَيْفَ تَأْخُذُ وَنَهُ ۚ وَقَدْ أَفْضَىٰ

ناحق اور مزاح گناہ سے اور کیونکر اس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے

بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَأَخْذُنْ مِنْكُمْ مِّثْلًا ۚ غَلِيظًا ۝۲۱

تم میں کا ایک دوسرے تک اور لے چکیں وہ عورتیں تم سے عہد پختہ

**رابطہ آیات** | مندرجہ بالا آیات میں توبہ کا ذکر ایک مناسبت سے آیا تھا، اس سے پہلے عورتوں

سے متعلق احکام کا ذکر چل رہا تھا، ان آیات میں بھی عورتوں کے متعلق احکام ہیں، جاہلیت میں عورتوں پر ان کے شوہروں کی طرف سے بھی ظلم ہوتا تھا، اور ان کے وارثوں کی طرف سے بھی۔

جب عورت کا شوہر مر جاتا تو شوہر کے ورثاء اپنی من مانی کرتے تھے، دل چاہتا تو اسی عورت کے ساتھ خود نکاح کر لیتے یا دوسرے کے ساتھ کرا دیتے، اور اگر رغبت نہ ہوئی تو نہ

خود نکاح کریں اور نہ دوسرے سے نکاح کرنے دیں بلکہ ان کو قیدی بنا کر رکھیں، تاکہ اس کو ذریعہ آمدنی بنا دیں، اس لئے کہ اس صورت میں اب وہ یا تو اپنا مال متاع ان کو دے کر اپنے آپ کو

چھڑا لیتی اور یا یوں ہی اس کے گھر میں قید رہتی، اور اسی حالت میں اس کو موتا جاتی تھی۔



شوہر بھی اپنی بیویوں پر ظلم و ستم کیا کرتے تھے، اگر رغبت نہ ہوتی تو نہ حقوق زوجیت ادا کرتے اور نہ اس کو طلاق دیتے، تاکہ وہ اپنا مال بے کر طلاق حاصل کر لے۔

ان آیات میں ابھی مفاسد کا سبب باب ہے، اور عائشہؓ دھن سے خاص شوہروں کو خطاب کیا گیا ہے، **وَإِنْ أَرَدْتُمْ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مِّثْلًا غَيْرًا تِلْكَ بِرِءَايَتِي** بھی اسی مضمون کا تکرار ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! ستم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے (مال یا جان کے) جبراً مالک ہو جاؤ (مال کا مالک ہونا تین طرح ہے، ایک یہ کہ اس عورت کا جو حق شرعی میراث میں ہے اس کو خود لے لیا جاوے اس کو نہ دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے یہاں تک کہ وہ یہاں ہی مر جائے پھر اس کا مال لے لیں، یا اپنے ہاتھ سے کچھ دے، تیسرے یہ کہ خاوند اس کو بے وجہ مجبور کرے کہ وہ اس کو کچھ مال دے تب یہ اس کو چھوڑے۔

اول اور تیسری صورت میں جبر کی قید سے یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ امور بالکل عورت کی خوشی سے ہوں تو جائز اور حلال ہیں، اور دوسری صورت میں یہ جبر واقع میں نکاح سے روکنے میں ہے جس سے غرض مال لینا تھا، اس لئے لفظوں میں اس سے متعلق کر دیا، اس سے بھی وہی فائدہ ہوا، یعنی اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح نہ کرے تو ان لوگوں کو گناہ نہیں۔

اور جان کا مالک ہونا یہ تھا کہ مردہ کی عورت کو میت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، اس صورت میں جبر کی قید واقعی یعنی بیان واقعہ کے لئے ہے، کہ وہ ایسا کرتے تھے، مگر اس کا یہ مفہوم نہیں کہ اگر عورت اپنی رضامندی سے اپنے کو مال میت کی طرح ترکہ مورد ثبوت بنانے پر راضی ہو جائے، تو وہ سچ مچ میراث اور ملک ہو جاوے گی، اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کر دے کہ جو کچھ تم لوگوں نے (یعنی خود تم نے یا تمھارے عزیزوں نے) ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ (بھی ان سے) وصول کر لو (اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں۔

ایک یہ کہ میت کا وارث اس میت کی بیوی کو نکاح نہ کرنے دے، تاکہ ہم کو بے کچھ دے، دوسرے یہ کہ خاوند اس کو مجبور کرے کہ مجھ کو کچھ دے تب چھوڑ دوں، تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی بدو نہ کچھ لئے اس کو نکاح نہ کرنے دے، یہاں کی پہلی صورت اوپر کی دوسری صورت کا ایک جزو ہے، اور یہاں کی دوسری صورت اوپر کی تیسری صورت ہے، اور وہاں کی پہلی صورت اور یہاں کی تیسری صورت الگ الگ ہے مگر بعض صورتوں میں ان سے مال لینا



یا ان کو مقید کرنا جائز ہے وہ ایہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں (اس میں بھی تین صورتیں آئیں، ایک یہ کہ ناشائستہ حرکت نا فرمانی شوہر کی اور بد خلقی ہو تو خاوند کو جائز ہے، کہ اس کو بدول مال لئے ہوتے جو مہر سے زیادہ نہ ہو اس کو نہ پھوڑے، دوسرے یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو ابتداء سے اسلام میں قبل نزول حدود خاوند کو جائز تھا کہ اس جبرمانہ میں اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس کر لے اور اس کو نکال دے، اب یہ حکم منسوخ ہے زنا سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوتا، ان دو صورتوں میں مال لیا جائے گا، اور تیسری صورت یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو خاوند کو اور نیز دوسرے ورثاء کو جیسا کہ شروع رکوع میں مذکور ہے بطور مزا کے بحکم حاکم عورتوں کو گھروں کے اندر مقید رکھنا جائز تھا، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا پس یہ مقید رکھنا بطور سزا کے ہو گا، بغرض وصول مال کے نہ ہو گا، پس یہ ہستنا مطلق عضل سے ہو گا، نہ عضل مقید بغرض اذہاب مال سے۔۔۔ آگے خاص شوہروں کو حکم ہے) اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گزران کیا کرو (یعنی خوش اخلاقی اور نان و نفقہ کی خبر گیری) اور اگر (بمقتضائے طبیعت) وہ تم کو ناپسند ہوں (مگر ان کی طرف سے کوئی امر ناپسندیدگی کا موجب واقع نہ ہو) تو (تم بمقتضائے عقل یہ سمجھ کر برداشت کرو کہ) ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو، اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت (دنوی یا دینی) رکھ دے (مثلاً وہ تمہاری خدمت گار اور آرام رساں اور ہمدرد ہو یہ دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد پیدا ہو کر بچپن میں مرجائے یا زندہ رہے اور صالح ہو جو ذخیرہ آخرت ہو جائے یا اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنے کا ثواب و فضیلت تو ضرور ہی ملے گی) اور اگر تم (خود اپنی رغبت کی وجہ سے) بچائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دوسری بیوی کرنا چاہو (اور پہلی بیوی کا کوئی قصور نہ ہو) اور تم اس ایک کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ و عطیہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو (خواہ ہاتھ میں سوئپ دیا، یا خاص مہر کے لئے صرف معاہدہ میں دینا کیا ہو) تو تم اس (دیئے ہوئے یا معاہدہ کئے ہوئے) میں سے (عورت کو تنگ کر کے) کچھ بھی (واپس) مت لو (اور معاف کرنا بھی حکماً واپس لینا ہے) کیا تم اس کو (واپس) لیتے ہو (اس کی ذات پر نا فرمانی یا بدکاری کا) بہتان رکھ کر اور اس کے مال میں (صریح گناہ (یعنی ظلم) کے مرتکب ہو کر) (خواہ بہتان صراحۃً ہو یا کہ اس طور پر دلالت ہو کہ اوپر صرف نا فرمانی و بدکاری کی صورت میں اس سے مال لینے کی اجازت تھی، پس جب اس سے مال لیا تو گویا اس کو نا فرمان و بدکردار دوسروں کے ذہن میں تصور کرایا اور ظلم مالی کی وجہ ظاہر ہے کہ بغیر خوش دلی کے عورت نے دیا، اور ہبہ کی صورت میں یہ ظلم اس لئے کہ زوجین کے آپس میں کوئی کسی کو بدیہ دید سے قواب



اس سے واپس لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں اور واپس لے گا تو وہ ایک قسم کا غصب ہوگا، اور بہتان بھی اسی سے لازم آتا ہے، کیونکہ واپس لینا گویا یہ کہنا ہے کہ یہ میری زوجہ نہ تھی، اس کا بہتان ہونا ظاہر ہے، کہ اس کو دعوت زوجیت میں کاذبہ اور معاشرت میں فاسقہ ٹھہراتا ہے، اور تم اس روئے ہوتے ہو (حقیقۃً یا کھٹا) کیسے لیتے ہو حالانکہ (علاوہ بہتان و ظلم کے اس کے لینے سے دو افراد بھی مانع ہیں، ایک یہ کہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو (یعنی صحبت ہو چکی ہے، یا خلوت صحیحہ کہ وہ بھی حکم صحبت میں ہے، بہر حال انھوں نے اپنی ذات تمھارے تمتع و لذت کے لئے تمھارے سپرد کر دی ہے، اور مہر ایسی سپردگی کا معاوضہ ہے، پس مبدل منہ کو حاصل کر کے بدل کو واپس لینا یا کہ نہ دینا عقل سلیم کے بالکل خلاف ہے اور اگر ڈال مہر نہیں بلکہ عطیہ تھا تو یہ بے حجابانہ ملاقات اثر زوجیت کی وجہ سے مانع ہے، اور اصل مانع زوجیت ہے) اور دوسرا مانع یہ کہ وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار (یعنی عہدِ استحکام) لے چکی ہیں (وہ عہد وہ ہے کہ نکاح کے وقت تم نے مہر اپنے ذمہ رکھا تھا اور عہد کر کے خلاف کرنا یہ بھی عقل کے نزدیک مذموم ہے، اور اگر وہ ہبہ اور عطیہ ہے تو قبل بے حجابانہ ملاقات کے یہ عہد بھی اثر زوجیت ہونے کی وجہ سے واپسی ہبہ سے مانع ہے، غرض چار موانع کے ہوتے ہوئے واپسی نہایت ہی مذموم ہے)

## معارف مسائل

اسلام سے پہلے عورتوں پر ان تین آیتوں میں ان مظالم کی روک تھام ہے جو اسلام سے پہلے صنفِ ہونیوالے مظالم کا انداد نازک پر روار کھے جاتے تھے، ان میں ایک بہت بڑا ظلم یہ تھا کہ مرد عورت کی جان و مال کا اپنے آپ کو مالک سمجھتے تھے، عورت جس کے نکاح میں آگئی وہ اس کی جان کو بھی اپنی ملک سمجھتا تھا، اور اس کے مرنے کے بعد اس کے وارث جس طرح اس کے مرد کو مال کے وارث اور مالک ہوتے تھے، اسی طرح اس کی بیوی کے بھی وارث اور مالک مانے جاتے تھے، چاہیں تو وہ خود اس سے نکاح کر لیں یا دوسرے کسی سے مال لے کر اس کا نکاح کر دیں، شوہر کا لڑکا جو دوسری بیوی سے ہوتا وہ خود بھی باپ کے بعد اس کو اپنے نکاح میں لاسکتا تھا اور جب عورت کی جان ہی اپنی ملک سمجھ لی گئی تو مال کا معاملہ ظاہر ہے اور اس ایک بنیادی غلطی کے نتیجے میں عورتوں پر طرح طرح کے صدمات مظالم ہو ا کرتے تھے، مثلاً:

ایک ظلم تھا کہ جو مال عورت کو کہیں سے وراثت میں ملتا یا اس کے میکہ والوں کی طرف سے بطور ہدیہ تحفہ ملا، بیچاری عورت اس سبک محروم و بے تعلق رہتی، اور یہ سب مال



سسرال کے مرد مضم کر لیتے تھے۔

دوسرا ظلم یہ ہوتا تھا کہ اگر عورت نے اپنے حصہ مال پر کہیں قبضہ کر ہی لیا تو مرد اس کو نکاح کرنے سے اس لئے روکتے تھے کہ یہ اپنا مال باہر نہ لے جاسکے بلکہ یہیں مر جائے اور مال چھوڑ جائے تو ہمارے قبضہ میں آجائے۔

تیسرا ظلم کہیں کہیں یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود محض طبعی طور پر وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی تو شوہر اس کے حقوق زوجیت ادا نہ کرتا، مگر طلاق دے کر اس کی گھلو خلاصی بھی اس لئے نہیں کرتا کہ یہ تنگ آ کر زیور اور زہر جو وہ اسے دے چکا ہے واپس کر دے، یا اگر ابھی نہیں دیا تو معاف کر دے تب اسے آزاد سی ملے گی۔ اور بعض اوقات شوہر طلاق بھی دیدیتا لیکن پھر بھی اپنی اس مطلقہ کو کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرنے دیتا تا کہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مہر واپس کر دے، یا واجب الادا مہر کو معاف کر دے۔ چوتھا ظلم بعض اوقات یوں ہوتا تھا کہ شوہر مر گیا، اس کے وارث اس کی بیوہ کو نکاح نہیں کرنے دیتے، یا جاہلانہ عار کی وجہ سے یا اس طبع میں کہ اس کے ذریعہ کچھ مال وصول کریں۔

یہ سب مظالم اس بنیاد پر ہوتے تھے کہ عورت کے مال بلکہ اس کی جان کا بھی اپنے آپ کو مالک سمجھا جاتا تھا، قرآن کریم نے اس فساد کی اس جڑ کو اکھاڑ ڈالا، اور اس کے تحت ہونے والے تمام مظالم کے السداد کے لئے ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرِهًا  
لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ فَمَا كَانَ عَلَيْكُمْ مِنْ شَيْءٍ بِمَا ضَرَبْتُمُوهُنَّ لِتَصْنَعُوا فِيهِنَّ كَدِيبًا ۚ لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مَا عَلَىٰ آبَائِكُمْ عَلَىٰ النِّسَاءِ مَا مَلَاحَتْ أَعْيُنُكُمْ ۚ لَكُمْ فِي حُلِيِّهِنَّ مِثْلُ مَا عَلَىٰ آبَائِكُمْ ۚ وَلِغَيْرِكُمْ فِيهِمْ شَرٌّ مِمَّا يُكْتُمُونَ ۚ

جبراً کی قید اس جگہ بطور شرط کے نہیں کہ عورتوں کی رضامندی سے ان کا مالک، بنانا صحیح قرار دیا جائے، بلکہ بیان واقعہ کے طور پر ہے کہ عورتوں کی جان و مال کا بلاوجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھنا ظاہر ہے کہ جبراً ہی ہو سکتا ہے، اس پر کوئی ہوش و عقل والی عورت راضی کہیں ہو سکتی ہے (بحر محیط) اسی لئے شریعت نے اس معاملہ میں اس کی رضا کو مؤثر نہیں قرار دیا، کوئی عورت بیوقوفی سے کسی کی ملوک بننے پر راضی بھی ہو جائے تو اسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد انسان کسی کا ملوک ہو جائے۔

ظلم و فساد کی ممانعت کا عام طریقہ یہ ہے کہ بصیغہ نہی اس سے منع کر دیا جائے، لیکن اس جگہ قرآن کریم نے اس عام طریقہ کو چھوڑ کر لفظ لَا يَحِلُّ سے اس کو بیان فرمایا ہے، اس میں اس معاملہ کے شدید گناہ ہونے کے علاوہ اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ اگر کسی نے کسی بائع عورت سے بغیر اس کی رضا و اجازت کے نکاح کر بھی لیا تو وہ نکاح شرعاً







اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس وصول نہ کرے یا مفسر کردہ ہر معاف نہ کر لے۔  
 اگلی دو آیتوں میں بھی اسی مضمون کا تفصیلی بیان ہے، ارشاد ہے کہ جب عورت کی طرف سے  
 کوئی سرکشی یا بے حیائی کا کام سرزد نہ ہو، مگر شوہر محض اپنی طبعی خواہش اور خوشی کے لئے  
 موجودہ بیوی کو چھوڑ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں اگر وہ ڈھیروں مال  
 بھی اس کو جسے چکا ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس سے دیئے ہوئے مال کا کوئی حصہ طلاق  
 کے معاوضہ میں واپس لے، یا واجب الادا ہر کو معاف کر لے، کیونکہ عورت کا کوئی قصور  
 نہیں، اور جس سبب سے ہر واجب ہوتا ہے وہ سبب بھی پورا ہو چکا ہے، یعنی عقد نکاح بھی ہو گیا  
 اور دونوں آپس میں بے حجابانہ مل بھی چکے ہیں، تو اب دیا ہوا مال واپس لینے یا واجب الادا  
 ہر کے معاف کرانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس رقم کی واپسی کے ظلم و گناہ ہونے کو تین مرحلوں میں بیان فرمایا گیا  
 اول فرمایا، اِذَا خُلِدَتْ ذُنُوهُمَا، یعنی کیا تم بہ چاہتے ہو کہ بیوی پر زنا  
 وغیرہ کے بہتان لگانے کا کھلا گناہ کر کے اپنا مال واپس لینے کا راستہ نکالو، یعنی جب  
 یہ معلوم ہو چکا کہ دیا ہوا مال واپس لینا صرف اس وقت جائز ہے، جبکہ بیوی کسی ناشائستہ  
 حرکت کی مرتکب ہو، تو اب اس سے مال واپس لینا درحقیقت اس کا اعلان کرنا ہے کہ اس  
 نے کوئی ناشائستہ حرکت بے حیائی وغیرہ کی ہے، خواہ زبان سے اس پر تہمت زنا کی لگائے  
 یا نہ لگائے، بہر حال یہ ایک صورت تہمت اور بہتان کی ہے جس کا اِذَا خُلِدَتْ میں لفظ  
 گناہ عظیم ہونا ظاہر ہے۔

دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا گیا، وَكَيْفَ تَأْخُذُ وَذُنُوهَا قَدْ أَقْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ،  
 یعنی اب تم اپنا مال ان سے کیسے واپس لے سکتے ہو، جبکہ صرف عقد نکاح ہی نہیں بلکہ  
 خلوتِ صحیحہ اور ایک دوسرے سے بے حجابانہ ملنا بھی ہو چکا ہے، کیونکہ اس صورت میں  
 دیا ہوا مال اگر مہر کا ہے تو عورت اس کی پوری مستحق اور مالک ہو چکی ہے، کیونکہ اس نے اپنے  
 نفس کو شوہر کے سپرد کر دیا، اب اس کی واپسی کے کوئی معنی نہیں، اور اگر دیا ہوا مال ہدیہ تحفہ  
 کا ہے تو بھی اب اس کی واپسی ممکن نہیں، کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دوسرے کو  
 بہہ کریں اس کی واپسی نہ شرعاً جائز ہے اور نہ قانوناً نافذ کی جاتی ہے، غرض ازواجِ تعلق  
 بہہ کی واپسی سے مانع ہے۔

اور اسی مضمون کو تیسرے جملہ میں ارشاد فرمایا، وَإِذَا خُلِدْنَ مِنْكُمْ مِّثَاقًا غَلِيظًا،  
 ”یعنی ان عورتوں نے تم سے پختہ اور مضبوط عہد لے لیا ہے“ اس سے مراد عقد نکاح کا عہد ہے۔



جو اللہ کے نام اور خطاب کے ساتھ مجمع کے سامنے کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس ازدواجی عہد و میثاق اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کے لئے عورت کو مجبور کرنا کھلا ہوا ظلم و جور ہے، مسلمانوں کو اس سے اجتناب لازم ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ط

اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تھے اسے باپ مگر جو پہلے ہو چکا ،

إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَمُقْبَاطًا وَسَاءَ سَبِيلًا ۝۲۳ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ

یہ بے حیائی ہے اور کام ہے غضب کا اور بُرا چلن ہے ، حرام ہوئی ہیں تم پر

أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ

تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالاتیں اور بیٹیاں

الْأَخِ وَبَنَاتِ الْأَخِ وَاتِّخَاتُكُمْ الَّتِي أَرَضَعْتُمْ

بھائی کی اور بہن کی اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا

وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرِّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ

اور دودھ کی بہنیں اور تمہاری عورتوں کی مائیں

وَرَبَائِبُكُمُ الَّتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ الَّتِي

اور ان کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں جن کو جتا ہے تمہاری عورتوں نے جن سے

دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا

تم نے صحبت کی، اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی تو تم پر

جُنَاحٌ عَلَيْكُمْ زَوْحَلًا ثَلَاثًا أَبْنَاءُ الذِّينِ مِنْ

کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں اور عورتیں تھکے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے

أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْبَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ

ہیں ، اور یہ کہ اکٹھا کر دو بہنوں کو مگر جو پہلے

سَلَفَ إِنْ اللَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۲۴

ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔



## وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ

اور عاوند والی عورتیں مگر جن کے مالک ہو جائیں

أَيَّمَانُكُمْ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَّا رَأَيْتُمْ

تمہارے ہاتھ حکم ہوا اللہ کا تم پر اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا

أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ ط

بشرطیکہ طلب کرو ان کو اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ط

پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق جو مقرر ہوئے

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَا ضِيَكُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ط

اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں کہ ٹھہراؤ تم دونوں آپس کی رضا سے مقرر کئے پیچھے

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝۲۴

بے شک اللہ ہے خبردار حکمت والا

رَبِطَ آيَاتِ | اور پر سے جاہلیت کی رسوم قبیحہ کا ذکر چلا آ رہا ہے، ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ بعض حرام عورتوں سے نکاح کر لیا کرتے تھے، مثلاً اپنی سوتیلی ماں سے،

ایک بہن کے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے اسی کی مناسبت سے دوسری محرمات کا بھی ذکر آ گیا، نیز وہ لوگ لے پالک بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے کو حرام سمجھتے تھے، اس کا بھی ابطال فرمادیا، اس سلسلہ میں بعض ان عورتوں کی حلت کو بھی بیان کیا گیا جن میں مسلمانوں کو شبہ ہوا تھا، مثلاً باندی جو مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی ہو اور اس کا پہلا شوہر دارالحرب میں ہو، اسی کے ساتھ نکاح کے شرائط اور اس کے متعلقات ہر وغیرہ کا بھی ذکر آ گیا۔

## خُلاصۃ تفسیر

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ ریا وادایا نانا نے نکاح کیا ہو، مگر (خیر) جو بات گذر گئی گذر گئی، (آئندہ کبھی ایسا نہ ہو) بیشک یہ (بات عقلاً بھی) بڑی بے حیائی ہے، اور (اہل طبائع سلیمہ کے عرف میں بھی) نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً بھی) بہت مجرطریقہ ہے، تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں (یعنی ان سے نکاح کرنا



حرام اور باطل ہے، اور ان کی کئی قسمیں ہیں:

**اول محرمات نسبتیہ** وہ یہ ہیں (تمھاری مائیں اور تمھاری بیٹیاں) اور ان میں سب اصول<sup>۱</sup> فروع بواسطہ و بلا واسطہ سب داخل ہیں) اور تمھاری بہنیں (خواہ عینی ہوں یا علانی یا اختیاتی) اور تمھاری پھوپھیاں (اس میں باپ کی اور سب مذکور اصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آگئیں) اور تمھاری خالائیں (اس میں ماں کی اور سب مؤنت اصول کی تینوں قسموں کی بہنیں آگئیں) اور بھتیجیاں (اس میں تینوں قسموں کے بھائیوں کی اولاد بواسطہ و بلا واسطہ سب آگئیں) اور بھانجیاں (اس میں تینوں قسموں کی بہنوں کی اولاد بواسطہ و بلا واسطہ سب آگئیں) اور

**قسم دوم محرمات رضاعیہ** وہ یہ ہیں (تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تم کو دودھ پلایا اگر (یعنی انا) اور تمھاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے بہن ہیں (یعنی تم نے ان کی حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیایا ہے، یا اس نے تمھاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیایا ہے، گو مختلف وقت میں پیامو) اور

**قسم سوم محرمات بالمصاہرہ** وہ یہ ہیں (تمھاری بیبیوں کی مائیں) اس میں زوجہ کے سب مؤنت اصول آگئے) اور تمھاری بیبیوں کی بیٹیاں (اس میں زوجہ کے سب مؤنت فروع آگئے) جو کہ (عادتاً) تمھاری پرورش میں رہتی ہیں (مگر اس میں ایک قید بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لڑکیاں) ان بیبیوں سے (ہوں) کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو (یعنی کسی عورت کے ساتھ صرف نکاح کرنے سے اس کی لڑکی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب اس عورت سے صحبت بھی ہو جائے تب لڑکی حرام ہوتی ہے) اور اگر (ہنوز) تم نے ان بیبیوں سے صحبت نہ کی ہو (مگر نکاح ہو چکا ہو) تو (ایسی بی بی کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے میں) تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمھاری ان بیٹیوں کی بیبیاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمھاری نسل سے ہوں (اس میں سب مذکور فروع کی بیبیاں آگئیں) اور نسل کی قید کا مطلب یہ ہے کہ منہ بولے یعنی لے پالک جس کو متبنتی کہتے ہیں اس کی بی بی حرام نہیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (رضاعی ہو یا نفسی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو لیکن جو (اس حکم سے) پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں کہ رحمت سے گناہ معاف کر دیتے ہیں) اور

**قسم چہارم** وہ عورتیں ہیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر اس قسم میں وہ مستثنیٰ ہیں، جو کہ (مشرعاً) تمھاری ملوک ہو جائیں (اور ان کے حربی شوہر دار الحرب میں موجود ہوں) اور بعد ایک حیض آجانے یا وضع حمل کے حلال ہیں، (کذا فی الہدایہ) اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو



تم پر فرض کر دیا ہے اور ان عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمھارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو یعنی مہر ہونا نکاح میں ضرور ہے اور اس طرح کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (جس کی شرطیں شرع میں مشہور ہیں، مثلاً گواہ بھی ہوں وہ نکاح موقت بھی نہ ہو، وغیرہ) صرف مستی ہی نکالنا نہ ہو (اس کے عموم میں زنا اور متحہ سب داخل ہو گیا، گو اس میں بھی مال خرچ کیا جاتا ہے) پھر (نکاح ہو جانے کے بعد) جس طریق سے (مبخلہ طسرقی شرعیہ معتبرہ کے) تم ان عورتوں سے منتفع ہوئے ہو سوان کو (ان کے عوض) انکے مہر دو جو کچھ معتبر ہو چکے ہیں اور یہ نہ سمجھو کہ اس معتبرہ میں کسی طرح مثل نماز و روزہ کے کمی بیشی ممکن نہ ہو بلکہ مقرر ہوئے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بیوی) باہم رضا مسند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں (مثلاً خاوند نے اور مہر بڑھا دیا یا عورت نے کم کر دیا، یا معاف ہی کر دیا، ہر طرح درست ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں (تمھاری مصلحتوں کو خوب جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (ان مصلحتوں کی رعایت سے احکام مقرر فرمائے ہیں، گو کہیں تمھاری سمجھ میں نہ آوے)۔

## معارف مسائل

ان آیات میں محرمات یعنی ان عورتوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے پھر بعض محرمات تو وہ ہیں جو کسی حال میں حلال نہیں ہوتیں، جنھیں محرمات ابدیہ کہا جاتا ہے اور بعض محرمات ابدیہ نہیں ہیں وہ بعض حالتوں میں حلال بھی ہو جاتی ہیں۔ شروع کی تین قسمیں محرمات نسبہ، محرمات رضاعیہ اور محرمات بالمصاہرۃ، محرمات ابدیہ ہیں، اور آخر کی ایک قسم منکوحہ عورتیں اُس وقت تک کے لئے حرام ہیں جب تک وہ بغیر کے نکاح میں ہیں:

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ ۖ جالبیت کے زمانہ میں اس میں کوئی باک نہیں کیا جاتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیوی سے نکاح کر لیتے تھے، اس آیت میں اللہ پاک نے اس بے شرمی اور بے حیائی کے کام سے منع فرمایا اور اس کو موجب مقت یعنی خدا سے پاک کی ناراضگی کا باعث بتایا، ظاہر ہے کہ یہ کیسی حشاک کی موت اور کردار کی خرابی ہے کہ جس کو ایک عرصہ تک ماں کہتے رہے، اس کو باپ کی موت کے بعد بیوی بنا کر رکھ لیا۔

مسئلہ: آیت شریفہ میں باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے،



اس میں اس بات کی قید نہیں لگائی ہے کہ باپ نے ان سے وطی بھی کی ہو، لہذا کسی بھی عورت سے اگر باپ کا عقد بھی ہو جائے تو اس عورت سے بیٹے کے لئے نکاح کبھی بھی حلال نہیں۔ اسی طرح سے بیٹے کی بیوی سے باپ کو نکاح کرنا درست نہیں، اگرچہ بیٹے کا صرف نکاح ہی ہوا ہے، قَالَ الشَّاهِدُ وَتَحْرُمُ زَوْجَتُهُ الْأَصْلُ وَالْقَرْمُ بِمَجَرَّدِ الْعَقْدِ دَخَلَ بِهَا أَوْلًا۔

مسئلہ: اگر باپ نے کسی عورت سے زنا کر لیا ہو تو بھی بیٹے کو اس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ، یعنی اپنی والدہ سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لفظ أُمَّهَاتُكُمْ کے عموم میں دادیاں اور نانیاں سب داخل ہیں۔ وَبَنَاتُكُمْ، اپنی صلی لڑکی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور لڑکی کی لڑکی سے بھی، اور بیٹے کی لڑکی سے بھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، پوتی، پرپوتی، نواسی، پڑنواسی، ان سب کے نکاح کرنا حرام ہے، اور سوتیلی لڑکی جو دو سکر شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس سے نکاح کرنے نہ کرنے میں تفصیل ہے جو آگے آرہی ہے، اور جو لڑکا لڑکی صلی نہ ہو بلکہ گود لے کر پال لیا ہو ان سے اور ان کی اولاد سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ کسی دوسرے طریقہ سے حرمت نہ آئی ہو اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی عورت سے زنا کیا تو اس نطفہ سے جو لڑکی پیدا ہو وہ بھی بیٹی کے حکم میں ہے اس سے بھی نکاح درست نہیں۔

وَأَخَوَاتُكُمْ، اپنی حقیقی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے، اور اس بہن سے بھی جو علاقائی (باپ شریک) اور اس بہن سے بھی جو اخپاتی (ماں شریک) ہو۔ وَعَمَّاتُكُمْ، اپنے باپ کی حقیقی بہن، علاقائی، اخپاتی بہن، ان تینوں سے نکاح حرام ہے، غرض کہ تینوں طرح کی پھوپھیوں سے نکاح نہیں ہو سکتا۔

وَأَخْلَافُكُمْ، اپنی والدہ کی بہن حقیقی ہو یا علاقائی ہو یا اخپاتی، ہر ایک سے نکاح حرام ہے۔

وَبَنَاتُ الْأَخِ، بھائی کی لڑکیوں، یعنی بھتیجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، حقیقی ہو علاقائی ہو یا اخپاتی ہو، تینوں طرح کے بھائیوں کی لڑکیوں سے نکاح حلال نہیں ہے۔

وَبَنَاتُ الْأُخْتِ، بہن کی لڑکیوں یعنی بھانجیوں سے بھی نکاح حرام ہے، اور یہاں بھی وہی تعمیم ہے کہ بہنیں خواہ حقیقی ہوں علاقائی ہوں یا اخپاتی ان کی لڑکیاں شرعاً



نکاح میں نہیں آسکتیں۔

وَأَمْهَنَكُمُ الَّتِي آرَضَعْنَكُمْ، جن عورتوں کا دودھ پیا ہے اگرچہ وہ حقیقی مائیں نہ ہوں وہ بھی حرمت نکاح کے بارے میں والدہ کے حکم میں ہیں، اور ان سے بھی نکاح حرام ہے، تھوڑا دودھ پیا ہو یا زیادہ، ایک مرتبہ پیا ہو یا متعدد دفعہ پیا ہو، ہر صورت میں یہ حرمت ثابت ہو جاتی ہے، فقہاء کی اصطلاح میں اس کو حرمت رضاعت سے تعبیر کرتے ہیں۔

البتہ اتنی بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ حرمت رضاعت اُسی زمانہ میں دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے جو بچپن میں دودھ پینے کا زمانہ ہوتا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: إِنَّمَا الرِّضَاعَةُ مِنَ الْمَجَاعَةِ، یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی، وہ اسی زمانہ کے دودھ پینے سے ہوگی جس زمانہ میں دودھ پینے ہی بچے کا نشوونما ہوتا ہے (بخاری مسلم)

اور یہ مدت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بچے کی پیدائش سے لیکر ڈھائی سال تک ہے اور دیگر فقہاء کے نزدیک جن میں امام ابو حنیفہؒ کے مخصوص شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں، صرف دو سال کی مدت تک رضاعت ثابت ہو سکتی ہے اور اسی پر امام محمدؒ کا فتویٰ بھی ہے اگر کسی لڑکے لڑکی نے اس عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پیا تو اس کی حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرِّضَاعَةِ، یعنی رضاعت کے رشتہ سے جو بہنیں ہیں ان سے بھی نکاح کرنا حرام ہے، تفصیل اس کی یوں ہے کہ جب کسی لڑکی یا لڑکے نے ایام رضاع میں کسی عورت کا دودھ پی لیا، وہ عورت ان کی رضاعی والدہ بن گئی، اور اس عورت کا شوہر اس کا باپ بن گیا، اور اس عورت کی بیسی اولاد اس کے بہن بھائی بن گئے، اور اس عورت کی بہنیں ان کی خالائیں بن گئیں، اور اس عورت کا جلیٹھ دیوان بچوں کے رضاعی چچا بن گئے، اور اس عورت کے شوہر کی بہنیں ان بچوں کی پھوپھیاں بن گئیں، اور باہم ان سب میں حرمت رضاعت ثابت ہو گئی، نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے رضاع کے رشتہ سے بھی حرام ہو جاتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا يَحْرُمُ مِنَ الْوِلَادَةِ (بخاری) اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے: إِنْ أَلَّاهُ حَرَّمَ مِنَ الرِّضَاعَةِ مَا حَرَّمَ مِنَ النَّسَبِ (بحوالہ مشکوٰۃ، ص ۲۷۳)

مسئلہ: اگر ایک لڑکے ایک لڑکی نے کسی عورت کا دودھ پیا تو ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح رضاعی بھائی اور رضاعی بہن کی لڑکی سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ: رضاعی بھائی یا رضاعی بہن کی بیسی ماں سے نکاح جائز ہے، اور بیسی بہن



کی رضاعی ماں سے بھی حلال ہے، اور رضاعی بہن کی نسی بہن سے بھی اور نسی بہن کی رضاعی بہن سے بھی نکاح جائز ہے۔

**مسئلہ:** منہ یا ناک کے ذریعہ ایام رضاع میں دودھ اندر جانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، اور اگر اور کسی راستہ سے دودھ اندر پہنچا دیا جائے یا دودھ کا انجکشن دے دیا جائے تو حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی۔

**مسئلہ:** عورت کے دودھ کے علاوہ کسی اور دودھ (مثلاً چوپائے کا دودھ یا کسی مرد کا) سے رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

**مسئلہ:** دودھ اگر دوا میں، یا بکری، گائے، بھینس کے دودھ میں ملا ہوا ہو تو اس سے حرمت رضاعت اس وقت ثابت ہوگی، جب کہ عورت کا دودھ غالب ہو، اور اگر دونوں برابر ہوں تب بھی حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے، لیکن اگر عورت کا دودھ کم ہے تو یہ حرمت ثابت نہ ہوگی۔

**مسئلہ:** اگر مرد کے دودھ نکل آئے تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔  
**مسئلہ:** اگر دودھ پیئے کا شک ہو تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔  
اگر کسی عورت نے کسی بچے کے منہ میں پستان دیا، لیکن دودھ جانے کا یقین نہ ہو تو اس سے حرمت رضاعت ثابت نہ ہوگی اور نکاح کی حلت پر اس کا اثر نہ پڑے گا۔

**مسئلہ:** اگر کسی شخص نے کسی عورت سے نکاح کر لیا، اور کسی اور عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے تو اگر دونوں اس کی تصدیق کریں تو نکاح کے فاسد ہونے کا فیصلہ کر لیا جائے گا، اور اگر یہ دونوں اس کی تکذیب کریں اور عورت دیندار خاترس ہو تو فساد نکاح کا فیصلہ نہ ہوگا، لیکن طلاق دے کر مفارقت کر لینا پھر بھی افضل ہے۔

**مسئلہ:** حرمت رضاعت کے ثبوت کے لئے دو دیندار مردوں کی گواہی ضروری ہے، ایک مرد یا ایک عورت کی گواہی سے رضاعت ثابت نہ ہوگی، لیکن چونکہ معاملہ حرام حلال سے متعلق ہے، اس لئے احتیاط کرنا افضل ہے، حتیٰ کہ بعض فقہاء نے یہ تفصیل لکھی کہ اگر کسی عورت سے نکاح کرنا ہو اور ایک دیندار مرد گواہی دے کہ یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہیں تو نکاح کرنا جائز نہیں، اور اگر نکاح کے بعد ہو تو احتیاط جدا ہونے میں ہے، بلکہ اگر ایک عورت بھی کہہ دے تب بھی احتیاط اسی میں ہے کہ مفارقت اختیار کر لیں۔

**مسئلہ:** جس طرح دو دیندار مردوں کی گواہی سے حرمت رضاعت ثابت ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک دیندار مرد اور دو دیندار عورتوں کی گواہی سے بھی اس کا ثبوت ہو جاتا ہے۔



البتہ حسیاط اسی میں ہے کہ اگر نفاۃ شہادت پورا نہ ہو تب بھی شک سے بچنے کے لئے حرمت کو ترجیح دی جائے۔

وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ، بیویوں کی مائیں بھی شوہروں پر حرام ہیں، یہاں بھی اہبات میں تفصیل ہے۔

اس میں بیویوں کی تانیاں، دادیاں، نسی ہوں یا رضاعی سب داخل ہیں۔  
مسئلہ: جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے، اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو یا جس کے ساتھ زنا کیا ہو یا اس کو شہوت کے ساتھ چھوا ہے۔

مسئلہ: نفس نکاح ہی سے بیوی کی ماں حرام ہو جاتی ہے، حرمت کے لئے دخول وغیرہ ضروری نہیں۔

وَرَبَّاءُ نِسَائِكُمُ الَّتِي فِي حُجُورِكُمْ مِّنْ نِّسَائِكُمُ الَّتِي دَخَلْتُمُ بَيْتًا، جس عورت کے ساتھ نکاح کیا اور نکاح کے بعد ہمبستری بھی کی تو اس عورت کی لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہے اسی طرح اس کی پوتی، نو اسی حرام ہو گئیں، ان سے نکاح کرنا جائز نہیں، لیکن اگر ہمبستری نہیں کی، صرف نکاح ہوا تو صرف نکاح سے مذکورہ قسمیں حرام نہیں ہو جاتیں، لیکن نکاح کے بعد اگر اس کو شہوت کے ساتھ چھوا، یا اس کے اندام نہانی کی طرف شہوت کی نگاہ سے دیکھا تو یہ بھی ہمبستری کے حکم میں ہے، اس سے بھی اس عورت کی لڑکی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: یہاں بھی نسا، کم میں تعیم ہے، لہذا اس عورت کی لڑکی پوتی اور نو اسی بھی حرام ہو گئیں، جس کے ساتھ شبہ میں ہمبستری کی ہو یا اس کے ساتھ زنا کیا ہو۔

وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ، بیٹے کی بیوی حرام ہے، اور بیٹے کے عموم میں پوتا، نو اسی بھی داخل ہیں، لہذا ان کی بیویوں سے نکاح جائز نہ ہوگا۔

مِنْ أَصْلَابِكُمْ کی قید سے متنبی (لے پالک) کو نکالنا مقصود ہے، اس کی بیوی سے نکاح حلال ہے، اور رضاعی بیٹا بھی نسی بیٹے کے حکم میں ہے، لہذا اس کی بیوی سے بھی نکاح کرنا حرام ہے۔

وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْاَرْوَاحَيْنِ، دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے، حقیقی بہنیں ہوں یا علاقائی ہوں یا خیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی بہنیں ہوں، یہ حکم سب کو شامل ہے، البتہ طلاق ہو جانے کے بعد دوسری بہن سے نکاح جائز ہے لیکن یہ جواز عدت گزرنے کے بعد ہی عدت کے دوران نکاح جائز نہیں ہے۔



مسئلہ: جس طرح ایک ساتھ دو بہنوں کو ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے اسی طرح پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بھی کسی ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔  
 قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُجْمَعُ بَيْنَ الْمَرْعُوقَةِ وَغَمَاتِهَا وَلَا بَيْنَ الْمَرْعُوقَةِ وَخَالَاتِهَا رِجَالًا وَمَسْلَمًا

مسئلہ: فقہائے کرام نے بطور قاعدہ کلیہ یہ لکھا ہے کہ ہر ایسی دو عورتیں جن میں سے اگر کسی ایک کو مذکر فرض کیا جائے تو شرعاً ان دونوں کا آپس میں نکاح درست نہ ہو، اس طرح کی دو عورتیں ایک مرد کے نکاح میں جمع نہیں ہو سکتیں۔

إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ، یعنی جاہلیت میں جو کچھ ہوتا رہا اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، یہ الفاظ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ كَمْذُ کی آیت میں بھی ذکر ہوئے ہیں، اور وہاں پر بھی یہی معنی ہیں کہ کہ جاہلیت میں جو کچھ تم سے صادر ہوا سو ہوا، اب اسلام لانے کے بعد اس کا مواخذہ نہیں ہوگا، اور آئندہ کے لئے جہتنباب لازم ہے۔

اسی طرح اگر نذول تحریم کے اس وقت میں باپ کی منکوحہ یا دو بہنیں نکاح میں ہوں تو تفریق ضروری ہے، اور دو بہنوں کی صورت میں ایک بہن کو الگ کر دینا لازم ہے۔  
 حضرت براء بن عازبؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ بن نبیہؓ کو ایک آدمی کے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا، اس لئے کہ اس شخص نے باپ کی بیوی سے نکاح کر لیا تھا زنا شکوۃ، ص ۲۴۴)

ابن فیروز دہلیؒ کی روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ جب میں اسلام لے آیا تو دو بہنیں میرے نکاح میں تھیں، میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے فرمایا ان میں سے ایک کو طلاق دے کر جدا کر دو، اور ایک کو باقی رکھ لو (حوالہ بالا) ان روایات سے معلوم ہوا کہ جس طرح حالت اسلام میں ابتداءً منکوحۃ الاب اور جمع بین الاختین جائز نہیں، اسی طرح اگر حالت کفر میں نکاح کی یہ صورت واقع ہوئی ہو تو اسلام لانے کے بعد اس کو باقی رکھنا جائز نہ ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا، اسلام سے پہلے جو کچھ انھوں نے حماقت میں کیا، اب اسلام لانے کے بعد اللہ جل شانہ ان سے درگزر کرے گا، اور ان کی طرف اپنی رحمت کے نغمے متوجہ ہوگا۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ، یعنی شوہر والی عورتیں بھی حرام کی گئیں، جب تک کوئی عورت کسی شخص کے نکاح میں ہو، دوسرا شخص اس سے نکاح نہیں کر سکتا، اس سے واضح



طور پر معلوم ہوا کہ ایک عورت بیک وقت ایک زائد شوہر والی نہیں ہو سکتی ہے، اس دور کے بعض جاہل ملحد کہنے لگے ہیں کہ مردوں کو جب ایک سے زائد بیویوں کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ایک سے زائد شوہروں سے متمتع ہونے کی اجازت ملنی چاہئے، یہ مطالبہ اس آیت شریفہ کے بالکل خلاف ہے، ایسی جاہلانہ باتیں کرنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مرد کے لئے کثرت ازواج ایک نعمت ہے، جسے ہر مذہب و ملت میں جائز و قرار دیا گیا ہے، جس پر انسان کی تاریخ شاہد ہے، لیکن عورت کے لئے ایک وقت میں ایک سے زائد شوہر ہونا، اس عورت کے لئے بھی باعث مصیبت ہے، اور جو دو مرد ایک عورت کے شوہر بن جائیں، ان کے لئے بھی باعث تنگ و عار ہے، اور دوسرے شرمی ہے، نیز اس میں کسی بچہ کے ثابت النسب ہونے کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، جب کئی مرد کسی عورت سے استماع کریں گے تو پیدا ہونے والی اولاد کو ان میں سے کسی ایک کا بیٹا تجویز کرنے کا کوئی طریق باقی نہ رہے گا، اس طرح کا بدترین مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو انسانیت کے سراپا دشمن ہوں، اور جن کی غیرت حیا کا جنازہ بیکل چکا ہو، ایسے لوگ اولاد اور والدین کے حقوق کی لائن سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے پوری انسانیت کو محروم کرنے کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں، جب نسب ثابت نہیں ہوگا تو باقی حقوق و فرائض کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟

خالص طبعی اور عقلی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو ایک عورت کے لئے متعدد شوہر ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا :

۱۔ ازدواج کا بنیادی مقصد تناسل ہے، اس اعتبار سے متعدد عورتیں تو ایک مرد سے حاملہ ہو سکتی ہیں، لیکن ایک عورت متعدد مردوں سے حاملہ نہیں ہو سکتی وہ ایک ہی سے حاملہ ہوگی، اس لئے متعدد شوہروں کی صورت میں ایک کے علاوہ باقی شوہروں کی قوت ضائع گئی، شہوت رانی کے سوا ان کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔

۲۔ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ عورت مرد کے مقابلہ میں صنفِ نازک ہے وہ سال کے اکثر حصہ میں استمتاع کے بھی قابل نہیں رہتی، بعض حالات میں اس کے لئے ایک ہی شوہر کے حقوق پورے کرنا ممکن نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ایک سے زیادہ شوہر ہوں۔

۳۔ چونکہ مرد جسمانی قوت کے اعتبار سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند ہے، اس لئے اگر کسی مرد کی جنسی قوت معمول سے زیادہ ہو، اور ایک عورت سے اس کی تشفی نہ ہو سکتی ہو تو اسے جائز طریقہ سے دوسرے اور تیسرے نکاح کا موقع ملنا چاہئے، ورنہ وہ دوسرے ناجائز طریقہ اختیار کرے گا، اور پورے معاشرے کو بگاڑ دے گا، لیکن عورت سے ایسے بگاڑ کا اندیشہ نہیں ہے۔



شریعت اسلامیہ میں اس مسئلہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت کے دوسرے نکاح کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی عورت کا کوئی شوہر طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدت گزرنے تک کسی دوسرے شخص سے اس عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔  
**اَلَا مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ نِسَائِكُمْ** یہ جملہ **وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ** سے استثناء ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی بیوی سے کسی دوسرے شخص کو نکاح کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ کوئی عورت مملوکہ باندی ہو کر آجائے، جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دارالحرب کے کافروں سے جیا دیکھا، اور وہاں سے کچھ عورتیں قید کر کے لے آئے، ان عورتوں میں جو عورت دارالاسلام میں لائی گئی اور اس کا شوہر دارالحرب میں رہ گیا، تو اس عورت کا نکاح دارالاسلام میں آنے سے اپنے سابق شوہر سے ختم ہو گیا، اب یہ عورت اگر کتابیہ یا مسلمہ ہو تو اس کا نکاح دارالاسلام کا کوئی بھی مسلمان نکاح کر سکتا ہے، اور اگر امیر المؤمنین اس کو باندی بنا کر کسی فوجی سپاہی کو مال غنیمت کی تقسیم میں دیدے تب بھی اس سے استمتاع جائز ہے۔ لیکن یہ نکاح واستمتاع ایک حیض آنے کے بعد ہی جائز ہے، اور اگر حمل ہے تو وضع حمل ضروری ہے۔

**مَسْئَلہ:** اگر کوئی کافر عورت دارالحرب میں مسلمان ہو جائے، اور اس کا شوہر کافر ہے تو عین حیض گزرنے کے بعد وہ اس کے نکاح سے جدا ہو جائے گی۔

**مَسْئَلہ:** اور اگر دارالاسلام میں کوئی کافر عورت مسلمان ہو جائے، اور اس کا شوہر کافر ہو، تو حاکم شرع اس کے شوہر پر اسلام پیش کرے، اگر وہ مسلمان ہونے سے انکار کرے تو قاضی ان دونوں میں تفسیح کر دے، اور یہ تفریق طلاق شمار ہوگی، اس کے بعد عدت گزار کر وہ عورت کسی مسلمان سے نکاح کر سکتی ہے۔

**کُتِبَ عَلَيْكُمُ**، یعنی جن محرمات کا ذکر ہوا ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے، **قَالَ الْقَاضِي** اسی حرمت **هَذِهِ النِّسَاءُ** کتاباً من اللہ **عَلَيْكُمْ**۔

**وَاَجَلَ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ**، یعنی جو محرمات اب تک مذکور ہوئیں، ان کے علاوہ دوسری عورتیں تمھارے لئے حلال ہیں، مثلاً چچا کی لڑکی، خالہ کی لڑکی، ماموں زاد بہن، ماموں چچا کی بیوی ان کی وفات یا طلاق دینے کے بعد بشرطیکہ یہ مذکورہ اقسام اور کسی رشتہ سے محرم نہ ہوں، اور اپنے مشرے بولے بیٹے کی بیوی جب وہ طلاق دیدے یا وفات پا جائے، بیوی مرجائے تو اس کی بہن کے ساتھ۔ وغیرہ۔ بے شمار صورتیں بنتی ہیں، ان سب کو **مَا وَرَاءَ ذَلِكُمْ** کے عموم میں داخل فرما دیا۔

**مَسْئَلہ:** بیک وقت چار عورتوں سے زیادہ کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں، اس کا



تفصیلی بیان سورۃ نساء کے شروع میں گزر چکا ہے، قریب کی آیات میں اس کا ذکر نہ دیکھ کر کسی کو یہ مغالطہ نہ ہو جائے کہ مآذَرَ آءِ ذِکْرِ کے عموم میں بغیر کسی پابندی کے عورتوں سے نکاح جائز ہے، نیز بہت سی محرمات وہ ہیں جن کا ذکر احادیث شریفہ میں ہے، اور ان کی طرف آیات میں اشارات بھی ہیں، جن کو ہم تفسیر کے ذیل میں کر کرتے چلے آئے ہیں۔

اَنْ تَبْتَغُوا بِاَمْوَالِكُمْ، یعنی محرمات کا یہ بیان تمھارے لئے اس لئے کیا گیا ہے کہ اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اور ان کو اپنے نکاح میں لاؤ۔

ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ اس سے دو باتیں معلوم ہونیں، ایک یہ کہ نکاح ہر سے خالی نہیں ہو سکتا رحتی کہ اگر زوجین آپس میں بیٹے کر لیں کہ نکاح بغیر بچے ہوگا تب بھی ہر لازم ہوگا، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، دوسرے یہ بات معلوم ہوتی کہ ہر وہ چیز ہونی چاہئے جس کو مال کہا جاسکے۔

حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ دس درہم سے کم ہر نہیں ہونا چاہئے، ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے۔

مُحْصِنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ، یعنی اپنے مالوں کے ذریعہ حلال عورتیں طلب کرو اور یہ سمجھ لو کہ عورتوں کی تلاش عفت و عصمت کے لئے ہے جو نکاح کا اہم مقصد ہے، اور نکاح کے ذریعہ اس چیز کو حاصل کرو، مال خرچ کر کے زنا کے لئے عورتیں تلاش کرو۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زنا کار بھی مال خرچ کرتے ہیں، لیکن وہ مال خرچ کرنا بھی حرام ہے، اور اس مال کے ذریعہ جو عورت حاصل کی جائے اس سے استمتاع حلال نہیں ہوتا لفظ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ بڑھا کر زنا کی ممانعت فرماتے ہوتے اس طرف بھی اشارہ فرمایا

کہ زنا میں صرف شہوت رانی، سفح مادہ پانی بہانا مقصود ہوتا ہے، کیونکہ اس سے طلب الولد اور ابقاء النسل کا ارادہ نہیں ہوتا، مسلمانوں کو پاک دامن رہنے اور تکثیر نسل انسانی کے لئے اپنی قوت کو بر محل خرچ کرنا چاہئے، جس کا طریقہ ملک نکاح اور ملک بھین ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً، یعنی نکاح کے بعد جن عورتوں سے استمتاع کرو تو ان کے مہر دیدو، یہ دینا تمھارے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

اس آیت میں استمتاع سے بیویوں سے ہمبستر ہونا اور وطی کرنا مراد ہے، اگر محض نکاح ہو جائے اور رخصتی نہ ہو اور شوہر کو استمتاع کا موقع نہ ملے، بلکہ وہ اس سے پہلے ہی طلاق دیدے تو ادھا مہر واجب ہوتا ہے، اور اگر استمتاع کا موقع مل جائے تو پورا مہر واجب ہو جاتا ہے، اس آیت میں خصوصی قوجہ دلائی ہے کہ جب کسی عورت سے استمتاع کر لیا تو اس کا مہر دینا



ہر طرح سے واجب ہو گیا، اس میں کوتاہی کرنا شریعت اسلام کے خلاف ہے، اور انسانی غیرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جب نکاح کا مقصد حاصل ہو گیا تو بیوی کے حق میں کوتاہی اور مال مثول نہ ہو۔ البتہ شریعت عورت کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ ہر اگر معجل ہے تو ہر کی وصولی تک وہ شوہر کے پاس جانے سے انکار کر سکتی ہے۔

**حُرْمَتِ مَتْعَہ** لفظ استمتاع کا مادہ م ت ع ہے، جس کے معنی کسی فائدہ کے حاصل ہونے کے ہیں، کسی شخص سے یا مال سے کوئی فائدہ حاصل کیا تو اس کو استمتاع

کہتے ہیں، عربی قواعد کی رو سے کسی کلمہ کے مادہ میں ت اور ت کا اضافہ کر دینے سے طلب و حصول کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں، اس لغوی تحقیق کی بنیاد پر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا مطرب طلب پوری امت کے نزدیک خلفاً عن سلف وہی ہے، جو ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے، لیکن ایک فرقہ کا کہنا ہے کہ اس سے اصطلاحی متعہ مراد ہے، اور ان لوگوں کے نزدیک یہ آیت متعہ حلال ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ متعہ جس کو کہتے ہیں اس کی صاف تردید قرآن کریم کی آیت بالا میں لفظ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ سے ہو رہی ہے، جس کی تشریح آگے آرہی ہے۔ متعہ اصطلاحی جس کے جواز کا ایک فرقہ مدعی ہے یہ ہے کہ ایک مرد کسی عورت سے یوں کہے کہ اتنے دن کے لئے اتنے پیسے یا فلاں جنس کے عوض میں تم سے متعہ کرتا ہوں، متعہ اصطلاحی کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، محض مادۂ اشتقاق کو دیکھ کر یہ فرقہ مدعی ہے کہ آیت سے حلتِ متعہ کا ثبوت ہو رہا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب دوسرے معنی بھی کم از کم محتمل ہے دگوہلے نزدیک متعین ہے تو ثبوت کا کیا راستہ ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے محرمات کا ذکر فرما کر یوں فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ اپنے اصول کے ذریعہ حلال عورتیں تلاش کرو، اس حال میں کہ پانی نہانے والے نہ ہوں یعنی محض شہوت رانی مقصود نہ ہو، اور ساتھ ہی ساتھ محصنین کی بھی قید لگائی ہے، یعنی یہ کہ عفت کا دھیان رکھنے والے ہوں۔ متعہ چونکہ مخصوص وقت کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں نہ حصول اولاد مقصود ہوتا ہے نہ گھر بار بسانا، اور نہ عفت و عصمت، اور اس لئے جس عورت سے متعہ کیا جائے اس کو فریق مخالف زوجہ وارثہ بھی قرار نہیں دیتا، اور اس کو ازواجِ معروفہ کی گنتی میں بھی شمار نہیں کرتا۔ اور چونکہ مقصد محض قضاءِ شہوت ہے، اس لئے مرد و عورت عارضی طور پر ملتے جلتے تلاش کرتے رہتے ہیں، جب یہ صورت ہے تو متعہ عفت و عصمت کا ضامن نہیں بلکہ دشمن ہے۔



صاحب ہدایہ نے حضرت امام مالکؒ کی طرف منسوب کیا ہے کہ ان کے نزدیک متعہ جائز ہے، لیکن یہ نسبت بالکل غلط ہے، جیسا کہ شراح ہدایہ اور دیگر اکابر نے تصریح کی ہے کہ صاحب ہدایہ سے تسامح ہوا ہے۔

البتہ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اخیر تک حلت متعہ کے قائل تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، امام ترمذیؒ نے باب ماجاء فی مکاح المتعہ کا باب قائم کر کے دو حدیثیں نقل کی ہیں، پہلی حدیث یہ ہے:

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ وَعَنْ لُحُومِ الْخَمِيرِ إِلَّا أَهْلِيَّةَ زَمَنْ خَيْبَرَ	حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے موقع پر عورتوں سے متعہ کرنے اور پالتو گھوڑوں کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔
--	---

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث بخاری و مسلم میں بھی ہے۔

دوسری حدیث جو امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے وہ یہ ہے:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ إِنَّمَا كَانَتْ الْمُتْعَةُ فِي أَوَّلِ الْإِسْلَامِ حَتَّى إِذَا نَزَلَتِ الْآيَةُ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَكُلُّ فُرْجٍ سِوَاهُمَا فَهُوَ حَرَامٌ	حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں متعہ اسلام کے عہد اول میں مشروع تھا، یہاں تک کہ آیت کریمہ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ، نازل ہوئی تو وہ منسوخ ہو گیا، اس کے بعد حضرت ابن عباسؒ نے فرمایا کہ زوجہ
---	--

شرعیہ اور ملوکہ شرعیہ کے علاوہ ہر طرح کی مشرکگاہ سے استمتاع حرام ہے ۱۱

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حضرت ابن عباسؒ کچھ عرصہ تک متعہ کو جائز سمجھتے تھے

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سمجھانے سے (جیسا کہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۲ پر ہے) اور آیت شریفہ إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ سے متنبہ ہو کر رجوع فرمایا، جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوا۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو فرقہ حلت متعہ کا قائل ہے باوجودیکہ اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ

کے محبت اور فرمانبردار ہونے کا دعویٰ ہے، لیکن اس مسئلہ میں وہ ان کا بھی مخالف ہے، وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ - (۲۶: ۲۲۷)

صاحب روح المعانی، قاضی عیاضؒ سے نقل کرتے ہیں کہ غزوہ خیبر سے پہلے متعہ



حلال تھا، پھر غزوہ خیبر میں حرام کر دیا گیا، اس کے بعد فتح مکہ کے دن حلال کر دیا گیا، لیکن پھر تین دن کے بعد ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا گیا۔

نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ فرمان باری تعالیٰ شانہ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَعْتَابِهِمْ  
خَافُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ كَذِبٌ مُّكْرٍ مِّنْ  
یہ ایسا واضح ارشاد ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، اس سے حرمتِ متعصا ظاہر  
ہے، اس کے مقابلہ میں بعض شاذ قراءتوں کا سہارا لینا قطعاً غلط ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا اِسْتَمْتَعْتُ سے متعدی اصطلاحی مراد ہونے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، محض ایک احتمال ہے، یہ احتمال اِلَّا عَلَىٰ اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ کے قطعی الدلائل مضمون کے ہرگز معارض نہیں ہو سکتا، اور بالفرض اگر دونوں دلیلیں قوت میں برابر ہوں تو کہا جائے گا کہ دونوں دلیلیں حلت و حرمت میں متعارض ہیں، بالفرض اگر تعارض مان لیا جائے تب بھی عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ محرم کو بیع پر ترجیح ہونی چاہیے۔

**مسئلہ:** نکاح متعدی کی طرح نکاح موقت بھی حرام اور باطل ہے، نکاح موقت یہ ہے کہ ایک مقررہ مدت کے لئے نکاح کیا جائے — اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ متعدی میں لفظ متعدی بولا جاتا ہے، اور نکاح موقت لفظ نکاح سے ہوتا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا تَرَوْنَ أَصْيَحُّ مِنْ أَنْ تَعْلِيَ الْفَرْصَةَ، آیت کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ باہمی ہر معاشرہ کرنے کے بعد ہر معاشرہ کوئی حتمی چیز نہیں ہو جاتی کہ اس میں کمی بیشی درست نہ ہو، بلکہ شوہر مقررہ ہر پر اپنی طرف سے اضافہ بھی کر سکتا ہے اور بیوی اگر چاہے تو اپنی خوش دلی سے تھوڑا یا پورا ہر معائنہ کر سکتی ہے، الفاظ کے عموم سے معلوم ہوا کہ عورت اگر ہر معجل طے کر کے تا جیل کرے، یعنی بعد میں لینے کو منظور کر لے تو یہ بھی درست ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں۔

ان اللہ کان علیہما حکیمًا آیت کے ختم پر یہ جملہ بڑھا کر ایک تویہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کو سب کچھ خبر ہے، احکام مذکورہ کی اگر کوئی شخص خلاف ورزی کرے تو اگرچہ اس کی خبر قاضی، حاکم اور کسی انسان کو نہ ہو، لیکن اللہ جل شانہ کو تو سب خبر ہے، اس سے ہر حال میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

اور یہ بھی بتلایا کہ جو احکام ارشاد فرمائے ہیں یہ سب کچھ حکمت پر مبنی ہیں، حکمت اس دقیق بات کو کہتے ہیں جو ہر شخص کی سمجھ میں نہیں آتی، حرمت و حلالیت کے احکام جو آیات میں مذکور ہیں ان کی علت کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ان کو ہر حال میں مانتا لازم ہے، کیونکہ



اگر ہمیں علت معلوم نہیں تو صاحب حکم باری تعالیٰ شانہ کو معلوم ہے جو علیم اور حکیم ہے۔  
اس دور کے بہت سے پڑھے لکھے جاہل احکام خداوندیہ کی علتیں تلاش کرتے ہیں، اگر  
کوئی علت معلوم نہیں ہوتی تو معاذ اللہ حکم ربی کو نامناسب یا دور حاضر کے تقاضوں کے خلاف  
کہہ کر مال دیتے ہیں، ان الفاظ میں ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا گیا ہے اور بتلادیا گیا ہے کہ تم ناواقف  
ہو، اللہ جل شانہ دانائے ہم نامہجھ ہوا اللہ حکیم ہے، اپنی سمجھ کو معیار حقانیت نہ بناؤ، واللہ اعلم  
وعلمہ اتم واحکم۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ الْمُحْصَنَاتِ

اور جو کوئی نہ رکھے تم میں معتدور اس کا کہ نکاح میں لائے بیبیان

الْمُسَوِّمَاتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ

مسلمان تو نکاح کر لے ان سے جو تمھارے ہاتھ کا مال ہیں جو کہ تمھارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان،

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَيِّمَا نِكْمًا بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَإِنَّكَ حَوَّهْنَّ

اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمھاری مسلمان تم آپس میں ایک ہو سوان سے نکاح کرو

بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَالْأَوْهَنَ أَجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ مُحْصَنَاتٍ

ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دوران کے ہر موافق دستور کے قید میں آنے والیاں ہوں

غَيْرِ مُسَفِّحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ فَإِذَا أَحْصَيْتَ فَإِنْ

نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں پھر جب وہ قید نکاح میں چکیں تو اگر

أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ

کریا بے حیائی کا کام تو ان پر آدمی سزا ہے بیبیوں کی سزا

مِنَ الْعَذَابِ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ وَأَنْ

سے یہ اس کے واسطے ہے جو کوئی تم میں ڈرے تکلیف میں پڑنے سے اور صبر

تَصْبِرُوا خَيْرٌ لَّكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ٢٥

کرو تو بہتر ہے تمھارے حق میں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

رَبِطَ آيَاتٍ | اوپر سے چونکہ نکاح کے احکام چلے آ رہے ہیں، اس لئے اسی کے ذیل میں اب



شرعی لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کا ذکر شروع ہوا، اور پھر انہی کے متعلق حد کا حکم بھی بیان کر دیا گیا، کہ باندی اور غلام کی حد آزاد عورت و مرد سے مختلف ہوتی ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اور جو شخص تم میں پوری قدرت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس (والوں) کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی (شرعاً) مملوکہ ہیں نکاح کرے، کیونکہ اکثر لونڈیوں کا مہر وغیرہ کم ہوتا ہے اور ان کو غریب کے ساتھ بیاہ دینے میں عار بھی نہیں کرتے) اور لونڈی سے نکاح کرنے میں عار نہ کرے، کیونکہ دین کی رُو سے تو تمہیں ہے کہ وہ تم سے بھی افضل ہو، وجہ یہ کہ مدارا فضیلت دین کا ایمان ہے اور تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے کہ اس میں کون اعلیٰ ہے کون ادنیٰ ہے، کیونکہ وہ متعلق قلب کے ہے جس کی پوری اطلاع اللہ ہی کو ہے، اور دنیا کی رُو سے زیادہ وجہ عار کی تفاوت نسب ہے اس میں جو انساب کا اصل مبدأ ہے یعنی حضرت آدم و حوا علیہما السلام اس میں مشارکت کے اعتبار سے) تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو (پھر عار کی کیا چیز سو جب عدم عار کی وجہ معلوم ہو گئی تو ضرورت مذکورہ کے وقت) ان سے نکاح کر لیا کرو (مگر شرط یہ بھی ہے کہ) ان کے مالکوں کی اجازت سے (ہو) اور ان کے ان مالکوں کو ان کے مہر قاعدہ (شرعیہ) کے موافق دیدیا کرو (اور یہ مہر دینا) اس طور پر (ہو) کہ وہ منکوحہ بنائی جاویں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کمر لے والی ہوں (یعنی وہ مہر بمقابلہ نکاح ہو بطور اجرت زنا کے دینے سے وہ حلال نہ ہوگی) پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنائی جاویں۔ پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تو (بعد شہوت بشرطیکہ مسلمان ہوں) ان پر اس سزا سے نصف سزا (جاری) ہوگی جو کہ (غیر منکوحہ) آزاد عورتوں پر ہوتی ہے، (جیسا کہ نکاح کے قبل بھی لونڈیوں کی یہی سزا تھی) اور اسی طرح غلاموں کی بھی) یہ (لونڈیوں سے نکاح کرنا) اس شخص کے لئے (مناسب) ہے جو تم میں (بوجہ غلبہ شہوت اور آزاد منکوحہ میسر نہ ہونے کے) زنا (میں مبتلا ہو جانے) کا اندیشہ رکھتا ہو، (اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے مناسب نہیں) اور اگر اس اندیشہ کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قادر ہو تو) تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (یہ نسبت نکاح کنیز کے) اور (یوں) اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں (اگر صورت کراہت میں بھی نکاح کر لیا، ہم مواخذہ نہیں کریں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (کہ حرمت کا حکم نہیں فرمایا)۔



## معارف و مسائل

طَوْلٌ قدرت اور غنا کو کہتے ہیں، آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن کو آزاد عورتوں سے نکاح کرنے کی قدرت نہ ہو، یا اس کا سامان میسر نہ ہو، تو مؤمن باندیوں سے نکاح کر سکتا ہے اس سے پتہ چلا کہ جہاں تک ممکن ہو آزاد عورت ہی سے نکاح کرنا چاہیے، باندی سے نکاح نہ کرے اور اگر باندی سے نکاح کرنا پڑ ہی جائے تو مؤمن باندی تلاش کرے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کا یہی مذہب ہے کہ آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کر لینا یا کتابیہ باندی سے نکاح کر لینا مکروہ ہے۔

اور حضرت امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا حرام ہے، اور کتابیہ باندی سے نکاح کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ بہر حال باندی کے نکاح سے بچنا آزاد مرد کے لئے ہر حال میں بہتر ہے، اور اگر مجبوراً کرنا ہو تو مؤمن باندی سے نکاح کریں، وجہ اس کی یہ ہے کہ باندی سے جو اولاد پیدا ہو وہ اس شخص کی غلام ہوتی ہے جو باندی کا مالک ہے اور غیر مؤمن باندی سے جو اولاد ہوگی اندیشہ ہے کہ وہ ماں کے ڈھنگ پر غیر دین اختیار کریں، اولاد کو غلامی سے بچانے اور مؤمن بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کی ماں آزاد ہو، اور اگر باندی ہو تو کم از کم مؤمنہ ضرور ہو، تاکہ بچے کا ایمان محفوظ رہے اسی لئے علماء کرام نے فرمایا ہے کہ کتابی عورت جو آزاد ہو اس سے اگرچہ نکاح کرنا درست ہے لیکن بچنا بہتر ہے، اور اس قدر میں تو اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، کیونکہ یہود و نصاریٰ کی عورتیں عموماً مسلمانوں سے اس لئے نکاح کرتی ہیں کہ خود شوہر کو اور شوہر کی اولاد کو اپنے دین پر لاسکیں۔

پھر فرمایا وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاٰیْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہارے ایمان کا خوب علم ہے، ایمان و جبر فضیلت ہے، بعض مرتبہ غلام اور باندی ایمانی مرتبہ میں آزاد مرد و عورت سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے مؤمن باندی سے نکاح کرنے کو قابلِ نفرت نہ جانیں، بلکہ اس کے ایمان کی قدر کریں۔

آخر میں فرمایا بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ، یعنی آزاد اور غلام سب ایک ہی جنس بنی آدم کے تعلق رکھتے ہیں، اور سب ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں، فضیلت کا مدار ایمان اور تقویٰ پر ہے، قَالَ فِي الْمَظْهَرِ قَهْدَانِ الْجَمَلَتَانِ لَيْتَا لَيْسَ النَّاسُ بِنِكَاحِ الْاِمَاعِ وَمَنْعِهِمْ عَنِ الْاِسْتِنَاكِافِ مِنْهُمْ، یعنی ان دونوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ لوگ باندیوں کے نکاح



سے مانوس ہوں اور اس نکاح کو قابل نفرت نہ سمجھیں۔

فَاِنْ كُنْتُمْ حَاكِمِينَ اُولَئِكَ مَكْحُومٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (یعنی باندیوں سے نکاح ان کے مالکوں کی اجازت سے کرو، اگر وہ اجازت نہ دیں تو باندیوں کا نکاح صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ باندی کو خود اپنے نفس پر ولایت حاصل نہیں ہوتی، یہی حکم غلام کا بھی ہے، کہ وہ اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ باندیوں سے نکاح کرو تو ان کے مہر خوبی کے ساتھ ادا کرو، یعنی مثال مثول نہ کرو اور پورا ادا کرو، باندی سمجھ کر اس بارے میں تکلیف نہ دو۔

اس سلسلہ میں امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ہر باندی کا حق ہے، اور دوسرے ائمہ فرماتے ہیں کہ باندی کے مہر میں جو مال ملے اس کا مالک بھی باندی کا آقا ہے۔

مُحْصَنَاتٍ غَيْرِ مُسَفِّحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتٍ اٰیٰتِ اٰلِیْنَ، یعنی مؤمن باندیوں سے نکاح کرو اس حال میں کہ وہ پاک و امن ہوں نہ وہ مسافحات ہو (یعنی علانیہ زنا کرنے والی) اور نہ خفیہ طریقہ پر آشکار کھنے والی ہو، گو اس جگہ پر باندیوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ نکاح کے لئے پاک و امن باندیوں کو تلاش کرو، لیکن آزاد عورت جو زانیہ ہو اس سے نکاح سے بچنا بھی افضل اور بہتر ہے۔

جیسا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ اگر حرہ کے ساتھ نکاح کی قدرت نہ ہو تو باندی کے ساتھ نکاح کرو، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ متعہ جائز نہیں، اس لئے کہ اگر متعہ جائز ہوتا تو حرہ کے ساتھ نکاح کے عدم استطاعت کی صورت میں کسی شخص کے لئے آسان ترین صورت متعہ کرنے کی تھی کہ اس میں جنسی خواہش بھی پوری ہو جاتی، اور مالی بوجھ بھی نکاح کے مقابلہ میں بہت کم ہوتا۔

نیز آیت میں مُحْصَنَاتٍ غَيْرِ مُسَفِّحَاتٍ کے ساتھ باندیوں کی صفت بیان کی گئی ہے، اور متعہ کی صورت میں سفاح ہی سفاح ہوتا ہے، کہ ایک عورت قلیل مدت میں متعدد اشخاص کے استعمال میں آتی ہے، اور چونکہ بچہ کسی کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا، اس لئے تناسل کا بھی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، اور سب کی قوت صرف شوٹانی میں ضائع چلی جاتی ہے۔

پھر فرمایا قَدْ اٰتٰیْنَاكَ مَا عَلٰی الْمَحْصَنَاتِ (یعنی جب باندیاں نکاح میں آگئیں، اور ان کے پاک و امن رہنے کا انتظام ہو گیا تو اب اگر زنا کر بیٹھیں تو ان کو اس سزا سے آدھی سزا ملے گی جو آزاد عورتوں کے لئے مقرر ہے اس سے غیر شادی شدہ آزاد عورتیں مراد ہیں، غیر شادی شدہ آزاد مرد و عورت سے اگر زنا کا صدور ہو جائے تو اس کو تین سو کوڑے لگائے جائیں گے، جس کا ذکر سورہ نور کی



دوسری آیت میں ہے اور جو کوئی شادی شدہ مرد و عورت زنا کر لے تو اس کی سزا رجم ہے یعنی پتھروں سے مار مار کر قتل کرو یا جائے گا، چونکہ اس میں تنصیف نہیں ہو سکتی، اس لئے چاروں اماموں کا مذہب یہی ہے کہ غلام یا باندی خواہ شادی شدہ ہوں خواہ کنوایے ہوں اگر ان سے زنا سرزد ہو جائے تو ان کی سزا پچاس کوڑے ہیں، باندیوں کا حکم تو آیت شریفہ میں مذکور ہے، اور بطور دلالت النص غلام کا مسئلہ بھی اسی سے سمجھ میں آ رہا ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ، یعنی باندیوں سے نکاح کرنے کی اجازت اس شخص کے لئے ہے جس کو زنا میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔

وَ اَنْ تَصِيْرُوْا خَيْرًا لَّكُمْ، یعنی باوجود اندیشہ زنا کے بھی اگر صبر کر لو اور اپنے نفسوں کو پاک و امن رکھو تو یہ تمہارے لئے اس بات سے بہتر ہے کہ باندیوں سے نکاح کرو۔ آیت کے ختم پر فرمایا وَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، یعنی باندیوں سے نکاح کرنا مکروہ ہے، اگر اس کراہت پر عمل کر لو گے تب بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے، اور وہ رجم والا بھی ہے، کیونکہ اس نے باندیوں سے نکاح کی اجازت دیدی، اور اس کو ممنوع قرار نہیں دیا۔

فَاَقْلَبْ۔ آیت بالا کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذکر آیا ہے ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں، جو کافر مرد و عورت جہاد کے موقع پر قید کر لئے جاتے تھے، اور امیر المؤمنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کر دیتا تھا، یہ قیدی غلام باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی (باستثناء بعض صورتوں کے) جن کا تفصیلی ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے، جب مسلمانوں نے شرعی طور پر جہاد کرنا چھوڑ دیا ہے، اور اپنے جہاد اور صلح و جنگ کا مدار دشمنان دین کے اشاروں پر رکھ دیا ہے، اور غیر شرعی اصولوں کے پابند ہو گئے ہیں اُس وقت سے غلام اور باندی سے بھی محروم ہو گئے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں، اس لئے کہ یہ آزاد ہیں۔

بعض عسلاقول میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنا لیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے، اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ

اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے واسطے اور چلائے تم کو پہلوں

قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۳۶ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ

کی راہ اور معاف کرے تم کو اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا اور اللہ چاہتا ہے



أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهْوَاتِ

کہ تم پر متوجہ ہووے اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو لگے ہوئے ہیں اپنے مزوں کے پیچھے

أَنْ تَمِيلُوا مِيلًا عَظِيمًا ۴۷ يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَفِّفَ عَنْكُمْ

کہ تم پھر جاؤ راہ سے بہت دور اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے

وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا ۴۸

اور انسان بنا ہے کمزور۔

**رَبِّ آيَات** | ماقبل کی آیتوں میں احکام کی تفصیل مذکور ہوئی ان آیتوں میں اللہ جل شانہ اپنا انعام و احسان بتلاتے ہیں اور یہ کہ ان احکام کی مشروعیت میں تمھارے ہی منافع و مصالح کی رعایت رکھی گئی ہے، اگرچہ تم اس کی تفصیل کو نہ سمجھو، پھر اس کے ساتھ ہی ان احکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے اور گمراہوں کے ناپاک ارادوں پر بھی متنبہ کیا گیا، کہ یہ لوگ تمھارے بدخواہ ہیں، جو تمھیں مستقیم راستے سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ کو (ان مضامین مذکورہ کے ارشاد فرمانے سے اسی طرح دوسرے مضامین سے اپنا کوئی نفع مقصود نہیں کہ یہ محال عقلی بلکہ تم کو نفع پہنچانے کے لئے) یہ منظور ہے کہ (آیات احکام میں تو) تم سے (تمھاری مصلحت کے احکام) بیان کرتے اور (آیات قصص میں) تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتلا دے (تاکہ تم کو اتباع کی رغبت اور مخالفت سے خوف ہو) اور (خلاصہ مشترک مقصود یہ ہے کہ) تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمادے (اور وہ توجہ یہی بیان فرمانا اور بتلانا ہے جس میں سراسر بندوں ہی کا نفع ہے جیسا مذکور ہوا) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں، (کہ بندوں کی مصلحت جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (کہ بلا وجہ ان مصلحتوں کی رعایت فرماتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کو (بیان احکام و قصص سے جیسا ابھی مذکور ہوا) تمھارے حال پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمانا منظور ہے اور جو لوگ (کفار و فجار میں سے) شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم (راہ راست سے) بڑی بھاری کبھی میں پڑ جاؤ (اور انہی جیسے ہو جاؤ) چنانچہ وہ اپنے فاسد خیالات مسلمانوں کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کو احکام میں جس طرح تمھاری مصلحت پر نظر ہے اسی طرح تمھاری آسانی پر بھی نظر ہے، جیسا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (احکام میں) تمھارے ساتھ تخفیف (یعنی آسانی) بھی



مشطور ہے اور روجہ اس کی یہ ہے کہ آدمی دین و نصبت اور مکاشفین کے بدن اور ہمت دونوں میں کمزور پیدا کیا گیا ہے اس لئے اس کے ضعف کے مناسب احکام منتشر فرمائے ہیں، ورنہ باعتبار رعایت مصلحت کے اعمال شاقہ کا تجویز کیا جاتا بھی مضائقہ نہ تھا، مگر ہم نے دونوں امر کا مجموعاً لحاظ فرمایا اور یہ بڑے علم و حکمت اور نیز رحمت و شفقت پر موقوف ہے۔

## معارف و مسائل

نکاح کے بہت سے احکام بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں یہ بتایا کہ اللہ پاک واضح طور پر خوب کھول کر تمہیں احکام بتاتے ہیں، اور انبیاء کرام اور صالحین عظام جو پہلے گزرے ہیں ان کے طریق کی رہبری فرماتے ہیں، تم یہ نہ سمجھو کہ یہ حرام و حلال کی تفصیلات صرف ہمارے ہی لئے ہے، بلکہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں ان کو بھی اس طرح کے احکام بتائے گئے تھے، جنہوں نے عمل کیا، اور منتشر بین بارگاہ خداوندی ہوئے۔

جو لوگ متبع شہوات میں اپنی زناکار اور وہ قومیں اور اصحاب مذاہب باطلہ جن کے نزدیک حرام حلال کوئی چیز نہیں وہ تم کو بھی راہ حق سے ہٹا کر اپنے باطل ارادوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، تم ان سے ہوشیار رہنا، بعض مذہبوں میں اپنی محرم عورتوں سے بھی نکاح کر لینا درست ہے، اور بہت سے ملحدین اس دور میں نکاح کو ختم کرنے ہی کے حق میں ہیں، اور بعض ممالک میں عورت کو متاع مشترک قرار دیتے جانے کی باتیں ہو رہی ہیں، یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو مہر اپنا نفس کے بندے اور خواہش کے غلام ہیں، اسلام کا کلمہ پڑھنے والے بعض ضعیف الایمان لوگ جو ان ملحدوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ان کی باتوں میں آکر اپنے دین کو فرسودہ خیال کرنے لگتے ہیں، اور دشمنوں کی باتوں کو انسانیت کی ترقی سمجھتے ہیں، اور نادانستہ طور پر اس خام خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ ماڈرن نظریات کے حاکم ہیں، کاش: ہمارا دین بھی اس کی اجازت دیتا، العیاذ باللہ! اللہ پاک نے تنبیہ فرمائی ہے کہ تم لوگ ایسے بدطینت انسانوں کے نظریات کو اپنانے سے دور رہنا۔

پھر فرمایا یُرِیدُ اللہُ اَنْ یُّحَقِّقَ عَلَیْکُمْ یعنی اللہ پاک تم پر تحقیق اور بلکہ احکام کا ارادہ فرماتے ہیں، تمہاری دقتیں دور کرنے کے لئے نکاح کے بارے میں ایسے نرم احکام دیئے جن پر سب عمل پیرا ہو سکتے ہیں، اور اگر آزاد عورتوں سے نکاح کی طاقت نہ ہو تو باندیوں سے نکاح کی اجازت دیدی ہے، مہر کے بارے میں طرفین کو باہمی رضامندی سے طے کرنے کا اختیار دیا اور ضرورت کے وقت ایک سے زائد عورت سے بھی نکاح کی اجازت دیدی گئی، بشرطیکہ



عدل ہاتھ سے نہ چھوٹے۔

پھر فرمایا: وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا یعنی انسان خلقی طور پر ضعیف ہے، اور اس کے اندر شہوانی مادہ رکھا گیا ہے، اگر بالکل ہی عورتوں سے دور رہنے کا حکم دیا جاتا تو اطاعت اور فرمانبرداری کرنے سے عاجز رہ جاتا، اس کے عجز و ضعف کے پیش نظر عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ ترغیب دی، اور نکاح کے بعد آپس میں جو ایک دوسرے کو نفس اور نظر کی پاکیزگی کا نفع اور دوسرے فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے طرفین کو تقویت پہنچتی ہے، پس نکاح ضعف کے دور کرنے کا باہمی معاہدہ اور ایک بے مثال طریقہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ

اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں باطل

إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا

مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے اور نہ خون کرو

أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝۳۹ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ

آپس میں بیشک اللہ تم پر مہربان ہے اور جو کوئی یہ کام کرے

عَدُوًّا وَإِنَّا وَظَلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى

تعدی سے اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے آگ میں اور یہ اللہ

اللَّهُ يَسِيرًا ۝۴۰

پر آسان ہے۔

**رَبِطُ آيَاتِ** | شروع سورۃ نساء میں تمام انسانوں کا ایک ماں باپ سے پیدا ہونا اور سب کا

ایک رشتہ اخوت میں جکڑے رہنا بیان فرما کر عام انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور

ان کی ادائیگی کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا، پھر یتیموں اور عورتوں کا تفصیلی بیان آیا، پھر میراث

کے احکام کا بیان ہوا، جس میں یتیموں، عورتوں کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے حقوق

کی ادائیگی کی بھی تاکید آئی، اس کے بعد نکاح کے احکام آئے کہ کس عورت سے نکاح حلال

ہے کس سے حرام، کیونکہ نکاح ایک ایسا معاملہ اور معاہدہ ہے جس سے عورت کی جان اور

مال میں تصرف کرنے کا کسی کو حق ملتا ہے۔

مذکورہ آیتوں میں عام انسانوں کے جان و مال کی حفاظت اور ان میں ہر ناجائز تصرف



کرنے کی ممانعت کا بیان ہے، خواہ وہ انسان مرد ہوں یا عورتیں اور غرضتہ دار ہوں یا غیریہاں تک کہ مسلم ہوں یا وہ غیر مسلم جن سے ترک جنگ کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو (کما صرح بہ المنہری)

## خُلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی غیر مباح) طور پر مت کھاؤ (برق) لیکن (مباح طور پر) مثلاً کوئی تجارت ہو جو باہمی رضا مندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں اور بھی سب شرائط شرعیہ ہوں) تو مضائقہ نہیں (یہ تو مالی تصرف تھا، آگے تصرف نفسی کو فرماتے ہیں) اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں (اس لئے ضرر رسانی کی صورتوں کو منع فرمادیا، بالخصوص جبکہ اس میں یہ اثر ہو کہ دوسرا شخص پھر تم کو ضرر پہنچا دے گا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تم کو بھی ضرر سے بچالیا) اور (چونکہ قتل ان دونوں امدوں میں اشد ہے اس لئے اس پر بالخصوص وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص ایسا فعل (یعنی قتل) کرے گا اس طور پر کہ حد (شرع) سے گذر جائے اور (وہ گذرنا بھی خطا، فعل یا خطا پر اسے نہ ہو بلکہ) اس طور پر کہ (قصداً) ظلم کرے تو ہم عنقریب (یعنی بعد الموت) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے اور یہ امر (یعنی ایسی سزا دینا) خدا تعالیٰ کو (بالکل) آسان ہے (کچھ اہتمام کی حاجت نہیں جس میں اس احتمال کی گنجائش ہو کہ شاید کسی وقت اہتمام و سامان جمع نہ ہو تو سزا ٹل جائے گی)۔

## معارف و مسائل

جس طرح باطل طریقہ سے غیر کا مال کھانا جائز نہیں خود اپنا مال بھی بطل طریق سے حرام کرنا جائز نہیں

آیت کے الفاظ میں آمُوا لَكُمْ بَيْنَكُمْ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "اپنے مال آپس میں" اس میں یہ بات تو باتفاق مفسرین داخل ہے ہی کہ کوئی شخص دوسرے کا مال ناجائز طریق پر نہ کھائے، ابوجیان نے تفسیر بحر محیط میں فرمایا کہ اس کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی اپنا ہی مال ناجائز طور پر کھائے، مثلاً ایسے کاموں میں خرچ کرے جو شرعاً گناہ یا اسرار بے جا ہیں، وہ بھی آیت کی رو سے ممنوع و ناجائز ہے۔

آیت میں لَا تَأْكُلُوا کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "مت کھاؤ" مگر عام محاورہ کے اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مال میں ناحق طور پر کسی قسم کا تصرف نہ کرو، خواہ کھانے پینے کا ہو یا اسے استعمال کرنے کا، عرف عام میں کسی کے مال میں تصرف کرنے کو اس کا



کھانا ہی بولا جاتا ہے، اگرچہ وہ چیز کھانے کی نہ ہو، لفظ باطل جس کا ترجمہ ناحق سے کیا گیا ہے، عبداللہ بن مسعود اور جبہ بن صفاہ کے نزدیک تمام ان صورتوں پر حاوی ہے جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں، جس میں چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت، سود و قمار اور تمام معاملات فاسدہ داخل ہیں۔ (بحر محیط)

باطل طریقہ سے کوئی مال | قرآن کریم نے ایک لفظ بِاطِلَیْلِ فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے  
لکھنے کی تشریح و تفصیل | حاصل کئے ہوئے مال کو حرام قرار دیدیا، پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلاً  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ فرمائی، آپ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی  
اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید و فروخت یا ناجائز اجارہ  
وغیرہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں وہ درحقیقت اس قرآنی حکم  
کی تشریح ہے، اس لئے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں، احادیث  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوئے ہیں، سب کا عام طور پر یہی حال  
ہے کہ وہ کسی نہ کسی قرآنی اشارہ کی تشریح ہوتی ہے، خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی  
تشریح ہے۔

آیت کے پہلے جملہ میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں تصرف کرنے کو  
حرام قرار دیا گیا ہے، دوسرے جملہ میں جائز طریقوں کو حرمت سے مستثنیٰ کرنے کے لئے ارشاد  
فرمایا: إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ، یعنی دوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو  
بذریعہ تجارت یا بھی رضا مندی سے حاصل کیا گیا ہو۔

جائز طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث،  
لیکن عام طور پر ایک شخص کا مال دوسرے کے تصرف میں آنے کی معروف و جاری صورت  
تجارت ہی ہے۔

پھر تجارت کے معنی عام طور پر صرف بیع و شراء کے لئے جاتے ہیں، مگر تفسیر مظہری  
میں اجارہ یعنی ملازمت و مزدوری اور کرایہ کے معاملات کو بھی تجارت میں داخل  
قرار دیا گیا ہے، کیونکہ بیع میں تو مال کے بدلہ میں مال حاصل کیا جاتا ہے، اور اجارہ میں محنت  
و خدمت کے بدلہ میں مال حاصل ہوتا ہے، لفظ تجارت ان دونوں کو حاوی ہے۔

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے، لیکن اگر رضا مندی  
کے ساتھ یعنی بیع و شراء یا ملازمت و مزدوری کا معاملہ ہو جائے تو اس طرح دوسرے کا مال  
حاصل کرنا اور اس میں مالکانہ تصرفات کرنا جائز ہے۔



کسب معاش کے ذرائع میں تجارت | دوسرے کا مال حاصل کرنے کی جائز صورتوں میں سے اس  
اور محنت سب سے افضل ہے | آیت میں صرف تجارت کے ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے  
کہ کسب معاش کے ذرائع میں سے تجارت اور محنت سب سے افضل اور اطمینان دہیہ معاش ہے  
حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے  
دریافت کیا گیا کہ کونسی کمائی حلال و طیب ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:

عَمِلَ الرَّجُلُ بَيْدًا وَكُلَّ مَيْعًا | یعنی انسان کے ہاتھ کی مزدوری اور ہر  
مَبْرُورًا، رواہ احمد والحاکم | سچی بیع و شراہ (جس میں جھوٹ فریب  
(منظہری و ترغیب و ترہیب) نہ ہو) "

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

التَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ | سچا تاجر جو امانت دار ہو وہ انبیاء  
النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَ | اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا  
الشُّهَدَاءِ (ترمذی)

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

التَّاجِرُ الصَّدُوقُ تَحْتَ ظِلِّ | سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے  
الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، رواہ | سایہ میں ہوگا  
الاصبہانی (ترغیب)

پاکیزہ کمائی کے خاص شرائط | اور حضرت معاویہ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے زیادہ پاک کمائی تاجروں کی کمائی ہے، بشرطیکہ وہ جب بات کریں  
تو جھوٹ نہ بولیں، اور جب وعدہ کریں تو وعدہ خلافی نہ کریں، اور جب اُن کے  
پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، اور جب کوئی سامان  
(کسی سے) خریدیں تو (تاجروں کی عادت کے مطابق) اُس سامان کو بُرا اور خراب  
نہ بتائیں، اور جب اپنا سامان فروخت کریں تو (واقعہ کے خلاف) اس کی تعریف  
نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا قرض ہو تو ٹالیں نہیں، اور جب اُن کا  
قرض کسی کے ذمہ ہو تو اس کو تنگ نہ کریں "

(اخر جہ الاصبہانی، از حاشیہ منظہری)



اسی لئے ایک حدیث میں ارشاد ہے:

إِنَّ التُّجَّارَ يُعْتَبُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ  
فَجَارًّا إِلَّا مَنْ اتَّقَى اللَّهَ وَبَرَّ  
وَصَدَقَ (أَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ  
عَنْ رِقَاعَتِهِ بْنِ رَافِعٍ)

قیامت کے روز تاجر لوگ فاجروں گنہگاروں  
کی صف میں ہوں گے بجز اس شخص کے جو اللہ  
سے ڈرے اور نیکی کا معاملہ کرے، اور  
سچ بولے۔

دوسرے کا مال حلال ہونے کے لئے آیت کے اس جملہ میں تجارت کے ساتھ عَنْ تَرَاضٍ يَمْنُكُمْ  
تجارت اور تراضی کی دو شرطیں فرما کر یہ بتلا دیا کہ جہاں تجارت ہی نہ ہو بلکہ تجارت کے نام پر جوا،  
سٹہ یا ربوہ اور سود کا معاملہ ہو یا مال ابھی موجود نہیں، محض ذہنی قرار داد پر اس کا سود اکٹھا  
کیا ہو وہ بیع باطل اور حرام ہے۔

اسی طرح اگر تجارت یعنی مبادلہ اموال تو ہو لیکن اس میں فریقین کی رضامندی نہ ہو  
وہ بھی بیع فاسد اور ناجائز ہے، اور یہ دونوں صورتیں اہل اموال بالباطل میں داخل ہیں، پہلی  
صورت کو فقہاء بیع باطل کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اور دوسری صورت کو بیع فاسد  
کے نام سے۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ ایک مال کا دوسرے مال سے تبادلہ کرنے کا نام تجارت ہے،  
اگر ان میں کسی ایک جانب مال ہو اور اس کے بالمقابل مال ہی نہ ہو تو وہ تجارت نہیں، بلکہ  
قریب ہے، سود کے معاملات کا یہی حال ہے کہ سود کی رقم ادھار کی میعاد کا معاوضہ ہوتا ہے  
اور یہ میعاد کوئی مال نہیں، اسی طرح سٹہ، جوا کہ اس میں ایک طرف تو مال متعین موجود  
ہے، دوسری طرف مال کا ہونا یا نہ ہونا مشکوک ہے، اسی طرح وہ وعدے کے سودے جن میں  
مال ابھی تک وجود میں نہیں آیا، اور اس کا سود اکٹھا کر لیا گیا تو ایک طرف مال اور دوسری طرف  
موسوم وعدہ ہے، اس لئے حقیقت کے اعتبار سے یہ تجارت ہی نہیں، بلکہ ایک قسم کا دھوکہ  
قریب ہے، اسی لئے فقہاء نے اس کو بیع باطل قرار دیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے مال اور تبادلہ مال تو ہو، لیکن کسی ایک  
جانب سے رضامندی نہ ہو، یہ تجارت تو ہوئی مگر فاسد اور غلط قسم کی تجارت ہے، اس لئے  
اس کو بیع فاسد کہا جاتا ہے اور ناجائز ہے۔

اس تشریح سے بیع و شراء اور تجارت کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں سب نکل جاتی ہیں۔  
شرط تراضی کی حقیقت البتہ ایک تیسری قسم اور ہے جس میں طرفین سے تبادلہ مال بھی ہے اور  
بظاہر فریقین کی رضامندی بھی، مگر وہ رضامندی درحقیقت مجبوری کی رضامندی ہوتی ہے



حقیقی رضامندی نہیں ہوتی، اس لئے شرعاً اس میسری قسم کو بھی دوسری ہی قسم میں داخل قرار دیا گیا ہے، مثلاً عام ضرورت کی چیزوں کو سب طرف سے سمیٹ کر کوئی ایک شخص یا ایک کمپنی اسٹاک کرے اور پھر اس کی قیمت میں خاطر خواہ اضافہ کر کے فروخت کر لے گئے، چونکہ بازار میں دوسری جگہ ملتی نہیں، گاہک مجبور ہے کہ ہنگی سستی جیسی بھی یہ فروخت کرے وہ اس کو خریدے، اس صورت میں اگرچہ گاہک خود چل کر آتا ہے اور بظاہر رضامندی کے ساتھ خریدتا ہے، لیکن اس کی یہ رضامندی درحقیقت ایک مجبوری کے تحت ہے، اس لئے کالعدم ہے۔

اسی طرح کوئی شوہر اپنی بیوی کے ساتھ معاشرت کی ایسی صورتیں پیدا کر دے کہ وہ اپنا مہر معاف کرنے پر مجبور ہو جائے، تو گو معافی کے وقت وہ اپنی رضامندی کا اظہار کرتی ہے لیکن درحقیقت رضامندی نہیں ہوتی۔

یا کوئی آدمی جب یہ دیکھے کہ میرا جائز کام بغیر رشوت دیئے نہیں ہوگا وہ رضامندی کے ساتھ رشوت دینے کے لئے آمادہ ہو تو چونکہ یہ رضامندی بھی درحقیقت رضامندی نہیں اس لئے شرعاً کالعدم ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ **إِلَّا أَنْ تَكُونُوا تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ** سے بیع و شراء اور تجارت کی صرف انہی صورتوں کا جواز ثابت ہوا جن کا جواز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ثابت ہے، اور فقہاء نے ان کو منضبط کر دیا ہے اور جتنی صورتیں بیع و شراء اور تجارت کی شرعاً ممنوع و ناجائز ہیں وہ سب اس سے خارج ہیں، قرآن کریم کے اس ایک لفظ نے فقہ کی پوری کتاب البیوع اور کتاب الاجارہ کا مکمل بیان کر دیا۔

آیت کا تیسرا جملہ یہ ہے **وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ**، جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ تم اپنے آپ کو قتل نہ کرو، اس میں باتفاق مفسرین خود کشی بھی داخل ہے، اور یہ بھی کہ ایک دوسرے کو ناحق قتل کرے۔

آیت کے پہلے جملہ میں عام انسانوں کے مالی حقوق اور ان کی حفاظت کا بیان تھا، اس جملہ میں ان کے جانی حقوق کی حفاظت کا بیان آگیا۔ اور اس جگہ مال کو مفتدم اور جان کو مؤخر شاید اس لئے بیان فرمایا گیا کہ مالی حقوق میں ظلم و جور اور کوتاہی و غفلت بہت عام ہے، ناحق قتل و خون ریزی اگرچہ اس سے زیادہ اشد ہے مگر عادتاً اس میں ابتلاء کم ہے، اس لئے اس کو مؤخر بیان فرمایا۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہے **إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ حَقِيقًا**، یعنی جو احکام اس آیت میں دیئے گئے ہیں کہ لوگوں کا مال ناحق نہ کھاؤ یا کسی کو ناحق قتل نہ کرو، یہ سب احکام تمہارے حق



میں رحمت خداوندی ہیں تاکہ تم ان کاموں کے اتھروی وبال سے بھی محفوظ رہو اور دنیوی سزاؤں سے بھی۔

اس کے بعد دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ عَدُوًّا ظَلَمًا قُتِلَ نَفْسُ يَتْلِيهِ نَاسًا، یعنی قرآنی ہدایات کے باوجود اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے اور جان بوجھ کر تعدی اور ظلم کی راہ سے کسی کا مال ناحق لے لے یا کسی کو ناحق قتل کر دے تو ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کر دیں گے۔ تعدی اور ظلم کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر سہو و نسیان یا خطا سے ایسا ہو گیا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں۔

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ

اگر تم بچتے رہو گے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں تو ہم معاف کر دیں گے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے

وَنُدْخِلْكُمْ مَدْخَلًا كَرِيمًا ﴿۳۱﴾

اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں

**رابط آیات** | اس آیت سے پہلی آیات میں چند بڑے بڑے گناہوں کا ذکر اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان ہے، قرآن کریم کا مخصوص انداز بیان یہ ہے کہ جب کسی جرم پر سزا سے ڈرایا جاتا ہے جسے ترہیب کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ جو شخص اس جرم سے باز آئے گا اس کے لئے یہ انعامات و درجات ہیں۔

اس آیت میں بھی ایک خاص انعام خداوندی ذکر کر کے ترغیب دی گئی ہے، وہ یہ کہ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچ گئے تو تمہارے چھوٹے گناہوں کو ہم خود معاف کر دیں گے، اور ہر طرح تم ہر طرح کے بڑے چھوٹے صغیر و کبیرہ گناہوں سے پاک و صاف ہو کر عزت و راحت کے اس مقام میں داخل ہو سکو گے جس کا نام جنت ہے۔

## خلاصہ تفسیر

جن کاموں سے تم کو (شرع میں) منع کیا جاتا ہے (یعنی گناہ کے کام) ان میں سے جو

بھاری بھاری کام ہیں (یعنی بڑے بڑے گناہ ہیں) اگر تم ان سے بچتے رہو تو اس بچنے پر ہم

وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اعمالِ حسنہ کے کرنے سے جب کہ وہ مقبول ہو جائیں (ہم تمہاری

خفیف برائیاں) (یعنی چھوٹے چھوٹے گناہ جو کہ دوزخ میں لے جاسکتے ہیں) تم سے دور (یعنی



معاف فرمادیں گے (پس دوزخ سے محفوظ رہو گے) اور ہم تم کو ایک معسر زجگہ (یعنی بہشت) میں داخل کر دیں گے۔

## معارف و مسائل

**گناہوں کی دو قسمیں** | آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں، کچھ کبیرہ، یعنی بڑے گناہ اور کچھ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر کوئی شخص ہمت کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے صغیرہ گناہوں کو وہ خود معاف فرمادیں گے۔

کبیرہ گناہوں سے بچنے میں یہ بھی داخل ہے کہ تمام فرائض و واجبات کو ادا کرے، کیونکہ فرض و واجب کا ترک کرنا خود ایک کبیرہ گناہ ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ جو شخص اس کا اہتمام پورا کرے کہ تمام فرائض و واجبات ادا کرے، اور تمام کبیرہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے، تو حق تعالیٰ اس کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ کر دیں گے۔

**اعمال صالحہ سفارہ کا** | کفارہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اعمال صالحہ کو صغیرہ گناہوں کا کفارہ کفارہ ہو جاتے ہیں | بنا کر اس کا حساب بیباق کر دیں گے، اور بجائے عذاب کے ثواب اور بچاؤ جہنم کے جنت نصیب ہوگی۔ — جیسے احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ جب کوئی شخص نماز کے لئے وضو کرتا ہے تو ہر عضو کے دھونے کے ساتھ ساتھ گناہوں کا کفارہ ہو گیا، چہرہ دھویا تو آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، کٹی کر لی تو زبان کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا، پاؤں دھوئے تو پاؤں کے گناہ دھل گئے، پھر جب وہ مسجد کی طرف چلتا ہے تو ہر قدم پر گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔

**کبیرہ گناہ صرف توبہ** | آیت سے معلوم ہوا کہ وضو، نماز وغیرہ اعمال صالحہ کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ سے معاف ہوتے ہیں | ہونا جو روایات حدیث میں مذکور ہے اس سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اور کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اور صغیرہ کی یہ شرط ہے کہ آدمی ہمت اور کوشش کر کے کبیرہ گناہوں سے بچ گیا ہو۔ — معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں میں مبتلا رہتے ہوئے وضو اور نماز ادا کرتا رہے تو محض وضو نماز یا دوسرے اعمال صالحہ سے اس کے صغیرہ گناہوں کا بھی کفارہ نہیں ہوگا، اور کبیرہ تو اپنی جگہ ہیں ہی۔ — اس لئے کبیرہ گناہوں کا ایک بہت بڑا ضرر خود ان گناہوں کا وجود ہے جس پر قرآن و حدیث کی شدید وعیدیں آئی ہیں، اور وہ بغیر سچی توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اس کے علاوہ دوسری محرومی یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے



چھوٹے گناہ بھی معاف نہیں ہوں گے، اور یہ شخص محشر میں کبار و صغائر کے بوجھ میں لدا جائے گا اور کوئی اس وقت اس کا بوجھ ہلکا نہ کر سکے گا۔

گناہ اور اس کی تقسیم | آیت میں کبار کا لفظ آیا ہے، اس لئے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ کبیرہ کے صغائر، کیا ہیں؟ کہتے ہیں اور وہ مکمل کتنے ہیں، اور صغیرہ گناہ کی کیا تعریف ہے اور اس کی تعداد کیا ہے؟

علماء امت نے اس مسئلہ پر مختلف انداز میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ گناہ کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم اور ان کی تعریفات سے پہلے یہ خوب سمجھ لیجئے کہ مطلق گناہ نام ہے ہر ایسے کام کا جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور مرضی کے خلاف ہو، اسی سے آپ کو یہ اندازہ بھی ہو جائے گا کہ اصطلاح میں جس گناہ کو صغیرہ یعنی چھوٹا کہا جاتا ہے، درحقیقت وہ بھی چھوٹا نہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت ہر حالت میں نہایت سخت و شدید جرم ہے، اسی حیثیت سے امام الحرمین اور بہت سے علماء امت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی اور اس کی مرضی کی مخالفت کبیرہ ہی ہے۔ کبیرہ اور صغیرہ کا فرق صرف گناہوں کے باہمی مقابلہ اور موازنہ کی وجہ سے کیا جاتا ہے، اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ كُلُّ مَا خَلَى عَنْهُ فَهُوَ كَبِيرٌ، یعنی جس کام سے شریعت اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس گناہ کو اصطلاح میں صغیرہ یا چھوٹا کہا جاتا ہے، اس کے یہ معنی کسی کے نزدیک نہیں ہیں کہ ایسے گناہوں کے ارتکاب میں غفلت یا سستی برتی جائے اور ان کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کیا جائے، بلکہ صغیرہ گناہ کو دنیا کی اور بے پرواہی کے ساتھ کیا جائے، تو وہ صغیرہ بھی کبیرہ ہو جاتا ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا کہ چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے چھوٹا بچہ اور بڑا بچہ، یا آگ کے بڑے انگارے اور چھوٹی چنگاری کہ انسان ان دونوں میں سے کسی کی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، اسی لئے محمد بن کعب قرظیؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ گناہوں کو ترک کیا جائے، جو لوگ نماز، بیع کے ساتھ گناہوں کو نہیں چھوڑتے ان کی عبادت مقبول نہیں، اور حضرت فضیل بن عیاضؓ نے فرمایا کہ تم جس قدر کسی گناہ کو ہلکا سمجھو گے اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہو جائے گا، اور سلف صالحینؓ نے فرمایا کہ ہر گناہ کفر کا قاصد ہے، جو انسان کو کافرانہ اعمال و اخلاق کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ



کو ایک خط میں لکھا کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کے مزاح بھی مذمت کرنے لگتے ہیں اور دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں، گناہوں سے بے پرواہی انسان کے لئے دائمی تباہی کا سبب ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے، پھر اگر توبہ اور استغفار کر لیا تو یہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اور اگر توبہ نہ کی تو یہ نقطہ بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کے پورے دل پر چھپا جاتا ہے، اور اس کا نام مسترآن میں رین ہے کَلَّا بَلْ سَاءَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ" یعنی ان کے دلوں پر رنگ لگا دیا ان کے اعمال بد نے (۳۱: ۳۲) البتہ گناہوں کے مفسد اور نتائج بد اور مضمرات کے اعتبار سے ان کے آپس میں فرق ضروری ہے، اس فرق کی وجہ سے کسی گناہ کو کبیرہ اور کسی کو صغیرہ کہا جاتا ہے۔

**گناہ کبیرہ** | گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن و حدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر مسترآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرات و بیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ابن عباسؓ کے سامنے کسی نے کبیرہ گناہوں کی تعداد سات بتلائی تو آپؐ نے فرمایا سات نہیں سات سو کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

امام ابن حجر مکیؒ نے اپنی کتاب الزواجر میں ان تمام گناہوں کی فہرست اور ہر ایک کی مکمل تشریح بیان فرمائی ہے، جو مذکور الصدر تعریف کی رو سے کبار میں داخل ہیں، انکی اس کتاب میں کبار کی تعداد چار سو ستر سٹھ تک پہنچی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بعض نے بڑے بڑے ابواب معصیت کو شمار کرنے پر اکتفا کیا ہے تو تعداد کم لکھی ہے بعض نے ان کی تفصیلات اور انواع و اقسام کو پورا لکھا تو تعداد زیادہ ہو گئی، اس لئے یہ کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا، اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین کہیں چھ کہیں سات کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اسی سے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا اتنا بیان کر دیا گیا۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبیرہ



گناہوں میں بھی جو سب بڑے ہیں میں تمہیں ان سے باخبر کرتا ہوں، وہ تین ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک سا بھی ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی، اور جھوٹی گواہی دینا یا جھوٹ بولنا۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کیا ہے، فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ تو فرمایا کہ تم اپنے بچہ کو اس خطرہ سے مار ڈالو کہ یہ تمہارے کھانے میں شریک ہو گا، تمہیں اس کو کھلانا پڑے گا، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کونسا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ اپنے بڑوسی کی بیوی کے ساتھ بدکاری کرنا، بدکاری خود ہی بڑا جرم ہے، اور بڑوسی کے اہل و عیال کی حفاظت بھی چونکہ اپنے اہل و عیال کی طرح انسان کے ذمہ لازم ہے اس لئے یہ جرم دو گنا ہو گیا۔

صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بات کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالیاں دے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے ہی ماں باپ کو گالی دینے لگے؟ فرمایا کہ ہاں! جو شخص کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دیتا دیتا ہے اس کے نتیجے میں وہ اس کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے خود اپنے ماں باپ کو گالیاں دی ہوں، کیونکہ یہی ان گالیوں کا سبب بنا ہے۔

اور صحیح بخاری کی ایک روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک اور قتل ناحق اور یتیم کا مال ناجائز طریق پر کھانے اور سود کی آمدنی کھانے اور میدانِ جہاد سے بھاگنے اور پاکہ من عورتوں پر تہمت لگانے اور ماں باپ کی نافرمانی کرنے اور بیت اللہ کی بے حرمتی کرنے کو کبیرہ گناہوں میں شمار فرمایا ہے۔

بعض روایات حدیث میں اس کو بھی کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے کہ کوئی شخص دارالکفر سے ہجرت کرنے کے بعد پھر دارالہجرہ کو چھوڑ کر دارالکفر میں دوبارہ چلا جائے۔ دوسری روایات حدیث میں ان صورتوں کو بھی گناہ کبیرہ کی فہرست میں داخل کیا گیا ہے مثلاً جھوٹی قسم کھانا، اپنی ضرورت سے زائد پانی کو روک رکھنا، دوسرے ضرورت والوں کو نہ دینا، جادو سیکھنا، جادو کا عمل کرنا، اور فرمایا کہ شراب پینا اکبر الکبائر ہے، اور فرمایا کہ شراب پینا ام الفواحش ہے کیونکہ شراب میں مست ہو کر آدمی ہر بڑے سے بُرا کام کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ سب سے بڑا کبیرہ گناہ یہ ہے کہ انسان اپنے مسلمان بھائی پر ایسے عیب لگائے جس سے اس کی آبروریزی ہوتی ہو۔



ایک حدیث میں ہے جس شخص نے بغیر کسی عذر شرعی کے دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کر دیا تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوا، مطلب یہ ہے کہ کسی نماز کو اپنے وقت میں نہ پڑھا، بلکہ قصداً کر کے دوسری نماز کے ساتھ پڑھا۔

بعض روایات حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا بھی کبیرہ گناہ ہے اور اس کے عذاب و سزا سے بے فکر و بے خوف ہو جانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ وارث کو نقصان پہنچانے اور اس کا حصہ میراث کم کرنے کے لئے کوئی وصیت کرنا بھی کبائر میں سے ہے۔

اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ خبابؓ و خاصرؓ ہوتے اور تباہ ہو گئے اور تین دفعہ اس کلمہ کو دہرایا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ محروم القسمہ اور تباہ و برباد کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا ایک وہ شخص جو تکبر کے ساتھ پاجامہ یا تہبند یا کرتہ اور عبا کو ٹخنوں نیچے لٹکاتا ہے، دوسرے وہ آدمی جو اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کر کے احسان جتلائے، تیسرے وہ آدمی جو بوڑھا ہونے کے باوجود بدکاری میں مبتلا ہو، چوتھے وہ آدمی جو بادشاہ یا افسر ہونے کے باوجود جھوٹ بولے، پانچویں وہ آدمی جو عیال دار ہونے کے باوجود تکبر کرے، چھٹے وہ آدمی جو کسی امام کے ہاتھ پر محض دنیا کی خاطر بیعت کرے۔

اور صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ چغلی کھانے والا جنت میں نہ جائے گا۔ اور نسائی و مسند احمد وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ چند آدمی جنت میں نہ جائیں گے شرابی، ماں باپ کا نافرمان، رشتہ داروں سے بلا وجہ قطع تعلق کرنے والا، احسان جتلائی والا جنات و شیاطین یا دوسرے ذرائع سے غیب کی خبریں بتانے والا، دیوث، یعنی اپنے اہل عیال کو بے حیائی سے نہ روکنے والا۔

مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اُس شخص پر جو کسی جانور کو اللہ کے سوا کسی کے لئے قربان کرے۔

وَلَا تَمْنُوا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ لِّلرَّجَالِ

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دے اللہ نے ایک کو ایک پر مردوں کو

نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

حصہ ہے اپنی کمائی سے اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے



وَسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝۳۳

اور مانگو اللہ سے اس کا فضل بے شک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۝

اور ہر کس کے لئے ہم نے مقرر کر دیئے ہیں وارث اس مال کے کہ چھوڑ میں ماں باپ اور قرابت والے،

وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتَوْهُمْ نَصِيبَهُمْ ۝

اور جن سے معاہدہ ہوا تمھارا ان کو دیدو ان کا حصہ بے شک

اللَّهُ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ۝۳۴

اللہ کے روبرو ہے ہر چیز۔

**رابط آیات** | ماقبل کی آیتوں میں میراث کے احکام گذرے ہیں، ان میں یہ بھی بتلایا جا چکا ہے

کہ میت کے ورثہ میں اگر مرد اور عورت ہو، اور میت کی طرف رشتہ کی نسبت ایک ہی طرح کی ہو تو مرد کو عورت کی نسبت دو گنا حصہ ملے گا، اسی طرح کے اور فضائل بھی مردوں کے ثابت ہیں، حضرت ام سلمہؓ نے اس پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے، اور بھی فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہیں۔

مقصداً اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی تمنا تھی کہ اگر ہم لوگ بھی مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل ہمیں بھی حاصل ہو جاتے، بعض عورتوں سے یہ تمنا کی کہ کاش ہم مرد ہوتے تو مردوں کی طرح جہاد میں حصہ لیتے اور جہاد کی فضیلت ہمیں حاصل ہو جاتی۔

ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مرد کو میراث میں دو گنا حصہ ملتا ہے اور عورت کی شہادت بھی مرد سے نصف ہے تو کیا عبادات و اعمال میں بھی ہم کو نصف ہی ثواب ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں دونوں قولوں کا جواب دیا گیا ہے، حضرت ام سلمہؓ کے قول کا جواب وَلَا تَسْتَمْتِرُوا سے دیا گیا، اور اس عورت کے قول کا جواب لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ سے دیا گیا۔

## خلاصہ تفسیر

اور ہم سب مردوں، عورتوں کو حکم ہوتا ہے کہ فضائل و نیکیوں میں سے ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (مثلاً مردوں کو) بعضوں پر (مثلاً عورتوں پر)



بلا دخل ان کے کسی عمل کے، فوقیت بخشی ہے، (جیسے مرد ہونا یا مردوں کا حصہ ہونا یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیرہ لکھنے) مردوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے، (اور مدار نجات کا قانوناً یہی اعمال ہیں، اور ان میں کسی کی تخصیص نہیں، تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال میں جو فضائل کسبیتہ ہیں کوشش کر کے دوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کرو، باوجود اس پر قادر ہونے کے فضائل خاصہ مذکورہ کی تمنائیں محض ہوس اور فضول ہے) اور اگر فضائل و ہبیتہ میں ایسے فضائل کی رغبت ہے جن میں اعمال کو بھی دخل ہے مثلاً احوال و کمالات باطنیہ و امثالہا تو فضائل کسبیتہ نہیں، لیکن اس کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ خالی تمنائیں کیا کرو، بلکہ یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (خاص) کی درخواست (یعنی دعا) کیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس میں سب چیزیں آگئیں، یعنی فضائل و ہبیتہ قسم اول کی وجہ تخصیص بھی، اور فضائل کسبیتہ پر ثواب دینا بھی، اور فضائل و ہبیتہ قسم دوم کی درخواست بھی، پس یہ جملہ سب متعلق ہے) اور ہر ایسے مال کے لئے جسکو الدین اور (دوسرے) رشتہ دار لوگ (اپنے مرنے کے بعد) چھوڑ جاویں، ہم نے وارث مقرر کر دیئے ہیں، اور جن لوگوں سے تمھارے عہد (پہلے سے) بندھے ہوئے ہیں (اسی کو مولیٰ الموالات کہتے ہیں) ان کو (اب جبکہ شرع سے رشتہ دار لوگ وارث مقرر ہو گئے، ساری میراث مت دو، بلکہ صرف) ان کا حصہ (یعنی ایک ششم) دیدو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں (پس ان کو ساری میراث نہ دینے کی حکمت اور ششم حصہ مقرر کر دینے کی مصلحت اور یہ کہ یہ ششم ان کو کون دیتا ہے کون نہیں دیتا، ان سب کی ان کو خبر ہے)۔

## معارف و مسائل

امور خستہ یارہ اور غیر خستہ یارہ | آیت میں ان غیر خستہ یارہ کی تمنائیں کی منع کیا گیا ہے۔  
کی تمنائیں کرنا | جو دوسروں کو حاصل ہوں — وجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو دوسروں سے مال و دولت، آرام و عیش و حسن و خوبی، علم و فضل وغیرہ میں کم پاتا ہے تو عادتاً اس کے دل میں ایک مادہ حسد کا ابھرتا ہے، جس کا تقاضا کم سے کم یہ ہوتا ہے کہ میں بھی اس کے برابر یا زیادہ ہو جاؤں، اور بسا اوقات اس پر قدرت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت کمالات ایسے ہیں جن میں انسان کے سعی و عمل کو کوئی دخل نہیں، وہ محض قدرت کے انعام ہوتے ہیں، جیسے کسی شخص کا مرد ہونا، یا کسی اعلیٰ خاندان نبوت میں یا خاندان حکومت میں



پیدا ہونا، یا حسین و خوب صورت پیدا ہونا وغیرہ کہ جس شخص کو یہ انعامات حاصل نہیں، وہ اگر عمر بھر اس کی کوشش کرے کہ مثلاً مرد ہو جائے یا خاندانی سید بن جائے، اس کا ناک نقشہ، قد و قامت حسین ہو جائے، تو یہ اس کی قدرت میں نہیں، نہ کسی دوا، اور علاج یا تدبیر سے وہ ان چیزوں کو حاصل کر سکتا ہے، اور جب دوسرے کی برابری پر قدرت نہیں ہوتی تو اب اس کے نفس میں یہ خواہش جگہ بکھڑتی ہے کہ دوسروں سے بھی یہ نعمت چھین جائے تاکہ وہ بھی اس کے برابر یا کم ہو جائیں، اسی کا نام حسد ہے، جو انسانی اخلاق میں انتہائی شرمناک اور مضر خصلت ہے، اور دنیا کے بہت سے جھگڑوں اور فسادات، قتل و غارتگری کا سبب ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت نے اس فساد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ارشاد فرمایا **وَلَا تَمْتَنُوا** مَا قُضِيَ إِلَيْكُمْ بِهِ **بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ**، یعنی اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکمت و مصلحت جو کمالات و فضائل لوگوں میں تقسیم فرمائے ہیں، کسی کو کوئی وصفت دیدیا کسی کو کوئی، کسی کو کم کسی کو زیادہ، اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت پر راضی اور خوش رہنا چاہئے، دوسرے کے فضائل و کمالات کی تمنا میں نہ پڑنا چاہئے، کہ اس کا نتیجہ اپنے لئے رنج و غم اور حسد کے گناہ عظیم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جس کو حق تعالیٰ نے مرد بنا یا زیادہ اس پر شکر ادا کرے جس کو عورت بنا دیا وہ اسی پر راضی رہے اور سمجھے کہ اگر وہ مرد ہو جاتی تو شاید مردوں کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکتی، اور گنہگار ہو جاتی، جس کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت پیدا کیا ہے وہ اس پر شکر گزار ہو کہ اس کو ایک نعمت ملی، اور جو بد صورت ہے وہ بھی رنجیدہ نہ ہو اور سمجھے کہ میرے لئے اسی میں کوئی خیر مقدر ہوگی، اگر مجھے حسن و جمال ملتا تو شاید کسی فتنہ اور خرابی میں مبتلا ہو جاتا، جو شخص نسب کے اعتبار سے سید ہاشمی ہے وہ اس پر شکر کرے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، اور جس کو یہ نسبت حاصل نہیں وہ اس فکر میں نہ پڑے اور اس کی تمنا بھی نہ کرے، کیونکہ چہیز کسی کوشش سے حاصل ہونے والی نہیں، اس کی تمنا اس کو گناہ میں مبتلا کر دے گی، اور بجز رنج و غم کے کچھ حاصل نہ ہوگا، بجائے نسب پر افسوس کرنے کے اعمال صالحہ کی فکر میں زیادہ پڑے، ایسا کرنے سے وہ بڑے نسب والوں سے بڑھ سکتا ہے۔

بعض آیات قرآنی اور ارشادات نبوی میں مسابقت فی الخیرات، یعنی نیک کاموں میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کا حکم یا دوسروں کے فضائل و کمالات کو دیکھ کر ان کی تحصیل کے لئے سعی و عمل اور جدوجہد کی ترغیب آتی ہے تو وہ ان اعمال و افعال سے متعلق ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، اور کسب و کنساب کے حاصل ہو سکتے ہیں، مثلاً



علی فضائل اور عملی و اخلاقی کمالات کسی کے دیکھ کر ان کے حاصل کرنے کی جدوجہد مستحسن اور پسندیدہ عمل ہے، یہ آیت اس کے منافی نہیں، بلکہ آیت کا آخری حصہ اس کی تائید کر رہا ہے، جس میں ارشاد ہے لِلَّذَّیْنَ جَالٍ نَّعِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلَّذِیْنَ كَسَبُوا صِلٰتٌ، یعنی جو کوئی چیز مردوں نے کسب و عمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا، اور جو عورتوں نے سعی و عمل کے ذریعہ حاصل کی ان کو اس کا حصہ ملے گا۔

اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ فضائل و کمالات کی تحصیل میں کسب و اكتساب اور جدوجہد بیکار نہیں، بلکہ ہر مرد و عورت کو اس کی سعی و عمل کا حصہ ضرور ملے گا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کے علی، علی، اخلاقی فضائل کو دیکھ کر ان کی تمنا، اور پھر تمنا پوری کرنے کے لئے سعی و عمل اور جدوجہد کرنا مطلوب اور مستحسن ہے۔

یہاں ایک مغالطہ بھی رفع ہو گیا، جس میں بہت سے ناواقف مبتلا ہو کر تے ہیں بعض تو غیر اختیاری فضائل کی تمنا میں لگ کر اپنے عیش و آرام اور سکون و اطمینان کو دنیا ہی میں برباد کر لیتے ہیں، اور اگر نوبت حسرت تک پہنچ گئی، یعنی دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا ہونے لگی تو آخرت بھی برباد ہوئی، کیونکہ حسرت کے گناہ عظیم کا ارتکاب ہوا۔

اور بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی سستی، کم ہمتی، بلکہ بے غیرتی سے اختیاری فضائل حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے اور کوئی کہے تو اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے قیمت و تقدیر کے حوالے دینے لگتے ہیں۔

اس آیت نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلادیا، کہ جو کمالات و فضائل غیر اختیاری ہیں اور ان میں اندان کا کسب و عمل موثر نہیں، جیسے کسی کا عالی نسب یا حسین و خوب صورت پیدا ہونا، وغیرہ، ایسے فضائل کو تو حوالہ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور تقدیر بخ و غم ہے۔ اور جو فضائل و کمالات اختیاری ہیں جو کسب و عمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب و عمل اور جدوجہد بھی ہو، اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی و عمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی، بلکہ ہر ایک کو بقدر محنت حصہ ملے گا مرد و عورت۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس آیت سے پہلے لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ یا بِاَیْمَانِی اور لَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ کے احکام آئے تھے جن میں کسی کا مال ناحق استعمال کرنے اور کسی کو ناحق قتل کرنے کی ممانعت ہے، اس آیت میں ان دونوں جرموں کے سرچشمہ



کو بند کرنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ دوسرے لوگوں کو جو مال و دولت یا عیش و عشرت یا عزت و جاہ وغیرہ میں تم پر تفوق خدا داد حاصل ہے، تم اس کی تمنا بھی نہ کرو۔ اس میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چوری، ڈاکہ اور دوسرے ناجائز طریقوں سے کسی کا مال لینا، یا قتل و غارتگری کرنا، ان سب جرائم کا اصل منشاء یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان جب دوسرے انسان کو مال و دولت وغیرہ میں اپنے سے فائق اور بڑھا ہوا پاتا ہے تو اول اس کے دل میں اس کی برابری یا اس سے برتری کی خواہش و تمنا پیدا ہوتی ہے، پھر یہ تمنا ہی ان سب جرائم تک پہنچا دیتی ہے، شرابی ہدایت نے ان تمام جرائم کے سرچشمہ کو بند کر دیا کہ دوسروں کے فضائل و کمالات کی تمنا ہی کو روک دیا۔

آیت میں اس کے بعد ارشاد ہے وَسْئَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ، اس میں یہ ہدایت ہے کہ جب تم کسی کو کسی کمال میں اپنے سے زائد دیکھو تو بجائے اس کے کہ اُس خاص کمال میں اس کے برابر ہونے کی تمنا کرو، تمہیں کرنا یہ چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کی درخواست کرو، کیونکہ فضل خداوندی ہر شخص کے لئے جدا جدا صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے، کسی کے لئے مال و دولت فضل الہی ہوتا ہے، اگر وہ فقیر ہو جائے تو گناہ و کفر میں مبتلا ہو جائے، اور کسی کے لئے تنگی اور تنگدستی ہی میں فضل ہوتا ہے، اگر وہ غنی اور مالدار ہو جائے تو ہزاروں گناہوں کا شکار ہو جائے، اسی طرح کسی کی عزت و جاہ کی صورت میں فضل خداوندی ہوتا ہے، کسی کے لئے گناہی اور کس میری ہی میں اس کے فضل کا ظہور ہوتا ہے، اور حقیقت حال پر نظر کرے تو معلوم ہو جائے کہ اگر اس کو عزت و جاہ ملتی تو بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا۔

اس لئے اس آیت نے یہ ہدایت دی کہ جب اللہ سے مانگو تو کسی خاص وصف معین کو مانگنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا فضل مانگو تاکہ وہ اپنی حکمت کے مطابق تم پر اپنے فضل کا دروازہ کھول دے۔

آخر آیت میں فرمایا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتے والا ہے، اس میں اشارہ فرمادیا کہ حق تعالیٰ کی تقسیم عین حکمت اور عین عدل و انصاف ہے، جس کو جس حال میں پیدا کیا اور رکھا ہے، وہی مقتضائے حکمت و عدل تھا، مگر چونکہ انسان کو اپنے اعمال کے عواقب کا پورا پتہ نہیں ہوتا، اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ کس کو کس حال میں رکھنا اس کے لئے مفید ہے۔

آیت مذکورہ کی شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب میراث میں مردوں کا دوا



حصہ مسترد ہوا تو بعض عورتوں نے یہ تمنا کی کہ ہم مرد ہوتے تو ہمیں بھی وہ ہر حصہ ملتا، اس کے مناسب دوسری آیت میں میراث کے قانون کا اعلاہ اس انداز سے کر دیا گیا کہ اس میں جو کچھ حصے مسترد کئے گئے ہیں وہ عین حکمت اور مطابق عدل ہیں، انسانی عقل چونکہ تمام عالم کے مصالح و مفاسد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے وہ ان حکمتوں کو بھی نہیں پہنچ سکتی، جو خدا تعالیٰ کے مسترد کردہ قانون میں ملحوظ ہیں، اس لئے جو حصہ کسی کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے اس کو اس پر راضی رہنا اور شکر گزار ہونا چاہئے۔

عقد مولات سے | اس آیت کے آخر میں جو باہمی معاہدہ کی بنا پر حصہ دینا مذکور ہے، یہ ابتدائی مہلک میراث پہنچنے کا حکم میں تھا، بعد میں آیت **وَأُولَ الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ** سے یہ سوخ ہو گیا، اب اگر دوسرے ورثاء موجود ہوں تو ذو شخصوں کے باہمی معاہدہ کا میراث پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

**الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى**

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو

**بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَإِلَّا فَالِصَّاحَةُ قِنْتُ**

ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال پھر جو عورتیں نیک ہیں تا بعد از ہیں

**حَفِظَتْ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ وَالَّتِي تَخَافُونَ**

بھبھائی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے اور جن کی بد خوئی کا ڈر ہو

**نَشْوَنَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ**

تم کو تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو ان کو

**فَإِنْ اطَّعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ**

پھر اگر کہا مانیں تمھارا تو مت تلاش کرو ان پر راہ الزام کی بیشک اللہ ہے سب سے

**عَلِيًّا كَبِيرًا ۝ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَأَبْعَثُوا حَكَمًا**

اوپر بڑا اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف

**مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِ مَآجٍ إِنْ يَرِيْدَا إِصْلَاحًا وَفِي**

مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے، اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ

**اللَّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا ۝**

موافقت کر دے گا ان دونوں میں، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔



**رَبِّطِ آيَاتِ** عورتوں کے متعلق جو احکام گذر چکے ہیں، اس میں ان کی حق تلفی کی ممانعت بھی مذکور ہوئی، اب آگے مردوں کے حقوق کا ذکر ہے، اور ان کے مطالبہ اور ان کو فوت کرنے کی صورت میں تادیب کی اجازت بھی دی گئی ہے، حقوق میں اختلاف واقع ہونے کی صورت میں اس کے تصفیہ کا طریق اور حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت بھی مذکور ہے، اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اس سے یہ جواب بھی نکل آیا کہ جب مرد عورت کے مقابلہ میں افضل ہیں تو یہ شکال نہیں ہونا چاہئے، کہ میراث میں ان کا حصہ عورتوں کی نسبت زیادہ کیوں ہے؟

## خُلاصۂ تفسیر

مرد محاکم میں عورتوں پر (دو وجہ سے، ایک تو) اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (یعنی مردوں کو) بعضوں پر (یعنی عورتوں پر قدرتی) فضیلت دی ہے، (یہ تو وہی امر ہے) اور (دوسرے) اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں اور نان نفقہ میں) خرچ کئے ہیں، (اور خرچ کرنے والوں کا ہاتھ اونچا اور بہتر ہوتا ہے اس سے کہ جس پر خرچ کیا جاوے اور یہ امر مستحب) سو جو عورتیں نیک ہیں (وہ مرد کے ان فضائل و حقوق کی وجہ سے) اطاعت کرتی ہیں (اور) مرد کی عدم موجودگی میں (بھی) بحفاظت (و توفیق) الہی (اس کی آبرو و مال کی) نگہداشت کرتی ہیں اور جو عورتیں (اس صفت کی نہ ہوں، بلکہ) ایسی ہوں کہ تم کو (قرآن سے) ان کی بددماغی کا احتمال (قوی) ہو تو ان کو (اول) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو) ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تہنا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو) ان کو (اعتدال کے ساتھ) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو ان پر زبانی کرنے کے لئے، بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت اور عظمت والے ہیں (ان کے حقوق اور قدرت اور علم سب بڑے ہیں، اگر تم ایسا کرو گے پھر وہ بھی تم پر اپنے حقوق کے متعلق ہزاروں الزام قائم کر سکتے ہیں) اور اگر (قرآن سے) تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بی بی میں (ایسی کشاکش کا) اندیشہ ہو کر آؤ (وہ باہم نہ صلح کر سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (جو بیز کر کے اس کشاکش کے رفع کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں، اور جو بے راہی پر ہو یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو سمجھا دیں) اگر ان دونوں آدمیوں



کو دیکھ کر دل سے اصلاح و معاملہ کی منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بی بی میں بشرطیکہ وہ ان دونوں کی رائے پر عمل بھی کریں، اتفاق فرمادیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں جس طریق سے ان میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو جانتے ہیں، جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے وہ طریق ان کے قلب میں القاء فرمادیں گے۔

## معارف و مسائل

سورۃ نسا کے شروع سے یہاں تک بیشتر احکام اور ہدایات عورتوں کے حقوق سے متعلق آئی ہیں جن میں ان مظالم کو مٹایا گیا ہے جو اسلام سے پہلے پوری دنیا میں اس صنفِ نازک پر توڑے جاتے تھے، اسلام نے عورتوں کو وہ تمام انسانی حقوق دیے جو مردوں کو حاصل ہیں، اگر عورتوں کے ذمہ مردوں کی کچھ خدمات عائد کیں تو مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق فرض کئے۔ سورۃ بقرہ کی آیت میں ارشاد فرمایا، وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ (۲۲۸: ۲) یعنی عورتوں کے حقوق مردوں کے ذمہ ایسے ہی واجب ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں کے ذمہ ہیں، اس میں دونوں کے حقوق کی مماثلت کا حکم دے کر اس کی تفصیلات کو عرف کے حوالہ فرمایا، جاہلیت اور تمام دنیا کی ظالمانہ رسموں کا یکسر خاتمہ کر دیا، ہاں یہ ضروری نہیں کہ دونوں کے حقوق صورت کے اعتبار سے متماثل ہوں، بلکہ عورت پر ایک قسم کے کام لازم ہیں تو اس کے مقابل مرد پر دوسری قسم کے کام ہیں، عورت امور خانہ داری اور بچوں کی تربیت و حفاظت، ذمہ دار ہے تو مردان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسب معاش کا ذمہ دار ہے، عورت کے ذمہ مرد کی خدمت و اطاعت ہے تو مرد کے ذمہ اس کا مهر اور نفقہ یعنی تمام ضروری اخراجات کا انتظام ہے، غرض اس آیت نے عورتوں کو مردوں کے مماثل حقوق دیدیئے۔

لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جس میں مردوں کو عورتوں پر تفوق اور ایک خالص فضیلت حاصل ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فرمایا، وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَ دَرَجَةٌ، یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت کا حاصل ہے۔

ان آیات میں اسی درجہ کا بیان قرآن کریم کے حکیمانہ طرز بیان کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے کہ مردوں کی یہ فضیلت اور تفوق خود عورتوں کی مصلحت اور فائدہ کے لئے اور عین مقتضائے حکمت ہے، اس میں عورت کی نہ کسر شان ہے نہ اس کا کوئی نقصان ہے۔

ارشاد فرمایا، الرِّجَالُ كَسُوا مَوْنًا عَلَى النِّسَاءِ (۲۲۱: ۵)، قَوَّامٌ، قِيَّامٌ، قِيَّتُمْ، عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلائے والا ہو، اسی لئے



اس آیت میں قوام کا ترجمہ عموماً حاکم کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہوتا ہے کہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلہ سے کام چل سکے، جس طرح ملک و سلطنت اور ریاست کے لئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی، اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے، اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلہ میں اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علی اور علی قوتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں، اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھدار عورت یا مرد اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

**خلاصہ یہ ہے** سورۃ بقرہ کی آیت میں وَالرِّجَالُ عَلَى النِّسَاءِ (۲۲۸:۲) فرما کر اور سورۃ نسا کی آیت متذکرہ میں الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ فرما کر یہ بتلادیا گیا کہ اگرچہ عورتوں کے حقوق مردوں پر ایسے ہی لازم و واجب ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں اور دونوں کے حقوق باہم مماثل ہیں، لیکن ایک چیز میں مردوں کو مستیاز حاصل ہے کہ وہ حاکم ہیں۔ اور قرآن کریم کی دوسری آیات میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ حکومت جو مردوں کی عورتوں پر ہے محض آمریت اور استبداد کی حکومت نہیں، بلکہ حاکم یعنی مرد بھی قانون شرع اور مشورہ کا پابند ہے، محض اپنی طبیعت کے تقاضہ سے کوئی کام نہیں کر سکتا، اس کو حکم دیا گیا ہے کہ عَاشِرُ وَهْنٍ بِالنِّسَاءِ وَهْنٌ (۱۹:۵) یعنی عورتوں کے ساتھ معروف طریقہ پر اچھا سلوک کرو۔

اسی طرح دوسری آیت میں عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ (۲۲۳:۲) کی تعلیم ہے، جس میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ امور خانہ داری میں بیوی کے مشورہ سے کام کریں، اس تفصیل کے بعد مرد کی حاکمیت عورت کے لئے کسی بچ کا سبب نہیں ہو سکتی، تاہم چونکہ یہ احتمال تھا کہ مردوں کی اس فضیلت اور اپنی محکومیت سے عورتوں پر کوئی ناگوار اثر ہو، اس لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ صرف حکم بتلانے اور جاری کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی اس کی حکمت اور وجہ بھی بتلادی، ایک وہی جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں، دوسرے کسی جو عمل کا اثر ہے۔

پہلی وجہ یہ ارشاد فرمائی يَمَّا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمُ عَلَى بَعْضٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں خاص حکمت و مصلحت کے تحت ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے، کسی کو افضل کسی کو مفضول بنایا ہے، جیسے ایک خاص گھر کو اللہ نے اپنا بیت اللہ اور قبلہ قرار دیدیا،



بیت المقدس کو خاص فضیلت دیدی، اسی طرح مردوں کی حاکمیت بھی ایک خدا اور فضیلت ہے جس میں مردوں کی سعی و عمل یا عورتوں کی کوتاہی و بے عملی کا کوئی دخل نہیں۔

دوسری وجہ کسی اور خستہ کاری ہے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، مہر لدا کرتے ہیں، اور ان کی تمام ضروریات کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ ان دو وجہ سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا۔

**فائدہ :-** یہاں ایک بات اور قابل غور ہے، ابن حبانؒ بحر محیط میں لکھتے ہیں، کہ آیت میں حاکمیت رجال کی دو وجہوں کے بیان سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کسی کو ولایت و حکومت کا استحقاق محض زور و تغلب سے قائم نہیں ہوتا، بلکہ کام کی صلاحیت و اہلیت ہی اس کو حکومت کا مستحق بنا سکتی ہے۔

مردوں کی افضلیت کے پہلی وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نسا کی طرف ضمیر میں بیان کے لئے قرآن حکیم عائد کر کے فَضَّلَهُمْ عَلَيْهِمْ فرما دیا جاتا، مگر قرآن کریم نے عنوان کا عجیب اسلوب بدل کر بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ کے الفاظ اختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا بعض اور جزو قرار دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور افضلیت ثابت بھی ہو جائے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کا سر اس کے ہاتھ سے افضل یا انسان کا دل اس کے معدے سے افضل ہے، تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مثل اعضاء و اجزاء کے ہیں، مرد دوسرے کو عورت بدن۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالات علمی و عملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے اور صفت حاکمیت میں بھی مرد سے فائق ہو جائے۔

مرد اور عورت کے مختلف اعمال | دوسری وجہ خستہ کاری جو یہ بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال تقسیم کار کے اصول پر مبنی ہیں | عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیات میراث میں مردوں کا حصہ دہرا اور عورتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہو سکتا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلا دی کہ مالی ذمہ داریاں تمام مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے



ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے اور شادی کے بعد شوہر پر اس لئے اگر غور کیا جائے، تو مرد کو دو ہر حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورتوں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔ دوسرا اشارہ ایک اہم اصول زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے عہتبار سے نہ اس کی محمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اس کے حالات اس کے لئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح وفرتوں اور بازاروں میں پھرا کرے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اس کی پوری ذمہ داری مرد پر ڈال دی، شادی سے پہلے باپ اس کا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر۔ اس کے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مرد ان امور کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اس کا رتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر ڈیوٹیاں تقسیم کر دی گئی ہیں، ہاں ڈیوٹیوں کے درمیان جو باہم تفاضل ہوا کرتا ہے وہ یہاں بھی ہے۔

اس لئے یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلا دیا گیا کہ مردوں کی حاکمیت سے عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اس کا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔

**صلح بیوی** | اس آیت کے شروع میں بطور ضابطہ یہ بتلا دیا گیا کہ مرد عورت پر حاکم ہے اس کے بعد نیک و بد عورتوں کا بیان اس طرح فرمایا: **قَالَصَلِّحْتُ قَبِيضًا** خِفْظًا لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ یعنی نیک عورتیں وہ ہیں جو مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے ان کی اطاعت کرتی ہیں اور مردوں کے پیٹھے پیچھے بھی اپنے نفس اور ان کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، یعنی اپنی عصمت اور گھر کے مال کی حفاظت جو امور خانہ داری میں سب سے اہم ہیں، ان کے بجالانے میں ان کے لئے مردوں کے سامنے اور پیچھے کے حالات بالکل مساوی ہیں، یہ نہیں کہ ان کے سامنے تو اس کا اہتمام کریں اور ان کی نظروں سے غائب ہوں تو اس میں لا پرواہی برتیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر ارشاد فرمایا کہ:

”یعنی بہترین عورت وہ ہے کہ جب تم اس کو دیکھو تو خوش ہو، اور جب اس کو کوئی حکم دو تو اطاعت کرے اور جب تم

خَيْرُ النِّسَاءِ امْرَأَةٌ اِذَا نَظَرْتُ  
اِلَيْهَا سَرَّ لَكَ وَ اِذَا اَمَرْتَهَا  
الْحَاظِلَكَ وَ اِذَا اَخْبَرْتَهَا



حَفِظْتُكَ فِي مَالِهَا وَنَفْسِهَا

غائب ہو تو اپنے نفس اور مال کی حفاظت کرے

اور چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت دونوں آسان کام نہیں، اس لئے آگے فرمادیا يَتَحَفِظُ اللَّهُ، یعنی اس حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں، انہی کی امداد اور توفیق سے وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں، ورنہ نفس و شیطان کے مکائد ہر وقت ہر انسان مرد و عورت کو گھیرے ہوئے ہیں، اور عورت میں خصوصاً اپنی علمی اور عقلی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں، اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط نظر آتی ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق اور امداد ہے، ایسی وجہ ہے کہ بے حیائی کے گناہوں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔

اطاعت شعار، تابع دار عورتوں کی فضیلت جہاں اس آیت سے مفہوم ہوتی ہے وہاں اس سلسلہ میں احادیث بھی وارد ہیں۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو عورت اپنے شوہر کی تابعدار و مطیع ہو اس کے لئے استغفار کرتے ہیں پرندے ہوا میں اور مچھلیاں دریا میں، اور فرشتے آسمانوں میں اور درندے جنگلوں میں۔ (بحر محیط)

تفسیر مان بیوی اور اس کی اصلاح کا طریقہ | اس کے بعد ان عورتوں کا ذکر ہے جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار نہیں یا جن سے اس کام میں کوتاہی ہوتی ہے، قرآن کریم نے ان کی اصلاح کے لئے مردوں کو علی الترتیب تین طریقے بتلائے، وَالَّتِي تَخَافُونَ لِمُتَوَنِّهِنَّ

فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْبِرْنَ لَهُنَّ، یعنی عورتوں کی طرف سے اگر نافرمانی کا صدور یا اندیشہ ہو، تو پہلا درجہ ان کی اصلاح کا یہ ہے کہ نرمی سے ان کو سمجھاؤ اور اگر وہ محض سمجھانے سے باز نہ آئیں، تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کا بسترہ اپنے سے علیحدہ کر دو، تاکہ وہ اس علیحدگی سے شوہر کی ناراضی کا احساس کر کے اپنے فعل پر نادم ہو جائیں قرآن کریم کے الفاظ میں فِي الْمَضَاجِعِ کا لفظ ہے، اس سے فقہاء، رحمہم اللہ نے یہ مطلب نکالا کہ جدائی صرف بسترہ میں ہو، مکان کی جدائی نہ کرے، کہ عورت کو مکان میں تہنا چھوڑ دے اس میں ان کو بچ بھی زیادہ ہوگا، اور فساد بڑھنے کا اندیشہ بھی اس میں زیادہ ہے۔

ایک صحابیؓ سے روایت ہے :

قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا حُرْمَةُ زَوْجَتِي

أَخَذَ نَا عَلَيَّ، قَالَ أَنْ تُطْعِمَهَا

إِذَا أَطْعَمْتَ وَتَكْسُوَهَا إِذَا

”میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

عرض کیا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے

آپ نے فرمایا جب تم کھاؤ تو انہیں بھی



اَلْكُسَيْتَ وَلَا تُضْرِبِ الْوَجْهَ  
وَلَا تُقْبَحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِي  
اَلْكِبٰی (مشکوٰۃ، ص ۲۸۱)

بھی کھلاؤ اور تم پہنو تو انھیں بھی پہناؤ، اور  
چہرے پر مت مارو، اگر اس سے علحدگی کرنا چاہو  
تو صرف اتنی کر دو کہ (بستر الگ کر دو) مکان

اور جو اس شریفانہ سزا و تنبیہ سے بھی متاثر نہ ہو تو پھر اس کو معمولی مار مارنے کی بھی  
اجازت ہے، جس سے اس کے بدن پر اثر نہ پڑے، اور ہڈی ٹوٹنے یا زخم لگنے تک نوبت  
نہ آئے، اور چہرہ پر مارنے کو مطلقاً منع فرما دیا گیا ہے۔

ابتدائی دو سزائیں تو شریفانہ سزائیں ہیں، اس لئے انبیاء و صلحاء سے قولاً بھی انکی  
اجازت منقول ہے، اور اس پر عمل بھی ثابت ہے، مگر تیسری سزا یعنی مار پیٹ کی اگرچہ بدرجہ  
مجبوری ایک خاص انداز میں مرد کو اجازت دی گئی ہے مگر اس کے ساتھ ہی حدیث میں یہ  
بھی ارشاد ہے وَكُنْ يَضْرِبُ خِيَارَ كَعْدٍ، یعنی اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیئے  
چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے کہیں ایسا عمل منقول نہیں۔

ابن سعد اور بیہقی نے حضرت عدیل اکبرؓ کی صاحبزادی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ  
پہلے مردوں کو مطلقاً عورتوں کو مارنے سے منع کر دیا گیا تھا، مگر پھر عورتیں شیر ہو گئیں، تو یہ  
اجازت مکرر دی گئی۔

آیت مذکورہ کا تعلق بھی اسی قسم کے ایک واقعہ سے ہے، اس کا شان نزول ہے  
کہ زید بن ابی ہریرہؓ نے اپنی لڑکی حبیبہؓ کا نکاح حضرت سعد بن ربیعؓ سے کر دیا تھا، اُن کے  
آپس میں کچھ اختلاف پیش آیا، شوہر نے ایک طمانچہ مار دیا، حبیبہؓ نے اپنے والد سے شکایت  
کی، والد اُن کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ نے حکم  
دیدیا کہ حبیبہؓ کو حق حاصل ہے کہ جس زور سے سعد بن ربیعؓ نے ان کے طمانچہ مارا ہے وہ بھی  
اتنی ہی زور سے اُن کے طمانچہ ماریں۔

یہ دونوں حکم نبویؐ سن کر چلے کہ اس کے مطابق سعد بن ربیعؓ سے اپنا انتقام لیں، مگر  
اسی وقت آیت مذکورہ نازل ہو گئی، جس میں آخری درجہ میں مرد کے لئے عورت کی مار پیٹ  
کو بھی جائز قرار دیدیا ہے، اور اس پر مرد سے قصاص یا انتقام لینے کی اجازت نہیں دی،  
آیت نازل ہونے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلا کر حق تعالیٰ کا حکم سنا دیا،  
اور انتقام لینے کا پہلا حکم منسوخ فرما دیا۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ ان تدابیر سے گمانہ کے ذریعہ اگر وہ تابعدار ہو جائیں  
تو پھر تم بھی چشم پوشی سے کام لو، معمولی باتوں پر الزام کی راہ نہ تلاش کرو، اور سمجھ لو کہ



اللہ کی قدرت سب پر حاوی ہے۔

**خلاصہ مضمون** | آیت سے بنیادی اصول کی حیثیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلی آیات کے ارشادات کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حقوق باہم متماثل ہیں، بلکہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا اس وجہ سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ بہ نسبت مرد کے ضعیف ہیں، اپنے حقوق اپنی قوت بازو کے ذریعہ مرد سے حاصل نہیں کر سکتیں، لیکن اس مساوات کے یہ معنی نہیں کہ عورت و مرد میں کوئی تفاضل یا درجہ کا کوئی فرق ہی نہ ہو، بلکہ باقصدائے حکمت و انصاف دو سبب مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے:

اول تو جنس مرد کو اپنے علی اور علی کمالات کے اعتبار سے عورت کی جنس پر ایک خدا و فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، جس کا حصول جنس عورت کے لئے ممکن نہیں — افراد و احاد اور اتفاقی واقعات کا معاملہ الگ ہے۔

دوسرے یہ کہ عورتوں کی تمام ضروریات کا تکفل مرد اپنی کمائی اور اپنے مال سے کرتے ہیں۔ پہلا سبب وہی غیر خستیاری اور دوسرا کسی اور خستیاری ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں سے بعض کو حاکم بعض کو محکوم بنانے کے لئے عقل و انصاف کی رُو سے دو چیزیں ضروری تھیں، ایک جس کو حاکم بنایا جائے اس میں علم و عمل کے اعتبار سے حاکمیت کی صلاحیت، دوسرے اس کی حاکمیت پر محکوم کی رضا مندی، پہلا سبب مرد کی صلاحیت حاکمیت کو واضح کر رہا ہے، اور دوسرا سبب محکوم کی رضا مندی کو، کیونکہ بوقت نکاح جب عورت اپنے ہر اور نان نفقہ کے تکفل کی شرط پر نکاح کی اجازت دیتی ہے تو اس کی اس حاکمیت کو تسلیم اور منظور کرتی ہے۔

الغرض اس آیت کے پہلے جملہ میں خانگی اور عائلی نظام کا ایک بنیادی اصول بتلایا گیا ہے، کہ اکثر چیزوں میں مساواتِ حقوق کے باوجود مرد کو عورت پر ایک فضیلت حاکمیت کی حاصل ہے اور عورت محکوم و تابع ہے۔

اس بنیادی اصول کے ماتحت عملی دنیا میں عورتوں کے دو طبقے ہو گئے، ایک وہ جنہوں نے اس بنیادی اصول اور اپنے معاہدہ کی پابندی کی اور مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی۔ دوسرے وہ جو اس اصول پر پوری طرح قائم نہ رہا، پہلا طبقہ تو خانگی امن و اطمینان کا خود ہی کفیل ہے، اس کو کسی اصلاح کی حاجت نہیں۔ دوسرے طبقہ کی اصلاح کے لئے آیت کے دوسرے جملہ میں ایک ایسا مرتب نظام



بتلایا گیا کہ جس کے ذریعہ گھر کی اصلاح گھر کے اندر ہی ہو جائے اور میاں بیوی کا جھگڑا انہیں دونوں کے درمیان نمٹ جائے، کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہ ہو، اس میں مردوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا کہ اگر عورتوں سے نافرمانی یا اطاعت میں کچھ کمی محسوس کرو تو سب پہلا کام یہ کرو کہ سمجھا بھٹاکرا ان کی ذہنی اصلاح کرو، اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہو گیا، عورت ہمیشہ کے لئے گناہ سے اور مرد قلبی اذیت سے اور دونوں رنج و غم سے بچ گئے، اور اگر فہمائش سے کام نہ چلا تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کو تنبیہ کرنے اور اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لئے خود غلجہ بستر پر سووا، یہ ایک معمولی سزا اور بہترین تنبیہ ہے، اس سے عورت متنبہ ہو گئی تو جھگڑا یہیں ختم ہو گیا، اور اگر وہ اس شریفانہ سزا پر بھی اپنی نافرمانی اور کج روی سے باز نہ آئی تو تیسرے درجہ میں معمولی مار مارنے کی بھی اجازت دیدی گئی جس کی حد یہ ہے کہ بدن پر اس مار کا اثر و زخم نہ ہو۔ مگر اس تیسرے درجہ کی سزا کے استعمال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد فرمایا کہ شریف اور بھلے لوگ ایسا نہیں کریں گے۔

بہر حال اس معمولی مار پیٹ سے بھی اگر معاملہ درست ہو گیا تب بھی مقصد حاصل ہو گیا، اس میں مردوں کو عورتوں کی اصلاح کے لئے جہاں یہ تین اختیارات دیئے گئے وہیں آیت کے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ **فَإِنْ أَطَعْتُمُوهُ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِمْ سَبِيلًا** یعنی اگر ان سے غمخیزی نہ بیروں سے وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو اب تم بھی زیادہ بال کی کھال نہ نکالو اور الزام تراشی میں مت لگو، بلکہ کچھ چشم پوشی سے کام لو اور خوب سمجھ لو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر تمہیں کچھ بڑائی دی ہے تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی تمہارے اوپر بھی مسلط ہے، تم زیادتی کرو گے تو اس کی سزا تم بھگتو گے۔

جھگڑا اگر طویل پکڑ جائے | یہ نظام تو وہ تھا کہ جس کے ذریعہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جائے،  
نودونوں طرف براہی | لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھگڑا طویل پکڑ لیتا ہے، خواہ  
کے حکم سے صلح کرائی جائے | اس وجہ سے کہ عورت کی طبیعت میں تیز و سرکشی ہو، یا اس بناء پر  
کہ مرد کا قصور اور اس کی طرف سے بے جا تشدد ہو، بہر حال اس صورت میں گھر کی بات کا  
باہر نکالنا تو لازمی ہے، لیکن عام عادت کے مطابق تو یہ ہوتا ہے کہ طرفین کے حامی ایک دوسرے  
کو برا کہتے ہیں اور الزام لگاتے پھرتے ہیں، جس کا نتیجہ جانتین سے اشتعال اور پھر دو شخصوں  
کی لڑائی حساندانی جھگڑے کی صورت ختم ہوتی رہتی ہے۔  
اس دوسری آیت میں قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے



حکام وقت، فریقین کے اولیاء اور حامیوں کو اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کر کے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اشتعال بھی ختم ہو جائے اور الزام تراشی کے راستے بھی بند ہو جائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ منکمل آئے، اور گھر کا جھگڑا اگر گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں ختم ہو جائے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے۔

وہ یہ کہ اگر باپ حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمانوں کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لئے دو حکم مقرر کریں، ایک مرد کے خاندان سے دوسرا عورت کے خاندان سے، اور ان دونوں جگہ لفظ حکم سے تعبیر کر کے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو، اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو ذمی علم بھی ہو اور دیانتدار بھی۔

**خلاصہ یہ ہے کہ ایک حکم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا، مقرر کر کے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں۔** اب وہاں جا کر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اختیارات کیا ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا، البتہ آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا **اِنْ يَكُنْ دَآخِلًا حَآیَ وَفِی اللّٰهِ بَلَدًا**، یعنی اگر یہ دونوں حکم اصلاح حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں اسداد فرمادیں گے اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کر دیں گے۔

اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں:

اول تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حکم اگر نیک ہوں اور دل سے چاہیں کہ باہم صلح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی امداد ہوگی، کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے، اور ان کے ذریعہ دونوں میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق و محبت پیدا فرمادیں گے، اس کے نتیجہ سے یہ بھی سمجھا سکتا ہے کہ جہاں باہمی ملوث نہیں ہو پاتی تو دونوں حکمین میں سے کسی جانب اخلاص کے ساتھ صلح جوئی میں کمی ہوتی ہے۔

دوسری بات اس جملہ سے یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ان دونوں حکمین کے بھیجے کا مقصد میاں بیوی میں صلح کرانا ہے، اس سے زیادہ کوئی کام حکمین کے بھیجنے کے مقصد میں شامل نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ فریقین رضامند ہو کر انہیں دونوں حکموں کو اپنا وسیلہ مختار یا ثالث بنادیں، اور یہ تسلیم کر لیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دو گے



ہیں منظور ہوگا، اس صورت میں یہ دونوں حکم کلی طور پر ان کے معاملہ کے فیصلہ میں مختار ہو جائیں گے، دونوں طلاق پر متفق ہو جائیں تو طلاق ہو جائے گی، دونوں مل کر خلع وغیرہ کی کوئی صورت طے کر دیں تو وہی فریقین اور مرد کی جانب سے دیئے ہوئے اختیار کی بنا پر عورت کو طلاق دیدیں تو فریقین کو مانتا پڑے گی، سلف میں حسن بصریؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی یہی تحقیق ہے، (روح المعانی وغیرہ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا، اس میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ ان دونوں حکموں کو از خود کوئی اختیار بجز صلح کرانے کے نہیں ہے، جب تک فریقین ان کو کلی اختیار نہ دیدیں۔۔۔ یہ واقعہ سنن بیہقی میں بروایت عبیدہ سلمانی اس طرح مذکور ہے:

ایک مرد اور ایک عورت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور دونوں کے ساتھ بہت سی جماعتیں تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حکم دیا کہ ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک عورت کے خاندان سے مسترر کریں، جب یہ حکم تجویز کر دیئے گئے تو ان دونوں سے خطاب فرمایا کہ تم جانتے ہو تمہاری ذمہ داری کیا ہے؟ اور تمہیں کیا کرنا ہے؟۔۔۔ سن لو! اگر تم دونوں ان میاں بیوی کو بیچارہ کھنے اور باہم مصالحت کر دینے پر متفق ہو جاؤ تو ایسا ہی کر لو، اور اگر تم یہ سمجھو کہ ان میں مصالحت نہیں ہو سکتی یا قائم نہیں رہ سکتی، اور تم دونوں کا اس پر اتفاق ہو جائے کہ ان میں جدائی ہی مصالحت ہے تو ایسا ہی کر لو، یہ سن کر عورت بولی کہ مجھے یہ منظور ہے، یہ دونوں حکم قانون الہی کے موافق جو فیصلہ کر دیں خواہ میری مرضی کے مطابق ہو یا خلاف مجھے منظور ہے۔

لیکن مرد نے کہا کہ جدائی اور طلاق تو میں کسی حال گوارا نہ کروں گا، البتہ حکم کو یہ اختیار دیتا ہوں کہ مجھ پر مالی تاوان جو چاہیں ڈال کر اس کو راضی کر دیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ نہیں تمہیں بھی ان حکمین کو ایسا ہی اختیار دینا چاہئے جیسا عورت نے دیدیا۔

اس واقعہ سے بعض ائمہ مجتہدین نے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ ان حکمین کا اختیار ہونا ضروری ہے جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فریقین سے کہہ کر ان کو با اختیار بنوایا، اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اور حسن بصریؒ نے یہ قرار دیا کہ اگر ان حکمین کا با اختیار ہونا امر شرعی اور ضروری ہوتا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد اور فریقین سے رضا مندی حاصل کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی، فریقین کو رضا مند کرنے کی کوشش خود اس



کی دلیل ہے کہ اصل سے یہ حکمیں با اختیار نہیں ہوتے، ہاں، میاں بیوی ان کو مختار بنا دیں تو با اختیار ہو جاتے ہیں۔

قرآن کریم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے سے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا جس کے ذریعہ عدالت و حکومت تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے مقدمات اور جھگڑوں کا فیصلہ برادر یوں کی پچائیت میں ہو سکتا ہے۔

دوسرے نزاعات میں بھی حکم | حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ باہم صلح کرانے کے لئے دو حکموں کے ذریعہ مصالحت کر لی جا

دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جاسکتا ہے اور لینا چاہئے، خصوصاً جب کہ جھگڑنے والے آپس میں عزیز و رشتہ دار ہوں، کیونکہ عدالتی فیصلوں سے وقتی جھگڑا تو ختم ہو جاتا ہے، مگر وہ فیصلے دلوں میں کدورت و عداوت کے جراثیم چھوڑ جاتے ہیں جو بعد میں نہایت ناگوار شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے قاضیوں کے لئے یہ فرمان جاری فرما دیا تھا کہ،

رُدُّوا الْقَضَاءَ بَيْنَ ذَوِي الْأَرْحَامِ  
حَتَّى يَصْطَلِحُوا فَإِنَّ فَضْلَ الْقَضَاءِ  
يُورِثُ الصَّغَائِرَ

(معین الحکام، ص ۲۱۴)

رشتہ داروں کے مقدمات کو انہی میں  
واپس کر دو تاکہ وہ خود برادری کی امداد  
سے آپس میں صلح کی صورت نکال لیں  
کیونکہ قاضی کا فیصلہ دلوں میں کینہ و  
عداوت پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے۔

فقہائے حنفیہ میں سے قاضی قدس علاء الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن شحنے نے لسان الحکام میں اس فرمان فاروقی کو ایسے پچائیتی فیصلوں کی خاص بنیاد بنایا ہے جن کے ذریعہ فریقین کی رضا مندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے، مگر اس کی جو علت و حکمت اسی فرمان میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کر دیا کرتے ہیں، یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ داروں میں عام ہے، کیونکہ باہمی کدورت اور عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ہے، اس لئے حکام اور قضاة کے لئے مناسب یہ ہے کہ مقدمات کی سماعت سے پہلے اس کی کوشش کر لیا کریں کہ کسی صورت سے ان کے آپس میں رضا مندی کے ساتھ مصالحت ہو جائے۔

غرض ان دو آیتوں میں انسان کی خانگی اور عائلی زندگی کا ایک ایسا جامع اور مکمل



نظام ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر اس پر پورا عمل ہو جائے تو دنیا کے اکثر جھگڑے اور جنگ و جدال ہیٹ جائیں، مرد اور عورتیں سب مطمئن ہو کر اپنی خانگی زندگی کو ایک جنت کی زندگی محسوس کرنے لگیں اور خانگی جھگڑوں سے جو قبائلی اور پھر جماعتی اور ملکی جھگڑے اور جہت گیری کھڑی ہو جاتی ہیں ان سب سے امن ہو جائے۔

آخر میں پھر اس عجیب غریب قرآنی نظام محکم پر ایک اجمالی نظر ڈالتے، جو اس نے گھریلو جھگڑوں کے ختم کرنے کے لئے دنیا کو دیا ہے:

- ۱۔ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں تدریجی تدبیروں کے ساتھ چکا دیا جائے۔
  - ۲۔ یہ صورت ممکن نہ رہے تو حکام یا برادری کے لوگ دو جھگڑوں کے ذریعہ ان میں مصالحت کرادیں تاکہ گھر میں نہیں تو خاندان ہی اندر محدود رہ کر جھگڑا ختم ہو سکے۔
  - ۳۔ جب یہ بھی ممکن نہ رہے تو آخر میں معاملہ عدالت تک پہنچے، وہ دونوں کے حالات و معاملات کی تحقیق کر کے عادلانہ فیصلہ کرے۔
- آخر آیت میں إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا نَجِیًّاؕ فرما کر دونوں حکموں کو بھی مستثنیٰ فرمادیا کہ تم کوئی بے انصافی یا کج روی کرو گے تو تم کو بھی ایک علیم وخبیر سے سابقہ پڑنا ہے اس کو سامنے رکھو۔

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی

إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ

کرم اور قرابت والوں کے ساتھ، یتیموں اور فقیروں اور ہمسایہ

ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ

قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھے والے اور مسافر

السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ

کے ساتھ اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ بیشک اللہ کو پسند نہیں آتا اترالے

مُخْتَالًا فَخُورًا ۝۳۹ اَلَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِأَمْوَالِهِمْ اَلَّذِينَ

والا بڑائی کرنے والا جو کہ بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو

بِاَلْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا اَللّٰهُ مَوْلٰیہٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاعْتَدْنَا

بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے اور تیار کر رکھا ہے ہم نے



لِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ

کافروں کے لئے عذاب ذلت کا اور وہ لوگ جو کہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ

لوگوں کے دکھانے کو اور ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر

وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ۝

اور جس کا ساتھی ہو شیطان تو وہ بہت بُرا ساتھی ہے

**رَبِّطُ آيَاتِ** سورۃ نسا کی تفسیر میں آپ دیکھتے آئے ہیں کہ اس سورت میں حقوق العباد کا زیادہ

اہتمام کیا گیا ہے، شروع سورت سے یہاں تک عام الناسی حقوق کی اہمیت

کا اجمالی تذکرہ فرمانے کے بعد یتیموں اور عورتوں کے حقوق کا اہتمام اور ان میں کوتاہی پر سزا،

وعید اور اس دنیا میں جو ان کی دو صنف ضعیف یعنی بچوں اور عورتوں کے ساتھ ظلم روا رکھا گیا

اور ظالمانہ رسمیں اختیار کی گئیں ان کی اصلاح کا اور بکھیرداشت کے حقوق کا بیان آیا ہے، اس

کے بعد والدین اور دوسرے رشتہ داروں اور تعلق داروں اور پڑوسیوں اور عام انسانوں کے

حقوق کا کچھ تفصیلی بیان آ رہا ہے، اور چونکہ ان حقوق کو علی سبیل الکمال وہی شخص ادا کر سکتا ہے

جو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ اور قیامت کے ساتھ عقیدہ درست رکھتا ہو، نیر، بخل، کبر اور ریاء

بھی بچتا ہو، اس لئے کہ یہ امور بھی ادارہ حقوق میں مانع ہوتے ہیں، اس لئے ان آیات میں توحید

اور ترغیب و ترہیب کے کچھ مضامین ارشاد فرمائے، اور شرک، انکار قیامت، عصیانِ رسولؐ

اور بخل وغیرہ اخلاقِ ذمیہ کی مذمت بھی ذکر فرمائی؛

## خُلاصۂ تفسیر

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو اور اس میں توحید بھی آگئی، اور اس کے ساتھ کسی چیز

کو (خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان عبادت میں یا ان کی خاص صفات میں، اعتقاد میں، شریک

مت کرو اور (اپنے) والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور (دوسرے) اہل قرابت کے ساتھ

بھی، اور یتیموں کے ساتھ بھی اور غریب غریب کے ساتھ بھی، اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ

بھی اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی اور ہم مجلس کے ساتھ بھی، (خواہ وہ مجلس دائمی

ہو جیسے سفر طویل کی رفاقت اور کسی مباح کام میں شرکت یا عارضی ہو جیسے سفر قصیر

یا اتفاقی جلسہ میں شرکت) اور راہ گیر کے ساتھ بھی (خواہ وہ تمہارا خاص مہمان ہو یا نہ ہو)



اور ان غلام لونڈیوں کے ساتھ بھی جو (شرعاً) ہتھارے بالکاء قبضہ میں ہیں (غرض ان سب سے خوش معاملگی کرو جس کی تفصیل شرع نے دوسرے موقع پر بتلا دی ہے، اور جو لوگ ان حقوق کو ادا نہیں کرتے اکثر اس کے کئی سبب ہیں، یا تو ان کے مزاج میں تکبر ہے، کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، اور کسی کی طرف التفات ہی نہیں کرتے، اور یا ان کی طبیعت میں بخل غالب ہے کہ کسی کو دیتے دلاتے جان نکلتی ہے، اور یا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتقاد نہیں کہ آپ کے احکام کو ادا و اداء حقوق کے ثواب کے وعدوں کو اور اتلاف حقوق کے عذاب کی وعیدوں کو صحیح نہیں سمجھتے، اور یہ کفر ہے، اور یا ان کی عادت ٹائٹش اور نام و نمود کی ہے، اس لئے جہاں نمود ہو وہاں دیتے دلاتے ہیں گو حق نہ ہو، اور جہاں نمود نہ ہو وہاں ہمت نہیں ہوتی گو حق ہو، اور یا ان کو سرے سے خدا تعالیٰ ہی کے ساتھ عقیدہ نہیں، یا وہ قیامت کے قائل نہیں اور یہ بھی کفر ہے، اس لئے اسی ترتیب سے جو ان امور کا انفراداً یا اجتماعاً ارتکاب کرتے ہیں ان کا حال بھی سن لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو (دل میں) اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے) شیخی کی باتیں کرتے ہوں، جو کہ بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں (خواہ زبان سے یا اس طرح سے کہ ان کو دیکھ کر دوسرے یہی تعلیم پاتے ہیں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے، (اس سے مراد یا مال و دولت ہے جب کہ بلا مصلحت حفاظت کے محض بخل کی وجہ سے چھپا دے کہ اہل حقوق ان سے توقع ہی نہ کریں، یا مراد علم دین ہے کہ یہود اخبار رسالت کو چھپایا کرتے تھے، پس بخل بھی عام ہو جا دے گا، پس اس میں بخلاء و منکرین رسالت دولوں آگئے) اور ہم نے ایسے ناپاسوں کے لئے (جو نعمت مال یا نعمت بعثت رسول کی حق شناسی نہ کریں) امانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت کے دن) پر اعتقاد نہیں رکھتے (ان کا بھی یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت نہیں) اور زیادت یہ ہے کہ شیطان جن کا مصاحب ہو (جیسا ان مذکور لوگوں کا ہوا ہے) تو وہ اس کا بڑا مصاحب ہے (کہ ایسا مشورہ دیتا ہے جس میں انجام کار سخت ضرر ہو) :



## معارف و مسائل

حقوق کے بیان سے پہلے | حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت اور توحید کا  
توحید کا ذکر کیوں

مضمون اس طرح ارشاد فرمایا گیا، **وَأَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا**، یعنی اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو عبادت میں شریک نہ ٹھہراؤ۔

بیان حقوق سے پہلے مضمون عبادت اور توحید کو ذکر کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں

جن میں سے ایک یہ ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ کا خوف اور اس کے حقوق کا اہتمام ہو تو اس کا دنیا

میں اور کسی کے حقوق کے اہتمام کی کیا امید رکھی جاسکتی ہے، برادری، سوسائٹی کی شرم یا

حکومت کے قانون سے بچنے کے لئے ہزاروں راہیں ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ چیز جو انسان

کو انسانی حقوق کے احترام پر حاضر و غائب مجبور کر نیوالی ہے وہ صرف خوف خدا اور تقویٰ

ہے اور یہ خوف و تقویٰ صرف توحید ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اس لئے مختلف تعلقات

اور رشتہ والوں کے حقوق کی تفصیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید و عبادت کی یاد دہانی

بہت مناسب تھی۔

توحید کے بعد والدین اس کے بعد تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں میں سب سے پہلے والدین کے

حقوق کا ذکر | حقوق کا بیان فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور اپنے حقوق

کے متصل والدین کے حقوق کو بیان فرمایا کہ اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ حقیقت اور

اصل کے اعتبار سے تو ساری احسانات و انعامات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، لیکن

ظاہری اسباب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ احسانات انسان

پر اس کے والدین کے ہیں، کیونکہ عام اسباب میں وہی اس کے وجود کا سبب ہیں، اور

آفرینش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک جتنے کٹھن مراحل ہیں ان سب میں بظاہر

اسباب ماں باپ ہی اس کے وجود اور پھر اس کے بقا و ارتقاء کے ضامن ہیں، اسی لئے

قرآن کریم میں دوسرے مواقع میں بھی ماں باپ کے حقوق کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و

اطاعت کے متصل بیان فرمایا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ | یعنی میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا شکر

ادا کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **وَلَا تَذْأَبْ خَلًا مِمَّنْ بَيْنَ يَدَيْهِ إِسْرَءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ**

**وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا**، (۸۳:۲) ان دونوں آیتوں میں والدین کے معاملہ میں یہ نہیں فرمایا کہ



ان کے حقوق ادا کرو، یا ان کی خدمت کرو، بلکہ لفظ احسان لایا گیا جس کے عام مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ حسب ضرورت ان کے نفقہ میں اپنا مال خرچ کریں، اور یہ بھی داخل ہے کہ جیسی ضرورت ہو اس کے مطابق جسمانی خدمات انجام دیں، یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ گفتگو میں سخت آواز سے یا بہت زور سے مبولیں جس سے ان کی بے ادبی ہو، کوئی ایسا کلمہ نہ کہیں جس سے ان کی دل شکنی ہو، ان کے دوستوں اور تعلق والوں سے بھی کوئی ایسا سلوک نہ کریں جس سے والدین کی دل آزاری ہو، بلکہ ان کو آرام پہنچانے اور خوش رکھنے کیلئے جو صورتیں اختیار کرنی پڑیں وہ سب کریں، یہاں تک کہ اگر ماں باپ نے اولاد کے حقوق میں کوتاہی بھی کی ہو جب بھی اولاد کے لئے ہر سلوک کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس وصیتیں فرمائی تھیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے، دوسرے یہ کہ اپنے والدین کی نافرمانی یا دل آزاری نہ کرو اگرچہ وہ یہ حکم دیں کہ تم اپنے اہل اور مال کو چھوڑ دو۔ (مسند احمد)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں جس طرح والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکیدات وارد ہیں، اسی طرح اس کے بے انتہا فضائل اور درجات ثواب بھی مذکور ہیں۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اس کے رزق اور عمر میں برکت ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے یعنی اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لڑکا اپنے والدین کا مطیع و فرمانبردار ہو جب وہ اپنے والدین کو عزت و محبت کی نظر سے دیکھتا ہے تو ہر نظر میں اس کو رچ مقبول کا ثواب ملتا ہے۔

بیہقی ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں لیکن جو شخص ماں باپ کی نافرمانی اور دل آزاری کرے اس کو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں طرح طرح کی آفتوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔



قربت داروں کے ساتھ آیت میں والدین کے بعد عام ذی القربی یعنی تمام رشتہ داروں  
 حسن سلوک کی تاکید کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید آئی ہے، قرآن کریم کی ایک جامع اور مشہور  
 آیت میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اپنے خطبات کے آخر میں تلاوت فرمایا  
 کرتے تھے، اس مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ، یعنی اللہ تعالیٰ حکم  
 دیتے ہیں سب کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کا اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا  
 جس میں رشتہ داروں کی سب سے استطاعت مالی اور جانی خدمت بھی داخل ہے، اور ان سے  
 ملاقات و خبر گیری بھی۔

حضرت سلمان ابن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا کہ صدقہ عام مسکینوں فقروں کو دینے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور اگر  
 اپنے ذی رحم رشتہ دار کو دیا جائے تو اس میں دو ثواب ہیں، ایک صدقہ کا دوسرا اصلہ  
 کا، یعنی رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے کا۔ (مسند احمد، نسائی، ترمذی)

آیت مذکورہ میں اول والدین کے حقوق کی تاکید فرمائی پھر عام رشتہ داروں کی۔  
 یتیم اور مسکین کا حق | تیسرے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ، یتیموں اور  
 مسکین کے حقوق کا مفصل بیان اگرچہ شروع سورت میں آچکا ہے مگر اس کی یاد دہانی  
 رشتہ داروں کے ضمن میں فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ لاوارث بچوں اور بیگس  
 لوگوں کی امداد و اعانت کو بھی ایسا ہی ضروری سمجھیں جیسا اپنے رشتہ داروں کے لئے کرتے ہیں۔  
 پڑوسی کا حق | چوتھے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ، اور پانچویں نمبر میں  
 وَالْجَارِ الْجُنُبِ، جار کے معنی پڑوسی کے ہیں، اس آیت میں اس کی دو قسمیں بیان فرمائی  
 ہیں، ایک جار ذی القربی، دوسرے جار جنب، ان دو قسموں کی تفسیر و تشریح میں صحابہ کرام  
 کے مختلف اقوال ہیں:

عام مفسرین نے فرمایا کہ جار ذی القربی سے مراد وہ پڑوسی ہے جو تمھارے مکان  
 کے متصل رہتا ہے اور جار جنب سے وہ پڑوسی مراد ہے جو تمھارے مکان سے کچھ فاصلہ  
 پر رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جار ذی القربی سے وہ  
 شخص مراد ہے جو پڑوسی بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس طرح اس میں دو حق جمع ہو گئے  
 اور جار جنب سے مراد وہ ہے جو صرف پڑوسی ہے رشتہ دار نہیں، اس لئے اس کا



درجہ پہلے سے مؤخر رکھا گیا۔

بعض حضرات مغترین نے فرمایا کہ جَارِ ذی الْقُرْبٰی وہ پڑوسی ہے جو اسلامی برادری میں داخل اور مسلمان ہے، اور جَارِ جَنْبِ سے غیر مسلم پڑوسی مراد ہے۔

الفاظ قرآن ان سب معانی کو محتمل ہیں، اور حقیقت کے اعتبار سے بھی درجہ میں فرق ہو جانا امر معقول ہے، اور معتبر ہے، اور پڑوسی کے رشتہ دار یا غیر ہونے کے اعتبار سے بھی اور مسلم اور غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ پڑوسی خواہ قریب ہو یا بعید، رشتہ دار ہو یا غیر مسلم ہو یا غیر مسلم، بہر حال اس کا حق ہے بقدر استطاعت کے امداد و اعانت اور خبر گیری لازم ہے۔

البتہ جس کا حق علاوہ پڑوسی کے دوسرا بھی ہے وہ دوسرے پڑوسیوں سے درجہ میں مقدم ہے، ایک حدیث میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو واضح فرما دیا ارشاد فرمایا کہ بعض پڑوسی وہ ہیں جن کا صرف ایک حق ہے، بعض وہ ہیں جن کے دو حق ہیں اور بعض وہ جن کے تین ہیں، ایک حق والا پڑوسی وہ غیر مسلم ہے جس سے کوئی رشتہ داری بھی نہیں، دو حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی ہونے کے ساتھ مسلمان بھی ہے، تین حق والا پڑوسی وہ ہے جو پڑوسی بھی ہے، مسلمان بھی اور رشتہ دار بھی۔ (ابن کثیر)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریل امین ہمیشہ مجھے پڑوسی کی رعایت و امداد کی تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو بھی رشتہ داروں کی طرح وراثت میں شریک کر دیا جائے گا (بخاری و مسلم)

ترمذی اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی محلہ کے لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے افضل اور بہتر وہ شخص ہے جو اپنے پڑوسیوں کے حق میں بہتر ہو۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک پڑوسی کو پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں، جب کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

ہمنشین کا حق | چھٹے نمبر میں ارشاد فرمایا: وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ، اس کے لفظی معنی "میں پہلو ساتھ" کے ہیں، جس میں رفیق سفر بھی داخل ہے جو ریل میں، جہاز میں، بس میں، سگاڑی میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، اور وہ شخص بھی داخل ہے جو کسی عام مجلس میں آپ کے برابر بیٹھا ہو۔

شریعت اسلام نے جس طرح نزدیک و دور کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق



واجب فرماتے، اسی طرح اس شخص کا بھی حق صحبت لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لئے کبھی مجلس یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم و غیر مسلم اور رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب برابر ہیں، اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے، کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو، کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو، مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں، اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے چنگڑے ختم ہو جائیں، ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے، اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں، دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے۔

بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ صاحب بالجنب میں ہر وہ شخص داخل ہے جو کسی کام اور کسی پیشہ میں آپ کا شریک ہے، صنعت مزدوری میں دفتر کی ملازمت میں، سفر میں، حضر میں۔ (روح المعانی)

راہ گیر کا حق | ساتویں نمبر میں ارشاد فرمایا: وَإِنَّ النَّسِيبَ لَإِیْسَ، یعنی راہ گیر، اس سے مراد وہ شخص ہے جو دورانِ سفر آپ کے پاس آجائے یا آپ کا ہمان ہو جائے، چونکہ اس اجنبی شخص کا کوئی تعلق والایہاں نہیں ہے، تو قرآن نے اس کے اسلامی، بلکہ انسانی تعلق کی رعایت کر کے اس کا حق بھی آپ پر لازم کر دیا، کہ بقدر وسعت و استطاعت اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ غلام، باندی اور ملازموں کا حق | آٹھویں نمبر میں ارشاد فرمایا: وَمَا مَلَکَتْ أَيْمَانُکُمْ، جس سے مراد مملوک غلام اور باندیاں ہیں، ان کا بھی یہ حق لازم کر دیا گیا کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں، استطاعت کے موافق کھلانے پلانے، پہنانے میں کوتاہی نہ کریں، اور ان کی طاقت سے زیادہ کام ان پر نہ ڈالیں۔

اگرچہ الفاظِ آیت کا صریح مدلول مملوک اور غلام اور باندیاں ہیں، لیکن اشتراکِ علت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی بنا پر یہ احکام نوکران اور ملازموں پر بھی حاوی ہیں کہ ان کا بھی یہی حق ہے، کہ مقررہ تنخواہ اور کھانا وغیرہ دینے میں بخل اور دیر نہ کریں، اور ان کی طاقت سے زیادہ کام ان پر کام نہ ڈالیں۔



حقوق میں کوتاہی دی لوگ کرتے ہیں | آخر آیت میں ارشاد فرمایا: إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا، یعنی اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند

جن کے دلوں میں تکبر ہو

نہیں کرتے جو متکبر اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے والا ہو۔

آیت کا یہ آخری جملہ پچھلے تمام ارشادات کا محملہ ہے، کہ پچھلے آٹھ نمبروں میں جن لوگوں کے حقوق کی تاکید آئی ہے اس میں کوتاہی وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں تکبر اور فخر و غور ہے، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔

تکبر اور جاہل تفاخر کی وعید میں بہت سی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں:

”حضرت عبداللہ مسعودی سے روایت ہے وہ شخص جہنم میں رہے گا جس کے لئے نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہو اور جنت میں ایسا کوئی شخص نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے معادلہ تکبر ہو“

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خُرْدٍ مِنْ إِيْمَانٍ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خُرْدٍ مِنْ كِبَرٍ (مشکوٰۃ ص ۳۳۳ بحوالہ مسلم)

ایک اور حدیث جس میں کبر کی تعریف بھی مذکور ہے:-

”حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکے گا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہو چاہے اس میں سے ایک آدمی نے سوال کیا، لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے کپڑے اچھے ہوں ان کے جوتے اچھے ہوں (تو کیا یہ بھی تکبر میں داخل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہیں اور جمال کو پسند بھی فرماتے ہیں، تکبر نام ہے حق رد کرنے کا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کا۔“

عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ فَقَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَتَعَلُّهُ حَسَنًا، قَالَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَطُّ النَّاسِ (مشکوٰۃ ص ۳۳۳ بحوالہ مسلم)



اس کے بعد اَلَّذِينَ يَبْخُلُونَ میں بیان ہے کہ جو لوگ متکبر بن جتے ہیں وہ حقوق واجبہ میں بھی بخل کرتے ہیں، اپنی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے اور دوسروں کو بھی اپنے قول و عمل سے اس بُری صفت کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

آیت میں بخل کا لفظ آیا ہے، جس کا اطلاق عرب عام میں حقوق مالیہ کے اندر کوتاہی کرنے پر ہوتا ہے، لیکن آیت کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بخل کا لفظ عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو بخل بالمال اور بخل بعلم دونوں کو شامل ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت یہودِ مدینہ کے حق میں نازل ہوئی تھی، یہ لوگ بہت زیادہ مغرور تھے، انتہاء درجہ کے کجوس تھے، مال خرچ کرنے میں بھی بخل کرتے تھے، اور اس علم کو بھی چھپاتے تھے جو انھیں اپنی الہامی کتابوں سے حاصل ہوا تھا، ان کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت تھی، اور آپ کی علامات کا بھی ذکر تھا، لیکن یہود نے ان سب کا یقین کر لینے کے بعد بھی بخل سے کام لیا، نہ خود اس علم کے تقاضے پر عمل کیا، اور نہ دوسروں کو بتلایا کہ وہ عمل کرتے۔

آگے فرمایا کہ ایسے لوگ جو اللہ کے دینے ہوئے مال و دولت میں بھی بخل کرتے ہیں اور علم و ایمان کے معاملہ میں بھی بخل ہیں، ایسے لوگ نعمتِ خداوندی کے ناسپاس ہیں اور ان کے لئے امانت آمیز عذاب تیار کر لیا گیا ہے۔

انفاق کی فضیلت اور بخل کی مذمت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر صبح کے وقت دو فرشتے نازل ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہتا ہے اے اللہ! بھلائی کے راستہ میں خرچ کرنے والے کو اچھا عوض عطا فرما، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! بخیل کو (مال و دولت کی) تباہی پہنکار کر۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا يَقُولُ الْآخَرُ اللَّهُمَّ أَعْطِ مُبْسِكًا تَلْفًا (بخاری و مسلم)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

عَنْ أَسْمَاءَ قَالَتْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلْفُ نَفْسٍ وَ



لَا تُحْصِي فَيُحْصِيَ اللَّهُ عَلَيْهِ  
وَلَا تُؤَمِّي فَيُؤَمِّي اللَّهُ عَلَيْكَ  
وَأَرْضِيخِي مَا اسْتَطَعْتُ، رُبَّكَ

اے اسماء! خیر کے راستہ میں خرچ کیا کر  
اور گن گن کر نہ دے ورنہ اللہ بھی تمہارے  
حق میں گننا شروع کر دے گا، اور انفاق

سے بچنے کے لئے بہت زیادہ حفاظت نہ برتو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی حفاظت کرنا  
شروع کر دے گا، اور کم از کم جو تجھ سے ہو سکے اس کے دینے سے دریغ نہ کر۔

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِنَ اللَّهِ قَرِيبٌ  
مِنَ الْجَنَّةِ قَرِيبٌ مِنَ النَّاسِ  
بَعِيدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ  
مِنَ اللَّهِ، بَعِيدٌ مِنَ الْجَنَّةِ  
بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِنَ  
النَّارِ، وَالْجَاهِلُ سَخِيٌّ أَحَبُّ  
إِلَى اللَّهِ مِنْ عَابِدٍ بَخِيلٍ  
(ترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے  
کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سخی  
اللہ سے بھی قریب جنت سے بھی قریب  
اور لوگوں کی نظروں میں بھی پسندیدہ ہے،  
اور حقیقت کی آگ سے دور ہے اور بخیل اللہ  
سے بھی دور، جنت سے بھی دور ہے لوگوں  
سے بھی دور ہے اور آگ سے قریب ہے، اور  
جاہل آدمی جو سخاوت کرتا ہو (اور فرائض کو  
ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرتا ہو)  
اس کجوس سے بہتر ہے جو عبارت گزار ہو۔

وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ قَالَ قَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
سَلِّ خَصْلَتَانِ لَا تَجْمَعَانِ فِي  
مُؤْمِنٍ، الْبُخْلُ وَسُوءُ الْخُلُقِ  
(ترمذی)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت  
ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
دو عادتیں کبھی مومن میں جمع نہیں  
ہوتیں، بخل اور بد اخلاقیت۔

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ، سے متکبرین کی ایک دوسری صفت بتلا دی کہ یہ لوگ اللہ کے  
راستہ میں خود بھی خرچ نہیں کرتے، اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، البتہ  
لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے رہتے ہیں، اور چونکہ یہ لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان  
نہیں رکھتے، اس لئے اللہ کی رضا اور ثواب آخرت کی نیت سے خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا  
نہیں ہوتا، ایسے لوگ تو شیطان کے ساتھی ہیں، لہذا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کے  
ساتھی شیطان کا ہوگا۔



اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حقوق واجبہ میں کوتاہی کرنا، بخل کرنا معیوب ہے اسی طرح لوگوں کو دکھانے کے لئے اور بے مقصد مصارف میں خرچ کرنا بھی بہت بُرا ہے وہ لوگ جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے دکھانے کو نیکی کرتے ہیں ان کا وہ عمل عند اللہ مقبول نہیں ہوتا، اور حدیث میں اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شرک سے بالکل بے نیاز ہوں، جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشُّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشْرَكَكَ

تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔

شداد بن اوس سے روایت ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا جس نے نماز پڑھی رکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، جس نے روزہ رکھا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا، اور جس نے کوئی صدقہ دیا دکھانے کے لئے تو اس نے شرک کیا۔

وَعَنْ شَدَّادِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ صَلِّيٍّ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ

(احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمھارے متعلق مجھے بہت زیادہ اندیشہ شرک صغیر کا ہے، صحابہؓ نے پوچھا شرک صغیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ریاء۔

عَنْ مَحْمُودِ بْنِ لَبِيدٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشُّرْكَ الْأَصْغَرَ، قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ وَمَا الشُّرْكَ الْأَصْغَرُ، قَالَ

الرِّيَاءُ۔

(احمد بحوالہ مشکوٰۃ)

اور بیعت کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ قیامت کے دن جب اعمال صالحہ کا ثواب



تقسیم ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان ریا کرنے والوں سے فرمائیں گے:  
 ”ان لوگوں کے پاس چلے جاؤ جن کو دکھانے کے لئے تم دنیا میں نیک عمل کرتے  
 تھے اور دیکھ لو کہ کیا ان کے پاس تمہارے اعمال کا ثواب اور اس کی جزا ہے؟“

وَمَا ذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَانْفَقُوا مِمَّا

اور کیا نقصان تھا ان کا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور خرچ کرتے اللہ کے

رِزْقِهِمْ اللَّهُ ط وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿۴۱﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا

دیکھتے ہیں سے اور اللہ کو ان کی خوب خبر ہے بیشک اللہ حق

يُظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ وَإِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضَعِفْهَا وَيُؤْتِ

نہیں رکھتا کسی کا ایک ذرہ برابر اور اگر نیکی ہو تو اس کو دونا کر دیتا ہے اور دیتا ہے

مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۲﴾ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ

اپنے پاس سے بڑا ثواب پھر کیا حال ہوگا جب بلا دیں گے ہم ہر امت

أُمَّةٍ بِرَسُولٍ مِّنْ لَّدُنَّا يُخْلِفُهُ أَوْ يَفْضَحْهُ أَوْ يُجَاهِدْهُ أَوْ يَمُوتْ ۚ يَوْمَئِذٍ

میں سے احوال کہنے والا اور بلا دیں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا اس دن

يُودُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُوا الرُّسُلَ كُتُوبٌ بِهِمْ

آرزو کریں گے وہ لوگ جو کافر ہوئے تھے اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ برابر ہو حسابیں

الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿۴۳﴾

زمین کے اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات

رَبِّطْ آيَاتِ | ماقبل کی آیات میں انکارِ خدا، انکارِ آخرت، اور بخل و غیرہ کی مذمت مذکور

تھی اور ان آیات میں خدا و آخرت پر ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب مذکور ہے، اور آخر

میں موافقِ حشر کا بیان کر کے ان لوگوں کو انجامِ بد سے ڈرایا گیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور نہ

نیک عمل کرتے ہیں۔

## خُلاصۃ تفسیر

اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جاوے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن



(یعنی قیامت) پر ایمان لے آویں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (اخلاص کیلئے) خرچ کرتے رہا کریں (یعنی کچھ بھی ضرر نہیں ہر طرح نفع ہی نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ ان کے نیک و بد کو خوب جانتے ہیں (پس ایمان و انفاق پر ثواب دیں گے اور کفر و غیرہ پر عذاب) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے کہ کسی کا ثواب مار لیں یا بے وجہ عذاب دینے لگیں جو کہ ظاہراً ظلم ہے) اور (بلکہ وہ تو ایسے رحیم ہیں کہ) اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا (کر کے) ثواب دیں گے جیسا کہ دوسری آیت میں وعدہ مذکور ہے) اور (اس ثواب موعود کے علاوہ) اپنے پاس سے (بلا معاوضہ عمل بطور انعام اور) اجر عظیم (الگ) دیں گے، سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جب کہ ہر امر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ کو ان لوگوں پر (جن کا آپ سے سابقہ ہوا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر لاویں گے (یعنی جن لوگوں نے خدائی احکام دنیا میں نہ مانے ہوں گے) ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام کے اظہارات سُنے جا دیں گے، جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے سب ظاہر کر دیں گے، اس شہادت کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہو کر سزا دی جائے گی، (ادھر فرمایا تھا کہ اس وقت کیا حال ہوگا، آگے اس حال کو خود بیان فرماتے ہیں کہ) اس روز وہ حال ہوگا کہ جن لوگوں نے (دنیا میں) کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش (اس وقت) ہم زمین کے پیوند ہو جاویں (تاکہ اس سوالی اور آفت سے محفوظ رہیں) اور (گواہی کے علاوہ خود وہ اقرار سی مجرم بھی ہوں گے کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا (جو ان سے دنیا میں صادر ہوئی تھیں) اخفاء نہ کر سکیں گے (پس دونوں طور پر فرد قرار داد جرم ان پر لگا دی جائے گی)

## معارف و مسائل

پہلی آیت میں فرمایا وَمَاذَ اَعْلَيْنٰهُمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ، یعنی ان کو کیا نقصان پہنچ جائے اور کیا مصیبت پیش آجائے اگر یہ لوگ اللہ پر اور آخرت پر ایمان لائیں اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کریں، یہ سب آسان کام ہیں، ان کے خستیار کرنے میں کچھ بھی تکلیف نہیں، پھر کیوں نامسلمان بن کر آخرت کی تباہی اپنے سر لے رہے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ، یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اعمال حسنہ کا ثواب اور جزائے خیر میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں فرماتے بلکہ اپنی طرف سے



اس میں اور اضافہ فرمادیتے ہیں، اور آخرت میں چند در چند ثواب بڑھا کر نوازیں گے، اور اپنی طرف سے ثواب عظیم عطا فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ ایک نیکی کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور اس کے علاوہ مختلف بہانوں سے اضافہ در اضافہ ہوتا رہتا ہے، بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب سب سے لاکھ گنا زیادہ ہو جاتا ہے، اور اللہ کی ذات تو کریم ذات ہے، وہ اپنی بے پایاں رحمت سے اتنا بڑھا کر دیدیتے ہیں کہ حساب و شمار میں بھی نہیں آتا، وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ، اس اجر عظیم کا کیا تصور کیا جاسکتا ہے جو بارگاہ رب العزت سے ملتا ہے، وَيُؤْتِي مَنْ لَّيْ قَدْ أَجْرًا عَظِيمًا

آیت میں جو لفظ ذَرَّةً آیا ہے اس کا ایک ترجمہ تو معروف ہی ہے، جو ماقبل میں گزر چکا اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ ذرۃ لال رنگ کی سب سے چھوٹی چوٹی کو کہا جاتا ہے، اہل عرب کم وزن اور حقیر ہونے میں اس کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ سَائِدَةٌ تَخْشَوْنَ كُنُوزَهُنَّ لِقَاءِ رَبِّهِنَّ فَيَسْفَوْا عَنْ عَصَاهِنَّ فَإِذَا هُمْ كَافِرُونَ اور کفار قریش کی توبیخ بھی مقصود ہے۔

ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب میدان حشر میں ہر ہر امت کا نبی اپنی امت کے نیک و اعمال پر بطور گواہ پیش ہوگا، اور آپ بھی اپنی امت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے، اور بطور مثال ان کفار و مشرکین کے متعلق خدائی عدالت میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے کھلے کھلے معجزات دیکھ کر بھی تکذیب کی، اور آپ کی وحدانیت اور میری رسالت پر ایمان نہ لائے۔

بخاری شریف میں روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعود سے فرمایا کہ مجھے قرآن سننا، حضرت عبداللہ نے عرض کیا آپ مجھ سے سننا چاہتے ہیں حالانکہ قرآن آپ ہی پر نازل ہوا ہے، آپ نے فرمایا ہاں پڑھو، میں نے سورۃ نسا کی تلاوت شروع کر دی، اور جب فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِرَسُولٍ مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَخْشَوْنَ كُنُوزَهُنَّ لِقَاءِ رَبِّهِمْ فَيَسْفَوْا عَنْ عَصَاهِنَّ فرمایا کہ اب بس کرو، اور جب میں نے آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

عَلَامۃ قسطلانی لکھتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا، اور اپنی امت کے کوتاہ عمل اور بے عمل لوگوں کی بابت خیال آیا اس لئے آنسو مبارک جاری ہو گئے۔

فائدہ: بعض حضرات نے فرمایا کہ هُوَ الَّذِي کا اشارہ زمانہ رسالت میں موجود



کفار و منافقین کی طرف ہے، اور بعض فرماتے ہیں کہ قیامت تک کی پوری امت کی طرف اشارہ ہے، اس لئے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی امت کے اعمال آپ پر پیش ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ گذشتہ امتوں کے انبیاء اپنی اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہوں گے، اور آپ بھی اپنی امت کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی امت کے متعلق گواہی دے، ورنہ قرآن کریم میں اس کا اور اس کی شہادت کا بھی ذکر ہوتا، اس اعتبار سے یہ آیت ختم نبوت کی دلیل بھی ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَتُوَكَّلُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِيْدَانِ آخِرَتٍ فِيْ كَافِرُوْنَ كِيْ يَدْخُلُوْا فِيْهَا  
کہ یہ لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین کا پیوند بن گئے ہوتے، کاش زمین پھٹ جاتی اور ہم اس میں دھنس کر مٹی بن جاتے، اور اس وقت کی پوچھ گچھ اور عذاب و حساب نجات پا جاتے۔

میدانِ حشر میں جب کفار دیکھیں گے کہ تمام جاؤراہک دوسرے کے مظالم کا بدلہ لینے ویسے کے بعد مٹی بنائے گئے تو ان کو حسرت ہوگی اور تمنا کریں گے کہ کاش ہم بھی مٹی ہو جاتے، جیسا کہ سورہ نباہ میں فرمایا، وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يَلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا

آخر میں فرمایا وَلَا يَكْتُمُوْنَ اِنَّهٗ حَدِيْثًا یعنی یہ کفار اپنے عقائد و اعمال سے متعلق کچھ بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے، ان کے اپنے ہاتھ پیرا قرار کریں گے، انبیاء گواہی دیں گے، اور اعمال ناموں میں بھی سب کچھ موجود ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ قرآن کریم میں ایک جگہ یہ ارشاد ہے کہ کفار کچھ بھی نہ چھپائیں گے، اور دوسری جگہ یہ ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (۲۳: ۶)، کہ ہم نے شرک نہیں کیا۔ بظاہر ان دو آیتوں میں تعارض ہے! تو آپ نے جواب دیا کہ ہو گایوں کہ جب شروع میں کفار یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے سوا جنت میں کوئی جاتا ہی نہیں تو وہ یہ طے کر لیں گے کہ ہمیں اپنے شرک اور اعمالِ بد کا انکار ہی کر دینا چاہیے، ہو سکتا ہے اس طرح ہم نجات پا جائیں، لیکن اس انکار کے بعد خود ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے، اور چھپانے کا جو مقصود انھوں نے بنایا تھا اس میں بالکل ناکام ہو جائیں گے اس وقت سب اقرار کر لیں گے، اس لئے فرمایا، وَلَا يَكْتُمُوْنَ اِنَّهٗ حَدِيْثًا، کچھ بھی نہیں چھپا سکیں گے۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ

اے ایمان والو! نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو

حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ

یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک

تَغْتَسِلُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ

کہ غسل کرلو اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں یا آیا ہے کوئی شخص

مِّنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لِمَسْتُمُ النِّسَاءِ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً

تم میں جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ ملا تم کو پانی

فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ

تو ارادہ کرو زمین پاک کا پھر ملو اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو

إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا غَدِيرًا ۝۴۳

بیشک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا

شان نزول | ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ شراب کی حرمت

سے پہلے ایک دفعہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے بعض صحابہ کرامؓ کی

دعوت کر رکھی تھی جس میں مے نوشی کا بھی انتظام تھا، جب یہ سب حضرات کھاپی چکے تو

مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امام بنا دیا گیا، ان سے نماز میں

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ کی تلاوت میں بوجہ نشہ کے سخت غلطی ہو گئی، اس پر یہ آیت نازل

ہوئی جس میں تنبیہ کر دی گئی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے۔

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ یعنی ایسی حالت میں

نماز مت پڑھو کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو (اس وقت

تک نماز مت پڑھو، مطلب یہ ہے کہ اوائے نماز تو اپنے اوقات میں فرض ہے اور یہ حالت

اوائے نماز کے منافی ہے، پس اوقاتِ صلوٰۃ میں نشہ کا استعمال مت کرو، کبھی تمہارے منہ

سے نماز میں کوئی کلمہ خلاف نہ نکل جائے، اور حالتِ جنابت میں بھی (یعنی جبکہ غسل فرض



ہو) باستثناء تمھارے مسافر ہونے کی حالت کے (کہ اس کا حکم عنقریب آتا ہے، نماز کے پاس مت جاؤ) یہاں تک کہ غسل کر لو (یعنی غسل جنابت شرائط صحبت نماز سے ہے، اور یہ حکم یعنی جنابت کے بعد بدون غسل نماز نہ پڑھنا حالت عدم عذر میں ہی) اور اگر تم (کچھ عذر رکھتے ہو مثلاً) بیمار ہو (اور پانی کا استعمال مضر ہو جیسا کہ آگے آتا ہے) یا حالت سفر میں ہو (جوانہ پرستشٹی ہوا ہے کہ اس کا حکم بھی آوے گا، یعنی اور پانی نہیں ملتا، جیسا کہ آگے آتا ہے تو ان دونوں عذروں سے تیمم کی اجازت آتی ہے، اور جوانہ تیمم کچھ اپنی مذکور عذروں یعنی سفر و مرض کے ساتھ خاص نہیں بلکہ خواہ تم کو خاص یہ عذر ہوں یا (یہ کہ عذر خاص نہ ہوں یعنی نہ تم مر لیکن ہو نہ مسافر، بلکہ ویسے ہی کسی کا وضو یا غسل ٹوٹ جائے اس طرح سے کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیبیوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو اور) پھر ران ساری صورتوں میں خواہ مرض و سفر کے عذر کی صورت ہو یا نہ مرض ہو نہ سفر ویسے وضو اور غسل کی ضرورت ہو) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ تو اس وجہ سے کہ مرض میں اس سے ضرر ہوتا ہو خواہ اس لئے کہ وہاں پانی ہی موجود نہیں خواہ سفر ہو یا نہ ہو) تو ان سب حالتوں میں (تم پاک زمین سے تیمم کر لیا کرو (یعنی اس زمین پر دوبارہ ہاتھ مار کر) اپنے چہروں اور ہاتھوں پر (ہاتھ) پھیر لیا کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں (اور جس کی ایسی عادت ہوتی ہے وہ آسان حکم دیا کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے ایسے آسان حکم دیدیئے کہ تم کو تکلیف نہ تنگی نہ ہو)۔

## معارف و مسائل

شراب کی حرمت کے | شریعت اسلامیہ کو حق تعالیٰ نے ایک خاص امتیاز یہ دیا ہے کہ اس کے احکام | تدریجی احکام کو سہل اور آسان کر دیا ہے، اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ ہے کہ شراب نوشی عرب کی پرانی عادت تھی، اور پوری قوم اس عادت میں مبتلا تھی، بحرِ مخدوم حضرات کے جن کی طبیعت ہی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا سلیم بنا دیا تھا کہ وہ اس خبیث چیز کے پاس کبھی نہیں گئے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ نبوت سے پہلے آپ نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ عادت کسی چیز کی بھی ہو اس کا چھوڑنا انسان پر بڑا مشکل ہوتا ہے، خصوصاً شراب اور نشہ کی عادت تو انسان کی طبیعت پر ایسا قبضہ کر لیتی ہے کہ اس سے نکلنا آدمی اپنے لئے موت سمجھنے لگتا ہے۔



اللہ تعالیٰ کے نزدیک شراب نوشی اور نشہ کرنا حرام تھا، اور اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو اس سے بچنا مقصود و مطلوب تھا، مگر یکایک اس کو حرام کر دیا جاتا تو لوگوں پر اس حکم کی تعمیل سخت مشکل ہو جاتی، اس لئے ابتداءً اس پر جسزوری پابندی عائد کی گئی، اور اس کے خراب اثرات پر تنبیہ کر کے ذہنوں کو اس کے چھوڑنے پر آمادہ کیا گیا، چنانچہ ابتداءً اس آیت میں صرف یہ حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ، جس کا اصل یہ تھا کہ نماز کے وقت نماز کا ادا کرنا تو فرض ہے، اوقات نماز میں شراب استعمال نہ کی جائے جس سے مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ ایسی خراب چیز ہے جو انسان کے لئے نماز سے مانع ہے، بہت سے حضرات نے تو اسی وقت سے اس کے چھوڑنے کا اہتمام کر لیا اور دوسرے حضرات بھی اس کی خرابی اور بُرائی کو سوچنے لگے، آخر کار سورۃ مائدہ کی آیت میں شراب کے ناپاک اور حرام ہونے کا قطعی حکم آگیا اور ہر حال میں شراب پینا حرام ہو گیا۔

**مسئلہ:** جس طرح نشہ کی حالت میں نماز حرام ہے، بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب نیند کا غلبہ ایسا ہو کہ آدمی اپنی زبان پر قابو نہ رکھے تو اس حالت میں بھی نماز پڑھنا درست نہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

اِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ	اگر تم میں سے کسی کو نماز میں اونگھ
فَلْيَرْقُدْ حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ	آنے لگے تو اسے کچھ دیر کے لئے سو جانا
فَإِنَّهُ لَا يَذَرِي لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ	چاہئے تاکہ نیند کا اثر چلا جائے ورنہ نیند
فَلْيَسُبْ نَفْسَهُ (قرطبی)	کی حالت میں وہ سمجھ نہیں سکے گا اور

بجائے دعا، واستغفار کے اپنے آپ کو گالی دینے لگ جائے گا۔

نیم کا حکم ایک انعام ہے | اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ وضو و طہارت کے لئے ایسی چیز کو جو اس امت کی خصوصیت ہے | پانی کے قائم مقام کر دیا جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہے، اور ظاہر ہے کہ زمین اور مٹی ہر جگہ موجود ہے، حدیث میں ہے کہ یہ سہولت صرف امت محمدیہ کو عطا کی گئی ہے، نیم کے ضروری مسائل فقہ کی کتابوں اور اردو کے رسالوں میں بکثرت چھپے ہوئے ہیں ان کو دیکھ لیا جائے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتُرُونَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب سے خرید کرتے ہیں

الضَّلَالَةَ وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٧﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ

گمراہی اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بہک جاؤ راہ سے اور اللہ خوب جانتا ہے



بَاعِدَا إِلَيْكُمَا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَلِيًّا ۖ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿۴۵﴾

تمھارے دشمنوں کو اور اللہ کافی ہے حمایتی اور اللہ کافی ہے مددگار جسے

الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ

لوگ یہودی پھرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے اور کہتے ہیں

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ وَرَاعِنَا لِيَا لَسِنَتِهِمْ

ہم نے سنا اور نہ مانا اور کہتے ہیں کہ سن نہ سنایا جائیو اور کہتے ہیں راعنا موڑ کر اپنی زبان کو

وَطَعْنَا فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأَسْمَعُ

اور عیب لگانے کو دین میں اور اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن

وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ ۖ وَلَٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ

اور ہم پر نظر کر تو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست لیکن لعنت کی ان پر اللہ نے

بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۴۶﴾

ان کے کفر کے سبب سرون ایمان نہیں لائے مگر بہت کم

## خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی دیکھنے کے قابل ہیں) دیکھو تو تعجب کرو جن کو کتاب (اللہ یعنی توریت کے علم کا ایک بڑا حصہ ملا ہے) (یعنی توریت کا علم رکھتے ہیں) باوجود اس کے کہ وہ لوگ گمراہی (یعنی کفر) کو اختیار کر رہے ہیں اور (خود تو گمراہ ہوئے ہی تھے مگر وہ) یوں چاہتے ہیں کہ تم (بھی) راہ (راست) سے (علحدہ ہو کر) بے راہ ہو جاؤ (یعنی طرح طرح کی تدبیریں اس کی کرتے ہیں جیسا کہ تیسرے پارہ کے آخر اور چوتھے کے شروع میں کچھ ذکر ہو چکا ہے) اور تم کو اگر ان لوگوں کی اب تک خبر نہ ہو تو کیا ہوا، اللہ تعالیٰ (تو) تمھارے (ان) دشمنوں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے تم کو بتلادیا سو تم ان سے بچتے رہو) اور ان کا حال مخالفت کا شکر زیادہ فکر میں بھی نہ پڑ جانا کیونکہ اللہ تعالیٰ (تمھارا) کافی رفیق ہے کہ تمھاری مصلحتوں کی رعایت رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ (تمھارے لئے) کافی حامی ہے کہ ان کی مضرتوں سے تمھاری حفاظت کرے گا اور یہ لوگ (جن کا ذکر ہو چکا ہے) یہودیوں میں سے ہیں (اور ان کا گمراہی کو اختیار کرنا جو اوپر آچکا ہے یہ ہے کہ) کلام (الہی یعنی توریت) کو اس کے مواقع



(اور محل) سے (لفظاً یا معنی) دوسری طرف پھیر دیتے ہیں اور (ایک گراہی ان کی جس میں دھوکہ سے دوسرے ساوہ ذہن شخص کا پھنس جانا بھی ممکن ہے یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتے وقت) یہ کلمات کہتے ہیں جو آگے مذکور ہوتے ہیں، ان کلمات کے دو دو معنی ہیں ایک اچھے اور ایک بُرے، وہ لوگ مطلب لیتے تھے اور دوسروں پر ظاہر کرتے تھے کہ ہم اچھے مطلب کہتے ہیں، اور اس سے کسی مسلمان کا دھوکہ میں آکر بچنے ایسے ہی کلمات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرنا بعید نہ تھا، چنانچہ سورۃ بقرہ کے (کو غ ۱۰۴ آیت) میں مؤمنین کو لفظ رَاعِنَا سے مانعت فرمائی گئی ہے، پس اس اعتبار سے یہود کا ان کلمات کو کہنا ایک گونہ دوسروں کو گمراہ کرنا بھی ہے، گو لفظاً ہی ہوا پس اس میں يُرِيدُونَ اَنْ تَصِلُوْا کا لفظ جو کہ اوپر آیا ہے بیان بھی ہو گیا جیسا کہ الَّذِيْنَ تَهَادُّوْا میں بیان تھا الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا کا اور يُخْرِجُوْنَ میں بیان تھا يُشْرِكُوْنَ کا ان کلمات میں سے ایک یہ ہے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا، اس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ ہم نے سُن لیا اور مانا نہیں، اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ آپ کا ارشاد ہم نے سُن لیا اور کسی آپ کے مخالف کا قول جو کہ ہم کو بہکاتا تھا ہمیں مانا۔ اور بُرا مطلب ظاہر ہے کہ ہم نے آپ کی بات کو سن تو لیا مگر ہم عمل نہ کریں گے) اور (دوسرا کلمہ یہ ہے) اَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ہم ہماری بات سنو اور خدا کرے تم کو کوئی بات سنائی نہ جائے، اس کا اچھا مطلب تو یہ کہ تم کو کوئی مخالف اور رنج دہ بات نہ سنائی جائے، بلکہ آپ کا ایسا اقبال ہے کہ جو بات فرمائیں سب اس کے جواب میں موافق ہی بات آپ کو سنائیں، اور بُرا مطلب یہ ہے کہ تم کو کوئی موافق اور مسرت بخش بات نہ سنائی جائے بلکہ آپ جو بات کہیں اس کا جواب مخالف ہی آپ کے کان میں پڑے) اور (تیسرا کلمہ یہ ہے) رَاعِنَا اس کے دونوں اچھے اور بُرے مطلب سورۃ بقرہ میں گزر چکے ہیں کہ اچھے معنی تو یہ ہیں کہ ہمارے رعایت کیجئے اور بُرے معنی لغت یہود میں دشنام ہے، غرض ان کلمات کو اس طور پر کہتے ہیں کہ اپنی زبانوں کو (لجہ توقیر سے لجہ تحقیر کی طرف) پھیر کر اور (دل سے) دین میں طعن زنی (اور تحقیر) کی نیت سے (وجہ یہ ہے کہ نبی کے ساتھ طعن و استہزاء عین دین کے ساتھ طعن و تحقیر ہے) اور اگر یہ لوگ (بجائے دُومعنی دینے والے الفاظ کے) یہ کلمات کہتے (بجائے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کے) سَمِعْنَا وَاطَعْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے سُن لیا اور مان لیا) اور (بجائے اَسْمَعُ غَيْرَ مُسْمِعٍ کے صرف) اَسْمَعُ (جس کے معنی خالی یہ ہیں کہ آپ سُن لیجئے) اور (بجائے رَاعِنَا کے) اَنْظُرْنَا (جس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری مصلحت پر نظر فرمائیے، اور یہ کلمات معنی شرارت سے پاک ہیں تو اگر یہ کلمات کہتے) تو یہ بات اُن کے لئے بہتر (اور نافع بھی)



ہوتی اور حقیقت میں بھی موقع کی بات تھی مگر انہوں نے تو اپنے نفع اور موقع کی بات کہی ہی نہیں، بلکہ وہی پیوہ بات بکتے رہے، اس لئے ان کو یہ تکلیف پہنچی کہ ان کو خدا تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب جس میں یہ کلمات بھی آگئے اور بھی ان کے سب اقوال و افعال کفریہ داخل ہو گئے، پس ان سب کفریات کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت (خاصہ) دور پھینک دیا اب وہ ایمان نہ لاویں گے ہاں مگر تھوڑے سے آدمی روبرو اس کے کہ وہ ایسی حرکتوں سے دور رہے وہ دوری رحمت خاصہ سے مستثنیٰ ہیں اور وہ ایمان بھی لے آئے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ

## معارف و مسائل

**رابط آیات** پہلی آیات میں مواقع تقویٰ کا بیان تھا، جس میں زیادہ تر ذکر باہمی معاملات کا تھا، درمیان میں کچھ احکام عبادت نماز اور متعلقات کے ذکر کر دیئے گئے، جو انسان میں خدا کا خوف اور فکر آخرت پیدا کرتے اور معاملات کی درستی کو آسان کر دیتے ہیں، مذکورہ آیات سے مخالفین کے ساتھ معاملات کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہودی شرارت کا علاج اور مسلمانوں کو الفاظ و عنوان میں بھی ادب کی رعایت کی تلقین کی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكِتَابَ الَّذِي نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا

اے کتاب والو ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا تصدیق کرتا ہے

لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْهَرَكُمْ مِنْ جُوهَا فَذَرُوهَا عَلَىٰ

اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے پہلے اس سے کہ ہم مٹا ڈالیں بہت سے چہروں کو پھر اٹ دیں انکو

أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَ

بیٹھ کی طرف یا لعنت کریں ان پر جیسے ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر اور

كَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ﴿۴۷﴾

اللہ کا حکم تو ہو کر ہی رہتا ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اے لوگو جو کتاب (توریت) دیئے گئے ہو تم اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے، (اور تم کو اس پر ایمان لانے سے وحشت نہ ہونا چاہئے کیونکہ



ہم نے اس کو ایسی حالت پر (نازل فرمایا) کہ وہ سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تمہاری اصل کتاب کے لئے وہ مصدق ہے) باقی تحریف کا حصہ اس سے الگ ہے سو تم قرآن پر اس (امر غیر یقینی کے ہونے) سے پہلے پہلے (ایمان لے آؤ) کہ ہم (تمہارے) چہروں پر کئے نقش و نگار یعنی آنکھ ناک وغیرہ کو بالکل مٹا ڈالیں اور ان (چہروں) کو ان کی الٹی جانب (یعنی گڈی) کی طرح (صفا چٹ) بنادیں یا ان (ایمان نہ لانے والوں) پر ہم ایسی (خاص طور کی) لعنت کریں جیسی لعنت ان ہفتہ والوں پر کی تھی جو یہود میں گزر چکے ہیں جن کا ذکر سورۃ بقرہ میں آچکا ہے، یعنی ان کی طرح ان کو بھی بندر کی شکل بنادیں اور اللہ تعالیٰ کا (جو) حکم صادر ہو جاتا ہے وہ پورا ہی ہو کر رہتا ہے (سو اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان نہ لانے پر اگر اس مسیح کا حکم کر دیئے، پھر یہ ضروری ہو جائے گا، لہذا تم کو ڈرنا چاہئے اور ایمان لے آنا چاہئے)

## معارف و مسائل

فائدہ نمبر ۱: (قولہ تعالیٰ) فَتَرَدَّهَا عَلٰی اَدْبَارِهَا (الٹ دیں ان کو پیٹھ کی طرف) اُلٹے میں دونوں احتمال ہیں، کہ چہرے کے نقش و نگار کو مٹا کر پوئے چہرے کو پیٹھ کی کی جانب الٹ دیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چہرے کو گڈی کی طرح سپاٹ کر دیں، یعنی چہرے کو گڈی کی طرف نہ پھیریں بلکہ گڈی کے مانند سپاٹ اور صاف کر دیں (منظری) (روح المعانی)۔

فائدہ نمبر ۲: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طس و مسخ کب ہوا؟ بعض نے کہا کہ یہ عذاب قیامت سے قبل یہود پر ہو گا، بعض نے کہا یہ عذاب اس لئے واقع نہیں ہوا کہ ان میں سے بعض لوگ ایمان لے آئے تھے۔

حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک سرے سے وہ سوال ہی واقع نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طس و مسخ کا عذاب ضرور واقع ہو گا، بلکہ احتمال ہے، یعنی اگر ان کے جرم کو دیکھا جائے تو وہ اس سزا کے مستحق ہیں، اور اگر عذاب نہ دیں تو یہ ان کی رحمت ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ

بیشک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے اور بخشتا ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے

لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ اَنْ يُشْرَكَ بِاللّٰهِ فَقَلِيلٌ فَاَرٰى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۲﴾

چاہے، اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا اس نے بڑا طوفان باندھا،



أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْكُونَ أَنْفُسَهُمْ بِاللَّهِ يَزْكِي

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں بلکہ اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے

مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝۴۹ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ يَفْتَرُونَ

جس کو چاہے اور ان پر ظلم نہ ہو گا تاگے برابر دیکھا کیسا باندھتے ہیں

عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَكَفَى بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ۝۵۰

اللہ پر جھوٹ اور کافی ہے یہی گناہ صریح

## خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ ہمیشہ دائمی سزا میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے، (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا اب وہ سزا (بخشی بھی نہ رہے گی) اور (وجہ اس مشرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا (جو اپنے عظیم ہونے کی وجہ سے قابل مغفرت نہیں)۔  
 (اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی تعجب کے قابل ہیں) جو اپنی کو مقدس بتلاتے ہیں (ان کے بتلانے سے کچھ نہیں ہوتا) بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے مقدس بتلا دیں (البتہ قابل اعتبار ہے اور اللہ تعالیٰ گستاخان میں مؤمن کو مقدس بتلا چکے ہیں، جیسے سورۃ تہیمہ میں آشقی یعنی کافر کے مقابلہ میں مؤمن کی نسبت فرمایا: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى، پس وہی مقدس ہو گا نہ کہ کفر کرنے والے جیسے یہود ہیں) اور (ان یہود کو قیامت میں اس جھوٹے دعوے کا جس کا سبب کفر کو ایمان سمجھنا ہے) جو سزا ہوگی اس سزا میں) ان پر تاگے کی برابر بھی ظلم نہ ہو گا (یعنی وہ سزا ان کے جرم سے زیادہ نہیں ہے، بلکہ ایسے جرم پر ایسی ہی سزا لائق ہے، ذرا) دیکھ لو (اس دعویٰ میں) یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں (کیونکہ جب وہ باوجود کفر کے اللہ کے ہاں مقبول ہولے کے مدعی ہیں تو اس سے صاف لازم آتا ہے کہ کفر اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ محض تہمت ہے اس لئے کہ تمام شرائع میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمادی ہے کہ کفر ہمارے نزدیک سخت ناپسند اور مردود ہے) اور یہی بات (کہ خدا پر تہمت لگائی جائے) صریح مجرم ہونے کے لئے کافی ہے (پھر کیا ایسی صریح بڑی بات پر ایسی سزا کچھ ظلم و زیادتی ہے)۔



## معارف و مسائل

شُرک کی تعریف | قولہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ، اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور اسکی چند صورتیں کے بارے میں جو عقائد ہیں اس طرح کا کوئی عقیدہ کسی مخلوق کے لئے رکھنا

یہ شرک ہے، اس کی کچھ تفصیلات یہ ہیں :

علم میں شریک ٹھہرانا : یعنی کسی بزرگ یا پیر کے ساتھ یہ اعتقاد رکھنا کہ ہمارے سب حال کی اس کو ہر وقت خبر ہے، بخومی، پنڈت سے غیب کی خبریں دریافت کرنا یا کسی بزرگ کے کلام میں نال دیکھ کر اس کو یقینی سمجھنا یا کسی کو دُور سے پکارنا اور یہ سمجھنا کہ اس کو خبر ہوگئی، یا کسی کے نام کا روزہ رکھنا۔

اشراک فی التصرف : یعنی کسی کو نفع یا نقصان کا مختار سمجھنا، کسی سے مراد میں مانگنا، روزی اور اولاد مانگنا۔

عبادت میں شریک ٹھہرانا : کسی کو سجدہ کرنا، کسی کے نام کا جانور چھوڑنا، چڑھاوا چڑھانا، کسی کے نام کی منت ماننا، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، خدا کے حکم کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے قول یا رسم کو ترجیح دینا، کسی کے روبرو رکوع کی طرح جھکنا، کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، دنیا کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھنا اور کسی مہینہ کو منہوس سمجھنا وغیرہ۔

اپنی مدح سرائی اور عیوب | قولہ تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِیَّی الْاِنِّیْ نَزَّلْتُکُمْ اَنْفُسَہُمْ، یہود اپنے آپ کو مقدس بتلاتے تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں

ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو اپنی پاکی بیان کر رہے ہیں، انہیں تعجب کرنا چاہئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنی یاد دہندوں کی پاکی بیان کرنا جائز نہیں ہے، یہ منہیت

تین وجہ سے ہے :

(۱) اپنی مدح کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، تو حقیقت میں مانعت کبر سے ہوتی۔

(۲) یہ کہ خاتمہ کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ تقویٰ و طہارت پر ہوگایا نہیں، اس لئے

اپنے آپ کو مقدس بتلانا خلافِ خوفِ الہی ہے، چنانچہ ایک روایت میں حضرت زینب بنت

ابی سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے؟

اس وقت چونکہ میرا نام بَرّۃ تھا (جس کے معنی ہیں گناہوں سے پاک) میں نے وہی بتلایا، تو آپؐ

نے فرمایا، اَلَمْ تَرَ اِیَّی الْاِنِّیْ نَزَّلْتُکُمْ اَنْفُسَہُمْ، اَعَلَمْتُ بِاَهْلِ الْبَیْرِ مِنْکُمْ، ثُمَّ هَآذِیْہِ (رواہ مسلم)



بحوالہ مشکوٰۃ) یعنی تم اپنے آپ کی گناہوں سے پاکی بیان نہ کرو کیونکہ یہ علم صرف اللہ ہی کو کہ تم میں سے کون پاک ہے، پھر برہ کے بجائے آپ نے زینب رکھا (منظری)

(۳) مانعت کی عیسوی وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات اس دعوے سے لوگوں کو یہ وہم ہونے لگتا ہے کہ یہ آدمی اللہ کے ہاں اس لئے مقبول ہے کہ یہ تمام تقاضے اور عیوب سے پاک ہے، حالانکہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ بہت سے عیوب بندہ میں موجود ہوتے ہیں (بیان القرآن)

مسئلہ: اگر مذکورہ عوارض نہ ہوں تو نعمت کے اظہار کے طور پر اپنی صفت بیان کرنے کی اجازت ہے (بیان القرآن)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب کا جو مانتے ہیں

بِالْحَبِطِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هُؤُلَاءِ

بنوں کو اور شیطان کو اور کہتے ہیں کافروں کو کہ یہ لوگ

أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۖ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ

زیادہ راہ راست پر ہیں مسلمانوں سے یہ وہی ہیں جن پر

لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝۵۲

لعنت کی ہے اللہ نے اور جس پر لعنت کرے اللہ نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار

## خُلاصۂ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (یعنی تورات کے علم) کا ایک حصہ ملا ہے (پھر باوجود اس کے) وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں (کیونکہ مشرکین کا دین بت پرستی اور شیطان کی پیروی تھا جب ایسے دین کو اچھا بتلایا تو بت اور شیطان کی تصدیق لازم آئی) اور وہ لوگ (یعنی اہل کتاب) کفار (یعنی مشرکین) کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت ان مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں (یہ تو انھوں نے صراحت ہی کہا تھا) یہ لوگ (جنھوں نے کفر کے طریق کو اسلامی طریقہ سے افضل بتلایا) وہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنایا ہے (اسی ملعون ہونے کا تو اثر ہے کہ ایسے بیباک ہو کر کفر یا ست بہک رہے ہیں) اور خدا تعالیٰ جس کو ملعون بنا دے اس کا (عذاب کے وقت) کوئی مددگار



نہ پاؤ گے مطلب یہ ہے کہ اس پران کو آخرت میں یا دنیا میں بھی سخت سزا ہوگی، چنانچہ دنیا میں بعضے قتل، بعضے قید، بعضے ذلیل رہا یا ہونے اور آخرت میں جو ہونے والا ہے وہی ہوگا۔

بجلی آیت **الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِشِرْكٍَ كَبِيرٍ** [بجلی آیت] **الضَّلَالَةَ** الخ سے یہود کی قبائح اور بُری خصلتوں کا ذکر چل رہا ہے، ان آیات کا تعلق بھی انہی کے ذکر قبائح سے ہے۔

## معارف و مسائل

انجبت والطاغوت" اوپر کی آیت نمبر ۱۵ میں دو لفظ "انجبت" اور "الطاغوت" کا ذکر کیا گیا ہے، ان سے کیا مراد ہے؟ ان سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، حضرت ابن عباس، ابن جریر اور ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ "انجبت" حبشی لغت میں باخسر کو کہتے ہیں، اور "طاغوت" سے مراد کافروں کا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "انجبت" سے مراد تحریک ہے اور "طاغوت" سے مراد شیطان ہے، مالک بن انس سے منقول ہے کہ اللہ کے سوا جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کو طاغوت کہا جاتا ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مالک بن انس کا قول زیادہ پسندیدہ ہے، کیونکہ اس کا ثبوت قرآن سے بھی ہوتا ہے، ارشاد ہے، **أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ**، لیکن ان متعدد اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں اس طرح کہ اصل میں جنت تو بت ہی کا نام تھا، لیکن بعد میں اس کا استعمال اللہ کے سوا دوسری عبادت کی جانے والی چیزوں پر بھی ہونے لگا (روح المعانی)

مذکورہ آیات کا شان نزول [حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہود کے سردار جی بن اخطب اور کعب بن اشرف اپنی ایک جماعت کو جنگِ اُحد کے بعد لے کر مکہ میں قریش کے ساتھ ملنے آئے، یہود کا سردار کعب بن اشرف، ابوسفیان کے پاس آیا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا، اہل مکہ نے کعب بن اشرف سے کہا تم ایک دھوکہ دینے والی قوم ہو اگر تم واقعی اپنے قول میں سچے ہو تو ہمارے ان دو بتوں (جنت اور طاغوت) کے سامنے سجدہ کرو۔

چنانچہ اس نے قریش کو مطمئن کرنے کے لئے ایسا ہی کیا، اس کے بعد کعب نے قریش سے کہا کہ تمیں آدمی تم میں اور تمیں ہم میں سامنے آئیں، تاکہ ربِ کعبہ کے ساتھ اس چیز کا عہد



کریں کہ ہم سب مل کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کریں گے۔  
کعب کی اس تجویز کو قریش نے پسند کیا، اور اس طرح سے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف  
ایک متحدہ محاذ قائم کر دیا، اس کے بعد ابوسفیان نے کعب سے کہا کہ تم اہل علم ہو تمھارے پاس  
اللہ کی کتاب ہے، لیکن ہم بالکل جاہل ہیں، اس لئے آپ ہمارے متعلق بتائیں کہ ہم حق پر چلنے  
والے ہیں یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

کعب نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے؟ (بوسفیان نے کہا) ہم حج کے لئے اپنے اونٹوں کو  
ذبح کرتے ہیں، اور ان کا دودھ پلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، اپنے خویش و اقرباء  
کے تعلقات کو قائم رکھتے ہیں، اور بیت اللہ کا طواف اور عمرہ کرتے ہیں، اس کے برخلاف  
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا ہے، وہ اپنوں سے علیحدہ ہو چکا ہے،  
اور اس نے ہمارے قدیم دین کے خلاف اپنا ایک نیا دین پیش کیا ہے۔  
ان باتوں کو سن کر کعب بن اشرف نے کہا کہ تم لوگ حق پر ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)  
(معاذ اللہ) گمراہ ہو چکا ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات نازل فرما کر ان کے دجل و فریب کی مذمت کی (روح المعانی)

نفسانی خواہشات بعض اوقات آدمی کو دین و ایمان محروم کر دیتی ہیں

کعب بن اشرف یہودیوں کا ایک ممتاز عالم تھا جو خدا پر بھی عقیدہ رکھتا تھا، اور اسی کی عبادت کرتا تھا، لیکن جب اس کے دل و دماغ پر نفسانی خواہشات کا بھوت سوار ہوا تو اس نے مسلمانوں کے خلاف قریش سے الحاق کرنا چاہا، قریش مکہ نے اس کے ساتھ ملنے کی یہ شرط لگائی کہ وہ ہمارے بتوں کے سامنے سجدہ کرے، اس نے اس کو بھی گوارا کر لیا، جس کی تفصیل گزر چکی ہے، اس نے اپنے مذہب کے خلاف قریش کی شرط کو تو پورا کیا لیکن اپنے مذہبی عقائد کو قائم رکھنے کے لئے ان سے علیحدگی اختیار کرنا گوارا نہ کیا، قرآن عزیز نے ایک دوسرے مقام پر اس قسم کا واقعہ بلعم باعوراء کے بارے میں بیان کیا ہے، ارشاد ہے: **وَاتَّبَعُوا عَلَىٰ هِمِّ نَبَاِ الَّذِي اَتَيْنَاهُ اٰيٰتِنَا فَاَسْلَخَتْ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝**

مفسرین نے لکھا ہے کہ بلعم بن باعوراء ایک حبیل القدر عالم اور صاحب تصرف درویش تھا، لیکن جب اس نے اپنی نضائی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ناپاک تدبیریں کرنی شروع کیں تو ان کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا، لیکن خود مردود اور گمراہ ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب کا محض علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا جب تک کہ صحیح معنی



میں اس کا اتباع نہ ہو اور محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی سے مکمل اجتناب نہ ہو، ورنہ آدمی اپنے مذہب جیسی عزیز چیز کو بھی اپنی خواہشات کی بھینٹ چڑھانے سے نہیں بچتا۔ آجکل بھی بعض لوگ اس قسم کے ہیں جو مادی اور سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے اپنے حق ملک کو آسانی سے چھوڑ دیتے ہیں، اور لادینی عقائد و نظریات کو اسلام کا لباس پہنانے کی پوری کوشش کرتے ہیں، نہ ان کو خدا کے عہد و میثاق کی کچھ پرواہ ہوتی ہے، اور نہ آخرت کا خوف، یہ سب کچھ صحیح اور حق ملک کو چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر چلنے سے ہوتا ہے۔

اللہ کی لعنت دنیا اور آخرت | لعنت نام ہے اللہ کی رحمت سے دوری کا، اور انتہائی رسوائی اور  
میں رسوائی کا سبب ہے | ذلت کا، جس پر اللہ کی لعنت ہو وہ اللہ کا قرب حاصل نہیں کر سکتا،  
ان کے بارے میں اتنی سخت وعید آئی ہے کہ فرمایا: **مَلْعُونٌ فَنِينَ** اَيْسَمًا تَقْفُوْا اَخِيْذُوْا رَقِيْتُمْ لَكُمْ  
تَقِيْلًا ۚ جن پر اللہ کی لعنت ہے وہ جہاں کہیں بھی ملیں اُن کی گردن اڑائی جائے ۝ یہ تو ان کی  
دنیاوی رسوائی ہے، اور آخرت کی رسوائی تو اس سے بھی سخت ہوگی۔

اللہ کی لعنت کے مستحق | **وَمَنْ يَلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ نَّجْعِلَ لَهُ نَصِيْرًا** اس آیت سے معلوم ہوتا  
کون لوگ ہیں؟ ۝ جو کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو اس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا، اب غور طلب  
یہ بات ہے کہ اللہ کی لعنت کے مستحق کون لوگ ہیں؟

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود دینے والے، سود کھانے  
والے، اس کے لکھنے والے اور اس کی گواہی دینے والے سب پر لعنت کی ہے، اور وہ سب  
گناہ میں برابر ہیں (رواہ مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا: **مَلْعُوْنٌ مِّنْ عَمَلِ قَوْمٍ لُّوْطٍ** (رواہ  
رمزین بحوالہ مشکوٰۃ) "یعنی جو آدمی لوط (علیہ السلام) کی قوم کے جیسا عمل کرے وہ لعنتی ہے"  
(یعنی مروجے بد فعلی کرنے والا) پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سارق (چور) پر لعنت بھیجتا ہے،  
جو انڈے اور رسی جیسی حقیر چیز کی چوری تک گریز نہیں کرتا جس کی پاداش میں اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے  
(متفق علیہ بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: **لَعَنَ اللّٰهُ اَكِلَ الرِّبْوِ وَ مُؤْكِلَهُ وَ الْوَائِسَةَ وَ  
الْمُسْتَوْشِمَةَ وَ الْمَرْصُوْرَ** (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

اللہ کی لعنت ہے سود کھانے والے اور کھلانے والے پُر اُن عورتوں پر جو اپنے  
جسم کو گودنے والی (یعنی سولی کے ناکہ سے جسم میں سوراخ کر کے سرمہ ڈالتی ہیں)  
ناکہ زینت ہو، یا گودانے والی ہیں اور ایسے ہی تصویر کھینچنے والوں پر لعنت کی ہے ۝



ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتے ہیں شراب پر اور اس کے پینے والے پر اٹلانے والے پر، اس کے بیچنے والے خریدنے والے، اس کے پھوڑنے والے، اس کے اٹھانے والے اور منگوانے والے سب پر (رواہ ابوداؤد، ابن ماجہ بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ چھ آدمی ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت بھیجی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر لعنت کی ہے، اور ہر نبی مستجاب الدعوا ہوتا ہے، وہ چھ آدمی یہ ہیں:

(۱) اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا (۲) اور وہ شخص جو جبر و قہر سے اقتدار حاصل کر کے اس آدمی کو عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہو اور جس کو اللہ نے عزت عطا کی ہو اس کو ذلیل کرے (۳) اللہ کی تقدیر کو جھٹلانے والا (۴) اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنے والا (۵) میری اولاد میں وہ آدمی جو محرمات کو حلال کرنے والا ہو (۶) اور میری سنت کو چھوڑنے والا (رواہ البیہقی فی المدخل بحوالہ مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا: لعنَ اللہُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُورَ اَلَيْسَ یعنی جو کوئی نامحرم پر بری نظر ڈالے اور جس کے اوپر نظر ڈالے (بشرطیکہ جس پر بری نظر پڑی ہے اس کے ارادہ اور اختیار کو اس میں دخل ہو) ان پر اللہ نے لعنت کی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَ یَلْبَسُ لِبْسَةَ الْمَرْءَةِ وَالْمَرْءَةَ تَلْبَسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مرد پر لعنت کی ہے جو عورت کا لباس پہنے اور ایسی عورت پر لعنت کی جو مرد کا لباس پہنے (مشکوٰۃ)

”حضرت عائشہؓ سے کسی نے عرض کیا کہ ایک عورت (مردانہ) جوتا پہنتی ہے حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ کے رسولؐ نے ایسی عورت پر لعنت کی ہے جو مردوں کے طور پر لباس پہنتی ہو“

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ تَعَالَى عَنْهَا أَنَّ أَمْرَةً تَلْبَسُ التَّحْلَ قَالَتْ لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَاءِ (رواہ ابوداؤد بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۸)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ان مردوں پر جو عورتوں کی طرح

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ لَعَنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالْمَرْجَلَةَ



شکل و صورت بنا کر ہجڑے بنیں، اور  
لعنت کی ان عورتوں پر جو شکل و صورت

مِنَ النِّسَاءِ وَقَالَ أَخْرِجُوهُنَّ مِنْ  
بُيُوتِكُمْ (رواہ البخاری بحوالہ مشکوٰۃ)

میں مروانہ بن خثیمار کریں، اور ارشاد فرمایا کہ ان کو اپنے گھروں سے نکال دو۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

”یعنی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو گودنے

لَعَنَ اللَّهُ الْوَأَشْمَاتِ الْمُسْتَوْتَاتِ

والیوں پر اور گودوانے والیوں پر اور جو

وَالْمُسْتَصَاتِ وَالْمُقَلِّجَاتِ

راہرو یعنی بھودوں کے بال چھتی ہیں (تاکہ

لِلْحُسْنِ الْمُخَيَّرَاتِ خَلَقَ اللَّهُ

بھوس باریک ہو جائیں) اور خدا کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو حُسن کے لئے دانتوں کے

درمیان کشادگی کرتی ہیں جو اللہ کی خلقت کو بد لئے والی ہیں۔“

لعنت کے احکام | لعنت جس قدر بُری چیز ہے اسی قدر اس کے کرنے پر پابندیاں بھی عامہ

کی گئی ہیں، کسی مسلمان پر لعنت کرنا حرام ہے اور کافر پر بھی صرف اُس صورت میں کی جاسکتی

ہے جبکہ اس کا کفر پر مبنی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس سے متعلق یہ ہیں:

حدیث میں ہے:

”حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ

عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ

اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مؤمن وہ نہیں ہے جو طعنہ باز اور لعنت

لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا

ہو، اور نہ ہی بدگو۔“

بِالطَّعَّانِ وَلَا الْبَدِي

(رواہ الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

”حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ میں نے

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ سَمِعْتُ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

فرماتے سنا کہ جب بندہ کسی چیز پر

يَقُولُ إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا عَنَ شَيْئًا

لعنت کرتا ہے تو وہ لعنت آسمان کی

صَعِدَتْ اللَّعْنَةُ إِلَى السَّمَاءِ

طرف چڑھتی ہے، جس پر آسمان کے

فَتُخَلَقُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ دُونَهَا

دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، پھر

ثُمَّ تَهْبِطُ إِلَى الْأَرْضِ فَتُخَلَقُ

وہ زمین کی طرف اترتی ہے تو زمین

أَبْوَابُهَا دُونَهَا ثُمَّ تَأْخُذُ يَمِينًا

کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں

وَشِمَالًا فَإِذَا لَمْ تَجِدْ مَسَافًا

یعنی زمین اس لعنت کو قبول نہیں

رَجَعَتْ إِلَى الَّذِي لَعِنَ فَإِنْ



كَانَ لَكَ أَهْلًا وَلَا مَجْعَتَ  
(إلى قائلها) (رواه ابوداؤد و بحوالہ مشکوٰۃ)

کرتی، پھر وہ دائیں بائیں گھومتی ہے جب کہیں اس کو راستہ نہیں ملتا تو جس پر لعنت کی گئی ہے اس کے پاس پہنچتی ہے، اگر وہ واقعی لعنت کا مستحق ہے تو اس پر پڑتی ہے، ورنہ پھر اپنے کہنے والے پر پڑ جاتی ہے۔

عَنْ أَبِي عُبَّاسٍ أَنَّ رَجُلًا نَازَعَتْهُ  
الرِّيحُ رِدَاءَهُ فَلَعَنَهَا فَقَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
لَا تَلْعَنُهَا فَإِنَّهَا مَأْمُورَةٌ  
وَأَنَّ مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهُ  
بِأَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ  
(رواه الترمذی بحوالہ مشکوٰۃ)

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ہونے ایک آدمی کی چادر اڑا لی تو اس نے ہوا پر لعنت کی اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس پر لعنت نہ کر اس لئے کہ وہ اللہ کی جانب سے مامور ہے اور (یاد رکھئے) کہ جو آدمی ایسی چیز پر لعنت کرے جس کی وہ مستحق نہیں ہے تو یہ لعنت اس کے کہنے والے ہی پر لوٹتی ہے۔

**مسئلہ:** کسی معین شخص کے بارے میں جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی موت کفر پر ہوئی ہے اس پر لعنت جائز نہیں، اگرچہ وہ فاسق ہی ہو، اسی اصول کی بناء پر یزید پر لعنت کرنے سے علامہ شامی نے منع کیا ہے، لیکن معین کا فریج جس کی موت کفر پر ہونے کا یقین ہو، مثلاً ابو جہل، ابولہب پر جائز ہے (شامی، ج ۲ ص ۸۳۶)

**مسئلہ:** کسی کا نام لئے بغیر اس طرح لعنت کرنا جائز ہے کہ ظالموں پر یا جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

**مسئلہ:** لغت لعنت کے معنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے کے ہوتے ہیں، شرعاً کفار کے حق میں اس کے معنی اللہ کی رحمت سے بعید ہونے کے ہیں، اور مؤمنین کے حق میں برابر (صلحاء) کے درجہ سے نیچے گرنے کے ہیں (نقلہ الشامی عن القسستانی، ج ۲ ص ۸۳۶) اس لئے کسی مسلمان کے لئے اس کے نیک عمل کم ہو جانے کی دعا بھی جائز نہیں۔

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذَا لَوْ كُنَ النَّاسُ

کیا ان کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک

نَقِيرًا ۝ أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ

بے برابر، یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر جو دیا ہے ان کو اللہ نے



مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

اپنے فضل سے سوہم نے تودی ہے ابراہیم کے خاندان کو کتاب اور علم،

وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا ۝۵۴ فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ

اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت پھر ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی

مَنْ صَدَّقَ عَنْهُ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝۵۵

اس سے بشارت اور کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ۔

## خُلاصۃ تفسیر

ہاں کیا ان کے پاس کوئی بھتہ ہے سلطنت کا سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے یاد دہرائیوں سے (جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں سو (آپ کو ایسی چیز مل جانا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ) ہم نے پہلے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان (والوں) کو کتاب (آسمانی) بھی دی ہے اور علم بھی دیا ہے اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (چنانچہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء گزرے ہیں، بعض انبیاء سلاطین بھی ہوئے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام و حضرت داؤد علیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام و حضرت سلیمان علیہ السلام کا کثیر الاندواج ہونا بھی معلوم و مشہور ہے اور یہ سب اولاد ابراہیم میں ہیں، سو جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اولاد ابراہیم سے ہیں، تو آپ کو اگر یہ نعمتیں و عطیات مل گئے تو تعجب کی کیا بات ہے) سو ان انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی جو کہ خاندان ابراہیم علیہ السلام سے گزر چکے ہیں جو لوگ موجود تھے ان میں سے بعض تو اس (کتاب و حکمت) پر ایمان لائے اور بعض ایسے تھے کہ اس سے روگرداں ہی رہے رہیں اگر آپ کی رسالت و قرآن پر بھی آپ کے زمانہ کے بعض لوگ ایمان نہ لائیں تو کوئی بچہ کی بات نہیں) اور ان کفار و معرضین کو اگر دنیا میں سزا کم بھی ہو یا نہ ہو تو کیا ہوا ان کے لئے آخرت میں (دوزخ کی آتش سوزاں) سزا کافی ہے،



## معارف و مسائل

یہودیوں کے حسد کرنے | اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم و فضل اور جاہ و جلال  
پر شدید مذمت عطا کیا تھا، اس پر یہودی جلتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آیت نمبر ۵۳ و ۵۴

میں ان کے اسی حسد و بغض کی شدید مذمت کی ہے، اور ان کے حسد کو نامعقول قرار دیتے ہوئے  
دو وجہیں بیان کی ہیں، ایک وجہ آیت نمبر ۵۳ میں بیان کی اور دوسری آیت نمبر ۵۴ میں، لیکن  
دونوں کا حاصل ایک ہے، یعنی تمہارا حسد کس بات پر ہے، اگر اس پر ہے کہ اصل صاحب سلطنت  
تم ہو، تمہاری ہی سلطنت ان کو مل گئی، اس کا غلط ہونا تو کھلا ہوا ہے، کہ تم سلطنت سے خود محروم  
ہو، اور تمہیں کچھ حصہ سلطنت کا مل جاتا تو تم ایک کوڑی بھی کسی کو نہ دیتے، اور اگر تمہارا حسد اس پر  
ہے کہ گو سلطنت ہمارے پاس سے ان کے پاس نہیں گئی پھر بھی ان کو کیوں ملی، ان کو سلطنت  
سے کیا علاقہ؟ تو اس کا جواب یہ دیا کہ یہ بھی انبیاء کے خاندان سے ہیں جن میں سلطنت پہلے سے  
ہوتی آئی ہے، اس لئے کسی اجنبی جگہ سلطنت نہیں آئی، لہذا تمہارا حسد کرنا نامعقول ہے۔

حسد کی تعریف، حکم اور | سلامہ نووی شافعی مسلحہ، حسد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں،  
اس کی مضرتوں کا بیان | الْحَسَدُ تَمَنَّى زَوَالِ الْيُغْنَى، (مسلم ج ۲) یعنی دوسرے آدمی  
کی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا حسد کہلاتا ہے، اور یہ حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا تَبَاغَضُوا وَلَا تَحْسَدُوا وَلَا  
تَدَابَرُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ خُفَاً  
وَلَا يَجُلُ لِلْمُسْلِمِ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ  
فَوْقَ ثَلَاثٍ

(مسلم، ج ۲)

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

أَيُّكُمْ وَالْحَسَدُ فَإِنَّ الْحَسَدَ  
يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ  
الْحَطَبَ، (رواہ ابو داؤد و بحوالہ مشکوٰۃ)

عَنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ  
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

”تم آپس میں بغض اور حسد نہ کرو اور  
نہ ہی ایک دوسرے سے پشت پھیر، بلکہ  
اللہ کے بندے اور بھائی بن جاؤ، اور  
جائز نہیں کسی مسلمان کے لئے کہ وہ اپنے  
بھائی سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے

”تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں  
کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ  
لکڑی کو کھا جاتی ہے“

”حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سرایا  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے



وَبِالْيُكُودِ دَاءُ الْأُمِّ قَبْلَكُمْ  
الْعَيْنُ وَالْبُغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ  
لَا أَقُولُ تَخْلُقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ  
تَخْلُقُ الدِّينَ  
رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ  
بِحَوْلِ الْمَشْكُوتِ

کہ تمھاری طرف (بھی) پہلی قوموں کا  
مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد  
ہے، اور بغض ایسی خصلت ہے جو  
مونڈ دینے والی ہے، میں یہ نہیں کہتا  
کہ وہ بالوں کو مونڈتی ہے، بلکہ دین کو  
مونڈ دیتی ہے۔

حسد خواہ دنیاوی کمال پر ہو یا دینی کمال پر دونوں حرام ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول  
”أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ“ سے امر اول کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے، اور ”الْكِتَابِ  
وَالْحِكْمَةِ“ سے امر ثانی کی طرف۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كَلِمًا

بیشک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے آگ میں جس وقت

نُصِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَلُهَا لَكُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا

جل جائے گی کھال اُن کی تو ہم بدل دیں گے ان کو اور کھال تاکہ چکتنے رہیں

الْعَذَابِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝۵۶ وَالَّذِينَ

عذاب بیشک اللہ ہے زبردست حکمت والا اور جو لوگ

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي

ایمان لائے اور کام کئے نیک البتہ ان کو ہم داخل کریں گے باغوں میں جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا لَهُمْ فِيهَا

نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہمیشہ ان کے لئے وہاں

أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۵۷

عورتیں ہیں ستھری اور ان کو ہم داخل کریں گے گھن کی چھاؤں میں

## خلاصہ تفسیر

بلاشک جو لوگ ہماری آیات (رواحکام) کے منکر ہوئے (ہم ان کو) عنقریب ایک سخت  
آگ میں داخل کریں گے (اور وہاں ان کی برابر یہ حالت رہے گی کہ) جب ایک دفعہ ان کی کھال



آگ سے جل چکی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری (تازی) کھال پیدا کر دینگے تاکہ (ہمیشہ) عذاب ہی بھگتتے رہیں (کیونکہ پہلی کھال میں جلنے کے بعد شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس میں احساس نہ ہے اسلئے شبہ قطع کرنے کیلئے یہ سازیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں کہ وہ ایسی سزا دیتے ہیں اور حکمت الہی میں اسلئے باوجود قدرت کے جلی ہوئی کھال کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں پھر بھی کسی حکمت بدل دیا جیسے کہ ایک حکمت کا بیان ابھی ہوا ہے) اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کے ہم آنگو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کر دیئے گئے انکے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہونگی انہیں ہمیشہ رہینگے انکے واسطے ان (باغوں) میں پاک صاف بیاباں ہونگی اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ (کی جگہ) میں داخل کریں گے۔

### معارف و مسائل

حضرت معاذؓ کُلَّمَا نَضَجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَا لَهُمُوهُمْ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ان کی کھال جل چکی گی تو اس کو تبدیل کیا جائے گا، اور یہ کام اتنی سرعت سے ہوگا کہ ایک ساعت میں تین مرتبہ کھال تبدیل کی جائے گی۔

اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں:

”آگ ایک دن میں ستر ہزار مرتبہ ان کو کھائے گی، جب ان کو کھا چکے گی تو ان لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم پھر پہلی حالت پر لوٹ جاؤ، پس وہ لوٹ جائیں گے“

تَأْكُلُ النَّارُ مِنْ يَوْمٍ سَبْعِينَ  
أَلْفَ مَرَّةٍ كُلَّمَا أَكَلَتْهُمْ قِيلَ  
لَهُمْ عُوذُوا فَيَعُودُونَ كَمَا  
كَانُوا رَأَخْرَجَ إِلَيْهِمْ سَعَتِ

الحسن بحوالہ مظہری ۲۷۰

”نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اہل جہنم میں سب سے کم عذاب کے اعتبار سے وہ آدمی ہوگا جس کے تلووں میں آگ کی دو چٹکار لیا ہوں گی جن کی وجہ سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح کھولتا ہوگا“

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
قَالَ إِنَّ أَهْلَ النَّارِ أَهْلَ النَّارِ  
عَذَابًا رَجُلٌ فِي أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ  
جَهَنَّمَانِ يَغْلِي مِنْهُمَا دِمَاغُهُ  
كَمَا يَغْلِي الرَّجُلُ بِالْقَمِيمِ

(مسند البخاری و مسلم بحوالہ الترغیب والترہیب ج ۴ ص ۲۳۹)

ازواج مطہرات کی تفسیر حاکم نے ابوسعید خدریؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کی عورتیں پاک ہوں گی، یعنی وہ حیض، بول و براز اور ناک سے بہنے والی کدورت سے پاک ہوں گی۔

حضرت مجاہدؒ نے مذکورہ چیزوں پر اضافہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ بچے پیدا کرنے اور

ناپاک نطفہ سے بھی پاک ہوں گی (مظہری)



ظِلًّا ظِلِيلًا، ظِل کے بعد ظلیل کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ وہ سایہ ہمیشہ رہے  
والا ہوگا اور گھنا سایہ ہوگا، جیسا کہ کہا جاتا ہے شَمْسٌ شَامِسٌ اور قَبِيلٌ لَيْثِلٌ، اس سے اشارہ  
اس بات کی طرف ہے کہ جنت کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی ہوں گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جنت  
جنت میں ایک ایسا درخت ہے جس کے سایہ کو ایک  
سوار سو سال میں بھی نہ کر سکا اگر آپ چاہیں  
تو یہ آیت وَظِلٌّ تَحْتَهُ دُرٌّ پڑھیں ۵۹

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ  
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ  
فِي الْجَنَّةِ شَجَرَةً يُسِيرُ الرَّكَّابُ  
فِي ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ مَا يَقْطَعُهَا  
أَقْرَعٌ وَإِنْ شِئْتُمْ وَظِلٌّ تَحْتَهُ  
(متفق علیہ، بحوالہ منطوری)

ربیع بن انس نے ظِلًّا ظِلِيلًا کی تفسیر میں فرمایا: ہو ظِلُّ الْعَرْشِ الَّذِي لَا يَزُولُ یعنی وہ سایہ  
عرش کا سایہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا

بیشک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو اور جب

حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا

فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے

يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَبِيحًا بَصِيرًا ۝ يَأَيُّهَا الَّذِينَ

تم کو بیشک اللہ ہے سننے والا دیکھنے والا اے ایمان والو

آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ

پھر اگر جھگڑا پڑو کس چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے اگر

كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَ

یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر یہ بات اچھی ہے اور

أَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝

بہت بہتر ہے اس کا اُغما



## خلاصہ تفسیر

راے اہل حکومت خواہ مکتوروں پر حکومت ہو خواہ بہتوں پر (بیشک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہنچا دیا کرو اور (تم کو) یہ (بھی حکم دیتے ہیں) کہ جب (محمکوم) لوگوں کا تصفیہ کیا کرو (ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں) تو عدل (انصاف) سے تصفیہ کیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے، (دنیا کے اعتبار سے بھی کہ اس میں استحکام حکومت ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی کہ موجب قرب و ثواب ہے) بلاشک اللہ تعالیٰ (تمہارے اقوال کو جو دربارہ امانت و تصفیہ تم سے صادر ہوتے ہیں) خوب سنتے ہیں (اور تمہارے افعال کو جو اس باب میں تم سے واقع ہوتے ہیں) خوب دیکھتے ہیں (تو اگر کمی و کوتاہی کرو گے مطلع ہو کر تم کو سزا دیں گے، یہ خطاب تو حکام کو ہوا، آگے محکومین کو ارشاد ہے کہ) اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کہنا مانو (اور یہ حکم تو تمہارے اور حکام سب کے لئے عام ہے) اور تم (مسلمانوں) میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی (کہنا مانو اور یہ حکم خاص ہو تم محکومین کے ساتھ) پھر (اگر ان کے احکام کا اللہ اور رسول کے کہے ہوئے کے خلاف نہ ہونا محکوم و حاکم دونوں کے اتفاق معتبر سے ثابت ہو تو خیر اس میں تو حکام کی اطاعت کرو گے ہی اور) اگر ان کے احکام میں سے (کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو) کہ یہ اللہ و رسول کے کہے ہوئے کے خلاف ہے یا نہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تو آپ سے پوچھ کر اور بعد آپ کی وفات کے ائمہ مجتہدین و علماء دین سے رجوع کر کے (اس امر کو) کتاب (اللہ اور سنت) رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف حوالہ کر لیا کرو (اور ان حضرات سے جیسا فتویٰ ملے اس پر سب محکوم و حکام عمل کر لیا کرو) اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ اس ایمان کا مقتضی یہی ہے کہ یوم قیامت میں اللہ تعالیٰ کی دار و گیر ہو جو کہ مخالفت کرنے پر ہونے والی ہے) (یہ امور) جو مذکور ہوئے اطاعت اللہ کی رسول کی اولی الامر کی، حوالہ کرنا تنازعات کا کتاب سنت کی طرف (سب) دنیا میں بھی، بہتر ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کا انجام خوشتر ہے (کیونکہ دنیا میں امن و راحت اور آخرت میں نجات و سعادت ہیں)۔



## معارف و مسائل

آیات کا شان نزول | مذکورہ آیات میں سے پہلی آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے کہ کعبہ کی خدمت اسلام سے پہلے بھی بڑی عزت سمجھی جاتی تھی، اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزز و ممتاز مانے جاتے تھے، اسی لئے بیت اللہ کی مختلف خدمتیں مختلف لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، زمانہ جاہلیت سے ایام حج میں حجاج کو زمزم کا پانی پلانے کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد محترم حضرت عباسؓ کے سپرد تھی، جس کو سقایہ کہا جاتا تھا، اسی طرح اور بعض خدمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے چچا ابوطالب کے سپرد تھیں، اسی طرح بیت اللہ کی کبھی رکھنا اور مقررہ ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہ سے متعلق تھا۔

عثمان بن طلحہ کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم پیر اور جمہورات کے روز بیت اللہ کو کھولا کرتے تھے، اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے، ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ صحابہؓ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لئے تشریف لائے، (اس وقت تک عثمان بن طلحہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے) انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اندر جانے سے روکا، اور انتہائی ترشی دکھائی، آپؐ نے بڑی بردباری کے ساتھ ان کے سخت کلمات کو برداشت کیا، پھر فرمایا، اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی کبھی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، جبکہ مجھے خستیار ہوگا کہ جس کو چاہو سپرد کروں، عثمان بن طلحہؓ نے کہا کہ اگر ایسا ہو گیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہو جائیں گے، آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، اس وقت قریش آباد اور عزت والے ہو جائیں گے، آپؐ یہ کہتے ہوئے بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے، اس کے بعد جب میں نے اپنے دل کو ٹیٹولا تو مجھے لعین ہو گیا کہ آپؐ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ہو کر رہے گا، میں نے اسی وقت مسلمان ہونے کا ارادہ کر لیا لیکن میں نے اپنی قوم کے تیور بدلے ہوئے پائے، وہ سب کے سب مجھے سخت ملامت کرنے لگے، اس لئے میں اپنے ارادہ کو پورا نہ کر سکا، جب کہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کبھی طلب فرمائی، میں نے پیش کر دی۔

بعض روایات میں ہے کہ عثمان بن طلحہؓ کبھی لے کر بیت اللہ کے اوپر چڑھ گئے تھے حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کے لئے زبردستی کبھی ان کے ہاتھ سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدی تھی، بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز ادا کرنے کے بعد



جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو پھر کبھی مجھ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا، کہ لو اب یہ کبھی ہمیشہ تمھارے ہی خاندان کے پاس قیامت تک رہے گی، جو شخص تم سے یہ کبھی لے گا وہ ظالم ہوگا، مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ کبھی لے لے، اسی کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلہ میں تمہیں جو مال مل جائے اس کو شرعی قاعدہ کے موافق استعمال کرو۔

عثمان بن طلحہ کہتے ہیں کہ جب میں کبھی لے کر خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر مجھے آواز دی اور فرمایا، کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں؟ اب مجھے وہ بات یاد آگئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے فرمائی تھی کہ ایک روز تم یہ کبھی میرے ہاتھ میں دیکھو گے، میں نے عرض کیا کہ بیشک آپ کا ارشاد پورا ہوا، اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا (منظہری بروایت ابن سعد)

حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی اِنَّ اللّٰهَ يَمْوِئُكُمْ اَنْ تَكُوْنُوْا اِلٰى اٰهْلِيْكُمْ اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی، ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اُس وقت جو کعبہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ عثمان بن طلحہ کو بلا کر کبھی ان کو سپرد کی، کیونکہ عثمان بن طلحہ نے جب یہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی تو یہ کہہ کر دی تھی کہ میں یہ امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں، اگرچہ ضابطہ سے اُن کا یہ کہنا صحیح نہ تھا، بلکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ہر طرح کا خستہ یا رتھا کہ جو چاہیں کریں، لیکن قرآن کریم نے صورت امانت کی بھی رعایت فرمائی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ہدایت کی کہ کبھی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمادیں، حالانکہ اس وقت حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے یہ کبھی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرمادیجئے، مگر آیت مذکورہ کی ہدایت کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی درخواست رد کر کے کبھی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمائی (تفسیر مظہری) یہاں تک آیت کے شان نزول پر کلام تھا، اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آیت کا شان نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ ہوا کرتا ہے لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری امت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

اب اس کے معنی اور مطلب ملاحظہ کیجئے:



ارشاد ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا**، یعنی اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مستحقین کو پہنچایا کرو، اس حکم کا مخاطب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمان ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ خاص امراء و حکام مخاطب ہوں، اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ہر وہ شخص مخاطب ہے جو کسی امانت کا امین ہے، اس میں عوام بھی داخل ہیں اور حکام بھی۔

ادائے امانت کی تاکید | حاصل اس ارشاد کا یہ ہے کہ جس کے ہاتھ میں کوئی امانت ہے اس پر لازم ہے کہ یہ امانت اس کے اہل و مستحق کو پہنچائے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادائے امانت کی بڑی تاکید فرمائی ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہو گا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو:

<p>لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةً لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ</p>	<p>”یعنی جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس شخص میں معاہدہ کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں“</p>
--	---

(یہ روایت بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کی ہے)

خیانت، نفاق کی علامت ہے | بخاری اور مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز نفاق کی علامتیں بتلاتے ہوئے ایک علامت یہ بتلائی کہ جب امانت اُس کے پاس رکھی جائے تو خیانت کرے۔

امانت کی قسمیں | اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن حکیم نے لفظ امانت بصیغہ جمع استعمال فرمایا، جس میں اشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر امانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کبھی کوئی خاص مال نہ تھا، بلکہ یہ کبھی خدمت بیت اللہ کے ایک عہدہ کی نشانی تھی۔

حکومت کے مناصب | اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ اللہ کی امانتیں ہیں | سب اللہ کی امانتیں ہیں، جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل و نصب کے اختیارات ہیں، ان کے لئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں ہے، بلکہ اُن پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لئے اپنے دائرہ حکومت میں اس کے مستحق کو تلاش کریں۔

کسی منصب پر غیر اہل کو بٹھانے والا ملعون ہے | پوری اہلیت والا سب شرائط کا جامع کوئی نہ ملے



تو موجودہ لوگوں میں قابلیت اور امانت داری کے اعتبار سے جو سب سے زیادہ فائق ہو اس کو ترجیح دی جائے۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی مدد میں بغیر اہلیت معلوم کئے ہوئے دیدیا اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے (جمع الفوائد، ص ۳۲۵)

بعض روایات میں ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لئے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ کی خیانت کی اور رسول کی اور سب مسلمانوں کی، آج جہاں نظام حکومت کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب اس فسادِ انی تعلیم کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے، کہ تعلقات اور سفارشات اور رشوتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نا اہل اور ناقابل لوگ عہدوں پر قابض ہو کر خلقِ خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظام حکومت برباد ہو جاتا ہے۔

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: **إِذَا أُوتِيَ الْإِمْرَءُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ**۔ یعنی جب دیکھو کہ کاموں کی ذمہ داری ایسے لوگوں کے سپرد کر دی گئی جو اس کام کے اہل اور قابل نہیں تو راب اس فساد کا کوئی علاج نہیں، قیامت کا انتظار کرو۔ یہ ہدایت صحیح بخاری کتاب العلم میں ہے۔

**خُلاصۃ** یہ ہے کہ قرآن کریم نے لفظ **أَمْنَت** بصیغہ جمع لاکر اس کی طرف اشارہ کر دیا کہ امانت صرف اسی کا نام نہیں کہ ایک شخص کا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بطور امانت رکھا ہو، بلکہ امانت کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں حکومت کے عہدے بھی داخل ہیں۔

اور ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

**الْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ** | یعنی مجلسیں امانت داری کے ساتھ ہونی چاہئیں

مطلب یہ ہے مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اسی مجلس کی امانت ہے، ان کی اجازت

کے بغیر اس کو دوسروں سے نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے: **الْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ**۔ یعنی جس شخص سے کوئی

مشورہ لیا جائے وہ امین ہے، اس پر لازم ہے کہ مشورہ دہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ

لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، اگر جانتے ہوئے خلاف مشورہ دیدیا تو امانت میں



خیانت کا مرتکب ہو گیا، اسی طرح کسی نے آپ سے اپنا راز کہا تو وہ اس کی امانت ہے، بغیر اس کی اجازت کے کسی سے کہہ دینا خیانت ہے، آیت مذکورہ میں ان سب امانتوں کا حق ادا کرنے کی تاکید ہے۔

یہاں تک پہلی آیت کے ابتدائی جملہ کی تفسیر تھی، آگے پہلی آیت کے دوسرے جملہ کی تفسیر ہے  
وَإِذَا حُكِمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔ یعنی جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو عدل و انصاف کے ساتھ کیا کرو۔ ظاہر یہ ہے کہ اس کا خطاب حکام و امراء کو ہے جو خصومات و مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے ہیں، اور اسی کے قرینہ سے بعض حضرات نے پہلے جملہ کا مخاطب بھی حکام و امراء کو قرار دیا ہے، اگرچہ پہلے جملہ کی طرح اس میں بھی گنجائش اس کی موجود ہے، کہ حکام و عوام دونوں اس خطاب میں شامل ہوں، کیونکہ عوام میں اکثر فریقین کسی کو ثالث بنا کر فیصلہ کر دیا کرتے ہیں، اسی طرح جھگڑوں کا فیصلہ کرنا عوام میں بھی پایا جاسکتا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اول نظر میں ان دونوں جملوں کے مخاطب حکام و امراء ہی معلوم ہوتے ہیں، اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے مخاطب اول حکام و امراء ہیں اور ثانیاً یہ خطاب ہر اس شخص کے لئے بھی ہے جس کے پاس لوگوں کی امانتیں ہوں اور جس کو کسی مقدمہ کا ثالث بنا دیا جائے۔

اس جملہ میں حق تعالیٰ نے بین الناس فرمایا بین المسلمین یا بین المؤمنین نہیں فرمایا، اس میں اشارہ فرما دیا کہ مقدمات کے فیصلوں میں سب انسان مساوی ہیں، مسلم ہوں یا غیر مسلم، اور دوست ہوں یا دشمن، اپنے ہموطن، ہم رنگ، ہم زبان ہوں یا غیر، فیصلہ کرنے والوں کا فرض ہے کہ ان سب تعلقات سے الگ ہو کر جو بھی حق و انصاف کا تقاضا ہو وہ فیصلہ کریں۔

عدل و انصاف امن عالم کا ضامن ہے | غرض آیت کے پہلے جملہ میں ادا سے امانات کا حکم ہے، اور دوسرے جملہ میں عدل و انصاف کا، ان میں ادا سے امانات کو مقدم کیا گیا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پورے ملک میں عدل و انصاف کا قیام اس کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، کہ جن کے ہاتھ میں ملک کا اقتدار ہے وہ پہلے ادارہ امانات کا فریضہ صحیح طور پر ادا کریں، یعنی حکومت کے عہدوں پر صرف اپنی لوگوں کو مقرر کریں جو صلاحیت کار اور امانت و دیانت کی رو سے اس عہدہ کے لئے سب سے زیادہ بہتر نظر آئیں، دوستی اور تعلقات یا محض سفارش یا رشتہ کو اس میں راہ نہ دیں، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ نا اہل ناقابل یا خائن اور ظالم لوگ عہدوں پر قابض ہو جائیں گے، پھر اگر ارباب اقتدار دل سے بھی یہ چاہیں کہ ملک میں عدل و انصاف کا رواج ہو تو ان کے لئے ناممکن ہو جائے گا، کیونکہ یہ عہدہ داران حکومت ہی حکومت کے ہاتھ اور پیر ہیں، جب یہ خائن یا ناقابل ہوئے تو عدل و انصاف قائم کرنے کی کیا راہ ہے؟



اس آیت میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس میں حق جل شانہ نے حکومت کے عہدوں کو بھی امانت قرار دے کر اڈل تو یہ واضح فرمادیا کہ جس طرح امانت صرف اسی کو ادا کرنا چاہئے جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر، مسکین پر جسم کھا کر کسی کی امانت اس کو دینا جائز نہیں یا کسی رشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لئے کسی شخص کی امانت اس کو دینا درست نہیں، اسی طرح حکومت کے عہدے جن کے ساتھ عام خلق خدا تعالیٰ کا کام متعلق ہوتا ہے یہ بھی امانتیں ہیں، اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اپنی صلاحیت کا رادہ قابلیت و استعداد کے اعتبار سے بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں، اور دیانت اور امانت کے اعتبار سے بھی سب میں بہتر ہوں، ان کے سوا کسی دوسرے کو یہ عہدہ سپرد کر دیا تو یہ امانت ادا نہ ہوئی۔

علاقائی اور صوبائی بنیادوں پر اس کے ساتھ قرآن حکیم کے اس جملہ نے اس عام غلطی کو بھی دور کر دیا جو اکثر ممالک کے دستوروں میں چل رہی ہے کہ حکومت کے عہدوں کو باشندگان ملک کے حقوق قرار دیدیا ہے۔

اور اس اصولی غلطی کی بناء پر یہ قانون بنانا پڑا کہ حکومت کے عہدے تناسب آبادی کے اصول پر تقسیم کئے جائیں، ہر صوبہ ملک کے لئے کوٹے مقرر ہیں، ایک صوبہ کے کوٹہ میں دو سکے صوبہ کا آدمی نہیں رکھا جاسکتا، خواہ وہ کتنا ہی قابل اور امین کیوں نہ ہو، اور اس صوبہ کا آدمی کتنا ہی غلط کار نہ اہل ہو، دستور آن حکیم نے صاف اعلان فرمادیا کہ یہ عہدے کسی کا حق نہیں بلکہ امانتیں ہیں جو صرف اہل امانت ہی کو دی جاسکتی ہیں، خواہ وہ کسی صوبہ اور کسی خطہ کے رہنے والے ہوں، البتہ کسی خاص علاقہ اور صوبہ پر حکومت کے لئے اسی علاقہ کے آدمی کو ترجیح دی جاسکتی ہے کہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کام کی صلاحیت اور امانت میں اس پر پورا اطمینان ہو۔

دستور مملکت کے چند اس طرح اس مختصر آیت میں دستور مملکت کے چند بنیادی اصول آگئے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ آیت کے پہلے جملہ کو ان شاء اللہ یا مومنین سے شروع فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اصل امر اور حکم اللہ تعالیٰ کا ہے، سلاطین و نیا سب اس کے مامور ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ ملک میں اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔

۲۔ دوسرے کہ حکومت کے عہدے باشندگان ملک کے حقوق نہیں جن کو تناسب آبادی کے اصول پر تقسیم کیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہوئی امانتیں ہیں جو صرف



انکے اہل اور لائق لوگوں کو دیئے جاسکتے ہیں۔

۳۔ تیسرے یہ کہ زمین پر انسان کی حکمرانی صرف ایک نائب و امین کی حیثیت سے ہو سکتی ہے وہ ملک کی قانون سازی میں ان اصول کا پابند ہے گا جو حاکم مطلق حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی بتلا دیئے گئے ہیں۔

۴۔ چوتھے یہ کہ حکام و امراء کا فرض ہے کہ جب کوئی مقدمہ ان کے پاس آئے تو نسل و وطن اور رنگ و زبان یہاں تک کہ مذہب و مسلک کا امتیاز کئے بغیر عدل و انصاف کا فیصلہ کریں۔

اس آیت میں دستور مملکت کے زرین اصول بتلا کر آخر میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو نصیحت کی ہے وہ بہت ہی اچھی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر شخص کی سزا ہے، اور جو بولنے اور فریاد کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو اس کے حالات کو خود دیکھتا ہے، اس لئے اس کے بتلائے اور بنائے ہوئے اصول ہی ایسے ہیں جو ہمیشہ ہر ملک میں اور ہر دور میں قابل عمل ہو سکتے ہیں، انسانی دماغوں کے بنائے اصول و دستور صرف اپنے ماحول کے اندر محدود ہو کر رہتے ہیں، اور تغیر حالات کے بعد ان کا بدلنا ناگزیر ہوتا ہے، جس طرح پہلی آیت کے مخاطب حکام و امراء تھے دوسری آیت میں عوام کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو! تم اللہ کی اور رسولؐ کی اور اپنے ادلی الامر کی اطاعت کرو۔

ادلی الامر کون لوگ ہیں؟ [ادلی الامر لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام و انتظام ہو، اسی لئے حضرت ابن عباس، مجاہد اور حسن بصری وغیرہ رضی اللہ عنہم، مفسرین قرآن نے ادلی الامر کے مصداق علماء و فقہاء کو قرار دیا ہے، کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب ہیں، اور نظام دین ان کے ہاتھ میں ہے۔

اور ایک جماعت مفسرین نے جن میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ ادلی الامر سے مراد حکام اور امراء ہیں جن کے ہاتھ میں نظام حکومت ہے۔

اور تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ لفظ دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء کو بھی اور حکام و امراء کو بھی، کیونکہ نظام امراء اپنی دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس آیت میں ظاہر باتیں کی اطاعتوں کا حکم ہے، اللہ رسولؐ، ادلی الامر، لیکن قرآن کی دوسری آیات نے واضح فرمادیا کہ حکم و اطاعت دراصل صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ہے، اِن

الْحُكْمُ لِلَّهِ، مگر اس کے حکم اور اس کی اطاعت کی عملی صورت چار حصوں میں منقسم ہے۔ حکم اور اطاعت کی تین عملی صورتیں | ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل



فرمادیا، اور اس میں کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں، جیسے شرک و کفر کا انتہائی جبرم ہونا، ایک اللہ وحدہ کی عبادت کرنا، اور آخرت اور قیامت پر یقین رکھنا، اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری برحق رسول مانتا، نماز، روزہ، حج از کوۃ کو فرض سمجھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر اور احکام ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلا واسطہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

دوسرا حصہ احکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات و تشریحات کی ضرورت ہے، ان میں قرآن کریم اکثر ایک مہمل یا مبہم حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل و تشریح جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی احادیث کے ذریعہ فرماتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے، اگر اس تفصیل و تشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح فرمادی جاتی ہے، اور بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکم الہی کا ترجمان ہوتا ہے۔

اس قسم کے احکام کی اطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے لیکن ظاہری اعتبار سے چونکہ یہ احکام صریح طور پر قرآن میں نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے امت کو پہنچے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت ظاہری اعتبار سے اطاعت رسول ہی کہلاتی ہے جو حقیقت میں اطاعت الہی کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔

تیسرا درجہ احکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث میں، یا ذخیرہ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے احکام میں علماء مجتہدین قرآن و سنت کے منصوصات اور زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور و فکر کر کے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں، ان احکام کی اطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے قرآن و سنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اطاعت خداوندی ہی کی ایک فرد ہیں، مگر ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ فقہی فتاویٰ کہلاتے ہیں، اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔

اسی تیسری قسم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں کتاب و سنت کی رو سے کوئی پابندی عائد نہیں، بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں کریں، جن کو اصطلاح میں مباحات کہا جاتا ہے، ایسے احکام میں عمل انتظام حکام و امراء کے سپرد ہے، کہ وہ حالات اور مصالح کے پیش نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں، مثلاً شہر کراچی میں ڈاک خدے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں، ریلوے کا نظام کس طرح ہو، آباد کاری کا انتظام



مکن قواعد پر کیا جائے، یہ سب مباحات ہیں، ان کی کوئی جانب نہ واجب ہے نہ حرام بلکہ اختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دیدیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا، اس لئے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

آیت مذکورہ میں اولوالامر کی اطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے، اس لئے اس آیت کی رو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی امور میں حکام و امراء کی اطاعت واجب ہوگئی۔

یہ اطاعت بھی درحقیقت اللہ جل شانہ کے احکام ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ احکام نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں، بلکہ ان کا بیان یا علماء کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے، اس لئے اس اطاعت کو تیسرا نمبر جہاں گناہ قرار دے کر اولوالامر کی اطاعت نام رکھا گیا، اور جس طرح منصوصاً قرآن میں قرآن کا اتباع اور منصوصاً رسولؐ میں رسولؐ کا اتباع لازم و واجب ہے، اسی طرح غیر منصوص فقہی چیزوں میں فقہاء کا، اور انتظامی امور میں حکام و امراء کا اتباع واجب ہے یہی مفہوم ہے اطاعت اولی الامر کا۔

خلافت شرع کاموں میں | وَإِذَا أَحْكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ، اس آیت میں  
امیر کی اطاعت جائز نہیں | اللہ تعالیٰ نے جس کام کو ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو، اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اولی الامر کی اطاعت کی تعلیم دی، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ امیر اگر عدل پر قائم رہے تو اس کی اطاعت واجب ہے، اور اگر وہ عدل و انصاف کو چھوڑ کر خلاف شرع احکام صادر کرے تو ان میں امیر کی اطاعت نہیں کی جائے گی، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ الخالق" یعنی مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس سے خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی عدل و انصاف کو قائم رکھنے کی طاقت اور صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کو قاضی بھی نہیں بننا چاہئے، کیونکہ حکم بالعدل بھی ایک امانت ہے جس کی حفاظت کمزور اور نااہل آدمی نہیں کر سکتا، چنانچہ جب حضرت ابوذرؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ مجھے کسی جگہ کا حاکم معتمد فرمائیں تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

يَا أَبَا ذَرٍّ إِنَّكَ ضَعِيفٌ وَانْهَاسَا | اے ابوذر آپ ضعیف آدمی ہیں، اور



أَمَانَةٌ وَإِنَّمَا يَوْمَ الْقِيَمَةِ خِزْيٌ  
وَنَقْأَمَةٌ إِلَّا مَنْ أَخَذَ بِحَقِّهَا  
وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا  
(زکواۃ مسلم بحوالہ مظہری)

مصب ایک امانت ہے جس کی وجہ قیامت  
کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی،  
سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق  
پورا کر دیا ہو (یعنی وہ ذلت سے بچ جائے گا)

عادل آدمی اللہ کا ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عادل اللہ کا محبوب  
محبوب ترین بندہ ہے اور قریب ترین انسان ہے، اور ظالم اللہ کی رحمت اور نظرِ کرم سے دور ہوتا ہے  
ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم جانتے  
ہو کہ سب سے پہلے اللہ کے سایہ کے نیچے کون جائے گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کے  
رسول ہی کو اس بات کا زیادہ علم ہے، تو پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے سامنے  
جب حق آجائے تو فوراً قبول کر لیتے ہیں، اور جب ان سے سوال کیا جاتا ہے تو مال کو خرچ کرتے  
ہیں اور جب وہ فیصلہ کرتے ہیں تو ایسا عادلانہ کرتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے لئے کرتے۔

اجتہاد اور قیاس کا ثبوت قولہ تعالیٰ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ  
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اگر تمھارا کسی امر کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو  
تم اللہ اور رسول کی جانب رجوع کرو۔

کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کتاب و سنت  
کے احکام منصوصہ کی جانب رجوع کیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ اگر احکام منصوصہ موجود  
نہیں ہیں تو ان کے نظائر پر قیاس کر کے رجوع کیا جائے گا، فَرُدُّوهُ کے الفاظ عام ہیں جو دونوں  
صورتوں کو شامل ہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اُترا

إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا

تیری طرف اور جو اُترا تجھ سے پہلے چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں

إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ

شیطان کی طرف اور حکم ہو چکا ہے ان کو کہ اس کو نہ مانیں اور چاہتا ہے شیطان

أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ① وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا

کہ ان کو بہکا کر دُور جا ڈالے اور جب ان کو کہہ کر آؤ اللہ کے حکم



أَنْزَلَ اللَّهُ وَرَآئِيَ الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ

کی طرف جو اس نے آمارا اور رسول کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ بیٹھے ہیں تجھ سے

صُدُّوْا ۶۱) فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ

رُک کر پھر کیا ہو جبکہ اُن کو پہنچے مصیبت اپنے احمقوں کے

أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ۶۲) بِاللَّهِ إِنَّ أَسْرَدَ نَاِ الْ

کئے ہوئے سے پھر آویں تیرے پاس نہیں کھاتے ہوئے اللہ کی کہ ہم کو غرض نہ تھی مگر

إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۶۳) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي

بھلائی اور ملاپ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو اُن کے دل

قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ

میں ہے سو تو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ اُن کے حق میں

قَوْلًا بَلِيغًا ۶۴) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ

بات کام کی اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم

اللَّهُ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا

میں اللہ کے فرمانے سے اور اگر وہ لوگ جس وقت انھوں نے اپنا بُرا کیا تھا آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی

اللَّهُ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا ۶۵)

چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان۔

## خلاصہ تفسیر

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو (زبان سے تو) دعوائے کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (یعنی توریت کیونکہ اس میں منافقین کا بیان ہے) اور اکثر منافقین یہودیوں سے تھے، مطلب یہ کہ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح ہم توریت کو مانتے ہیں اسی طرح قرآن کو بھی مانتے ہیں، یعنی اسلام کے مدعی ہیں، پھر اس پر حالت یہ ہو کہ اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شرع کی طرف مقدمہ لے جانے کے لئے شیطان بکھڑا ہے، پس اس پر عمل کرنا ایسا ہے جیسے شیطان ہی کے پاس مقدمہ لے گئے)



حالانکہ اس سے دو امر مانع موجود ہیں ایک یہ کہ ان کو (شریعت کی جابجائی) یہ حکم ہوا کہ اس (شیطان) کو نہ مانیں (یعنی اعتقاداً و عملاً اس کی مخالفت کریں) اور دوسرا مانع یہ کہ شیطان ان کا ایسا دشمن اور بدخواہ ہے کہ ان کو (راہ حق سے) بھٹکا کر بہت دور لیجانا چاہتا ہے (پس باوجود ان دونوں امور کے جن کا مقتضی یہ ہے کہ شیطان کے کہنے پر عمل نہ کریں، پھر بھی اس کی موافقت کرتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور آؤ (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (کہ آپ اس حکم کے موافق فیصلہ فرمادیں) تو آپ (اس وقت) منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ (کے پاس آئے) سے پہلو ہٹ کر تے ہیں پھر کیسی جان کو ہمتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو اس مصیبت سے پہلے کر چکے تھے، (مراد اس حرکت سے شرع کو چھوڑ کر دوسری جگہ مقدمہ لے جانا ہے، اور مصیبت سے مراد جیسے قتل یا خیانت و نفاق کا کھل جانا اور باز پرس ہونا، یعنی اس وقت سوچ پڑتی ہے کہ اس حرکت کی کیا تاویل کریں جس میں پھر سرخرو رہیں) پھر (تاویل سوچ کر) آپ (کے پاس آتے ہیں) خدا کی قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم جو دوسری جگہ چلے گئے تھے) ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا سوا اس کے کہ معاملہ کے دونوں فریق کی (کوئی بھلائی) (کی صورت) نکل آوے اور (ان میں) باہم موافقت (مصالحت) ہو جائے (مطلب یہ کہ قانون تو شرع ہی کا حق ہے ہم دوسری جگہ شرع کو ناحق سمجھ کر نہیں گئے تھے، لیکن بات یہ ہے کہ قانونی فیصلہ میں تو صاحب حق کو حاکم رعایت کرنے کے لئے نہیں کہہ سکتا اور باہمی فیصلہ میں اکثر رعایت کرا دی جاتی ہے، یہ وجہ تھی ہمارے دوسری جگہ جانے کی، اور قصہ قتل میں تاویل اس مقتول کے فعل کی ہوگی جس سے مقصود اپنی برائت یا حضرت عمرؓ پر دعویٰ قتل بھی ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کی اس تاویل کی تکذیب فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ (نفاق و کفر) ان کے دلوں میں ہے کہ اس کفر و نفاق و عدم رضا بحکم شرعی ہی کی وجہ سے یہ لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں اور وقت معین پر اس کی سزا بھی پالیں گے) سو (مصلحت یہی ہے کہ) آپ (علیہ السلام) خداوندی و مواحسنہ خداوندی پر اکتفاء فرما کر، ان سے تغافل کر جایا کیجئے (یعنی کچھ مواخذہ نہ فرمائیے) اور (وہ اپنے منصب رسالت کے اقتضائے) ان کو نصیحت فرماتے رہے (کہ ان حرکتوں کو چھوڑ دو) اور ان سے خاص ان کی ذات (کی اصلاح) کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے (تا کہ ان پر رحمت قائم اور تمام ہو جائے پھر نہ مانیں تو وہ جانیں) اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی (جو کہ اطاعتِ رسول کے باب میں فرمایا ہے) ان کی اطاعت کی جائے (پس اول تو ان لوگوں کو شروع ہی سے اطاعت کرنا واجب تھی) اور اگر (خیر شامت



نفس سے حماقت ہی ہو گئی تھی تو جس وقت (یہ گناہ کر کے) اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت (عذاب کے ساتھ) آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے پھر (حاضر ہو کر) اللہ تعالیٰ سے (اپنے اس گناہ کی) معافی چاہتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی) ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توبہ قبول فرما لیتے)

## معارف و مسائل

**رَبِّطِ آیَاتِ** پہلی آیات میں تمام معاملات میں اللہ اور رسول کے احکام کی طرف رجوع کرنا حکم تھا، اگلی ان آیات سے خلاف شرع قوانین کی طرف رجوع کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

**آیات کا شان نزول** ان آیات کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا کہ چل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ان سے فیصلہ کرائیں، مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی، کعب بن اشرف یہود کا ایک سردار اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے، مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے، اس میں کسی کی دودر رعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لئے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تھا، اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، اس لئے جانتا تھا کہ آپ کا فیصلہ میرے خلاف ہو گا، اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ انجام ہوا کہ دونوں اسی پر راضی ہو گئے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حاضر ہو کر آپ ہی سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں، مقدمہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچا، آپ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اسی کے حق میں فیصلہ دیر یا، اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا ناکام کر دیا، اس لئے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا، اور ایک نئی راہ نکالی، کہ کسی طرح یہودی کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ ہم



حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ کرانے چلیں، یہودی نے اس کو قبول کر لیا، راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہر کیف یہ دونوں اب حضرت فاروق اعظمؓ کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا، کہ اس مقدمہ کا فیصلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیے ہیں، مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں، اور آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اقرار کیا، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا اچھا ذرا بٹھرو! میں آتا ہوں، مگر میں تشریف لے گئے، اور ایک تلوار لے کر آئے، اور اس منافق کا کام تمام کر دیا، اور فرمایا، ”جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا یہی فیصلہ ہے“ یہ واقعہ روح المعانی میں بروایت ثعلبی وابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔

اور علامہ مفسرین نے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد منافق مقتول کے وارثوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف یہ دعویٰ بھی دائر کر دیا کہ انھوں نے ایک مسلمان کو بغیر دلیل شرعی کے مار ڈالا ہے، اور اس کو مسلمان ثابت کر لے کے لئے اس کے کفر قوی و عملی کی تائیدیں پیش کیں، آیت متذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی اصل حقیقت اور اس شخص مقتول کا منافق ہونا ظاہر فرما کر حضرت عمرؓ کو بری کر دیا۔

اس سلسلہ میں اور بھی چند وقائع منقول ہیں، جن میں کچھ لوگوں نے شرعی فیصلہ چھوڑ کر کسی کاہن یا بخومی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا، ہو سکتا ہے کہ آیت متذکرہ ان سب کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

اب آیات کی تفسیر دیکھئے، پہلی آیت ارشاد ہوا کہ اس شخص کو دیکھو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں پچھلی کتابوں تو رآت اور انجیل پر بھی ایمان لایا تھا اور جو کتاب (قرآن) آپ پر نازل ہوئی اس پر بھی ایمان لاتا ہوں، یعنی پہلے اہل کتاب میں داخل تھا، پھر مسلمانوں میں داخل ہو گیا، لیکن یہ مسلمانوں میں داخل ہونا محض زبانی ہے، دل میں وہی کفر بھرا ہوا ہے، جس کا ظہور جھگڑے کے وقت اس طرح ہو گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر یہودی سرور اکعب ابن ثرف کی طرف رجوع کرنے کی تجویز پیش کی، اور اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واضح اور حق فیصلہ دیدیا تو اس پر راضی نہ ہوا۔

لفظ طاغوت کے لغوی معنی سرکشی کرنے والے کے ہیں اور عرف میں شیطان کو طاغوت



کہا جاتا ہے، اس آیت میں کعب بن اشرف کی طرف مقدمہ لے جانے کو شیطان کی طرف ہجانا قرار دیا ہے، یا تو اس وجہ سے کہ کعب بن اشرف خود ایک شیطان تھا، اور یا اس وجہ سے کہ شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر خلاف شرع فیصلہ کی طرف رجوع کرنا شیطان ہی کی تعلیم ہو سکتی ہے، اس کا اتباع کرنے والا گویا شیطان ہی کے پاس اپنا مقدمہ لے گیا ہے، اسی لئے آخر آیت میں ہدایت فرمادی کہ جو شخص شیطان کی پیروی کرے گا تو شیطان اس کو دور دراز کی گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ دوسری آیت میں بتلادیا کہ باہمی خصومت اور جھگڑے کے وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شرعی فیصلہ سے اعراض کرنا کسی مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا، ایسا کام کرنے والا منافق ہی ہو سکتا ہے، اور جب اس منافق کا کفر عملاً اس طرح کھل گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا تو فاروق اعظمؓ کا اس کو قتل کرنا صحیح ہو گیا، کیونکہ اب منافق نہ رہا بلکہ کھلا کافر ہو گیا، اس لئے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ جب ان سے کہا جائے کہ آجاؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اُتارا ہے، اور اس کے رسول کی طرف، تو یہ منافقین آپ کی طرف آنے سے رُک جاتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان تاویلات باطلہ کا غلط ہونا واضح کیا ہے جو شرعی فیصلہ کو چھوڑ کر غیر شرعی فیصلہ کی طرف رجوع ہونے والوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناحق سمجھ کر نہیں چھوڑا، اور دوسروں کے فیصلوں کو اس کے بالمقابل حق سمجھ کر خستیاں نہیں کیا، بلکہ بعض مصالح کی بناء پر ایسا کیا، مثلاً یہ مصلحت تھی کہ آپ کے پاس تو قانونی فیصلہ ہوتا، جس میں باہمی مصالحت اور رواداری کا کوئی سوال نہیں تھا، ہم مقدمہ کو دوسری جگہ اس لئے گئے کہ ان دونوں فریق کے لئے کوئی بھلائی کی صورت نکل آئے، اور دونوں میں مصالحت کرادی جائے۔

یہ تاویلیں ان لوگوں نے اس وقت پیش کیں جب کہ ان کا راز کھل گیا، اور خباثت اور نفاق ظاہر ہو گیا ان کا آدمی حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا، غرض جب ان کے اعمال بد کے نتیجہ میں ان پر رسوائی یا قتل کی مصیبت پڑ گئی، تو قسمیں کھا کر تاویلیں کرنے لگے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرمادیا کہ یہ اپنی قسموں اور تاویلوں میں جھوٹے ہیں، انھوں نے جو کچھ کیا اپنے کفر و نفاق کی وجہ سے کیا ہے، ارشاد فرمایا کہ جب ان پر اپنے اعمال بد کے نتیجہ میں کوئی مصیبت پڑ جاتی ہے، مثلاً خیانت و نفاق ظاہر ہو کر رسوائی ہو گئی، یا اس کے نتیجہ میں قتل کا واقعہ پیش آیا، تو اس وقت یہ لوگ آپ کے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کے پاس مقدمہ لے جانے کا سبب کفر یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ



کرنا حق سمجھنا نہیں تھا، بلکہ ہمارا مقصد احسان و توفیق تھا، یعنی فریقین کے لئے کوئی بھلائی اور نفع کی راہ تلاش کرنا مقصود تھا۔

چوتھی آیت میں اس کا جواب آیا کہ ان کے دلوں میں جو کفر و نفاق ہے اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف اور باخبر ہیں، ان کی تاویل میں غلط اور قسمیں جھوٹی ہیں، اس لئے آپ ان کے عذر کو قبول نہ فرمائیں، اور حضرت عمرؓ کے خلاف دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ رد فرمادیں، کیونکہ اس منافق کا کفر واضح ہو چکا تھا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان منافقین کو بھی آپ خیر خواہانہ نصیحت فرمائیں جو ان کے دلوں پر اثر انداز ہو، یعنی آخرت کا خوف دلا کر ان کو مخلصانہ اسلام کی طرف دعوت دیں یا دنیوی سزا کا ذکر کر دیں کہ اگر تم نفاق سے باز نہ آئے تو کسی وقت نفاق کھل جائے گا، تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا جو پیشتر منافق کا ہوا۔

پانچویں آیت میں اول تو ایک عام ضابطہ بتلایا کہ ہم نے جو رسول بھیجا وہ اسی لئے بھیجا کہ سب لوگ فرمان خداوندی کے موافق اس کے احکام کی اطاعت کریں، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص رسول کے احکام کی مخالفت کرے اس کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کیا جائے گا اس لئے حضرت عمرؓ نے جو عمل کیا وہ صحیح ہوا، اس کے بعد ان کو خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا ہے کہ یہ لوگ تاویلات باطلہ اور جھوٹی قسموں کی بجائے اپنے تصور کا اعتراف کر لیتے اور آپ کے پاس حاضر ہو کر خود بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انکی مغفرت کی دعا کرتے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی توبہ قبول فرما لیتے۔

اس جگہ قبول توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا مغفرت کرنے کی شرط غالباً اس لئے ہے کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر حملہ کیا، اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کر کے آپ کو ایذا پہنچائی، اس لئے ان کے جرم کی توبہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار کو شرط کر دیا گیا۔

یہ آیت اگرچہ خاص واقعہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ نکل آیا، کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لئے دعا مغفرت کر دیں اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانہ میں ہو سکتی تھی اسی طرح آج بھی روضہ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔



حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر کے تابخ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گھاؤں والا آیا، اور قبر شریف کے پاس آکر گر گیا، اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسول کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول اس کے لئے دعا کی مغفرت کر دیں تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ میرے لئے مغفرت کی دعا کریں، اُس وقت جو لوگ حاضر تھے ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روحہ اقدس کے اندر سے آواز آئی قَدْ غُفِرَ لَكَ، یعنی مغفرت کر دی گئی (مخبر)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِي مَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں

لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ①۵

اٹھے پھر نہ پاویں اپنے جی میں تنگی تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے۔

## خلاصہ تفسیر

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ (جو صرف زبانی ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں عند اللہ) ایمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہوا اس میں یہ لوگ آپ سے (اور آپ نہ ہوں تو آپ کی شریعت سے) فیصلہ کرا دیں پھر (جب آپ تصفیہ کر دیں تو) اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں انکار کی تنگی نہ پاویں اور اس فیصلہ کو پورا پورا (ظاہر سے باطن سے) تسلیم کر لیں۔

## معارف و مسائل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے | اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علوم مرتبت  
فیصلہ کو تسلیم نہ کرنا کھنڈ ہے | کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت جو بے شمار آیات قرآنیہ سے  
ثابت ہے اس کی واضح تشریح بیان فرمائی ہے، اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہ نے  
فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دل میں بھی اس فیصلہ  
سے کوئی تنگی نہ پائی جائے۔



آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رسول خود امانت کے حاکم اور ہر شے کرنے والے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے ذمہ دار ہیں، آپ کی حکومت اور آپ کا فیصلہ کسی کے حکم بنانے پر موقوف نہیں، پھر اس آیت میں مسلمانوں کو حکم بنانے کی تلقین اس لئے فرمائی گئی ہے کہ حکومت کے معترکہ کردہ حاکم اور اس کے فیصلہ پر تو بہت سے لوگوں کو اطمینان نہیں ہوا کرتا، جیسا اپنے مقرر کردہ ثالث یا حکم پر ہوتا ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف حاکم نہیں بلکہ رسول معصوم بھی ہیں، رحمۃ للعالمین بھی ہیں امانت کے شفیق و مہربان باپ بھی ہیں، اس لئے تعلیم یہ دی گئی کہ جب بھی کسی معاملہ میں یا کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو فریقین کا فرض ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ کرائیں اور پھر آپ کے فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کر کے عمل کریں۔

اختلافات میں آپ کو حکم بنانا | حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ارشادِ قرآنی پر عمل آنحضرت آپ کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں | صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے ساتھ مخصوص نہیں، آپ کے بعد آپ کی شریعت مظہرہ کا فیصلہ خود آپ ہی کا فیصلہ ہے، اس لئے یہ حکم قیامت تک اس طرح جاری ہے کہ آپ کے زمانہ مبارک میں خود بلا واسطہ آپ سے رجوع کیا جائے، اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رجوع کیا جائے جو درحقیقت آپ ہی کی طرف رجوع ہے۔

چند اہم مسائل | اول یہ کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو اپنے ہر جھگڑے اور ہر مقدمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر مطمئن نہ ہوا یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اس شخص کو قتل کر ڈالا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور پھر معاملہ کو حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا، اس مقتول کے اولیاء نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں حضرت عمرؓ پر دعویٰ کر دیا کہ انھوں نے ایک مسلمان کو بلا وجہ قتل کر دیا، جب یہ استغاثہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوا تو بیباختہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا: مَا كُنْتُ أَظُنُّ أَنَّ عُمَرَ يَجْتَرُّ عَلَى قَتْلِ رَجُلٍ مُّؤْمِنٍ (یعنی مجھے یہ گمان نہ تھا کہ عمرؓ کسی مردِ مؤمن کے قتل کی جرأت کریں گے) اس سے ثابت ہوا کہ حاکم اعلیٰ کے پاس اگر کسی ماتحت حاکم کے فیصلہ کی اپیل کی جائے تو اس کو اپنے حاکم ماتحت کی جانب داری کے بجائے انصاف کا فیصلہ کرنا چاہیے، جیسا اس واقعہ میں آیت نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر اظہارِ ناراضی فرمایا، پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو حقیقت کھل گئی کہ اس آیت کی رو سے وہ شخص مؤمن ہی نہیں تھا۔



دوسرا مسئلہ اس آیت سے یہ نکلا کہ لفظ فِيمَا شَجَرَ صرف معاملات اور حقوق کے ساتھ متعلق نہیں، عقائد اور نظریات اور دوسرے نظری مسائل کو بھی حاوی ہے۔ (بحر محیط)  
اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جب بھی کسی مسئلہ میں باہم اختلاف کی نوبت آئے تو باہم جھگڑتے رہنے کے بجائے دونوں فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور آپ کے بعد آپ کی شریعت کی طرف رجوع کر کے مسئلہ کا حل تلاش کریں۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً یا عملاً ثابت ہوا اس کے کرنے سے دل میں حسرت محسوس کرنا بھی ضعف ایمان کی علامت ہے، مثلاً جہاں شریعت نے تیمم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی وہاں تیمم کرنے پر جس شخص کا دل راضی نہ ہو وہ اس کو تقویٰ نہ سمجھے بلکہ اپنے دل کا روگ سمجھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی متقی نہیں ہو سکتا، جس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی اور خود بیٹھ کر ادا فرمائی، اگر کسی شخص کا دل اس پر راضی نہ ہو اور ناقابل برداشت محنت و مشقت اٹھا کر کھڑے ہی ہو کر نماز ادا کرے، تو وہ سمجھ لے کہ اس کے دل میں روگ ہے ہاں معمولی ضرورت یا تکلیف کے وقت اگر رخصت کو چھوڑ کر عزیمت پر عمل کرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم کے مطابق درست ہے، مگر مطلقاً شرعی رخصتوں سے تنگدلی محسوس کرنا کوئی تقویٰ نہیں، اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى	یعنی اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمتوں پر
وَرُخْصَتُهُ كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتَى	عمل کرنے سے خوش ہوتے ہیں اسی طرح
عَزَائِمُهُ۔	رخصتوں پر عمل کرنے کو بھی پسند فرماتے ہیں

عام عبادات و اذکار و اوراد و رُود و تسبیح میں سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا معمول رہا، اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ کرام کا جس پر عمل رہا، مسلمانوں کا فرض ہے کہ حدیث کی مستند روایات سے اس کو معلوم کر کے اسی کو اپنا لائحہ عمل بنائیں۔

ایک اہم فائدہ | گذشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے صرف مصلح اور اخلاقی رہبر ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک عادل حاکم بھی تھے، پھر حاکم بھی اس شان کے کہ آپ کے فیصلہ کو ایمان و کفر کا معیار قرار دیا گیا، جیسا کہ بشرِ منافق کے واقعہ سے ظاہر ہے، اس چیز کی وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب میں متعدد مقامات پر اپنی اطاعت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم



کی اطاعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے، **أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ**، یعنی تم اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا، **مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ**، یعنی جو رسول کی اطاعت کرے اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

ان آیات میں غور کرنے سے آپ کی شانِ حاکمیت بھی نکھر کر سامنے آجاتی ہے، جس کی عملی صورت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس اپنا قانون بھیجا، تاکہ آپ مقدّمات کے فیصلے اسی کے مطابق کر سکیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، **إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ**، یعنی ہم نے آپ پر کتاب کو حق کے تحت نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان میں اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھلائے اور سمجھائے۔

**وَلَوْ أَنَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ أَنِ اقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُمْ فَعَلُوا**

اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان یا چھوڑ دو اپنی

گھر تو ایسا نہ کرتے مگر تھوڑے ان میں سے اگر یہ لوگ کریں وہ جو

مما يُوعِظُونَ بِهِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَشَدَّ تَثْبِيثًا ۖ وَإِذَا

ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ ان کے حق میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت رکھنے والا ہودین ہیں اور اس

لَا تَنْهَاهُمْ مِنْ لَدُنَّا أَجْرًا عَظِيمًا ۖ وَلَهُدَىٰ يَنْهَاهُمْ

وقت البتہ دیں ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب اور چلا دیں ان کو

صَلَاةً مُسْتَقِيمًا ۖ

سیدھی راہ

## خُلاصۂ تفسیر

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات (بطور احکام مقصودہ کے) فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو

یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے (جو مومن کامل ہوتے)

اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا (اس سے ثابت ہوا کہ کمال اطاعت کرنے والے کم ہوتے ہیں)



اور اگر یہ (منافق) لوگ کچھ ان کو (اطاعتِ رسولِ مہجانبِ دین کی) نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے (دنیا میں توبہ جو مستحقِ ثواب کے) بہتر ہوتا اور (نیز باعتبار تکمیلِ دین کے ان کے) ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا کیونکہ تجسس بہ سے ثابت ہوا کہ دین کا کام کرنے سے خود باطنی کیفیت اعتقاد و یقین کو ترقی ہوتی ہے، اور اس حالت میں جب کہ عمل سے خیریت اور تثبیتِ دین حاصل ہو جاتی تو آخرت میں (ہم ان کو خاص اپنے پاس سے احسن عظیم عنایت فرمائے، اور ہم ان کو (جنت کا) سیدھا راستہ بتلا دیتے (کہ بے روک ٹوک جنت میں داخل ہوں جو کہ احسن عظیم ملنے کا مقام ہے)۔

## معارف و مسائل

**شانِ نزول** | جس واقعہ کی بنا پر یہ آیت اور اس سے پہلی آیات نازل ہوئیں وہ بشرِ منافق کا معاملہ تھا، جس نے اپنے جھگڑے کے فیصلہ کے لئے پہلے کعب بن اشرف یہودی کو تجویز کیا، پھر مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، اور آپ کا فیصلہ چونکہ اس کے خلاف تھا اس پر راضی نہ ہوا، دوبارہ فیصلہ کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا، اس واقعہ کی جب مدینہ میں شہرت ہوئی تو یہود نے مسلمانوں کو عار دلائی کہ تم کیسے لوگ ہو کہ جس کو رسول مانتے ہو اور اس کے اتباع کے دعوے دار ہو، مگر اس کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے، دیکھو یہودیوں کو ان کے گناہ کی توبہ کے سلسلہ میں یہ حکم ملا تھا کہ تم اس میں ایک دوسرے کو قتل کر دو ہم نے تو اس شدید حکم کی تعمیل بھی کی، یہاں تک کہ ہمارے ستر ہزار آدمی مارے گئے، اگر تمہیں کوئی ایسا حکم دیدیا جاتا تو تم کیا کرتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، **وَقَوْمًا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ**، یعنی ان منافقین کا یا عام لوگوں کا جن میں کافر و مومن سب داخل ہیں یہی حال ہے کہ اگر ان کو یہی اسرائیل کی طرح کوئی سخت حکم خود کشی یا ترکِ وطن کا دیدیا جاتا تو ان میں سے بہت کم آدمی اس حکم کی تعمیل کرتے۔

اس میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ ہے جو اپنے جھگڑوں کا فیصلہ رسول اللہ یا شریعتِ رسول کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف لے جاتے ہیں، اور یہودی کے طعن کا جواب بھی ہے کہ یہ حال منافقین کا ہے پتے مسلمانوں کا نہیں، اور شاید اس کا یہ بھی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک صاحبؓ نے کہا کہ اللہ نے ہمیں اس آزمائش میں نہیں ڈالا، صحابی کا یہ کلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچا تو آپؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے زیادہ جما ہوا ہے، ابنِ وہبؒ کا



بیان ہے کہ یہ کلمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سن کر کہا کہ اگر یہ حکم نازل ہوتا تو خدا کی قسم میں سب پہلے اپنے آپ اور اپنے اہل بیت کو اس پر قربان کر دیتا۔ بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ حکم خود کشی یا ترک وطن کا اللہ کی طرف سے آجاتا تو ابن اُمّ عبد العزیٰ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ضرور اس پر عمل کرتے، اور رہا دوسرا معاملہ ترک وطن کا تو صحابہ کرامؓ نے اس پر تو عمل کر کے دکھلا دیا، کہ اپنے وطن مکہ اور اپنی تمام جائدادوں اور تجارتوں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت اختیار کر لی۔

آخر آیت میں فرمایا کہ یہ کام اگرچہ مشکل ہے، لیکن اگر وہ ہمارے فرمان کے مطابق اس کو مان لیں تو انجام کار یہی ان کے لئے بہتر ہوگا، اور یہ عمل ان کے ایمان کو اور مضبوط کر دے گا اور ہم اس پر ان کو ثواب عظیم عطا کریں گے، اور ان کو سیدھی راہ پر چلا دیں گے۔

اس کے بعد آخری آیت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والوں کے درجات عظیمہ کا بیان ہے جس میں ان کو یہ بشارت دیدی گئی ہے کہ یہ لوگ جنت میں انبیاء اور صدیقین اور شہداء و صلحاء کے ساتھ ہوں گے۔

اس آیت کے نزول کا ایک خاص واقعہ ہے اور اس کی تفصیل انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے چار درجات جن کا اس آیت میں ذکر ہے ان کی تشریح اور جنت میں ان کے ساتھ ہونے کی تفسیر انشاء اللہ آگے آئے گی۔

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ

اور جو کوئی حکم ماننے اللہ کا اور اس کے رسول کا سواہ ان کے ساتھ ہیں جن پر

اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ

اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق اور شہید اور

الصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ

نیک بخت ہیں اور اچھے ہیں ان کی رفاقت یہ فضل ہے اللہ کی طرف

اللَّهُ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عَلِيمًا ۝

سے اور اللہ کافی ہے جاننے والا



## خُلاصۂ تفسیر

اور جو شخص (ضروری احکام میں بھی) اللہ و رسول کا کہنا مان لے گا (گو محشر طاعات سے کمال حاصل نہ کر سکے) تو ایسے اشخاص بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) انعام (دین و قرب و قبول کا) فرمایا ہے، یعنی انبیاء (علیہم السلام)، اور صدیقین (جو کہ انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبہ کے ہوتے ہیں جن میں کمال باطنی بھی ہوتا ہے جن کو عرف میں اولیاء کہا جاتا ہے) اور شہداء (جنہوں نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دیدی) اور صلحاء (جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی جن کو نیک بخت و نیکو کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جن کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور مطیع کی ان کے ساتھ رفاقت ثابت ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا یہ ثمرہ ہوا کہ اس کو ایسے رفیق ملے) یہ (محبت اور رفاقت ان حضرات کے ساتھ محض فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے) یعنی عمل کا اجر نہیں ہے، کیونکہ اس کا مقتضا تو یہ تھا کہ جو درجہ اس عمل کا مقتضا تھا وہاں سے آگے نہ جاسکتا، پس یہ بطور انعام کے ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک عمل کو اور اس کے مقتضا کو، اور اس مقتضا سے زائد مناسب انعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس انعام میں بھی تفاوت ہوگا، کسی کو ان حضرات کی بار بار قرب ہوگا، کبھی گاہ بگاہ و علیٰ ہذا واللہ اعلم)

اور پر اللہ و رسول کی اطاعت پر خاص مخاطبین سے اجر عظیم کا وعدہ تھا، اب ربط آیات | ان آیات میں بطور قاعدہ کلیہ کے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر عام وعدہ کا ذکر ہے۔

## معارف و مسائل

جنت کے درجات اعمال کے | جو لوگ ان تمام چیزوں پر عمل کریں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اعتبار سے ہوں گے | اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے ان تمام چیزوں سے پرہیز کریں جن کے کرنے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے تو عمل کے اعتبار سے ان کے مختلف درجات ہوں گے، اول درجہ کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت کے مقامات عالیہ میں جگہ عطا فرمائیں گے، اور دوسرے درجہ کے لوگوں کو ان لوگوں کے ساتھ جگہ عطا فرمائیں گے جو انبیاء کے بعد ہیں



جن کو صدیقین کہا جاتا ہے، یعنی وہ اجلہ صحابہ جنہوں نے بغیر کسی جھجک اور مخالفت کے اولیٰ ایمان قبول کر لیا۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر تیسرے درجہ کے حضرات شہداء کے ساتھ ہونگے شہداء وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال و ترکان کر دیا، پھر چوتھے درجہ کے حضرات صلحاء کے ساتھ ہوں گے، اور صلحاء وہ لوگ ہیں جو اپنے ظاہر و باطن میں اعمالِ صالحہ کے پابند ہیں۔

**خلاصہ** یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محسوز اور مقبول ہیں جن کے چار درجے بتلائے گئے ہیں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

**شان نزول** یہ آیت ایک خاص واقعہ کی بنا پر نازل ہوئی ہے جس کو اعام تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے متعدد واسانید سے نقل کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز ایک صحابیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے دل میں آپ کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ ہے، اپنی بیوی سے بھی، اپنی اولاد سے بھی، بعض اوقات میں اپنے گھر میں بے چین رہتا ہوں یہاں تک کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کی زیارت کر لوں تب سکون ہوتا ہے، اب مجھے فکر ہے کہ جب اس دنیا سے آپ کی وفات ہو جائے اور مجھے بھی موت آجائے گی تو میں جانتا ہوں کہ آپ جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ درجاتِ عالیہ میں ہوں گے، اور مجھے اول تو یہ معلوم نہیں کہ میں جنت میں پہنچوں گا بھی یا نہیں، اگر پہنچ بھی گیا تو میرا درجہ آپ سے بہت نیچے ہوگا، میں وہاں آپ کی زیارت نہ کر سکوں گا تو مجھے کیسے صبر آئے گا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کلام سن کر کچھ جواب نہ دیا، یہاں تک کہ یہ آیت مذکورہ نازل ہو گئی، وَمَنْ يُؤْمِرْ بِعَمَلِهِ فَتُؤْتَىٰ لَهُ بِهِ مِثْلُ ثَمَرِهِ۔ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بشارت سنائی کہ اطاعت گزاروں کو جنت میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کے ساتھ ملاقات کا موقع ملتا رہے گا، یعنی درجاتِ جنت میں تفاضل اور اعلیٰ ادنیٰ ہونے کے باوجود باہم ملاقات و مجالست کے مواقع ملیں گے۔

**جنت میں ملاقات** جس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ اپنی اپنی جگہ سے ایک دوسرے کو دیکھیں گے کی چند صورتیں جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں بروایت ابو سعید خدریؓ منقول ہے کہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت اپنی کھڑکیوں میں اپنے سے اوپر کے طبقات والوں کو دیکھیں، گئے جیسے دنیا میں تم ستاروں کو دیکھتے ہو۔

اور یہ بھی صورت ہوگی کہ درجات میں ملاقات کے لئے آیا کریں گے، جیسا کہ ابن جریر نے بروایت ربیع نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ارشاد فرمایا کہ اونچے درجات والے نیچے درجات کی طرف اتر کر آیا کریں گے اور ان کے ساتھ ملاقات اور محالست ہوا کرے گی۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ نیچے کے درجات والوں کو ملاقات کے لئے اعلیٰ درجات میں جانے کی اجازت ہو، اس آیت کی بناء پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو جنت میں اپنے ساتھ رہنے کی بشارت دی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت کعب بن سلمیٰؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رات گزارتے تھے، ایک رات تہجد کے وقت کعب سلمیٰؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وضو کا پانی اور مسواک وغیرہ ضروریات لا کر رکھی، تو آپؐ نے خوش ہو کر فرمایا: مانگو کیا مانگتے ہو، کعب سلمیٰؓ نے عرض کیا، میں جنت میں آپؐ کی صحبت چاہتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اور کچھ؟ تو انھوں نے عرض کیا اور کچھ نہیں، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم جنت میں میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو "أَعِنِّي عَلَى تَفِيكِ بِكَثْرَةِ السُّجُودِ" یعنی تمھارا مقصد حاصل ہو جائے گا لیکن اس میں تم بھی میری مدد اس طرح کرو کہ کثرت سے سجدہ کیا کرو، یعنی نوافل کی کثرت کرو۔

مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ میں اس بات کی شہادت دے چکا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اور میں پانچ وقت کی نماز کا بھی پابند ہوں، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہوں، اور رمضان کے روزے بھی رکھتا ہوں، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس حالت میں مر جائے وہ انبیاء، صدیقین، اور شہداء کے ساتھ ہوگا، بشرطیکہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہ کرے۔

اسی طرح ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

یعنی وہ جو پاری جو سچا اور امانت دار ہو

انبیاء اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ

ہوگا

الْمَنَاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ

النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَ

الشُّهَدَاءِ



قرب کی شرط محبت ہے | رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور رفاقت آپ کے ساتھ  
محبت کرنے سے حاصل ہوگی، چنانچہ صحیح بخاری میں طرق متواترہ کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک  
بڑی جماعت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس شخص  
کا کیا درجہ ہوگا جو کسی جماعت سے محبت اور تعلق رکھتا ہے مگر عمل میں ان کے درجہ کو نہیں  
پہنچا، آپ نے فرمایا: **الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ** یعنی محشر میں ہر شخص اس کے ساتھ ہوگا  
جس سے اس کو محبت ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو دنیا میں کسی چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی  
جتنی اس حدیث سے، کیونکہ اس حدیث نے ان کو یہ بشارت دیدی کہ رسول کریم صلی اللہ  
علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے والے محشر اور جنت میں بھی حضورؐ کے ساتھ ہوں گے۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت نقل  
کی ہے کہ ایک شخص حبشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت  
میں حاضر ہوا، اور عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ  
پر موقوف نہیں۔

ہم سے حسن صورت اور حسین رنگ میں بھی ممتاز ہیں، اور نبوت و رسالت میں بھی، اب  
اگر میں بھی اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ ایمان رکھتے ہیں، اور وہی عمل کروں جو آپ  
کرتے ہیں، تو کیا میں بھی جنت میں آپ کے ساتھ ہو سکتا ہوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ضرور (متم اپنی حبشیانہ بد صورتی سے نہ  
گھبراؤ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے جنت میں کالے رنگ کے  
حبشی سفید اور حسین ہو جائیں گے، اور ایک ہزار سال کی مسافت سے چکیں گے، (اور جو  
شخص لا الہ الا اللہ کا قائل ہو اس کی فلاح و نجات اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتی ہے، اور جو  
شخص سبحان اللہ و بحدہ پڑھتا ہے اس کے نامہ اعمال میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں  
لکھی جاتی ہیں۔

پس منکر مجلس میں سے ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ جب اللہ تعالیٰ کے  
دربار میں حسنات کی اتنی سخاوت ہے تو ہم پھر کیسے ہلاک ہو سکتے یا عذاب میں کیسے گرفتار  
ہو سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا (یہ بات نہیں) حقیقت یہ ہے کہ قیامت میں بعض آدمی  
اتنا عمل اور حسنات لے کر آئیں گے کہ اگر ان کو پہاڑ پر رکھ دیا جائے تو پہاڑ بھی ان کے  
بوجھ کا تحمل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلہ میں جب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آتی ہیں اور ان کے  
موازنہ کیا جاتا ہے تو انسان کا عمل ان کے مقابلہ میں ختم ہو جاتا ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ



ہی اس کو اپنی رحمت سے نوازیں۔

اس حبشی کے سوال و جواب ہی پر سورۃ دہر کی یہ آیت نازل ہوئی، قُلْ اَنِّیْ عَلَیْہِ السَّحَابُ  
جَبْنَ مِنْ الذَّہْبِ کَمَ یَکُنْ شَیْئًا مِّنْ کُوْنًا ؕ حبشی نے حیرت سے سوال کیا یا رسول اللہ  
میری آنکھیں بھی ان نعمتوں کو دیکھیں گی جس کو آپ کی مبارک آنکھیں مشاہدہ کریں گی؟  
آپ نے فرمایا: ہاں ضرور! یہ سنکر حبشی نو مسلم نے رونا شروع کیا، یہاں تک کہ  
روتے روتے وہیں جان دیدی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے  
اس کی تجہیز و تکفین فرمائی۔

**درجات کی تفصیل** | آیت کی تفسیر مع شان نزول اور متعلقہ تشریحات کے بیان

ہو چکی اب ایک بات قابل غور باقی رہ گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا  
جن لوگوں پر انعام ہے ان کے چار درجے بیان فرمائے گئے ہیں، یہ درجے کس اعتبار سے ہیں؟  
اور ان چار درجوں میں باہمی نسبت اور فرق کیا ہے، اور کیا یہ چاروں درجے کسی ایک شخص  
میں جمع ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

حضرات مفسرین نے اس بارے میں مختلف اقوال اور طویل تفصیل لکھی ہے، بعض نے  
فرمایا کہ یہ چاروں درجے ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتے ہیں اور یہ سب فاعلاً متداخلہ کی طرح ہیں  
کیونکہ قرآن کریم میں جن کو نبی فرمایا گیا ہے اس کو صدیق وغیرہ کے القاب بھی دیے گئے ہیں  
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے: اِنَّہٗ كَانَ صِدِّیقًا نَّبِیًّا اور حضرت  
یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: وَنَبِیًّا مِّنَ الصَّالِحِیْنَ، اسی طرح حضرت عیسیٰ  
علیہ السلام کے متعلق وَكَهْلًا وَّمِنَ الصَّالِحِیْنَ آیا ہے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے یہ چار صفات اور درجات  
الگ الگ ہیں، لیکن یہ سب صفات ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں، اس کی مثال ایسی  
ہے جیسے مفسر، محدث، فقیہ، مورخ اور مشکلم مختلف صفات علماء کی ہیں، لیکن بعض علماء  
ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو مفسر بھی ہوں محدث بھی، فقیہ بھی اور مورخ و مشکلم بھی، یا جس طرح  
ڈاکٹر، انجینئر، پائلٹ مختلف صفات ہیں، مگر یہ سب کسی ایک شخص میں بھی جمع ہو سکتی ہیں۔  
البتہ عرف عام میں قاعدہ ہے کہ جس شخص پر جس صفت کا غلبہ ہوتا ہے اسی کے نام  
سے وہ معروف ہو جاتا ہے، طبقات پر کتابیں لکھنے والے اس کو اسی طبقہ میں شمار کرتے ہیں  
اسی وجہ سے عامہ مفسرین نے فرمایا کہ ”صدیقین“ سے مراد اجلہ صحابہ اور ”شہداء“ سے شہداء  
اور ”صالحین“ سے عام نیک مسلمان مراد ہیں۔



اور امام راغب اصفہانی نے ان چاروں درجات کو مختلف درجات قرار دیا ہے، تفسیر بحر تحیط، روح المعانی، اور منہجی میں بھی یہی مذکور ہے، یعنی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو چار قسموں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے لئے درجات اعلیٰ و ادنیٰ مقرر فرمائے ہیں، اور عام مسلمانوں کو اس کی ترغیب دی ہے، کہ وہ ان میں سے کسی کے درجے سے پیچھے نہ رہیں، علی اور علی جہد و جہد کے ذریعہ ان درجات تک پہنچنے کی کوشش کریں، ان میں نبوت ایک ایسا مقام ہے جو جہاد سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا، لیکن انبیاء کی محبت پھر بھی حاصل ہو جاتی ہے، امام راغب نے فرمایا کہ ان درجات میں سب سے پہلا درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جنکو قوت الہیہ کی امداد حاصل ہے، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو قریب دیکھ رہا ہو اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کے منعلق ارشاد فرمایا: **أَقْسَرُ دُونَكَ عَلَى مَا يَدْرِي**۔

**صدقین کی تعریف** | دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، اور وہ وہ لوگ ہیں جو معرفت میں انبیاء علیہم السلام کے قریب ہیں، اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو دُور سے دیکھ رہا ہو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے؟ آپ نے فرمایا میں کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کر سکتا جس کو نہ دیکھا ہو، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں نے آنکھوں سے تو نہیں دیکھا، لیکن ان کے قلوب نے حقائق ایمان کے ذریعہ دیکھ لیا ہے۔ اس دیکھنے سے حضرت علیؑ کی مراد اسی قسم کی رویت ہے کہ ان کی معرفت علیٰ مثل دیکھنے کے ہے۔ **شہداء کی تعریف** | تیسرا درجہ شہداء کا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو دلائل و براہین کے ذریعہ جانتے ہیں، مشاہدہ نہیں ہے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی چیز کو آئینہ میں قریب سے دیکھ رہا ہو، جیسے حضرت حارثؓ نے فرمایا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے رب کریم کے عرش کو دیکھ رہا ہوں۔

اور حدیث **أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ** میں بھی اسی قسم کی رویت مراد ہو سکتی ہے۔ **صالحین کی تعریف** | چوتھا درجہ صالحین کا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو مقصود کو تقلید و اتباع کے ذریعہ پہچانتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کسی چیز کو آئینہ میں دُور سے دیکھے، اور حدیث میں **فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ** وارد ہوا ہے اس میں بھی رویت کا یہی درجہ مراد ہو سکتا ہے امام راغب اصفہانی کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ درجات معرفت رب کے درجات ہیں، اور معرفت کے مختلف درجات کی بناء پر مختلف درجات ہیں۔ بہر حال آیت کا مضمون صاف ہے کہ اس میں مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت کرنے والے درجات عالیہ کے رہنے والوں کے ساتھ ہوں گے، اللہ تعالیٰ یہ محبت ہم سب کو نصیب کرے، آمین۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخذُوا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوا ثُبَاتٍ أَوْ

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

اِنْفِرُوا وَاجْمَعًا ۝۱۱

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! کافروں کے مقابلہ میں اپنی توجہ سیاط رکھو (یعنی ان کے داؤدھات سے بھی ہوشیار رہو اور مقابلہ کے وقت سامان، ہتھیار، ڈھال اور تلوار سے بھی درست رہو) پھر (ان سے مقابلہ کے لئے) متفرق طور پر یا مجتمع طور پر (جیسا موقع ہو) نکلو اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعض منافقین بھی شامل ہو رہے ہیں) بعضاً بعضاً شخص ایسا ہے (مراد



اس سے منافق ہے جو (جہاد) ہنستا ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا (جیسے شکست وغیرہ) تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہو کر) کہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا، (نہیں تو مجھ پر بھی مصیبت آتی) اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح وغنیمت) تو ایسے طور پر (خود غرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اور اس میں کچھ تعلق ہی نہیں (مال کے فوت ہونے پر تباہت کر کے) کہتا ہے، ہائے کیا خوب ہوتا کہ میں بھی لوگوں کا شریک حال ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی کہ مال و دولت لاتا اور خود غرضی اور بے تعلقی اس کہنے سے ظاہر ہے ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی کامیابی پر بھی تو خوش ہوتے ہیں یہ نہیں کہ اپنا افسوس کرنے بیٹھ جائے اور اس کی خوشی کا نام بھی نہ لے، اللہ تعالیٰ اس شخص کے حق میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی مفت نہیں ملتی اگر اس کا طالب ہے، تو ہاں اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے جو کہ موقوف ہے ایمان و اخلاق پر) یعنی مسلمان و مخلص بن کر ان (کافر) لوگوں سے لڑے جو آخرت (چھوڑ کر اس) کے بدلے دنیوی زندگی کو ہتھیار کئے ہوئے ہیں یعنی اس شخص کو اگر فوز عظیم کا شوق ہے تو دل درست کر لے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، تیغ و سنان کے سامنے سینہ سپر بنے دیکھو فوز عظیم ہاتھ آتا ہے یا نہیں، اوریوں کیا کوئی دل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی مصیبت جھیلے سچی کامیابی اس کی ہے، کیونکہ دنیا کی کامیابی (اول تو حقیر) پھر کبھی ہے کبھی نہیں، کیونکہ اگر غالب آگئے تو ہے ورنہ نہیں، اور آخرت کی کامیابی جو کہ ایسے شخص کے لئے موعود ہے ایسی ہے کہ عظیم بھی اور پھر ہر حالت میں ہے کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا پھر خواہ (مغلوب ہو جائے حتیٰ کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آجائے ہم (ہر حالت میں) اس کو (آخرت کا) اجر عظیم دیں گے (جو کہ فوز عظیم کہنے کے لائق ہے)۔

اس سے قبل اللہ اور رسول کی اطاعت کا ذکر تھا، آگے ان آیات کے فرمانبرداروں کو احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا ہے (قرطبی)

## معارف و مسائل

قوانینِ جہاد ① یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اخذُوا حِذْرَكُمْ إِنَّ اس آیت کے پہلے حصہ میں جہاد کرنے کے لئے اسلحہ کی فراہمی کا حکم دیا گیا، اور دوسرے حصہ میں اقدامِ جہاد کا، اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی جس کو متعدد مقامات پر واضح کیا گیا ہے کہ



ظاہری اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں اسلحہ کی فراہمی کا حکم تو دیدیا گیا، لیکن یہ وعدہ نہیں کیا گیا کہ اس کی وجہ سے تم یقیناً ضرر محفوظ ہی رہو گے، اس سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا گیا کہ اسباب کا اختیار کرنا صرف اطمینان قلبی کے لئے ہوتا ہے، ورنہ ان میں فی نفسہ نفع و نقصان کی کوئی تاثیر نہیں ہے، جیسے ارشاد ہے:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا آتٍ اَوْ مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا

یعنی اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ ہم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی مگر وہی جو ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے!

① اس آیت میں پہلے توجہ دہی کی تیاری کا حکم دے دیا گیا، اس کے بعد اس کے لئے نکلنے کا نظم بتلایا گیا، جس کے لئے دو جملے ذکر کئے گئے، یعنی قَاتِلُوا الْكُفَّارَ وَانْفِرُوا جَمِيعًا، ثبات، ثبوت کی جمع ہے، جس کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں، جس کو فوجی دستہ (سریت) کہتے ہیں، یعنی اگر تم جہاد کے لئے نکلو تو اکیلے اور تنہا نہ نکلو، بلکہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں نکلو، یا ایک کثیر (جمیعاً) لشکر کی صورت میں جاؤ، کیونکہ اکیلے لڑنے کے لئے جانے میں نقصان کا قومی احتمال ہوتا ہے، اور دشمن ایسے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

یہ تعلیم توجہ دہی کے موقع کے لئے مسلمانوں کو دی گئی ہے، لیکن عام حالات میں بھی شریعت کی یہی تعلیم ہے، کہ اکیلے سفر نہ کیا جائے، چنانچہ ایک حدیث میں تنہا مسافر کو ایک شیطان کہا گیا اور دو مسافروں کو دو شیطان اور تین کو جماعت فرمایا گیا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے:

خَيْرُ الصَّحَابَةِ اَرْبَعَةٌ وَخَيْرُ  
السَّائِيَا اَرْبَعٌ مِّائَةٌ وَخَيْرُ  
الْجُيُوشِ اَرْبَعَةٌ اَلَا فِي  
رَوَاهِ الطَّبْرَانِي بِحَوَالِهِ مَشْكُوتَةٌ

یعنی بہترین ساتھی چار ہیں اور بہترین فوجی  
دستہ چار سو کا ہے، اور بہترین لشکر  
چار ہزار کا ہے،

② وَ اِنَّ مِنْكُمْ لَخَاسِرٌ اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خطاب مؤمنین سے ہے، حالانکہ آگے جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ مؤمنین کی نہیں ہو سکتیں، اس لئے علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد منافقین ہیں، وہ چونکہ ظاہراً مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اس لئے خطاب میں ان کو مؤمنین کی ایک جماعت کہا گیا ہے۔



وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ

اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا

مرد اور عورتیں اور بچے جو کہتے ہیں اے رب ہمارے

أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا

نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ اور کر دے ہمارے لئے

مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ۝

اپنے پاس سے کوئی حمایتی اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار ،

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا

جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں سو

يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ

لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں سو لڑو تم شیطان کے حمایتیوں سے

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا ۝

بیشک فریب شیطان کا سست ہے۔

## خلاصہ تفسیر

اور تمھارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو (بادجو دیکھ اس کا قوی داعی موجود ہے، کیونکہ یہ جہاد) اللہ کی راہ میں (ہوتا ہے) یعنی اعلا بکلمۃ اللہ کے لئے ہے جس کا اہتمام ضروری ہے، اور اس اعلا بدین کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ (مکرو) (ایمان دار)وں کی خاطر سے (بھی لڑنا ضرور ہے تاکہ کفار کے پنجنے ستم سے رہائی پائیں)، جن (بیچاروں) میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو کفار سے تنگ و پریشان ہو ہو کر دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو کسی طرح، اس بستی سے (یعنی ملک سے جو ہمارے لئے جیل خانہ بنا ہوا ہے) باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں، (کہ ہم پائنت ٹھاڑھی ہے) اور ہمارے لئے غیب کسی دست کو کھلا کیجے اور ہمارے لئے غیب کسی حامی کو بھیجے (کہ ہماری حمایت کر کے ان ظالموں کے پنجنے سے چھڑا دے) جو لوگ بچے ایمان دار ہیں (وہ تو ان احکام کو سن کر) اللہ کی راہ میں (یعنی



غلبہ اسلام کے قصد سے) جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں (یعنی غلبہ کفر کے قصد سے) لڑتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں نصرت اللہ کی طرف سے ایمان داروں کو ہوگی، جب ایمان داروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے، تو اُسے ایمانداروں) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جو کہ اللہ کی مدد سے محروم ہیں) جہاد کرو (اور گو وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں لیکن) واقع میں (وہ شیطانی تدبیریں ہیں کہ شیطان ان کفری تدبیروں کا حکم کرتا ہے) شیطانی تدبیر (خود) لچر ہوتی ہے، (کیونکہ اس میں غیبی امداد نہیں ہوتی، اور کبھی چند روزہ غلبہ ہو جانا تو ان کو چند روزہ جہالت اور ڈھیل دینا ہے، تو غیبی امداد جو مؤمنین کے ساتھ ہے وہ تدبیر اس کا کیا مقابلہ کرے گی۔

خلاصہ یہ کہ داعی بھی ہے اور وعدہ نصرت بھی ہے، پھر کیا عذر ہے؟ اس لئے مکرر تاکید کی گئی۔

## معارف و مسائل

مظلوم کی فریاد سی اسلام | مکہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو جسمانی ضعف اور کم سامانی کا ایک اہم فریضہ ہے | کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے، اور بعد میں کافروں نے بھی ان کو جانے سے روک دیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دینی شروع کر دیں، تاکہ یہ لوگ اسلام سے پھر جائیں، ان حضرات میں سے بعضوں کے نام بھی تفاسیر میں مذکور ہیں، مثلاً ابن عباسؓ اور ان کی والدہؓ، سلمہ بن ہشامؓ، ولید بن ولیدؓ، اور ابو جندل بن اسلمؓ (قرطبی) یہ حضرات اپنے ایمان کی پختگی کی وجہ سے ان کے ظلم و ستم کو جھیلنے اور سہتے رہے، اور اسلام پر بڑی مضبوطی سے جھے رہے، البتہ اللہ تعالیٰ سے ان مصائب کے نجات کی دعائیں انھوں نے برابر جاری رکھیں، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ جہاد کر کے ان کو کفار کے جبر و تشدد سے چھٹکارا دلوائیں۔

اس آیت میں مؤمنین نے اللہ تعالیٰ سے دو چیزوں کی درخواست کی تھی، ایک یہ کہ ہم کو اس فترت سے نکالیں (یہاں قریہ سے مراد مکہ ہے) دوسری یہ کہ ہمارے لئے کوئی ناصر اور مددگار بھیج دیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دونوں باتیں قبول فرمائی ہیں، اس طرح کہ بعض کو وہاں سے نکلنے کے مواقع میسر کئے، جس سے ان کی پہلی بات پوری ہوئی بعض اس جگہ رہے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عتاب بن اسیدؓ کو ان کا متولی مقرر کیا، جنھوں نے مظلومین کو ان کے ظالمین سے نجات دلائی، اس طرح



سے اُن کی دوسری بات بھی پوری ہوگئی، اس آیت میں صاف لفظوں میں حکم قتال دینے کے بجائے قرآن نے یہ الفاظ اختیار کئے، مَا لَكُمْ لَا تَقَاتِلُونَ جن میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال و جہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ ہے، جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا تمام آیت یَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا سے یہ بتلایا گیا کہ حکم قتال ایک سبب مصائب کا بہترین علاج ہے۔ ان کمزور مسلمان مردوں اور عورتوں کی دعا، سختی جس کی قبولیت مسلمان کو حکم جہاد دے کر کی گئی، اور ان کی مصائب کا فوری خاتمہ ہو گیا۔

جنگ تو سب کرتے ہیں مگر اس سے اَلَّذِينَ آمَنُوا يَفْعَلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اس آیت میں بتلایا گیا مومن اور کافر کے مقاصد الگ الگ ہیں کہ مومنین اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی جدوجہد کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج ہو، اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے، اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے، اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا، دنیا کے امن کے لئے یہ ضروری ہے کہ دنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے، لہذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے یہی مقصد ہوتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلہ میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو اور طاغوتی قوتیں برسرِ اقتدار آئیں تاکہ دنیا میں کفر و شرک خوب چمکے، اور چونکہ کفر و شرک شیطان کی راہیں ہیں، اس لئے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ شیطان کی تدبیر اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا اس آیت میں بتلایا گیا کہ شیطانی تدابیر ضعیف ہے۔ لہذا کمزور ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مومنین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لہذا مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں سے لڑنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ ان کا مددگار اللہ تعالیٰ ہے، اور کافروں کو شیطان کی تدبیر کوئی فائدہ نہ دے گی۔

چنانچہ جنگ بدر میں ایسا ہی ہوا کہ پہلے شیطان کافروں کی سامنے بسی ڈینگیں مارتا رہا، اور اس نے کافروں کو بھلے یقین دلا دیا کہ "لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ" آج کے دن تم لوگوں کو کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اس لئے کہ "اِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ" (میں تمہارا مددگار ہوں) میں اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ تمہاری مدد کو آؤں گا، جب جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اگرچہ آگے بڑھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کی حمایت میں فرشتے آپہنچے ہیں تو اس نے اپنی تدبیر کو ناکام پا کر لٹے پاؤں بھاگنا شروع کر دیا، اور اپنے دوستوں یعنی



کافروں سے کہا: اِنِّیْ بَرِّیْ بِمَنِّکُمْ اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ  
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ میں تم لوگوں سے بری ہوں اس لئے کہ میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جس کی  
تم کو خبر نہیں (یعنی فرشتوں کا لشکر) میں اللہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ وہ سخت عذاب دینے والا  
ہے (منظری)

اس آیت میں شیطان کی تدبیر کو جو ضعیف کہا گیا ہے اس کے لئے اسی آیت سے  
دو شرطیں بھی مفہوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ آدمی جس کے مقابلہ میں شیطان تدبیر کر رہا ہے  
مسلمان ہو، اور دوسری یہ کہ اس کا کام محض اللہ ہی کے لئے ہو، کوئی دنیوی نفسانی غرض  
نہ ہو، پہلی شرط اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اور دوسری یَقٰیقُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ سے معلوم ہوتی  
ہے، اگر ان دونوں شرطوں میں سے کوئی فوت ہو جائے تو پھر ضروری نہیں کہ شیطان کی تدبیر  
اس کے مقابلہ میں کمزور ہو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب تم شیطان کو دیکھو تو بغیر کسی خوف و خدشہ کے  
اس پر حملہ کر دو۔ اس کے بعد آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ  
ضَعِیْفًا (احکام القرآن للسیوطی)

اَلَمْ تَرَ اِلٰی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ کُفُوْا اٰیْدِیْکُمْ وَاَقِمْوْا

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور قائم رکھو

الصَّلٰوةَ وَاتُوا النَّزٰکٰتَ ج ۝ فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ

نماز اور دینے رہو زکوٰۃ ج پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا

اِذَا فَرِیقٌ مِّنْهُمْ یُحْشَوْنَ النَّاسَ کَخَشِیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ

اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی

خَشِیَةً ۝ وَقَالُوْا اَسْرَبْنَا لِمَ کُتِبَتْ عَلَیْنَا الْقِتَالُ ج ۝ لَوْ لَا

نیا وہ ڈر اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ

اٰخَرْتَنَا اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۝ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۝

چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک کہہ دے کہ فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰ ۝ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فِتْنًا ۝

اور آخرت بہتر ہے پرہیزگار کو اور تمہارا حق نہ دیا جائے گا ایک تار کے برابر



أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَدْرِكَكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ

جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو آ پھڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں

مُسَيَّدَةٍ ۚ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ

میں اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی تو کہیں یہ اللہ کی طرف سے

اللَّهِ ۚ وَإِنْ تُصِيبَهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ لَقِ

ہے اور اگر اچھا پہنچے کچھ بُرائی تو کہیں یہ تیری طرف سے ہے

قُلْ كُلُّ مَنْ عِنْدَ اللَّهِ فَسَالٍ هُوَ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ

کہہ دے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے سو کیا حال ہے ان لوگوں کا ہرگز نہیں

يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ۝ مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ

مجھے کہ سمجھیں کوئی بات جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سوائے اللہ کی طرف سے ہے،

وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنَ نَفْسِكَ وَأَمَّا سَلْنَاكَ

اور جو تجھ کو بُرائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے ہے اور ہم نے تجھ کو بھیجا پیغام

لِلنَّاسِ رَسُولًا ۖ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝۹

پہنچانے والا لوگوں کو اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا۔

## خلاصہ تفسیر

(اے مخاطب) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (قبل نزول حکم جہاد تو جنگ کرنے کا) (ایسا اتفاق تھا کہ) ان کو (منع کرنے کے لئے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (اٹنے سے) روکے رہو اور (جو جو حکم تم کو پہنچے ہیں اس میں لگے رہو مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی اور یا) پھر ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو کیا حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (مخالف) لوگوں سے (طبعاً) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کر دیں گے) جیسا (کوئی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا زیادہ ڈرنے کے دُعا معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دشمن کا ڈر طبعی ہے، اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقل حالت سے شدید ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ خدا تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسی امید رحمت بھی تو ہے اور کافر دشمن سے تو ضرر کا خوف ہی خوف ہے، اور چونکہ یہ خوف



طبی تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، اور (یا حکم قتال کو ملتوی کرنے کی تمنائیں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور خدا تعالیٰ کے علم میں قول نفسی قول لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے (ابھی سے) ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدت ہملت دیدی ہوئی (ذرا بے فکری سے اپنی ضروریات پوری کر لیتے اور چونکہ یہ عرض کرنا بطور اعتراض یا انکار کے نہ تھا اس لئے گناہ نہیں ہوا، آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرمادیجئے کہ دنیا سے فائدہ اٹھانا (جس کے لئے ہم ہملت کی تمنا کرتے ہیں) محض چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ اگر کفر کے طور پر مخالفت کی تب تو اس کے لئے سامان آخرت کچھ بھی نہیں اور اگر معصیت کا مرتکب ہوا تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور ہم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے اُن کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیوں خالی رہتے ہو اور اگر جہاد بھی نہ کیا تو وقت معین پر موت سے بچ جاؤ گے ہرگز نہیں کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ) تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں موت آدباے گی اگرچہ پختہ مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو (غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مکر دنیا کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ بلکہ عقل کی بات یہ ہے کہ حج چند روزے جہاد کن باقی بخند) اور اگر ان (منافقین) کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح و کامیابی) تو کہتے ہیں کہ یہ منجانب اللہ (اتفاقاً) ہو گئی (ورنہ مسلمانوں کی بے تدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر ان کی کوئی بُری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت و قتل) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ کی اور مسلمانوں کی بے تدبیری کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرمادیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں بلکہ) سب کچھ (نعمت و نعمت اللہ ہی کی طرف سے ہے) (گو ایک بلا واسطہ اور ایک بواسطہ جیسا کہ عقرب اس کی تفصیل آتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے بلا واسطہ اعمال ہے اور نعمت یعنی مصیبت اللہ کے عدل سے بواسطہ اعمال سینہ دیکھے ہے پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو واقع میں اعمالِ سینہ کا اس میں دخل ہے، جیسا اُحد میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے، اگر آدمی ذرا بھی غور کرے تو خوش حالی کے قبل کوئی نیک عمل اس درجہ کا نہ پاوے گا محض نصل ہی







جس کی وجہ یہ تھی کہ عادتاً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی انتہائی تنگی و تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اس لئے ایسے وقت میں انتقام لینا زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن آرام و راحت کے وقت اس کی طبیعت لڑائی کی طرف آمادہ نہیں ہوتی، یہ ایک بشری تقاضا ہے، چنانچہ یہ مسلمان جب مکہ میں تھے تو اس وقت کفار کی ایذاؤں سے تنگ آ کر جہاد کے حکم کی تمنا کر رہے تھے، لیکن مدینہ میں آ کر جب ان کو سکون و آرام نصیب ہوا تو ایسی صورت میں جب قتال کا ختم ہوا تو اس وقت ان کا پُرانا جذبہ کم ہو چکا تھا اور ان کے دلوں میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا، اس لئے انھوں نے محض ایک تمنا کی کہ اگر اس وقت جہاد کا حکم نہ ہوتا تو بہتر تھا، اس تمنا کو اعتراض پر محمول کر کے ان مسلمانوں کی طرف معصیت کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، یہ تفسیر اس صورت میں ہے جب کہ انھوں نے شکایت کا اظہار زبان سے بھی کیا ہو، لیکن اگر زبان سے نہیں کیا محض ان کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا ہو تو وسوسہ قلبی کو شریعت نے معصیت ہی شمار نہیں کیا، یہاں یہ دونوں احتمال ہیں، اور آیت کے لفظ قائلو اسے پشہ نہ کیا جائے کہ انھوں نے زبان سے اظہار کر دیا تھا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے دل میں کہا ہو (بیان القرآن مخلصاً) بعض مفسرین کے نزدیک آیات کا تعلق مؤمنین سے نہیں ہے بلکہ منافقین سے ہے، اس صورت میں کسی قسم کا اشکال نہیں (تفسیر کبیر)

اصلاح ملک سے اَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، اللہ تعالیٰ نے پہلے نماز اور زکوٰۃ اصلاح نفس مقدم ہے کے احکام کو بیان فرمایا، جو اصلاح نفس کا سبب ہیں، اور اس کے بعد جہاد کا حکم دیا جو اصلاح ملک کا سبب ہے یعنی اس کے ذریعہ سے ظلم و ستم کا استیصال کیا جاتا ہے اور ملک میں امن و امان قائم ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کرنی چاہئے، چنانچہ درجہ کے اعتبار سے بھی قسم اول کا حکم فرض عین ہے اور ثانی کا فرض کفایہ ہے، جس سے اصلاح نفس کی اہمیت اور اس کا مقدم ہونا ظاہر ہے (منظری) دنیا اور آخرت کی آیت میں دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کو افضل اور بہتر نعمتوں میں فرق کہا گیا ہے، اس کی مندرجہ ذیل چند وجوہ ہیں۔

- ۱۔ دنیا کی نعمتیں قلیل ہیں اور آخرت کی نعمتیں کثیر ہیں۔
- ۲۔ دنیا کی نعمتیں ختم ہونے والی ہیں اور آخرت کی باقی رہنے والی ہیں۔
- ۳۔ دنیا کی نعمتوں کے ساتھ طرح طرح کی پریشانیاں بھی ہیں اور آخرت کی نعمتیں ان کدورتوں سے پاک ہیں۔

۴۔ دنیا کی نعمتوں کا حصول یقینی نہیں ہے اور آخرت کی نعمتیں ہر متقی کو یقیناً ملیں گی (تفسیر کبیر)



وَلَا تَحْزَنْ فِي الدُّنْيَا لَمَنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ ۖ مِنْ اللَّهِ فِي دَارِ اٰلِهٖمَاقَاتَصِيبُ  
 وَاِنْ تُحِجُّبَ لَدُنِّيَا رَجَالًا فَانْهَآ ۖ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَالْاٰزَالُ قَرِيْبٌ  
 "یعنی اس ناپائیدار دنیا میں ایسے شخص کے لئے کچھ بھلائی نہیں ہے جس کے لئے  
 اللہ تعالیٰ کی طرف سے پائیدار گھر یعنی آخرت میں کوئی جگہ نہ ہو، پھر اگر دنیا کچھ لوگوں  
 کو فریفتہ کرے تو آگاہ رہیں کہ یہ دنیا تو متاعِ قلیل ہے، اور اس کا زوال و ناپید ہونا  
 بہت قریب ہے، یعنی ادھر آنکھ بند ہوئی اور ادھر آخرت سامنے آئی۔"

**ایک عبرت ناک واقعہ** | اِنَّ مَا تَكُوْنُوْنَ اِيْدَارُكُمْ الْمَوْتُ الْاَلَمْ تَعَالٰی نے اس  
 آیت جہاد سے رکنے والوں کے اس شبہ کا ازالہ کر دیا کہ شاید  
 جہاد سے جان بچا کر موت سے بھی بچ سکتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ موت ایک دن آکر رہے گی خواہ  
 تم جہاں کہیں بھی ہو دیں موت آئے گی، جب یہ بات ہے تو تمہارا جہاد سے منہ پھیرنا بیکار ہے۔  
 حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں ایک عبرت ناک واقعہ بروایت ابن جریرؒ  
 ابن ابی حاتم عن مجاہدؒ لکھا ہے، کہ پہلی امتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضع حمل کا  
 وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے  
 کے لئے بھیجا، وہ دروازہ سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے پوچھا کہ  
 یہ عورت کیا جانی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ آپ یاد  
 رکھئے: یہ لڑکی ستو مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر ایک مکرٹی سے مرے گی، ملازم یہ سنکر  
 واپس ہوا، اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کر دیا، اور سوچا کہ اب یہ  
 مرگئی ہے تو بھاگ گیا، مگر چھ لڑکی کی ماں نے ٹانگے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک  
 کہ وہ لڑکی جوان ہو گئی، اور خوب صورت اتنی تھی کہ اس شہر میں وہ بے مثال تھی، اور اس  
 ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی، اور کافی عرصہ تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی  
 کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑا ہی اعلیٰ، تو اس سے ذکر کیا، کہ میں ایسی  
 لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ خوب صورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس  
 عورت نے کہا کہ فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوب صورت نہیں ہے، آپ اسی سے شادی  
 کر لیں، آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کر لی، تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ  
 تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک  
 لڑکی کا میں پیٹ چاک کر کے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا، یہ سنکر وہ



بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں یہ کہہ کر اس نے اپنا پیٹ دکھایا جس پر نشان موجود تھا، یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں، ایک یہ کہ تو ستورود سے زنا کرے گی، اس پر عورت نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں، مرد نے کہا تعداد تو ہے، دوسری بات یہ کہ تو مکرڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کرایا، جس میں مکرڑی کے جلے کا نام تک نہ تھا، ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکرڑی نظر آئی، عورت بولی کیا مکرڑی یہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا ہاں! اس پر وہ فوراً اٹھ لی، اور کہا کہ اس کو تو میں فوراً مار دوں گی، یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پاؤں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔ مکرڑی تو ہلاک ہو گئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں جو اس کی موت کا پیغام بن گئیں۔ (ابن کثیر)

یہ عورت صاف ستھرے شاندار محل میں اچانک ایک مکرڑی کے ذریعہ ہلاک ہو گئی، اس کے بالمقابل کتنے ایسے آدمی ہیں کہ عمر بھر جنگوں اور معرکوں میں گزار دی وہاں موت نہ آئی، حضرت خالد بن ولیدؓ جو اسلام کے سپاہی اور جرنیل معروف و مشہور ہیں، اور سیف اللہ ان کا لقب ہے پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے اور ہزاروں کافروں کو تہ تیغ کیا، ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا، اور ہمیشہ یہی دعا کرتے تھے کہ میری موت عورتوں کی طرح چار پائی پر نہ ہو، بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدان جہاد میں ہو، لیکن آخر کار ان کی موت بستر پر ہی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کا نظام قادر مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے، جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر ایک مکرڑی کے ذریعہ مار دے اور بچانا چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بچالے۔

پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ رِجَالٌ مُّسْتَدِينُونَ اس آیت میں کہا گیا کہ موت توکل کے خلاف نہیں، تم کو یہ کیفیت پہنچ کر رہے گی، اگرچہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رہنے رہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لئے مضبوط و عمدہ گھر تعمیر کرنا نہ خلاف توکل ہے، اور نہ خلاف شرع ہے۔ (قرطبی)

انسان کو نعمت محض مَا آتَاكُم مِّنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ یہاں حسنہ سے مراد اللہ کے فضل سے ملتی ہے نعمت ہے۔ (مظہری)

اس آیت سے اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ انسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنی ہی عبادت



کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے پھر اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، ان کو محدود عبادات اور طاعات سے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہماری عبادت بھی رب العالمین کی بارشاہت کے شایانِ شان نہ ہو۔

چنانچہ ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَا أَحَدٌ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا بِحُجَّةٍ	نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے
اللَّهُ قَبِيلٌ وَلَا أَنْتَ قَالَ وَلَا	کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا،
أَنَا (متفق علیہ)	رادی نے عرض کیا آپ بھی نہیں جائیں
(بحوالہ مظہری)	فرمایا ہاں میں بھی نہیں

مصیبت انسان کے [وَمَا آصَابَكَ مِنْ سَيْئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ، یہاں سَيِّئَةٍ سے مراد شامِ اعمال کا نتیجہ ہے] مصیبت ہے (مظہری)

مصیبت کی تخلیق اگرچہ اللہ ہی کرتا ہے، لیکن اس کا سبب خود انسان کے اعمال ہوتے ہیں، اب اگر یہ انسان کافر ہے تو اس کے لئے دنیا میں جو مصیبت پیش آتی ہے یہ اس کے لئے اس عذاب کا ایک معمولی سا نمونہ ہوتا ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر وہ مومن ہے تو اس کے لئے مصائب و کالیف اس کے گناہوں کا کفارہ ہو کر نجاتِ آخرت کا سبب ہو جاتی ہیں، چنانچہ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

مَا مِنْ مُصِيبَةٍ تُصِيبُ الْمُسْلِمَ إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا عَنْهُ حَتَّى الشُّوْكَةَ يُشَاكُّهَا	”یعنی کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو
(ترمذی بحوالہ مظہری)	کس مسلمان کو پہنچے، مگر وہ اس کے گناہوں
	کا کفارہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو
	اس کے پاؤں میں چبھتا ہے“

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِي مُوسَى أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُصِيبُ عَبْدًا مُكْتَبَةٌ فَمَا فَوْقَهَا وَمَا دُونَهَا إِلَّا بِذَنْبٍ وَمَا يَغْفِرُ أَكْثَرَ	حضرت ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ
	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندے کو
	جو کوئی ہلکی یا سخت مصیبت پیش آتی
	ہے تو وہ اس کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے،
	اور بہت گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں“

(ترمذی بحوالہ مظہری)



آپ کی رسالت تمام عالم کے لئے عام ہے اور سَلَّمَ لِلنَّاسِ رَسُولًا، اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رسالت پورے عالم کے انسانوں کے لئے عام ہے، خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تاقیامت پیدا ہوں (منظری)

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ وَمَنْ تَوَلَّى فَسًا

جس نے حکم مانا رسول کا اس نے حکم مانا اللہ کا اور جو اٹا پھرا تو نے

أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَقِيقًا ۝۸۰

تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان

## خُلاصۃ تفسیر

جس شخص نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی، (اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت عقلاً بھی واجب ہے، پس آپ کی اطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص آپ کی اطاعت سے روگردانی کرے سو آپ کچھ غم نہ کجے کیونکہ ہم نے آپ کو (بطور ذمہ داری کے) ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں، بلکہ آپ کا فرض پیغام پہنچا دینے سے پورا ہو جاتا ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ کفر کریں تو آپ پر کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں آپ بے فکر رہیں)

وَيَقُولُونَ لِمَا عَصَوْا رِفَاقًا بَرًّا ۖ وَمِنْ عِنْدِكَ طَائِفَةٌ

اور کہتے ہیں قبول ہے پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعض بعض

مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّنُونَ ۚ

ان میں سے رات کو اس کے خلاف جو تجھ سے کہہ چکے تھے اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں

فَاعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ عِلًّا ۝۸۱

سو تو تغافل کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر اور اللہ کافی ہے کارساز

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ ۚ أَلَمْ يَكُنْ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ

کیا غور نہیں کرتے قرآن میں اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوائے اللہ کے



## لَوْ جَدُّ وَافِيَةٍ اخْتِلَا فَاَكْثَرًا ④

تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت

## خلاصہ تفسیر

اور یہ (منافی) لوگ آپ کے احکام سنکر آپ کے سامنے زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں اصل مشورہ وہ کرتے ہیں باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس خلاف میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں، (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے، اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے، اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں، وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی ضرر نہیں پہنچا، کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تاکہ اس کا کلام الہی ہونا واضح ہو جائے) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس کے مضامین میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے) واقعات سے (اور حیرت انگیز سے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ ہر ہر مضمون میں ایک ایک اختلاف و تفاوت ہوتا تو مضامین کثیرہ میں اختلافات کثیرہ ہوتے، حالانکہ ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، پس لا محالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا)

## معارف و مسائل

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَرُوا مِنْ عِنْدِ رَبِّهِمْ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ

الَّذِي تَقُولُ، اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو دُرُخِ پالیس رکھتے ہیں زبان سے کچھ کہتے ہیں دل میں کچھ ہوتا ہے، اس کے بعد ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کے متعلق ایک خاص ہدایت ہے۔

پیشوا کے لئے ایک ہم ہدایت | فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا



جب منافقین آپ کے سامنے آتے تو کہتے کہ ہم نے آپ کا حکم قبول کیا اور جب واپس جاتے تو آپ کی نافرمانی کرنے کے لئے مشورے کرتے، اس سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت کوفت ہوتی، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت دی کہ ان کی پروا نہ کیجئے، آپ اپنا کام اللہ کے بھروسہ پر کرتے رہیں، کیونکہ وہ آپ کے لئے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے، لوگ طرح طرح کے اُلٹے سیدھے الزامات اس کے سر ڈالیں گے، دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے، ان سب چیزوں کے باوجود اس رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہئے، اگر اس کا رخ اور نصب العین صحیح ہوگا تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

**تدبرِ قرآن** | اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ، اس آیت سے اللہ تعالیٰ قرآن میں غور و فکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں، اس میں چند چیزیں قابل غور ہیں:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ فرمایا اَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ نہیں فرمایا، اس سے بظاہر ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ وہ اگر گہری نظر سے قرآن کو دیکھیں تو ان کو اس کے معانی و مضامین میں کوئی اختلاف نظر نہیں آئے گا، اور یہ مضمون تدبر کے عنوان سے ہی ادا ہو سکتا ہے، صرف تلاوت اور قرات جس میں تدبر اور غور و فکر نہ ہو اس سے بہت سے اختلافات نظر آنے لگتے ہیں جو حقیقت کے خلاف ہے۔

دوسری بات اس آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ قرآن کا مطالعہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطابق میں غور کرے، لہذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے ہے صحیح نہیں ہے، البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکال لیا گیا عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلید کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہو سکے تو کوئی مستند و معتمد تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں، اور ماہر علماء سے رجوع کریں۔



قرآن سنت کی تفسیر و تشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہے لیکن اس کیلئے شرائط ہیں قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کا استخراج کیا جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے تاکہ وہ نتائج کا استخراج صحیح کر سکے، اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل جاہل نہ کیا یا اس نے ناقص حاصل کیا، جن اوصاف و شرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے کہ نتائج غلط نکالے گا، اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

اگر ایک شخص جس نے کبھی کسی میڈیکل کالج کی شکل تک نہ دیکھی ہو یہ اعتراض کرنے لگے کہ ملک میں علاج و معالجہ پر سند یافتہ ڈاکٹروں کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی ہے؟ مجھے بھی بحیثیت ایک انسان کے یہ حق ملنا چاہئے۔ یا کوئی عقل سے کورا انسان یہ کہنے لگے کہ ملک میں نہریں، پل اور بند تعمیر کرنے کا شہیکہ صرف ماہر انجینیروں ہی کو کیوں دیا جاتا ہے؟ میں بھی بحیثیت شہری کے یہ خدمت انجام دینے کا حق دار ہوں۔

یا کوئی عقل سے معذور آدمی یہ اعتراض اٹھانے لگے کہ قانون ملک کی تشریح و تہجیر پر صرف ماہرین قانون ہی کی اجارہ داری کیوں قائم کر دی گئی؟ میں بھی عاقل و بالغ ہونے کی حیثیت سے یہ کام کر سکتا ہوں، اس آدمی سے یہی کہا جاتا ہے کہ بلا مشبہ بحیثیت شہری کے تمہیں ان تمام کاموں کا حق حاصل ہے، لیکن ان کاموں کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے سالہا سال ویدہ ریزی کرنی پڑتی ہے، ماہر اساتذہ سے ان علوم و فنون کو سیکھنا پڑتا ہے، اس کے لئے ڈگریاں حاصل کرنی پڑتی ہیں، پہلے یہ زحمت تو اٹھانا پڑے، پھر بلا مشبہ تم بھی یہ تمام خدمتیں انجام دے سکتے ہو، لیکن یہی بات اگر قرآن و سنت کی تشریح کے دقیق اور نازک کام کے لئے کہی جائے تو اس پر علماء کی اجارہ داری کے آوازے کسے جاتے ہیں؟ کیا قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کرنے کے لئے کوئی اہلیت اور کوئی قابلیت درکار نہیں؟ کیا پوری دنیا میں ایک قرآن و سنت ہی کا علم ایسا لاوارث رہ گیا ہے کہ اس کے معاملہ میں ہر شخص کو اپنی تشریح و تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے، خواہ اس نے قرآن و سنت کا علم حاصل کرنے کے لئے چند مہینے بھی خرچ نہ کئے ہوں۔

ویاس کا ثبوت | اس آیت سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی مسئلہ کی تصریح قرآن و



سنت میں نہ ملے تو انہی میں غور و فکر کر کے اس کا حل نکالنے کی کوشش کی جائے، اور اسی عمل کو اصطلاح میں قیاس کہتے ہیں۔ (قرطبی)

**اختلاف کثیر کی تشریح** | وَكَانَ مِنْ عِنْدِ رَبِّكَ لَوْ جَدَّ وَافِيَةً اِخْتِلَافًا كَثِيرًا، اختلاف کثیر کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مضمون میں اختلاف ہوتا تو مضامین کثیرہ کا اختلاف بھی کثیر ہوتا (بیان ہستہ) لیکن یہاں کسی ایک مضمون میں بھی اختلاف نہیں، لہذا یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بشر کے کلام میں یہ یکسانیت کہاں، نہ کسی جگہ فصاحت و بلاغت میں کمی، نہ توحید و کفر اور حلال و حرام کے بیان میں تناقض اور تغادوت، پھر غیب کی اطلاعات میں بھی نہ کوئی خبر ایسی ہے جو واقع کے مطابق نہ ہو، نہ نظم و ستران میں کہیں یہ فرق کہ بعض فصیح ہو اور بعض رکب، ہر بشر کی تحریر و تخریر پر ماحول کا اثر ہوتا ہے، اطمینان کے وقت کلام اور طرح کا ہوتا ہے پریشانی کے وقت دوسری طرح کا ہے، مسرت کے وقت اور رنگ ہوتا ہے اور رنج کے وقت دوسرا، لیکن ستران ہر قسم کے تغادوت اور تناقض سے پاک ہے اور بالاتر ہے، اور یہی کلام الہی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا

اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے

بِهِ وَكَوَسَدُوا إِلَى الرَّسُولِ وَالْأُولَى الْأَمْرُ مِنْهُمْ

ہیں اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک

لَعَلَّهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَكَ مِنْهُمْ وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ

تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کر نیوالے ہیں اس کی اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَا تَبْعَتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۳﴾

تم پر اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے

## خلاصہ تفسیر

اور جب ان کو کسی امر (جدید) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (ردہ امر موجب) امن ہو یا (خوف) خوف (مثلاً کوئی لشکر مسلمانوں کا کسی جگہ جہاد کے لئے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی، یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی یہ خوف کی خبر ہے) تو اس



(خبر) کو (فوراً) مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا مصلحت انتظامیہ کے خلاف ہوتا ہے) اور اگر (جائے خود مشہور کرنے کے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور جو (حضرت) اکابر صحابہؓ ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے اور پر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کی صحت و غلط اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں (جیسا ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا؟ آگے احکام مذکورہ سنانے کے بعد جو سراسر متضمن مصالح دنیویہ و آخریہ ہیں بطور منت کے مسلمانوں کو ارشاد ہے) اور اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا اپنا پیغمبر بھیجا یہ اگر نہ ہوتا تو تم سب کے سب ضرر دنیوی و آخری خستیاں کر کے) شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو بدولت عقل سلیم خدا واد کے کہ وہ بھی ایک خاص فضل و رحمت ہے اس سے محفوظ رہتے ورنہ زیادہ تباہی میں پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو جسکی معرفت ایسے مصالح کے احکام آتے ہیں بر خلاف مذکورہ منافقین کے بہت غنیمت سمجھنا چاہئے، اور پوری اطاعت کرنا چاہئے)۔

## معارف و مسائل

**شان نزول** | **وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ** ، ابن عباس، صحاک اور ابو معاذ رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، اور حضرت حسنؓ اور دوسرے اکثر حضرات کے نزدیک یہ آیت ضعیف اور کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے (روح المعانی) علامہ ابن کثیرؒ نے اس آیت سے متعلق واقعات نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ اس آیت کے شان نزول میں حضرت عمر بن خطابؓ کی حدیث کو ذکر کرنا چاہئے، وہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے تو وہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف آئے جب دروازہ پر پہنچے تو آپؐ نے سنا کہ مسجد کے اندر لوگوں میں بھی یہی ذکر ہو رہا ہے یہ دیکھ کر آپؐ نے کہا کہ اس خبر کی تحقیق کرنی چاہئے، چنانچہ آپؐ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دیدی ہے؟



آپ نے فرمایا کہ نہیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہ تحقیق کرنے کے بعد میں مسجد کی طرف واپس آیا اور دروازہ پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی، جو آپؐ لوگ کہہ رہے ہیں غلط ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ النَّحْلِ فَتَفَسِّرْهُ

بے تحقیق باتوں کا اڑانا | اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر سنی سنائی بات کو بغیر تحقیق کے بیان گناہ اور بڑا فتنہ ہے | نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا: كَفَى بِالْمَرْءِ كِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِحَدِيثِ مَا يَسْمَعُ، یعنی کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے بیان کر دے۔

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے فرمایا: مَنْ حَدَّثَ بِحَدِيثٍ وَهُوَ يَرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ۔ "یعنی جو آدمی کوئی ایسی بات بیان کرے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ یہ جھوٹی ہے تو دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا وہ بھی ہے" (تفسیر ابن کثیر)

اولوالامر کون لوگ ہیں؟ | وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولَى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمْ الْكِنَئُ يُكَتَّبُ بِطُوعٍ مِّنْهُمْ إِلَى اسْتِنَابٍ، اصل میں کنوئیں کی تہہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں، کنواں ٹھونڈنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماہِ مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا (قرطبی)

اولوالامر کی تعین میں متعدد اقوال ہیں، حضرت حسن، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ کے نزدیک علماء اور فقہاء مراد ہیں، حضرت سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء اور حکام مراد ہیں، ابو بکر جصاصؒ ان دونوں اقوال کو نقل کر کے بعد فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ اولی الامر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے، البتہ اس پر بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ اولی الامر سے مراد فقہاء نہیں ہو سکتے، کیونکہ اولی الامر اپنے لفظی معنی کے اعتبار سے وہ لوگ ہیں جن کا حکم چلتا ہو، اور ظاہر ہے کہ فقہاء کا یہ کام نہیں حقیقت یہ ہے کہ حکم چلنے کی دو صورتیں ہیں، ایک جبر و تشدد سے، وہ تو صرف اہل حکومت ہی کر سکتے ہیں، دوسری صورت اعتقاد و اعتماد کی وجہ سے حکم ماننے کی ہے، وہ حضرات فقہاء ہی کو حاصل ہے، جس کا مشاہدہ عام مسلمانوں کے حالات سے ہر دور میں ہوتا رہا ہے، کہ دین کے معاملات میں عام مسلمان اپنے اختیار سے علماء ہی کے حکم کو واجب العمل قرار دیتے ہیں، اور از روئے شریعت ان پر ان کے احکام کی اطاعت واجب بھی ہے، لہذا اس وجہ سے ان پر بھی اولوالامر کا اطلاق صحیح ہے (احکام القرآن للجبصا)



اس بحث کی مزید تفصیل آیت **أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ** کے تحت بھی گذر چکی ہے۔

مسائل جدید میں قیاس اجتہاد و عوام اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے لئے تقلید قائم کا ثبوت ہے کہ احکام اجتہاد و قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت قائم رکھتے ہیں۔ اس بیان سے چند امور مستفاد ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا۔ دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں، بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں۔ اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے دلالت کر رکھا ہے۔

تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔

(احکام القرآن للخصاص)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی استنباط و استدلال کے مکلف تھے ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دلائل کے ذریعہ احکام کے استنباط کے مکلف تھے، اس لئے کہ پہلے آیت میں دو آدمیوں کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا، ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور دوسرے اولوالامر کی طرف، اس کے بعد فرمایا **لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ** اور یہ حکم عام ہے جس میں مذکورہ فریقین میں سے کسی کی تخصیص نہیں ہے، لہذا اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی ذات بھی استنباط احکام کی مکلف تھی (احکام القرآن للخصاص)

**فَوَافِقُهُ** ○ اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ آؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور فکر کے جوابات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ مسائل حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔



تو جواب یہ ہے کہ آیت وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ، میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے، اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اختیار کرے، دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا احتمال رہتا ہے، تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔  
(احکام القرآن للخصاص ملخصاً)

اجتہاد و استنباط غلبہ ظن کا قاعدہ (۲) استنباط سے جو حکم فقہاء نکالیں گے اس کے بارے میں قطعی طور پر دیتا ہے علم یقینی کا نہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ کے نزدیک قطعی طور پر یہی حق ہے، بلکہ اس حکم کے خطا رہنے کا بھی احتمال باقی رہتا ہے، ہاں اس کے صحیح ہونے کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے، جو عمل کے لئے کافی ہے۔ (احکام القرآن للخصاص و تفسیر کبیری)

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلِّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ

سو تو لڑ اللہ کی راہ میں تو ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کا اور تاکید کر

الْمُؤْمِنِينَ هَٰذَا أَنَّىٰ يَكْفُ بِأَسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللَّهُ

مسلمانوں کو قریب ہے کہ اللہ بندہ کرے لڑائی کا لشروں کی اور اللہ

أَشَدُّ بِأَسَاوَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ۝۸۴

بہت سخت لڑائی میں اور بہت سخت ہے تنزیل دالا

## خلاصہ تفسیر

(جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوئی) پس آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے اور اگر فرضاً کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے کیونکہ آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں اور اس کے ساتھ (مسلمانوں کو) صرف (ترغیب دیدیجئے) پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ ہر کسی اللہ میں نہ تو باز پرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ مذکور ہو چکی اور نہ ہتھارہ جانے کا غم کیجئے جس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلائل و وعدہ ہے) کہ کافروں کے زور جنگ کو







شدتِ باس کے ساتھ اپنی سزا کی شدت بھی بیان فرمائی، یہ سزا خواہ قیامت میں ہو جیسا کہ ظاہر ہے، یا دنیا میں ہو جیسا کہ بعض نے کہا، بہر حال جس طرح جنگ کرنے میں ہماری قوت و طاقت بڑھی ہوئی ہے اسی طرح سزا دینے میں بھی ہماری سزا بہت سخت ہے۔

مَنْ يَشْفَعُ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ

جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے ایک حصہ اور جو کوئی

يَشْفَعُ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ

سفارش کرے بُری بات میں اس پر بھی ہے ایک بوجھ اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر

كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيبًا ۝۸۵ وَإِذَا حَيَّيْتُمْ بِحَيَّيَةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ

قدرت رکھنے والا اور جب تم کو دعا دیوے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے

مِنَّا أَوْ رُدُّوهَا ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝۸۶

بہتر یا وہی کہو اٹ کر بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لِيَجْمَعَ بَكُمُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ لَا رَيْبَ

اللہ کے سوا کسی کی ہندگی نہیں بیشک تم کو جمع کرے گا قیامت کے دن اس میں

فِيهِ ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَلِيلًا ۝۸۷

کچھ شبہ نہیں اور اللہ سے بھی بات کس کی بات۔

التفصیل

## خلاصہ تفسیر

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و مقصود دونوں مشروع ہوں) اس کو اُس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا اور جو شخص بُری سفارش کرے (یعنی جس کا طریق و غرض غیر مشروع ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بُری پر عذاب دے سکتے ہیں) اور جب تم کو کوئی (مشروع طور پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو، (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ویسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر)



حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے) اور یوں اپنے فضل سے معاف کر دیں وہ اور بتا ہے) اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات بھی ہوگی (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے)۔

## معارف و مسائل

سفارش کی حقیقت اور اس کے احکام اور اقسام | مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً اِلٰی اس آیت میں شفاعت یعنی سفارش کو اچھی اور بری دو قسموں میں تقسیم فرما کر اس کی حقیقت کو بھی واضح کر دیا، اور یہ بھی بتلا دیا کہ نہ ہر سفارش بری ہے اور نہ ہر سفارش اچھی، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ اچھی سفارش کرنے والے کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور بری سفارش کرنے والے کو عذاب کا، آیت میں اچھی سفارش کے ساتھ نَصِيبٌ کا لفظ آیا ہے، اور بری سفارش کے ساتھ كِفْلٌ کا، اور نعت میں دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی کسی چیز کا ایک حصہ، لیکن عرف عام میں لفظ نَصِيبٌ اچھے حصہ کے لئے بولا جاتا ہے، اور لفظ كِفْلٌ اکثر بُرے حصہ کے لئے استعمال کرتے ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اچھے حصہ کے لئے بھی لفظ كِفْلٌ استعمال ہوا ہے، جیسے قرآن کریم میں كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ ارشاد ہے۔

شفاعت کے لفظی معنی ملنے یا ملانے کے ہیں، اسی وجہ سے لفظ شفعہ عربی زبان میں جوڑے کے معنی میں آتا ہے، اور اس کے بالمقابل لفظ وتر بمعنی طاق استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے شفاعت کے لفظی معنی یہ ہوئے کہ کسی کمزور طالب حق کے ساتھ اپنی قوت ملا کر اس کو قوی کر دیا جائے، یا بیکیں اکیلے شخص کے ساتھ خود مل کر اس کو جوڑا بنا دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جائز شفاعت و سفارش کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ جس کی سفارش کی جائے اس کا مطالبہ حق اور جائز ہو، دوسرے یہ کہ وہ اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا، آپ پہنچا دیں، اس سے معلوم ہوا کہ خلاف حق سفارش کرنا یا دوسروں کو اس کے قبول پر مجبور کرنا شفاعتِ سیئہ یعنی بری سفارش ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ سفارش میں اپنے تعلق یا وجاہت سے طریقہ دباؤ اور اجبار کا استعمال کیا جائے تو وہ بھی ظلم ہونے کی وجہ سے جائز نہیں، اسی لئے وہ بھی شفاعتِ سیئہ میں داخل ہے اب خلاصہ مضمون آیت مذکورہ کا یہ ہو گیا کہ جو شخص کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام کے لئے جائز طریقہ پر سفارش کرے تو اس کو ثواب کا حصہ ملے گا، اور اسی طرح جو کسی



ناجائز کام کے لئے یا ناجائز طریقہ پر سفارش کرے گا اس کو عذاب کا حصہ ملے گا۔  
 حصہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص سے سفارش کی گئی ہے وہ جب اس مظلوم یا  
 محروم کا کام کرے تو جس طرح اس کام کرنے والے افسر کو ثواب ملے گا، اسی طرح سفارش  
 کرنے والے کو بھی ثواب ملے گا۔

اسی طرح کسی ناجائز کام کی سفارش کرنے والا بھی گنہگار ہوگا، اور یہ پہلے معلوم ہو چکا  
 ہے کہ سفارش کرنے والے کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ اس کی سفارش مؤثر اور کامیاب  
 بھی ہو بلکہ اس کو بہر حال اپنا حصہ ملے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **الَّذِي عَلَى الْخَيْرِ كَقَاعِلِهِ** (سرداہ البزار  
 عن ابن مسعود والطبرانی عنہ وعن سہل بن سعد، بحوالہ مظہری)، یعنی جو شخص  
 کسی نیکی پر کسی کو آمادہ کرے اس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا اس نیک عمل کرنے والے کو۔  
 اسی طرح ابن ماجہ کی ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے فرمایا:

”یعنی جس شخص نے کسی مسلمان کے قتل میں  
 ایک کلمہ سے بھی مدد کی تو وہ قیامت میں  
 حق تعالیٰ کی پیشی میں اس طرح لایا جائیگا  
 کہ اس کی پیشانی پر یہ لکھا ہوگا کہ یہ شخص اللہ  
 تعالیٰ کی رحمت کے محروم دیا یوس ہے“

**مَنْ أَعَانَ عَلَى قَتْلِ مُؤْمِنٍ بِشَطْرٍ  
 كَلِمَةٍ لَقِيَ اللَّهَ مَكْشُوبٌ بَيْنَ  
 عَيْنَيْهِ أَيْسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ**  
 (مظہری)

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نیکی پر کسی کو آمادہ کرنا نیک عمل اور برابر کا ثواب رکھتا ہے  
 اسی طرح بدی اور گناہ پر کسی کو آمادہ کرنا یا سہارا دینا بھی برابر کا گناہ ہے۔  
 آخر آیت میں ارشاد فرمایا: **وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا**، لفظ مقیت کے  
 معنی لغت کے اعتبار سے قادر و مقتدر کے بھی ہیں، اور حاضر و نگران کے بھی، اور روزی  
 تقسیم کرنے والے کے بھی، اور اس جملہ میں تینوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، پہلے معنی کے اعتبار  
 سے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، عمل کرنے والے اور سفارش کر میوالے  
 کی جزا یا سزا اس کے لئے دشوار نہیں۔

اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران و حاضر ہے  
 اس کو سب معلوم ہے کہ کون کس نیت سے سفارش کر رہا ہے، محض بوجہ اللہ کسی صحابی  
 کی امداد کرنا مقصود ہے یا کوئی اپنی غرض بطور رشوت کے اس سے حاصل کرنا ہے۔



اور تیسرے معنی کے اعتبار سے مطلب یہ ہوگا کہ رزق و روزی کی تقسیم کا تو اللہ تعالیٰ خود متکفل ہے، جتنا کسی کے لئے لکھ دیا ہے ۱۰ اس کو مل کر رہے گا، کسی کی سفارش کرنے سے وہ مجبور نہیں ہو جائے گا، بلکہ جسکو جتنی چاہے روزی عطا فرمائے گا، البتہ سفارش کرنے والے کو مفت میں ثواب مل جاتا ہے، کہ وہ ایک کمزور کی اعانت ہے۔

حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

كَانَ اللَّهُ فِي عَوْنِ عَبْدِهِ مَا	”یعنی اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بند
دَامَ فِي عَوْنِ أَخِيهِ	کی امداد میں لگا رہتا ہے جب تک وہ اپنے
	کسی مسلمان بھائی کی امداد میں لگا رہے۔“

اسی بناء پر صحیح بخاری کی ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اشْفَعُوا قُلُوبُكُمْ جُرُودًا وَلَيَقْضِيَ اللَّهُ	”یعنی تم سفارش کیا کرو تمہیں ثواب
عَلَى لِسَانِ نَبِيِّهِ مَا شَاءَ	ملے گا، پھر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے ذریعہ
	جو فیصلہ فرمائیں اس پر راضی رہو۔“

اس حدیث میں جہاں سفارش کا موجب ثواب ہونا بیان فرمایا ہے وہیں یہ بھی بتلایا کہ سفارش کی حد یہی ہے کہ کمزور آدمی جو خود اپنی بات کسی بڑے تک پہنچانے اور اپنی حاجت صحیح طور پر بیان کرنے پر قادر نہ ہو، تم اس کی بات وہاں تک پہنچا دو آگے وہ سفارش مانی جائے یا نہ مانی جائے، اور اس شخص کا مطلوبہ کام پورا ہو یا نہ ہو، اس میں آپ کا کوئی دخل نہ ہونا چاہیئے اور اس کے خلاف ہونے کی صورت میں آپ پر کوئی ناگواری نہ ہونی چاہیئے، حدیث کے آخری جملہ میں لفظ علی لسان نبیہ ما شاء کا یہی مطلب ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرف اشارہ موجود ہے، کہ سفارش کا ثواب یا عذاب اس پر موقوف نہیں کہ وہ سفارش کا میاب ہو، بلکہ اس ثواب و عذاب کا تعلق مطلق سفارش کر دینے سے ہے، آپ نے شفاعت حسنہ کر دی تو ثواب کے مستحق ہو گئے، اور شفاعت سیئہ کر دی تو عذاب کے مستوجب بن گئے، خواہ آپ کی سفارش پر عمل ہو یا نہ ہو۔

تفسیر بحر محیط اور بیان القرآن وغیرہ میں مَنْ يَشْفَعُ میں لفظ مَنْ مَّا کو سبب قرار دے کر اس کی طرف اشارہ بتلایا ہے، اور تفسیر مظہری میں امام تفسیر مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ سفارش کرنے والے کو سفارش کا ثواب ملے گا، اگرچہ اس کی سفارش قبول نہ کی گئی ہو، اور یہ بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی دوسرے انسان کے پاس جو سفارش کی جائے، اس کا بھی یہی اصول ہونا چاہیئے، کہ سفارش کر کے آدمی فارغ



ہو جائے اس کے قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جیسا کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی آزاد کردہ کنیز سے یہ سفارش فرمائی کہ اس نے جو اپنے شوہر مغیث سے طلاق حاصل کر لی ہے اور وہ اس کی محبت میں پریشان پھرتے ہیں دوبارہ انہی سے نکاح کر لے، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اگر یہ آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر اور اگر سفارش ہے تو میری طبیعت اس پر بالکل آمادہ نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم نہیں سفارش ہی ہے، بریرہؓ جانتی تھیں کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافت اصول کوئی ناگواری نہ ہوگی، اس لئے صاف عرض کر دیا کہ تو پھر میں یہ سفارش قبول نہیں کرتی، آپؐ نے خوش دلی کے ساتھ ان کو ان کے حال پر رہنے دیا۔

یہ تھی حقیقت سفارش کی جو شرعاً باعث اجر و ثواب تھی، آجکل لوگوں نے جو اس کا ٹھلیہ بگاڑا ہے وہ درحقیقت سفارش نہیں ہوتی، بلکہ تعلقات یا وجاہت کا اثر اور دباؤ ڈالنا ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر ان کی سفارش نہ مانی جائے تو ناراض ہوتے ہیں، بلکہ دشمنی پر آمادہ ہو جاتے ہیں، حالانکہ کسی ایسے شخص پر ایسا دباؤ ڈالنا کہ وہ ضمیر اور مرضی کے خلاف کرنے پر مجبور ہو جائے، اکراہ و اجبار میں داخل اور سخت گناہ ہے، اور ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی کے مال یا کہسی کے حق پر زبردستی قبضہ کر لے، وہ شخص شرعاً اور قانوناً آزاد و مختار تھا، آپؐ نے اس کو مجبور کر کے اس کی آزادی سلب کر لی، اس کی مثال تو ایسی ہوگی کہ کسی محتاج کی حاجت پوری کرنے کے لئے کسی دوسرے کا مال چھرا کر اس کو دیدیا جائے۔

سفارش پر کچھ معاوضہ لینا جس سفارش پر کوئی معاوضہ لیا جائے وہ رشوت ہے، حدیث میں اس رشوت اور حرام ہے کو سخت و حرام فرمایا ہے، اس میں ہر طرح کی رشوت داخل ہے خواہ وہ مالی ہو یا یہ کہ اس کا کام کرنے کے عوض اپنا کوئی کام اس سے لیا جائے۔

تفسیر کشاف وغیرہ میں ہے کہ شفاعت حسنہ وہ ہے جس کا منشأ کسی مسلمان کے حق کو پورا کرنا ہو، یا اس کو کوئی جائز نفع پہونچانا یا مصرت اور نقصان سے بچانا ہو، اور یہ سفارش کا کام بھی کسی دنیوی جوڑ توڑ کے لئے نہ ہو، بلکہ محض اللہ کے لئے کمزور کی رعایت مقصود ہو، اور اس سفارش پر کوئی رشوت مالی یا جانی نہ لی جائے، اور یہ سفارش کسی ناجائز کام میں بھی نہ ہو، نیز یہ سفارش کسی ایسے ثابت شدہ جرم کی معافی کے لئے نہ ہو جن کی سزا قرآن میں معین و معتبر ہے۔

تفسیر بحر تحیط اور منظر کسی وغیرہ میں ہے کہ کسی مسلمان کی حاجت روائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا بھی شفاعت حسنہ میں داخل ہے، اور دعا کرنے والے کو بھی جبر



ملتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی مسلمان کے لئے کوئی دعا خیر کرتا ہے، فرشتہ کہتا ہے ”وَلَا تُخْشَىٰ بَعْثُی“ یعنی اللہ تعالیٰ تیری بھی حاجت پوری فرمائیں۔

## سلام اور اسلام

وَإِذَا أَخْبَبْتُمْ بِبَحْيَةِ فَخَيُّوْا بِأَحْسَنِ مِمَّا دَخَلْتُمْ فِيهِ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سلام

اور اس کے جواب کے آداب بتلائے ہیں:

لفظ تحیہ کی تشریح اور تحیہ کے لفظی معنی میں کسی کو ”حَيَّاكَ اللہ“ کہنا، یعنی اللہ تم کو زندہ رکھے اس کا تاریخی پہلو

قبل از اسلام عرب کی عادت تھی کہ جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو ”حیاک اللہ“ یا ”نعم اللہ بک عیناً“ یا ”انعم حباًحاً وغیرہ الفاظ سے سلام کیا کرتے تھے، اسلام نے اس طرز تحیہ کو بدل کر اکسلا م علیکم کہنے کا طریقہ جاری کیا، جس کے معنی ہیں ”تم ہر تکلیف اور رنج و مصیبت سے سلامت رہو“

ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں سے ہے، اور ”السلام علیکم“ کے معنی یہ ہیں کہ ”اللہ رقیباً علیکم“ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا محافظ ہے۔

اسلامی سلام تمام دوسری دنیا کی ہر مہذب قوم میں اس کا رواج ہے کہ جب آپس میں ملاقات اقوام کے سلام سے بہتر ہے | کریں تو کوئی کلمہ آپس کی موانست اور اظہار محبت کے لئے کہیں لیکن موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی سلام جتنا جامع ہے کوئی دوسرا ایسا جامع نہیں، کیونکہ اس میں صرف اظہار محبت ہی نہیں، بلکہ ساتھ ساتھ ادائے حق محبت بھی ہے، کہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ آپ کو تمام آفات اور آلام سے سلامت رکھیں پھر دعا بھی عرب کے طرز پر صرف زندہ رہنے کی نہیں، بلکہ حیات طیبہ کی دعا ہے، یعنی تمام آفات اور آلام سے محفوظ رہنے کی، اسی کے ساتھ اس کا بھی اظہار ہے کہ ہم اور تم سب اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، ایک دوسرے کو کوئی نفع بغیر اس کے اذن کے نہیں پہونچا سکتا، اس معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ ایک عبادت بھی ہے، اور اپنے بھائی مسلمان کو خدا تعالیٰ کی یاد دلانے کا ذریعہ بھی۔

اسی کے ساتھ اگر یہ دیکھا جائے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ ہمارے ساتھ کو تمام آفات اور تکالیف سے محفوظ فرمادے تو اس کے منہ میں وہ گویا یہ وعدہ بھی کر رہا ہے کہ تم میرے ہاتھ اور زبان سے مامون ہو، تمہاری جان، مال، آبرو



کا میں محافظ ہوں۔

ابن عربیؒ نے احکام ہستراں میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

أَتَذَرِي مَا السَّلَامُ؟ يَقُولُ أَتَا  
آمِنْ قَتْنِي  
یعنی تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟  
سلام کرنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے  
مؤمن رہو

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحیہ ایک عالمگیر جامعیت رکھتا ہے، (۱) اس میں اللہ تعالیٰ کا بھی ذکر ہے (۲) تذکیر بھی (۳) اپنے بھائی مسلمان سے اظہار تعلق و محبت بھی، (۴) اس کے لئے بہترین دعا بھی (۵) اور اس سے یہ معاہدہ بھی کہ میرے ہاتھ اور زبان سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد وارد ہے:

الْمُسْلِمُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ  
مَنْ لِسَانُهُ وَفِيهِ  
یعنی مسلمان تو وہی ہے جس کے ہاتھ  
اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں،  
کسی کو تکلیف نہ پہنچے (الحديث)

کاش مسلمان اس کلمہ کو عام لوگوں کی رسم کی طرح ادا نہ کرے، بلکہ اس کی حقیقت کو سمجھ کر اختیار کرے، تو شاید پوری قوم کی اصلاح کے لئے یہی کافی ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے باہم سلام کو رواج دینے کی بڑی تاکید فرمائی، اور اس کو افضل الاعمال قرار دیا، اور اس کے فضائل و برکات اور اجر و ثواب بیان فرمائے، صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک  
مومن نہ ہو، اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں  
ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ  
اگر تم اس پر عمل کرو تو تمہارے آپس میں محبت قائم ہو جائیگی،  
وہ یہ کہ آپس میں سلام کو عام کرو، یعنی ہر مسلمان کے لئے خواہ  
اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو“

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کے اعمال میں سب سے افضل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں



کو کھانا کھلا دو، اور سلام کو عام کرو خواہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو (صحیحین)  
مسند حسد، ترمذی، ابو داؤد نے حضرت ابوامامہ رضی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو سلام کرنے  
میں ابتداء کرے۔

مسند بزار اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ہے کہ رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر  
اتارا ہے، اس لئے تم آپس میں سلام کو عام کرو، کیونکہ مسلمان آدمی جب کسی مجلس میں جاتا  
ہے اور ان کو سلام کرتا ہے تو اس شخص کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک فضیلت کا ایک بلند مقام حاصل  
ہوتا ہے، کیونکہ اس نے سب کو سلام، یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اگر مجلس والوں نے اس  
کے سلام کا جواب نہ دیا تو ایسے لوگ اس کو جواب دیں گے جو اس مجلس والوں سے بہتر ہیں  
یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے۔

اور ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بڑا بخیل وہ آدمی  
ہے جو سلام میں بخل کرے (طبرانی، معجم کبیر عن ابی ہریرہ رضی)  
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا صحابہ کرامؓ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ  
اس روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اکثر بازار میں صرف اس لئے جایا کرتے  
تھے کہ جو مسلمان ملے اس کو سلام کر کے عبادت کا ثواب حاصل کریں، کچھ خریدنا یا فروخت  
کرنا مقصود نہ ہوتا تھا، یہ روایت مؤطا، امام مالک میں طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ  
سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید کی جو آیت اوپر ذکر کی گئی ہے اس میں ارشاد یہ ہے کہ جب تمہیں  
سلام کیا جائے تو اس کا جواب اس سے بہتر الفاظ میں دو، یا کم از کم ویسے ہی الفاظ کہو  
اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس طرح فرمائی کہ ایک مرتبہ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا "السلام علیک رسول اللہ"  
آپ نے جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" پھر ایک صاحب  
آئے اور انھوں نے سلام میں یہ الفاظ کہے "السلام علیک یا رسول اللہ ورحمۃ اللہ" آپ نے  
جواب میں ایک کلمہ بڑھا کر فرمایا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" پھر ایک صاحب آئے انھوں نے اپنے سلام ہی میں تینوں  
کلمے بڑھا کر کہا "السلام علیک رسول اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" آپ نے جواب میں صرف ایک کلمہ "وعلیک" ارشاد  
فرمایا، ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی، اور عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ



آپ پرستربان پہلے جو حضرات آئے آپ نے ان کے جواب میں کئی کلمات دعاء کے ارشاد فرمائے، اور میں نے ان سب الفاظ سے سلام کیا تو آپ نے ”وعلیکم“ پر اکتفا فرمایا، آپ نے فرمایا کہ تم نے ہمارے لئے کوئی کلمہ چھوڑا ہی نہیں کہ ہم جواب میں اضافہ کرتے، تم نے سارے کلمات اپنے سلام ہی میں جمع کر دیئے، اس لئے ہم نے قرآنی تعلیم کے مطابق تمہارے سلام کا جواب بالمثل دینے پر اکتفا کر لیا، اس روایت کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختلف اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حدیث مذکور سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ سلام کا جواب اس سے لچھے الفاظ میں دینے کا جو حکم آیت مذکورہ میں آیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ سلام کرنے والے کے الفاظ سے بڑھا کر جواب دیا جائے، مثلاً اس نے کہا ”السلام علیکم“ تو آپ جواب دیں ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ“ اور اس نے کہا ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ تو آپ جواب میں کہیں ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ یہ کلمات کی زیادتی صرف تین کلمات تک مسنون ہے اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں، اور حکمت اس کی ظاہر ہے کہ سلام کا موقع مختصر کلام کرنے کا مقتضی ہے، اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں ہے جو کسی کام میں مغل یا سننے والے پر بھاری ہو جائے، اسی لئے جب ایک صاحب نے اپنے ابتدائی سلام ہی میں تینوں کلمے جمع کر دیئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگے اور زیادتی سے احتراز فرمایا، اس کی مزید توضیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس طرح فرمائی کہ مذکورہ تینوں سے زیادہ کرنے والے کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: **إِنَّ السَّلَامَ قَدْ أَتَتْهُ إِلَى الْبَرَكَةِ** (منظری عن البغوی) یعنی سلام لفظ برکت پر ختم ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ کرنا مسنون نہیں ہے۔ (و مثلاً عن ابن کثیر)

تیسری بات حدیث مذکور سے یہ معلوم ہوئی کہ سلام میں تین کلمے کہنے والے کے جواب میں اگر صرف ایک کلمہ ہی کہہ دیا جائے تو وہ بھی اوار بالمثل کے حکم میں حکم قرآنی **أَوْسَدُ دُؤْهًا** کی تعمیل کے لئے کافی ہے، جیسا کہ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک کلمہ پر اکتفا فرمایا ہے (تفسیر مظہری)

مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب کسی مسلمان کو سلام کیا جائے تو اس کے ذمہ جواب دینا تو واجب ہے، اگر بغیر کسی عذر شرعی کے جواب نہ دیا تو گناہگار ہوگا، البتہ جواب دینے میں دو باتوں کا اختیار ہے، ایک یہ کہ جن الفاظ سے سلام کیا گیا ہے ان سے



بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے، دوسرے یہ کہ لعینہ انہی الفاظ سے جواب دیدیا جائے۔

اس آیت میں سلام کا جواب دینے کو تو لازم واجب صراحۃً بتلادیا گیا ہے، لیکن ابتداءً سلام کرنے کا کیا درجہ ہے، اس کا بیان صراحۃً نہیں ہے، مگر اِذَا احْبَبْتُمْ میں اس کے حکم کی طرف بھی اشارہ موجود ہے، کیونکہ اس لفظ کو بضم بھول بغیر تعین فاعل ذکر کرنے میں اشارہ ہو سکتا ہے کہ سلام ایسی چیز ہے جو عادتاً سب ہی مسلمان کرتے ہیں۔

مسند احمد، ترمذی، ابو داؤد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب وہ شخص ہے جو سلام کی ابتداء کرے۔

اور سلام کی تاکید اور فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ابھی آپ سن چکے ہیں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً سلام کرنا بھی سنت مؤکدہ سے کم نہیں تفسیر بحر محیط میں ہے کہ ابتدائی سلام تو اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا اَلْسَّلَامُ تَطَوُّعٌ وَالرُّدُ خَيْرٌ رِّصَّةً، یعنی ابتداءً سلام کرنے میں تو اختیار ہے لیکن سلام کا جواب دینا فرض ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم شرعی کی مزید تشریح کے طور پر سلام اور جواب سلام کے متعلق اور بھی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں، وہ بھی مختصر طور پر ملاحظہ فرمائیے صحیحین کی حدیث میں ہے کہ جو شخص سواری پر ہو اس کو چاہئے کہ پیادہ چلنے والے کو خود سلام کرے، اور جو چل رہا ہو وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، اور جو لوگ تعداد میں قلیل ہوں کسی بڑی جماعت پر گزریں تو ان کو چاہئے کہ سلام کی ابتداء کریں۔

ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی اپنے گھر میں جائے تو اپنے گھر والوں کو سلام کرنا چاہئے کہ اس سے اس کے لئے بھی برکت ہوگی، اور اس کے گھر والوں کیلئے بھی ابو داؤد کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان سے بار بار ملاقات ہو تو ہر مرتبہ سلام کرنا چاہئے، اور جس طرح اول ملاقات کے وقت سلام کرنا مسنون ہے اسی طرح رخصت کے وقت بھی سلام کرنا مسنون اور ثواب ہے، ترمذی، ابو داؤد میں یہ حکم ہر دو ائقائدہ والو ہریرہ رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے۔

اور یہ حکم جواب بھی بیان کیا گیا ہے کہ سلام کا جواب دینا واجب ہے، اس سے چند حالات مستثنیٰ ہیں، جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسد نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے، یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے



یا انسانی ضروریات استیجا، وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں، اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں۔

اختتام مضمون پر فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ حَيِّبًا** یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والے ہیں، جن میں انسان اور اسلامی حقوق مثل سلام اور جواب سلام کے سب امور داخل ہیں، ان کا بھی اللہ تعالیٰ حساب لیں گے۔

پھر فرمایا **لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لِيَجْزِيَ كُفْرًا إِلَى يَوْمِ الْبَيْتَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ** یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اسی کو معبود جانو اور جو کام کر اس کی عبادت کی نیت کرو، وہ تم کو قیامت کے روز جمع فرمائیں گے، جس میں کوئی شک نہیں ہے، اس روز سب کے بدلے عنایت فرمائیں گے، قیامت کا وعدہ اور جزاء و سزا کی خبر سب حق ہے۔ **وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّخَذَ إِلَهًا هُوَ لَا يُنْفَعُ مِنْ شَيْءٍ** کیونکہ اللہ کی دی ہوئی خبر ہے اور اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے؟

**فَمَا لَكُمْ فِي السُّفٰقِيْنَ فِتْنٰتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُم بِمَا**

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فتنے ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو الٹ دیا بسبب

**كَسْبُوْا اَوْ تَرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْتَدُوْا** اور **مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ طَوْفًا**

ان کے اعمال کے کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر لاؤ جس کو گمراہ کیا اللہ نے اور جس کو گمراہ

**يُضِلُّ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيْلًا** ۸۸ **وَدُّوا لَوْ تُكْفُرُوْنَ**

کرے اللہ ہرگز نہ پاوے گا تو اس کے لئے کوئی راہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ

**كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءٍ فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَاءَ**

جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ

**حَتّٰى يَهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** ۸۹ **فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاْخُذُوْهُمْ**

یہاں تک کہ وطن چھوڑ آئیں اللہ کی راہ میں پھر اگر اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو

**وَاَقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وُجِدُوْهُمْ** ۹۰ **وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ**

اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو

**وَلِيّٰوَلَا نَصِيْرًا** ۹۱ **اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ**

دوست اور نہ مددگار مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں



وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ أَوْجَاءٌ وَكُمُ حَصْرَتْ صُدُورُهُمْ أَنْ

اور ان میں عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ تنگ ہو گئے ہیں دل ان کے تمہاری

يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ط وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ

لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے بھی اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور

عَلَيْكُمْ فَلَقَتَلُوكُمْ فَإِنْ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَالْقَوْلُ

دیدنیا تو ضرور لڑتے تم سے سو اگر یک سو رہیں وہ تم سے پھر تم سے نہ لڑیں اور پیش کریں

إِلَيْكُمْ السَّلَامَ ۖ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ۙ ۙ

تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ

سَتَجِدُونَ الْآخَرِينَ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا

اب تم دیکھو گئے ایک اور قوم کو جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی

قَوْمَهُمْ ط كَمَا رَدُّوْا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا فَإِنْ

قوم سے بھی جب کسی لڑائی جاتے ہیں وہ فساد کی طرت تو اس کی طرت ٹوٹ جاتے ہیں پھر اگر

لَمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوا إِلَيْكُمْ السَّلَامَ وَيَكْفُوا إِلَيْنَ يَهُمْ

وہ تم سے یک سو نہ رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور اپنے ہاتھ نہ روکیں

فَتَحَذَرُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ط وَأُولَئِكَ

تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ اور ان پر

جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا مُبِينًا ۙ ۙ

ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند

۹۱

## خلاصہ تفسیر

تین مختلف گروہوں کا بیان اور ان کے احکام

پہلے فرقہ کا بیان (جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم راخلاف رائے کر کے (دو گروہ ہو گئے) کہ ایک گروہ ان کو اب بھی مسلمان



کہنا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) الٹا پھیر دیا ان کے (بد) عمل کے سبب (وہ بد عمل ارتداد) دارالاسلام کو باوجود قدرت کے چھوڑ دینا ہے، جو کہ اس وقت مثل ترک اقرار بالاسلام کے علامت کفر کی تھی اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہ ہوئے تھے، اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا، کیا تم لوگ اسے وہ گروہ جن کو اس ترک دارالاسلام کا علامت کفر ہونا معلوم نہیں) اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کر دینا جو اللہ تعالیٰ نے (جب کہ ان لوگوں نے مگر اسی خستہ یار کی) مگر اسی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مؤمن گمراہ کو جو ہدایت یافتہ مؤمن کہتے ہو یہ تمھارے لئے جائز نہیں) اور جس کو اللہ تعالیٰ مگر اسی میں ڈال دیں اس کے (مؤمن ہونے کے) لئے کوئی سبیل نہ پاؤ گے (پس ان لوگوں کو مؤمن نہ کہنا چاہئے اور بھلا وہ خود کیا مؤمن ہوں گے ان کے غلو فی الکفر کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدا نہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ سو ان کی جب یہ حالت ہے تو ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی کے جواز کے لئے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیل اسلام کے لئے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا وہ حکم تھا جو آب اقرار بالشہادتین کا ہے، اور تکمیل اسلام کی قید اس لئے ہے کہ خالی دارالاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہل تجارت بھی آجاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آویں، یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ جامع اقرار و ہجرت کے ہو جاویں، اور یہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہو سکتا ہو، مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو پاؤ (یہ پکڑنا یا تو قتل کے لئے ہے یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن میں دوستی نہ خوف میں استعانت بلکہ الگ تھلگ رہو)۔

دوسرے فرقہ کا بیان | مگر ان کفار میں جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمھارے ساتھ مصالحت رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ بواسطہ صلح ہو یعنی ایسے لوگوں سے جاملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہو جاتے ہیں) کہ تمھارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے، جیسے بنو مدلج، کہ ان سے صلح ہوئی تو ان کے ہم عہد بھی اس استثناء میں آگئے تو بنو مدلج



بدرجہ اولیٰ مستثنیٰ ہوئے) یا دوسرا طریق یہ ہے کہ بلا واسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ (خود تمھارے پاس اس حالت سے آویں کہ ان کا دل تمھارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منعقبض ہو) اس لئے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمھارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، پس دونوں طریقوں میں جس طریق سے کوئی مصالحت رکھے وہ حکم مذکور پھڑنے اور قتل سے مستثنیٰ ہیں، اور تم ان لوگوں کی درخواست صلح میں اللہ تعالیٰ کا احسان مانو کہ ان کے دل میں تمھاری ہیبت ڈال دی (وہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط (اور دلیہ) کر دیتا پھر وہ تم سے لڑنے لگتے (مگر خدا تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچالیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے معاملہ سلامت دی کا رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کسی لفظ تاکید کے لئے فرمادیئے) تو (اس حالت صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اجازت نہیں دی)۔

میسر فرقہ کا بیان | لفظ ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہوگی)

کہ (براہ دھوکہ) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (اور ساتھ ہی اس کے) جب کہیں ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے) شرارت (دفساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں سے لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر (صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمھاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں، اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمھارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا مطلب مثل سابق کے ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پھڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے ان کا قتل کرنا ظاہر ہے) اور وہ حجت ان کا نقص عہد ہے

## معارف و مسائل

مذکورہ آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے جن کے متعلق دو حکم مذکور ہیں، واقعاً ان فرقوں کے مندرجہ روایات سے واضح ہوں گے۔

پہلی روایت: عبد بن حمید نے مجاہد سے روایت کیا کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے، اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے، اور



حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسباب تجارت لانے کا بہانہ کر کے پھر کمرہ چل دیئے اور پھر نہ آئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے کہا یہ مؤمن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا آیت **فَمَا لَكُمْ فِي الْأَمْرِ بِغَيْرِ شَيْءٍ** میں بیان کر دیا اور ان کے قتل کا حکم دیا۔

حضرت حکیم الامتہ تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کا منافع کہنا باہین معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے دل سے ایمان نہ لاتے تھے، اور منافقین کو قتل نہ کئے جاتے تھے لیکن جب ہی تک کہ اپنا کفر چھپاتے تھے، اور ان لوگوں کا ارتداد ظاہر ہو گیا تھا اور جنہوں نے مسلمان کہا شاید حسن ظن کی وجہ سے کہا ہو، اور ان کے دلائل ارتداد میں کچھ تاویل کر لی ہوگی، اور اس تاویل کی بنیاد رائے محض ہوگی جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہوگی اس لئے معتبر نہیں رکھی گئی۔

**دوسری روایت:** ابن ابی شیبہؒ نے حسنؒ سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالکؓ نے بعد واقعہ بدر واحد کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں آکر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپؐ نے حضرت خالدؓ کو تکمیل صلح کے لئے وہاں بھیج دیا، مضمون صلح یہ تھا:

”ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے، اور تشریش مسلمان ہو جائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے، اور جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں۔“

اس پر یہ آیت **وَذَٰلَکُمْ نَصْرُکُمْ اِلٰی قَوْلِ الْاٰلِیْنَ یَصْلُوْنَ** انا نازل ہوئی۔

**تیسری روایت:** حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا گیا کہ آیہ **سَتَجِدُنَ الْاٰخِرِیْنَ اِلٰہِیْنَ** میں جن کا ذکر ہے مراد ان سے قبیلہ اسد اور غطفان ہیں، کہ مدینہ میں آئے اور ظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے کہتے کہ ہم تو بندہ اور عقرب (بچھو) پر ایمان لاتے ہیں، اور مسلمانوں سے کہتے کہ ہم تمہارے دین پر ہیں۔

اور ضحاکؒ نے ابن عباسؓ سے یہی حالت بنی عبد الدار کی نقل کی ہے، پہلی اور دوسری روایت روح المعانی اور تیسری معالم میں ہے۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اس تیسری روایت والوں کی حالت مثل پہلی روایت والوں کے ہوئی، کہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہو گیا، اسی لئے ان کا حکم مثل عام کفار کے ہے، یعنی مصالحت کی حالت میں ان سے قتال نہ کیا جائے



اور مصالحت نہ ہونے کی صورت میں قتال کیا جائے، چنانچہ پہلی روایت والوں کے باب میں دوسری آیت یعنی فَإِنْ تَوَلَّوْا فَعَنْهُمْ وَارْكُزْهُمْ میں گرفتار کرنے اور قتل کا حکم اور تیسری آیت إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَيْكُمْ میں مصالحت میں ان کا استثناء موجود ہے جن کی مصالحت کا ذکر دوسری روایت میں ہے، اور تاکید استثناء کے لئے پھر فَإِنْ ارْكُزْهُمْ كَيْدٌ کی تصریح کر دی۔

اور تیسری روایت والوں کے باب میں چوتھی آیت یعنی مَسْجِدُ قَوْمٍ أَخْرِجُوا مِنْهُ میں بیان فرمادیا کہ اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش نہیں ہوتے بلکہ مقابلہ کرتے ہیں تو تم ان سے جہاد کرو، اس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر وہ صلح کریں تو ان سے قتال نہ کیا جائے۔  
(بیان القرآن)

خلاصہ یہ کہ یہاں تین فرقوں کا ذکر فرمایا گیا:

- ۱۔ جو ہجرت کہ شرط اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، یا کرنے کے بعد دارالاسلام سے نکل کر دارالحرب میں چلے جائیں۔
- ۲۔ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کر لیں، یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کر لیں۔

- ۳۔ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کر لیں، اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہو جائیں، اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں۔

پہلے فریق کا حکم عام کفار کی مانند ہے، دوسرا فریق قتل اور بکڑ دھکڑے مستثنیٰ ہے، تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان آیتوں کے کُل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدم صلح کے وقت قتال، اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

**ہجرت کی مختلف صورتیں اور احکام** | قوله تعالى حتى يهاجروا في سبيل الله ابتداء اسلام میں ہجرت دارالکفر سے تمام مسلمانوں پر فرض تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ کرنے سے منع کیا ہے، جو اس فرض کے تارک ہوں، پھر جب مکہ فتح ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، لَا هُجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ رواہ البخاری، یعنی جب مکہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا تو اب وہاں سے ہجرت فرض نہ رہی، یہ اس زمانہ کا حکم ہے جبکہ ہجرت شرط ایمان تھی اس آدمی کو مسلمان نہیں سمجھا جاتا تھا جو باوجود

۵۔ ہجرت سے متعلقہ بحث کے لئے تفسیر آیت نمبر ۱۱۱ سورہ نساء دیکھئے۔



قدرت کے ہجرت نہ کرے، لیکن بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا، اب یہ صورت باقی نہیں رہی۔  
ہجرت کی دوسری صورت یہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گی جس کے بارے میں حدیث  
میں آتا ہے لَا تَقْطَعُ الْهَجْرَةَ حَتَّى تَقْطَعَ التَّوْبَةَ : یعنی ہجرت اس وقت تک باقی رہے گی  
جب تک توبہ کی قبولیت کا وقت باقی رہے : (صحیح بخاری)

علامہ عینی شارح بخاری نے اس ہجرت کے متعلق لکھا ہے : أَنَّ الْمُرَادَ بِالْهَجْرِ  
الْبَاقِيَةِ هِيَ هَجْرُ التَّيَسَّاتِ : یعنی اس ہجرت سے مراد گناہوں کا ترک کرنا ہے : جیسا کہ  
ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں : الْمُسَاجِرُ مَنْ هَجَرَ  
مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ : یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں سے پرہیز کرے جن کو  
اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے : (بحوالہ مرقاة جلد اول)

مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں ہجرت کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے :  
(۱) دین کے لئے ترک وطن کرنا، جیسا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنا وطن مکہ ترک  
کر کے مدینہ اور حبشہ تشریف لے گئے۔ (۲) گناہوں کا چھوڑنا۔

وَلَا تَنْجِزُوا مِنْكُمْ وَلِيًّا وَلَا قَصِيْرًا : اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے طلب  
نصرت حرام ہے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ کفار کے خلاف انصار نے جب یہود  
سے مدد طلب کرنے کی اجازت آپ سے چاہی تو آپ نے فرمایا : اَلْجَيْشُ لَا حَاجَةَ لَنَا  
بِهِمْ : یعنی یہ جیٹ قوم ہے اس کی ہمیں کوئی حاجت نہیں : (منظری جلد ۲)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَاً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيرُ

اور مسلمان کا کہ نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرے

رَقَبَةً مُؤْمِنَةً رَدِيَّةً مُسْلِمَةً إِلَى أَهْلِهَا إِلَّا أَنْ يَصَدَّقَ

گردن ایک مسلمان کی اور خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں،

فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ

پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن

مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ

ایک مسلمان کی اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے،

فَدِيَّةٌ مُسْلِمَةٌ إِلَى أَهْلِهَا وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ

تو خوں بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی



فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ

پھر جسکو میسر نہ ہو تو دو روزے رکھے دو مہینے کے برابر گناہ بخشتوانے کو

اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۙ ۙ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّعْتَمِلًا

اللہ سے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر

فَجَزَاءُ وَهُوَ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ

تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا ہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت

وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ۙ ۙ

کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب

## خلاصہ تفسیر

اور کسی مؤمن کی شان نہیں کہ وہ کسی مؤمن کو (ابتداءً) قتل کرے لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے تو اس پر (شرعاً)

ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے اور خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس

(مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں بقدر حصص میراث) حوالہ کر دی

جائے اور جس کے کوئی وارث نہ ہو تو بیت المال قائم مقام ورثہ کے ہے) مگر یہ کہ وہ

لوگ (اس خوں بہا کو) معاف کر دیں (خواہ نکل یا بعض اتنی ہی معاف ہو جاوے گی)

اور اگر وہ (مقتول خطا) ایسی قوم سے ہو جو تمھارے مخالف ہیں (یعنی حربی ہیں اور انہی میں

کسی وجہ سے رہتا تھا) اور وہ شخص خود مؤمن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا

آزاد کرنا پڑے گا، اور دیت اس لئے نہیں کہ اگر ورثہ اس مقتول کے مسلمان ہیں تب تو

وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہ ہونے کے باعث مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس

صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی، اور دارالحرکے دارالاسلام کے بیت المال

میں ترکہ لایا نہیں جاتا، اور اگر وہ (مقتول خطا) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں

معاہدہ (صلح یا ذمہ کا) ہو (یعنی ذمی یا مصالح و مستامن ہو) تو خوں بہا (بھی واجب) ہے

جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کر دی جاوے،

کیونکہ کافر کافر کا وارث ہوتا ہے، اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا)



پھر (جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنے دام ہوں کہ خرید سکے) تو اس کے ذمہ بجائے اس آزاد کرنے کے، متواتر (یعنی لگاتار) دو ماہ کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ مشروع ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (اپنے علم و حکمت سے مصلحت کے مناسب احکام مقرر فرماتے ہیں، گو ہر جگہ حکمت بندہ کو معلوم نہ ہو) اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہتا رہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی، بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے، اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزا دوزخ) کا سامان کریں گے۔

## معارف و مسائل

**رَبِطُ آیَاتِ** | اوپر سے قتل و قتال کا ذکر چلا آ رہا ہے، اور کل صورتیں ابتداءً قتل کی آٹھ ہیں، کیونکہ مقتول چار حال سے خالی نہیں ہے، یا مؤمن ہے یا ذمی، یا مصالح و مستامن ہے یا حربی ہے، اور قتل دو طرح کا ہے یا عمدہ یا خطا، پس اس اعتبار سے کل صورتیں قتل کی آٹھ ہوتیں، اول مؤمن کا قتل عمدہ، دوم مؤمن کا قتل خطا، سوم ذمی کا قتل عمدہ، چہارم ذمی کا قتل خطا، پنجم مصالح کا قتل عمدہ، ششم مصالح کا قتل خطا، ہفتم حربی کا قتل عمدہ، ہشتم حربی کا قتل خطا۔

ان صورتوں میں بعض کا حکم تو اوپر معلوم ہو چکا، بعض کا آگے مذکور ہے، اور بعض کا حدیث میں موجود ہے، چنانچہ صورت اولیٰ کا حکم دنیوی یعنی وجوب قصاص سورۃ بقرہ میں مذکور ہے اور حکم اخروی آگے آیت وَمَنْ يَفْتُلْ میں آتا ہے، اور صورت دوم کا بیان قول اللہ تعالیٰ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ (القولہ) وَهُوَ مُؤْمِنٌ أَنْ يُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ میں آتا ہے، اور صورت سوم کا حکم حدیث دارقطنی میں ہے کہ ذمی کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان سے قصاص لیا (آخر جہ الزلیعی فی تخریج الہدایہ) صورت چہارم کا ذکر قول اللہ تعالیٰ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ مُبْغَضٍ وَبَيْنَهُمْ مِثْقَاطٌ مِنْ آتَانَا ہے، صورت پنجم کا ذکر اوپر کے رکوع قول اللہ تعالیٰ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا میں آچکا ہے،



صورت ہشتم کا حکم صورت چہارم کے ساتھ ہی مذکور ہے، کیونکہ میثاق عام ہے جو وقتی اور دائمی دونوں کو شامل ہے، پس وقتی و مستامن دونوں آگئے، درمختار کی کتاب الہیات کے شروع میں مستامن کی دیت کے وجوب کی تصحیح کی ہے، صورت ہفتم و ہشتم کا حکم خود جہاد کی مشرعت سے اوپر معلوم ہو چکا، کیونکہ جہاد میں اہل حرب قصداً مقتول ہوتے ہیں، اور خطا کا جواز بدعت اولیٰ ثابت ہوگا۔ (بیان لہذا)

قتل کی تین قسمیں اول پہلی قسم: عمدہ :- جو ظاہراً قصد سے لیے آلہ کے ذریعہ سے واقع ان کا شرعی حکم ہو جو آہنی یا تفریق اجزاء میں آہنی آلہ کی طرح ہو، جیسے دھار والا بانس یا دھار والا پتھر وغیرہ۔

دوسری قسم: شبه عمد :- جو قصداً تو ہو مگر لیے آلہ سے نہ ہو جس سے اجزاء میں تفریق ہو سکتی ہو۔

تیسری قسم: خطا :- یا تو قصد و ظن میں کہ دور سے آدمی کو شکاری جانور یا کافر حسرتی سمجھ کر نشان لگا دیا یا فعل میں کہ نشان تو جانور ہی کو لگایا لیکن آدمی کو جا لگا، اس میں خطا سے مراد غیر عمد ہے، پس دوسری، تیسری دونوں قسمیں اس میں آگئیں، دونوں میں دیت بھی ہے، اور گناہ بھی ہے، مگر ان دونوں امر میں دونوں قسمیں متفاوت ہیں۔ دیت دوسری قسم کی تنواؤنٹ ہیں، چار قسم کے، یعنی ایک ایک قسم کے پچیس پچیس، اور دیت تیسری قسم کی تنواؤنٹ ہیں، پانچ قسم کے یعنی ایک ایک قسم کے بیس بیس، البتہ اگر دیت میں نقد دیا جائے تو دونوں قسموں میں دس ہزار درہم شرعی یا ایک ہزار دینار شرعی ہیں، اور گناہ دوسری قسم میں زیادہ ہے بوجہ قصد کے، اور تیسری قسم میں کم صرف بے احتیاطی کا (کذا فی الہدایۃ) چنانچہ تحریر رقبہ کا وجوب و نیز لفظ توبہ بھی اس پر دال ہے، اور یہ حقیقت ان تینوں کی دنیا میں جاری ہونے والے احکام شرعیہ کے اعتبار سے ہے، اور گناہ کے اعتبار سے عمدہ و غیر عمد ہوتا، اس کا مدار قلبی قصد و ارادہ پر ہے، جس پر عمدہ آئندہ کا مدار ہے، وہ خدا کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ اس اعتبار سے قسم اول غیر عمد ہو جائے اور قسم ثانی عمدہ ہو جائے۔

مسئلہ: یہ مقدار مذکور دیت کی جب ہے کہ مقتول مرد ہو اور اگر عورت ہو تو اس کی نصف ہے (کذا فی الہدایۃ)

مسئلہ: دیت مسلم اور ذمی کی برابر ہے، قول رسول علیہ السلام **وَدَّيَّةُ كُلِّ ذِي عَهْدٍ فِي عَهْدِهِ أَلْفُ دِينَارٍ** (کذا فی الہدایۃ اخراجہ ابو داؤد فی مراسیلہ)۔



**مسئلہ:** کفارہ یعنی تحریرِ رقبہ یا روزے رکھنا خود قاتل کو ادا کرنا پڑتا ہے، اور دیت قاتل کے اہل نصرت پر ہی، جن کو شرع کی اصطلاح میں عاقلہ کہتے ہیں (بیان القرآن) یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور انصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں؛ وجہ دراصل یہ ہے کہ اس میں قاتل کے اولیاء بھی قصور وار ہوتے ہیں، کہ انھوں نے اس کو اس قسم کی بے احتیاطی کرنے سے روکا نہیں، اور دیت کے خوف سے آئندہ وہ لوگ اس کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں گے۔

**مسئلہ:** کفارہ میں لونڈی غلام برابر ہیں، لفظ رقبہ عام ہے، البتہ ان کے عصباً سالم ہونے چاہئیں۔

**مسئلہ:** دیت مقتول کی شرعی ورثہ میں تقسیم ہوگی، اور جو اپنا حصہ معاف کر دے گا اس قدر معاف ہو جائے گی، اور اگر سب معاف کر دیا سب معاف ہو جائے گی۔

**مسئلہ:** جس مقتول کا کوئی وارث شرعی نہ ہو اس کی دیت بیت المال میں داخل ہوگی، کیونکہ دیت ترکہ ہے اور ترکہ کا یہی حکم ہے۔ (بیان القرآن)

**مسئلہ:** اہل میثاق (ذمی یا مستامن) کے باب میں جو دیت واجب ہے ظاہر یہ ہے کہ اس وقت ہے جب اس ذمی یا مستامن کے اہل موجود ہوں، اور اگر اس کے اہل نہ ہوں، یا وہ اہل مسلمان ہوں اور مسلمان کافر کا وارث ہو نہیں سکتا، اس لئے وہ بجائے نہ ہونے کے ہے، تو اگر وہ ذمی ہے تو اس کی دیت بیت المال میں داخل کی جائیگی، کیونکہ ذمی لا وارث کا ترکہ جس میں دیت داخل ہے، بیت المال میں آتا ہے، (کافی الدلائل) ورنہ واجب نہ ہوگی (بیان القرآن)

**مسئلہ:** روزے میں اگر مرض وغیرہ کی وجہ سے تسلسل باقی نہ رہا ہو تو از سر نو رکھنے پڑیں گے، البتہ عورت کے حیض کی وجہ سے تسلسل ختم نہیں ہوگا۔

**مسئلہ:** اگر کسی عذر سے روزہ پر قدرت نہ ہو تو قدرت تک توبہ کیا کرے۔

**مسئلہ:** قتل عمد میں یہ کفارہ نہیں توبہ کرنا چاہئے۔  
(بیان القرآن)



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا

اے ایمان والو جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ كُنتَ مُؤْمِنًا

اور مت کہو اس شخص کو کہ جو تم سے سلام علیک کرے کہ تو مسلمان نہیں

تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ مَغَانِمٌ

تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں

كَثِيرَةٌ ۚ كَذَلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنْ اللَّهُ عَلَيْكُمْ

میں تم بھی تو ایسے ہی تھے اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا

فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۹۳﴾ لَا

سواب تحقیق کرو بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے برابر

يَسْتَوِ الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ

نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں

وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے

فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ

اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے

عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً ۚ وَكَلاَّ وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَفَضَّلَ

بیٹھ رہنے والوں پر درجہ اور ہر ایک سے وعدہ کیا اللہ نے بھلائی کا اور زیادہ کیا

اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجَتٍ

اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں جو کہ درجے ہیں

مِنْهُ وَمَغْفِرَةً ۖ وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۹۶﴾

اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے اور مہربانی ہے اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان



## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو ہر کام کو (قتل یا اور کچھ ہو) تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے (علامات) اطاعت (کی) ظاہر کرے (جیسا کلمہ پڑھنا یا مسلمانوں کے طرز پر سلام کرنا) یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو (دل سے) مسلمان نہیں (محض اپنی جان بچانے کو جھوٹ موٹ اظہار اسلام کرتا ہے) اس طور پر کہ تم دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو، کیونکہ خدا کے پاس (یعنی اگلے علم و قدرت میں تمہارے لئے) بہت غنیمت کے مال ہیں (جو تم کجائز طریقوں سے ملیں گے اور یاد تو کرو کہ) پہلے (ایک زمانہ میں) تم بھی ایسے ہی تھے کہ تمہارے اسلام کے قبول کا مدار صرف تمہارا دعویٰ و اظہار تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا (کہ اس ظاہری اسلام پر اکتفاء کیا گیا اور باطنی جستجو پر موقوف نہ رکھا) سو (ذرا) غور (تو) کرو بیشک اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (کہ بعد اس حکم کے کون اس پر عمل کرتا ہے کون نہیں کرتا ثواب میں برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں (یعنی جہاد میں نہ جاویں) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے (یعنی مالوں کو خرچ کر کے اور جانوں کو حاضر کر کے) جہاد کریں (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بتایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے اور (یوں بوجہ فرض عین نہ ہونے کے گناہ ان بیٹھنے والوں پر بھی نہیں بلکہ بوجہ ایمان اور دوسرے فرائض عین کے بجالانے کے) سب سے (یعنی مجاہدین سے بھی) قاعدین سے بھی (اللہ تعالیٰ نے) اچھے گھر کا (یعنی جنت کا آخرت میں) وعدہ کر رکھا ہے اور (اوپر جو اجمالاً کہا گیا ہے کہ مجاہدین کا بڑا درجہ ہے اس کی تعیین یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مجاہدین (مذکورین) کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے بڑا اجر عظیم دیا ہے، (وہ درجہ ہی اجر عظیم ہے اس جمال کی تفصیل فرماتے ہیں) یعنی (بوجہ اعمال کثیرہ کے جو مجاہد سے صادر ہوتے ہیں ثواب کے) بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور (گناہوں کی) مغفرت اور رحمت (یہ سب اجر عظیم کی تفصیل ہوتی) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں



## معارف و مسائل

**رابط آیات** | پچھلی آیات میں قبل مومن پر سخت وعید فرمائی ہے، آگے یہ فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے جاری ہونے میں مومن کے مومن ہونے کے لئے صرف ظاہری اسلام کافی ہے، جو شخص اسلام کا اظہار کرے اس کے قتل سے ہاتھ روکنا واجب ہے، اور محض شک و شبہ کی وجہ سے باطن کی تفتیش کرنا اور احکام اسلامیہ کے جاری کرنے میں اس کے یقینی ایمان کے ثبوت کا منتظر رہنا جائز نہیں، جیسا بعض صحابہ سے بعض غزوات میں اس قسم کی عنسزش واقع ہوئی، کہ بعض لوگوں نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا، لیکن بعض حضرات صحابہؓ نے ان کی علامات اسلام کو کذب پر محمول کر کے قتل کر ڈالا، اور مقتول کا مال غنیمت میں لے لیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا انسداد فرمایا، اور چونکہ اس وقت تک صحابہؓ کو یہ مسئلہ واضح طور پر معلوم نہ تھا اس لئے صرف فہمائش پر اکتفا کیا، اور اس فعل پر ان کے لئے کوئی وعید نازل نہیں فرمائی (بیان القرآن)

مسلمان سمجھنے کے لئے | مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جو شخص علامات اسلام کافی ہیں | اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ باطن کی تفتیش کرنا | بغیر تحقیق کے اس کے قول کو نفاق پر محمول کرے، اس آیت کے نزول جائز نہیں۔ | کا سبب کچھ ایسے واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کرامؓ سے اس بارہ میں عنسزش ہو گئی تھی۔

چنانچہ ترمذی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ قبیلہ بنو سلیم کا ایک آدمی صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ملا جب کہ یہ حضرات جہاد کے لئے جا رہے تھے، یہ آدمی اپنی بکریاں چرارہا تھا، اس نے حضرات صحابہؓ کو سلام کیا، جو عملاً اس چیز کا اظہار تھا، کہ میں مسلمان ہوں، صحابہ کرامؓ نے سمجھا کہ اس وقت اس نے محض اپنی جان و مال بچانے کے لئے یہ فریب کیا ہے، کہ مسلمانوں کی طرح سلام کر کے ہم سے بچ نکلے، چنانچہ انھوں نے اس کو قتل کر دیا، اور اس کی بکریوں کو مال غنیمت قرار دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص آپ کو اسلامی طرز پر سلام کرے تو بغیر تحقیق کے یہ نہ سمجھو کہ اس نے فریب کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا ہے، اور اس کے مال کو مال غنیمت سمجھ کر حاصل نہ کرو (ابن کثیر)



اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک دوسری روایت ہے جسکو بخاری نے مختصر اور بزار نے مفصلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دستہ مجاہدین کا بھیجا جن میں حضرت مقداد بن اسود بھی تھے، جب وہ موقع پر پہنچے تو سب لوگ بھاگ گئے، صرف ایک شخص رہ گیا، جس کے پاس بہت مال تھا، اس نے صحابہ کرامؓ کے سامنے کہا: **أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ**، مگر حضرت مقدادؓ نے یہ سمجھ کر کہ دل سے نہیں کہا بلکہ محض جان و مال بچانے کے لئے کلمہ اسلام پڑھ رہا ہے اس کو قتل کر دیا، حاضرین میں سے ایک صحابیؓ نے کہا کہ آپؐ نے بُرا کیا، کہ ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا جس نے **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کی شہادت دی تھی، میں اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گیا تو اس واقعہ کا ضرور ذکر کر دوں گا، جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا، آپؐ نے حضرت مقدادؓ کو بلا کر سخت تنبیہ فرمائی، اور فرمایا کہ بروی قیامت تمہارا کیا جواب ہوگا جب کلمہ **لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** تمہارے مقابلہ میں دعویدار ہوگا اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی: **لَا تَقُولُوا لِمَنْ آتَىٰكُمْ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا** مذکورہ آیت کے بارہ میں ان دو واقعات کے علاوہ دوسرے واقعات بھی منقول ہیں، لیکن محققین اہل تفسیر نے فرمایا کہ ان روایات میں تعارض نہیں ہو سکتا، کہ یہ چند واقعات مجموعی حیثیت سے نزول کا سبب ہوئے ہوں۔

آیت کے الفاظ میں **آتَىٰكُمْ السَّلَامَ** ارشاد ہے، اس میں لفظ سلام سے اگر اصطلاحی سلام مراد لیا جائے تب تو پہلا واقعہ اس کے ساتھ زیادہ چسپاں ہے، اور اگر سلام کے لفظی معنی سلامت اور اطاعت کے لئے جائیں تو یہ سب واقعات اس میں برابر ہیں، اسی لئے اکثر حضرات نے ”سلام“ کا ترجمہ اس جگہ اطاعت کا کیا ہے۔

واقعہ کی تحقیق کے بغیر | اس آیت کے پہلے جملہ میں ایک عام ہدایت ہے کہ مسلمان کوئی کام فیصلہ کرنا جائز نہیں | بے تحقیق محض گمان پر نہ کریں، ارشاد ہے **إِذَا حَضَرَ بُيُوتَكُمْ فِي سَبِيلِ**

**اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا**، یعنی جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام تحقیق کے ساتھ کیا کرو، محض خیال اور گمان پر کام کرنے سے بسا اوقات غلطی ہو جاتی ہے، اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذکر کی گئی کہ یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے، یا اس وجہ سے کہ شہادت عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے، ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”سوچ سمجھ کر



کام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے " (بحر محیط)

دوسرے جملہ یعنی تَبْتَغُونَ عَوَاصِیَ الدُّنْيَا میں اسی روگ کی اصلاح ہے، جو اس غلطی پر امتِ رام کرنے کا باعث ہوا، یعنی دنیا کی دولت مال غنیمت حاصل ہونے کا خیال۔ آگے یہ بھی بتلادیا کہ تمھارے لئے اللہ تعالیٰ نے اموالِ غنیمت بہت سے مقرر اور ہتدٰی کر رکھے ہیں، تم اموال کی منکر میں نہ پڑو، اس کے بعد ایک اور تنبیہ فرمائی کہ ذرا اس پر بھی تو نظر ڈالو کہ پہلے تم میں بھی تو بہت سے حضرات ایسے ہی تھے کہ مکہ مکرمہ میں اپنے اسلام و ایمان کا اعلان نہیں کر سکتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ کفار کے نرغہ سے نجات دیدی، تو اسلام کا اظہار کیا، تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص جو لشکرِ اسلام کو دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا ہے وہ حقیقتہً پہلے سے اسلام کا معتقد ہو مگر کفار کے خوف سے اسلام کا اظہار نہیں کرنے پایا تھا، اس وقت اسلامی لشکر کو دیکھ کر اظہار کیا، یا کہ شروع میں جب تم نے کلمہ اسلام کو پڑھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہا تو اس وقت تمہیں مسلمان قرار دینے کے لئے شریعت نے یہ قید نہیں لگائی تھی کہ تمھارے دلوں کو ٹیٹولیں اور دل میں اسلام کا ثبوت ملے، تب تمہیں مسلمان قرار دیں، بلکہ صرف کلمہ اسلام پڑھ لینے کو تمھارے مسلمان قرار دینے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا، اسی طرح اب جو تمھارے سامنے کلمہ پڑھتا ہے اس کو بھی مسلمان سمجھو۔

اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کا مطلب اس آیت کریمہ سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہو خواہ کلمہ پڑھ کر یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامعہ معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے۔

نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہوگا، فرض کر لو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا لَا تُكَفِّرُ أَهْلَ الْقِبْلَةِ بِذُنُوبِهِمْ، یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے، بعض روایات حدیث میں بھی اس قسم کے الفاظ مذکور ہیں، کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو، خواہ وہ کتنا ہی گنہگار بد عمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن و حدیث



سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول و فعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے اس وقت تک اس کے اقرار اسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سامعاً معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اخلاص یا اتفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا۔

لیکن جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلمات کفر بھی کہتا ہے، یا کسی بُت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے، یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا وغیرہ، وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائیگا۔ آیت مذکورہ میں لفظ **تَبَيَّنُوا** سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ یہود و نصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مؤمن مسلمان کہتے تھے، اور میلہ کذاب جس کو باجماع صحابہ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعار و نمائندگیوں وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں **أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کے ساتھ **أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ** بھی کہلاتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحب وحی کہتا تھا، جو نصوص قرآن و سنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بناء پر اس کو مرتد قرار دیا گیا، اور اس کے خلاف باجماع صحابہ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہو گیا کہ ہر کلمہ گواہی قبلہ کو مسلمان سمجھو اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے؟ اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلاف ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو بشرطیکہ اس کا خلاف ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو، اور اس میں کوئی دوسرے احتمال یا تاویل کی راہ نہ ہو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لفظ کلمہ گو "یا اہل قبلہ" یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعی اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول و فعل کا مرتکب نہ ہو۔

**جہاد متعلقہ چند احکام** | دوسری آیت یعنی **لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ**

میں چند احکام جہاد کو بیان کیا گیا ہے، کہ جو لوگ بغیر کسی معذوری کے شریک جہاد نہیں ہوتے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال کے جہاد کرتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو غیر مجاہدین پر درجہ میں فضیلت اور برتری



دی ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں فرق یعنی مجاہدین و غیر مجاہدین کے اچھے جزاء کا وعدہ کیا ہوا ہے، جنت و مغفرت دونوں کو حاصل ہوں گی، فرق درجات کا یہ ہے گا۔

علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے کہ بعض لوگ اس کو ادا کر لیں تو باقی مسلمان سبکدوش ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ جو لوگ جہاد میں مشغول ہیں وہ اُس جہاد کے لئے کافی ہوں، اور اگر وہ کافی نہیں تو ان کے قرب و جوار کے مسلمانوں پر فرض عین ہو جائے گا کہ مجاہدین کی مدد کریں۔

**فرض کفایہ کی تعریف** | فرض کفایہ شریعت میں ایسے ہی فرائض کو کہا جاتا ہے جن کی ادائیگی ہر فرد مسلم پر ضروری نہیں بلکہ بعض کا کر لینا کافی ہے، اور عموماً قومی اور اجتماعی کام اسی درجہ میں ہیں، علوم و دینیہ کی تعلیم و تبلیغ بھی ایسا ہی فرض ہے کچھ لوگ اس میں مشغول ہوں اور وہ کافی بھی ہوں تو دوسرے مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں، لیکن جہاں کوئی بھی مشغول نہ ہو تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔

نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین بھی ایک قومی چیز ہے، کہ ایک بھائی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا حق ادا کرتا ہے، اور اس کا حکم بھی یہی ہے، مساجد اور مدارس بنانا اور دوسرے فائدہ عامہ کے کام سہرا انجام دینا اسی حکم میں داخل ہیں، یعنی بعض مسلمان کر لیں تو باقی سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر وہ احکام جو اجتماعی اور قومی ضرورتوں سے متعلق ہیں، ان کو شریعت اسلام نے فرض کفایہ ہی قرار دیا ہے، تاکہ تقسیم عمل کے اصول پر تمام فرائض کی ادائیگی ہو سکے، کچھ لوگ جہاد کا کام انجام دیں، کچھ تعلیم و تبلیغ کا، کچھ دوسری اسلامی یا انسانی ضروریات مہیا کرنے کا۔

اس آیت میں **وَكَفَّ** وَعَدَ اللّٰهُ الْحَسَنٰی فرما کر ان لوگوں کو بھی مطمئن فرمادیا ہے جو جہاد کے علاوہ دوسری دینی ضرورتوں میں مشغول ہیں، لیکن یہ حکم عام حالات میں ہے، جبکہ کچھ لوگوں کا جہاد اسلام کے دشمنوں کی مدافعت کے لئے کافی ہو، اور اگر ان کا جہاد کافی نہ ہے ان کو مزید کمک کی ضرورت ہو تو اول قرب و جوار کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے وہ بھی کافی نہ ہو تو ان کے آس پاس کے لوگوں پر فرض عین ہو جاتا ہے اور وہ بھی کافی نہ رہیں تو دوسرے مسلمانوں پر یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس میں شریک ہو۔



تیسری آیت میں بھی انہی درجاتِ فضیلت کا بیان ہے، جو مجاہدین کو دوسروں پر حاصل ہیں۔

مسئلہ ۱۔ لشکرے سب نے، اندھے، بیمار اور دیگر معذور شرعی لوگوں پر جہاد و فسخ نہیں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُم الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ

وہ لوگ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ وہ برا کر رہے ہیں اپنا کہتے ہیں ان کے

كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ

فرشتے تم کس حال میں تھے وہ کہتے ہیں ہم تھے بے بس اس ملک میں کہتے ہیں فرشتے کیا نہ

تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ

تھی زمین اللہ کی کشادہ جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں سو ایسوں کا

مَا أُولَٰئِكَ جَهَنَّمَ سَاعَتْ مَصِيرًا ۙ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ

ٹھکانا ہے دوزخ اور وہ بہت بُری جگہ پہنچے مگر جو ہیں بے بس

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً

مردوں اور عورتوں اور بچوں میں سے جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر

وَلَا يَمْتَدُّونَ سَبِيلًا ۙ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُوَ

اور نہ جانتے ہیں کہیں کا رہتے سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ معاف

عَنْهُمْ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَفْوًا غَفُورًا ۙ وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ

کرے اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی

اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَغَمًا كَثِيرًا وَسِعَةً ۖ وَمَنْ

راہ میں پائے گا اس کے مقابلہ میں جبکہ بہت اور کشائش اور جو کوئی

يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ

کھلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے اللہ اور رسول کی طرف پھر آپڑے اس کو

السَّوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۙ

موت تو مقرر ہو چکا اس کا ثواب اللہ کے ہاں اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔



## خلاصہ تفسیر

بیشک جیسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے (باوجود قدرت ہجرت کے پھر ہجرت کے تارک ہو کر) اپنے کو گنہگار کر رکھا تھا تو (اس وقت) وہ (فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دین کے) کس (کس) کام میں تھے (یعنی دین کے کیا کیا ضروری کام کیا کرتے تھے) وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنی بود و باش کی) سر زمین میں محض مغلوب تھے (اس لئے بہت سی ضروریات دین پر عمل نہ کر سکتے تھے) یعنی ان فرائض کے ترک میں معذور تھے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہ کر سکتے تھے تو) کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کر کے اس (سے کسی دوسرے حصہ) میں چلا جانا چاہئے تھا (اور وہاں جا کر فرائض کو ادا کر سکتے تھے) اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور حُجُرم ان کا ثابت ہو جائے گا) سو ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کے لئے وہ بُری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے (واقع میں ہجرت پر بھی) قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ راستہ سے واقف ہیں اسوان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے مغفرت کرنے والے ہیں اور (جن لوگوں کے لئے ہجرت مشروع ہے ان میں سے) جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے لئے) ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی اور (اخبارِ دین کی) بہت گنجائش (ملے گی) پس اگر ایسی جگہ پہنچ گیا تو دنیا میں بھی اس مفسر اور اظہار سے کامیابی ظاہر ہے) اور (اگر اتفاق سے یہ مذکور کامیابی نہ ہوئی تب بھی آخرت کی کامیابی میں تو کوئی تردد نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ و رسولؐ کے دین کے ظاہر کر سکنے کے موقع کی طرف ہجرت کروں گا پھر (مقصد کے حاصل کرنے سے پہلے) اس کو موت آپکڑے، تب بھی اس کا ثواب (جس کا وعدہ ہجرت کرنے پر ہے) ثابت ہو گیا (جو وعدہ کی وجہ سے ایسا ہے جیسے) اللہ کے ذمہ (گو ابھی اس سفر کو ہجرت نہیں کہہ سکتے، لیکن صرف اچھی نیت سے اس کے شروع کر دینے پر پورا صلہ عطا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (اس ہجرت کی برکت سے گو وہ نا تمام رہے بہت سے گناہ معاف فرما دیں گے جیسا حدیث میں ہجرت کی فضیلت آئی ہے کہ ہجرت سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں) اور (بڑے رحمت والے ہیں) کہ عمل کو اچھی نیت سے شروع کرنے ہی سے عمل کے پورا ہونے کے برابر ثواب عنایت فرماتے ہیں)



## معارف و مسائل

**ہجرت کی تعریف** | ان چار آیتوں میں ہجرت کے فضائل، برکات اور احکام کا بیان ہے لغت میں ہجرت، ہجران اور ہجر کے معنی ہیں کسی چیز سے بیزار ہو کر اس کو چھوڑ دینا، اور محاورات عامہ میں ہجرت کا لفظ ترک وطن کرنے کیلئے بولا جاتا ہے، اصطلاح شرع میں دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں چلے جانے کو ہجرت کہتے ہیں (روح المعانی)

اور ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوٰۃ میں فرمایا کہ کسی وطن کو دینی وجوہ کی بناء پر چھوڑ دینا بھی ہجرت میں داخل ہے (مرقاۃ، صفحہ ۳۹ جلد ۱)

سورۃ حشر کی آیت **الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ** جو مہاجرین صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ملک کے کفار مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیں تو یہ بھی ہجرت میں داخل ہے۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پاکستان کی طرف منتقل ہونے والے مسلمان جو دار الکفر سے بیزاری کے سبب با اختیار خود اس طرف آئے ہیں یا جن کو غیر مسلموں نے محض ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے زبردستی نکال دیا ہے، یہ سب لوگ شرعی معنی کے اعتبار سے مہاجرین، البتہ جو تجارتی ترقی یا ملازمت کی سہولتوں کی نیت سے منتقل ہوئے وہ شرعاً مہاجر کہلانے کے مستحق نہیں۔

اور صحیح بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

<p>الْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ وَرَسُولُهُ</p>	<p>یعنی مہاجر وہ ہے جو ان تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے منع فرمایا ہے</p>
--	--

سواس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:

<p>الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ</p>	<p>یعنی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں</p>
---	--

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذا نہ پہونچائے، اسی طرح سچا اور کامیاب مہاجر وہی ہے جو صرف ترک وطن کر کے فایز نہ ہو جائے، بلکہ جتنی چیزیں شریعت نے حرام و ناجائز قرار دی ہیں ان سب کو بھی چھوڑ دے اپنے دل کو بھی بدل جامہٴ احرام کے ساتھ



**ہجرت کے فضائل** | قرآن کریم میں جس طرح جہاد کے متعلق آیات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں اسی طرح ہجرت کا ذکر بھی قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں متعدد مرتبہ آیا ہے، سب آیات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات ہجرت میں تین قسم کے مضامین ہیں، اول ہجرت کے فضائل، دوسرے اس کی دنیاوی اور اخروی برکات، تیسرے باوجود قدرت کے دارالکفر سے ہجرت نہ کرنے پر وعیدیں۔

پہلے مضمون یعنی ہجرت کے فضائل کی ایک آیت سورۃ بقرہ میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

”یعنی وہ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے۔“

دوسری آیت سورۃ توبہ میں ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْثَرُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

”یعنی جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑے درجہ میں ہیں، اور یہی لوگ کامیاب بامراد ہیں۔“

اور تیسری آیت یہی سورۃ نساء کی ہے:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكُهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ

”یعنی جو شخص اللہ اور رسول کے لئے اپنے گھر سے بیعت ہجرت نکل کھڑا ہوا پھر اس کو راستہ ہی میں موت آگئی تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہو گیا۔“

یہ آیت بعض روایات کے مطابق حضرت خالد بن حزامؓ کے بارے میں ہجرت حبشہ کے زمانہ میں نازل ہوئی، یہ مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی نیت پر نکلے تھے، راستہ میں ان کو سانپ نے کاٹ لیا، جس سے ان کی موت واقع ہو گئی، بہر حال ان تینوں آیتوں میں دارالکفر سے ہجرت کی ترغیب اور اس کے بڑے فضائل کا بیان واضح طور پر آگیا۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **الْهَجْرَةُ تَهْدِي إِلَى مَا كَانَ قَبْلَهَا** ”یعنی ہجرت ان سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو ہجرت سے پہلے کئے ہوں۔“



ہجرت کی برکات | برکات کے متعلق سورۃ نحل کی ایک آیت میں ارشاد ہے :

وَالَّذِينَ

یعنی جن لوگوں نے اللہ کے لئے

هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ

ہجرت کی بعد اس کے کہ اُن پر ظلم کیا گیا

مَا ظَلَمُوا النَّبِيَّ وَتَهَمُّ فِي

ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے

الدُّنْيَا حَسَنَةً وَآجِرُ الْآخِرَةِ

اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے

أَكْبَرُ كَوْنًا وَيَعْلَمُونَ ۝

کاش یہ لوگ سمجھ لیتے

سورۃ نساء کی چار آیتیں جو اوپر بھی گئی ہیں ان میں سے چوتھی آیت کا بھی تفسیر یہاں

یہی مضمون ہے جس میں ارشاد ہے :

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

یعنی جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت

يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مَرَامًا

کرے گا وہ پائے گا زمین میں جسگہ

كَثِيرًا وَسَعَةً ۝

بہت اور کشائش

آیت کا لفظ مَرَامٌ مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین

کی طرف منتقل ہونا، اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مَرَامٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں ہجرت کی برکات ظاہرہ و باطنہ کا بیان ہے، جس میں اللہ

تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کے لئے ہجرت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس

کے لئے دنیا میں راہیں کھول دیتے ہیں اور اس کو دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیتے ہیں

اور آخرت کے ثواب و درجات تو وہم دگمان سے بالاتر ہیں۔

اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاہدؒ نے رزقِ حلال سے اور حسنِ بصریؒ نے عمدہ مکان

سے اور بعض دوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزت و شرف سے کی ہے اور

حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، چنانچہ تاریخِ عالم شاہد

ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان

سے بہتر مکان، وطن کی عزت و شرف سے زیادہ عزت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام

عطا کیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عراقی وطن کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت

فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور

ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لئے اپنے وطن مصر کو چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو

اس سے بہتر وطن ملک شام کا عطا فرمایا، اور پھر مصر بھی ان کو مل گیا، ہمالے آقا حضرت

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے اللہ و رسول کے لئے مکہ کو چھوڑا تو مہاجرین



کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہوا، ہر طرح کی عزت و غلبہ اور راحت و ثروت عطا ہوئی، ہجرت کے ابتدائی دور میں چند روزہ تکلیف و مشقت کا اعتبار نہیں، اُس عبوری دور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں، اور ان کی کئی نسلوں میں جاری رہیں اسی کا اعتبار ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کے فقر و فاقہ کے جو واقعات تاریخ میں مشہور ہیں وہ عموماً ہجرت کے ابتدائی دور کے ہیں، یا وہ فقر و خستیا ری کے ہیں کہ انھوں نے دنیا و مال و دولت کو پسند ہی نہیں کیا، اور جو حاصل ہوا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا، جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حال بھی تھا، کہ آپؐ کا فقر و فاقہ محض خستیا ری تھا، آپؐ نے غنا و مال داری کو اختیار نہیں فرمایا، اور اس کے باوجود ہجرت کے چھٹے سال میں فتح خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب اہل و عیال کے گزارہ کا کافی انتظام ہو گیا تھا، اسی طرح خلفائے راشدینؓ میں سب کا یہی حال تھا، کہ مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دیا تھا، لیکن اسلامی ضرورت پیش آنے پر حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے گھر کا پورا مال لاکر پیش کر دیا، اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ کو جو کچھ وظیفہ ملتا وہ سب فقراء و مساکین میں تقسیم کر کے خود فقیرانہ زندگی گزارتی تھیں، اسی وجہ سے ان کا لقب اُمّ المساکین ہو گیا تھا، اور اس کے باوجود انھیں صحابہ جنھوں نے بڑی مقدار میں مال و جائداد چھوڑی ان کی مقدار بھی صحابہ کرامؓ میں کم نہیں، بہت سے حضرات صحابہؓ ایسے بھی تھے جو اپنے وطن مکہ مکرمہ میں مفلس و نادار تھے، ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت اور ہر طرح کی رفاہیت عطا فرمائی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایک صوبہ کے والی بنا دیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ اٹا کر کرتے تھے، اور اپنے نفس کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ابو ہریرہ! تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا، اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی، اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو تو پیدل ان کے ساتھ چلے، اور جب وہ کسی منزل پر اتریں تو تو ان کے لئے جلانے کی لکڑیاں چن کر لائے، آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا، تجھ کو امام اور امیر المؤمنین کہا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ ہاجرین کے لئے قرآن میں فرمایا ہے اس کو دنیا نے پورا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، البتہ اسی آیت میں شرط یہ ہے کہ ہاجر و انفی اللہ کے مصداق ہوں، دنیا کے مال و دولت یا حکومت و سلطنت



یا عورت وجاہ کی طلب میں ہجرت نہ کی ہو اور نہ صبح بخاری کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ بھی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو ان کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کے لئے ہے، یعنی صبح بخاری ہے، جس کے فضائل و برکات قرآن میں مذکور ہیں، اور جس شخص نے کسی مال کی طلب یا کسی عورت کے نکاح کے خیال سے ہجرت کی ہو تو اس کی ہجرت کا معاوضہ وہی چیز ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔

آج جو بعض مہاجرین پریشان حال ہیں یا تو ابھی وہ اُس عبوری دور میں ہیں جس میں ابتدائی ہجرت کے وقت پریشانی پیش آیا کرتی ہے، یا پھر وہ صبح معنی میں مہاجر نہیں ان کو اپنی نیت اور حال کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہئے، نیت اور عمل کی اصلاح کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی سچائی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا

اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں کہ کچھ کم کرو

مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يُفْتِكُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ

نماز میں سے اگر تم کو ڈر ہے کہ ستادیں گے تم کو کافر البتہ

الْكُفْرَيْنِ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُبِينًا ۝ وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ

کافر تمھارے صریح دشمن ہیں اور جب تو ان میں موجود ہو

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَدِيمِ الَّذِي هُوَ لَكَ بِهِ بَعْدَ عَدْلِكَ

پھر نماز میں کھڑا کرے تو چاہئے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ

وَلْيَأْخُذْ وَاسْطِحَاحَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِنْ

اور ساتھ لیویں اپنے ہتھیار پھر جب یہ سجدہ کریں تو ہٹ جاویں تیرے

وَرَاءَكُمْ وَلْيَتَلَطَّفُوا حَتَّىٰ تَبْلُغُوا الْمَدِينَةَ وَالَّذِينَ

پاس سے اور آگے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی وہ نماز پڑھیں

مَعَكُمْ وَلْيَأْخُذْ وَاسْطِحَاحَهُمْ وَأَسْلِحْهُمْ ۚ وَالَّذِينَ

تیرے ساتھ اور ساتھ لیویں اپنا بچاؤ اور ہتھیار کافر چاہتے ہیں

كَفَرُوا وَلَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ

کسی طرح تم بے خبر رہو اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ



عَلَيْكُمْ مِثْلَهُ وَاحِدَةً وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ

تم پر حملہ کریں بھاری ، اور تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم کو

أَذَى مِنْ مَطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَنْ تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ

تکلیف ہو مینو سے یا تم بیمار ہو کر اسلحہ اپنے ہتھیار

وَأَخُذُوا حِزْزَكُمْ إِنْ أَلَّاهُ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا

اور ساتھ لے لو اپنا بچاؤ بیشک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے عذاب ذلت کا

فَإِذَا أَقَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَادْكُورُوا اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا

پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے

وَعَلَى الْجُنُوبِ كُمْ فَإِذَا أَطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ إِنْ

اور لیٹے پھر جب خوف جاتا ہے تو درست کرو نماز کو بیشک

الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا ۝۱۰۳ وَلَا تَهِنُوا

نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں ، اور ہمت نہ ہارو

فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ

ان کا پیچھا کرنے سے ، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں

كَمَاتًا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ وَكَانَ

جس طرح تم ہوتے ہو اور تم کو اللہ سے امید ہے جو ان کو نہیں اور اللہ

اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝۱۰۴

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔

## خُلاصہ تفسیر

اور جب تم زمین میں سفر کرو جس کی مقدار زمین منسزل ہو سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا (بلکہ ضروری ہے) کہ تم (ظہر اور عصر اور عشاء کے فرض) نماز کی رکعات کو کم کرو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو) اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے (اور اس اندیشہ کی وجہ سے ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا جائے کیونکہ بلاشبہ



کافر لوگ تمھارے صریح دشمن ہیں، اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں اور اسی طرح آپ کے بعد اور جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جائیں گے تو کوئی دشمن موقع پا کر حملہ کر بیٹھے گا) تو (ایسی حالت میں) یوں چاہیے کہ (جماعت کے دو گروہ ہو جائیں پھر) ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑے ہو جائیں (اور دوسرا گروہ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑا ہے تاکہ دشمن کو دیکھتا ہے) اور وہ لوگ (جو آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہیں وہ بھی مختصر مختصر ہتھیار لیلیں (یعنی نماز سے پہلے لے کر ہمراہ رکھیں شاید مقابلہ کی ضرورت پڑ جائے تو ہتھیار لینے میں دیر نہ لگے، فوراً قتال کرنے لگیں، گو نماز قتال سے ٹوٹ جائے گی، لیکن گناہ نہیں) پھر جب یہ لوگ (آپ کے ساتھ) سجدہ کر چکیں (یعنی ایک رکعت پوری کر لیں) تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے) تمھارے پیچھے ہو جاویں (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور دوسرا گروہ کے جو کہ اب نماز میں شامل ہوں گے جن کا بیان آگے آتا ہے، یہ پہلا گروہ ان سب کے پیچھے ہو جائے) اور دوسرا گروہ جنھوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی (یعنی شروع بھی نہیں کی وہ اس پہلے گروہ کی جگہ امام کے قریب) آجائے اور آپ کے ساتھ نماز (کی ایک رکعت جو باقی رہی ہے اس کو) پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لیلیں (اور سامان اور ہتھیار ہمراہ لینے کا اس لئے سب کو حکم کیا ہے کہ) کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو تم پر ایک بارگی حملہ کر بیٹھیں، (سو ایسی حالت میں احتیاط ضروری ہے) اور اگر تم کو بارش (وغیرہ) کی وجہ سے (ہتھیار لے کر چلنے میں) تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اور اس وجہ سے ہتھیار باندھ نہیں سکتے) تو تمکو اس میں (بھی) کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور (پھر بھی) اپنا بچاؤ (ضرور) لے لو، (اور یہ خیال نہ کرو کہ کفار کی دشمنی کا صرف دنیا ہی میں علاج کیا گیا ہے بلکہ آخرت میں اس سے بڑھ کر ان کا علاج ہو گا کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزا (ابانت آمیز مہیا کر رکھی ہے) پھر جب تم نماز (خوف) کو ادا کر چکو تو (بدستور) اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی (یعنی ہر حالت میں حتیٰ کہ عین لڑائی کے وقت بھی اللہ کا ذکر جاری رکھو دل سے بھی اور احکام شرعیہ کے اتباع سے بھی کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے، لڑائی میں خلاف شرع کوئی کارروائی کرنے سے پرہیز کرو، غرض نماز تو ختم ہوئی ذکر ختم نہیں ہوتا، سفر یا خوف کی وجہ سے نماز میں تو تخفیف ہو گئی تھی، لیکن ذکر اپنی حالت پر ہی ہے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ (یعنی سفر ختم کر کے



مقیم ہو جاؤ، اور اسی طرح خوف کے ختم ہونے کے بعد بے خوف ہو جاؤ، تو نماز کو (اصلی) قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو (یعنی قصر اور نماز میں مثنیٰ وغیرہ چھوڑ دو، کیونکہ وہ بوجہ عارض کے جائز رکھا گیا تھا) یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے (پس فرض ہونے کی وجہ سے ادا کرنا ضرور اور وقت کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے وقت ہی میں ادا کرنا ضرور ہوا، اس لئے کچھ کچھ اس کی شکل و صورت میں تبدیلی کر دی گئی، ورنہ نماز کی صورت مقصودہ وہی اصلی صورت ہے، پس سبب کے ختم ہونے کے بعد نماز کی اصلی صورت کی حفاظت لازم ہو گئی) اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں جبکہ اس کی ضرورت ہے (اگر تم زخموں سے) تکلیف میں مبتلا ہو تو (کیا ہوا) وہ بھی تو درمیں مبتلا ہیں جیسے تم درمیں مبتلا ہو (تو وہ تم سے زیادہ قوت نہیں رکھتے بھڑکا ہے کو ڈرتے ہوا) اور (تم میں ایک زیادتی ان سے یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ (ان کی) امید نہیں رکھتے (یعنی ثواب، تو دل کی قوت میں تم زیادہ ہو سکتے، اور ضعف بدن میں ایک جیسے تو تم کو زیادہ چست ہونا چاہیگا) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (ان کو کفار کا کمزور دل اور کمزور بدن معلوم ہے) بڑے حکمت والے ہیں (تمہاری قوت برداشت زیادہ حکم نہیں فرمایا)۔

## معارف و مسائل

**رابط آیات** | اور جہاد اور ہجرت کا ذکر تھا، چونکہ غالب احوال میں جہاد اور ہجرت کے لئے سفر کرنا پڑتا ہے، اور ایسے سفر میں مخالفت کی طرف سے اندیشہ بھی اکثر ہوتا ہے، اس لئے سفر اور خوف کی رعایت سے جو نماز میں بعض خاص سہولتیں اور تخفیفیں کی گئی ہیں، آگے ان کا ذکر فرماتے ہیں۔

**سفر اور قصر کے احکام** | مسئلہ: جو سفر تین منزل سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے۔

مسئلہ: اور جب سفر ختم کر کے منزل پر جا پہنچے تو اگر وہاں پندرہ روز سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تب تو وہ حکم سفر میں ہے، فرض نماز چار گانہ آدمی پڑھی جائے گی، اور اسکو قصر کہتے ہیں، اور اگر پندرہ روز یا زیادہ کا رہنے کا ایک ہی بستی میں ارادہ ہو، تو وہ وطن اقامت ہو جائے گا، وہاں بھی وطن اصلی کی طرح قصر نہیں ہوگا، بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔



مسئلہ : قصر صرف تین وقت کے فرائض میں ہے، اور مغرب اور فجر میں اور سنن و وتر میں نہیں ہے۔

مسئلہ : سفر میں خوف نہ ہو تو بھی قصر نماز پڑھی جائے گی۔

مسئلہ : بعض لوگوں کو پوری نماز کی جگہ قصر پڑھنے میں دل میں گناہ کا دوسوہ پیدا ہوتا ہے، یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ قصر بھی شریعت کا حکم ہے، جس کی تعمیل پر گناہ نہیں ہوتا، بلکہ ثواب ملتا ہے۔

مسئلہ : آیت میں ہے وَإِذَا كُنْتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ، یعنی جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اب صلوٰۃ خوف کا حکم باقی نہیں رہا، کیونکہ آپ کی ذات بابرکات اب ہم میں موجود نہیں، اس لئے کہ یہ شرط اس وقت کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے، کیونکہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا آدمی بلا عذر کے امام نہیں بن سکتا، آپ کے بعد اب جو امام ہو وہی آپ کے قائم مقام ہے، اور وہی صلوٰۃ خوف پڑھائے گا، تمام ائمہ کے نزدیک صلوٰۃ خوف کا حکم آپ کے بعد بھی جاری ہے منسوخ نہیں ہوا۔

مسئلہ : جیسے آدمی سے خوف کے وقت صلوٰۃ خوف پڑھنا جائز ہے، ایسے ہی اگر کسی شیر یا اثر دبا وغیرہ کا خوف ہو اور نماز کا وقت تنگ ہو اس وقت بھی جائز ہے۔

مسئلہ : آیت میں دونوں گروہ کے ایک ایک رکعت پڑھنے کا تو ذکر فرمایا دوسری رکعت کا طریقہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو دونوں گروہ نے اپنی ایک ایک رکعت بطور خود پڑھ لی، مزید تفصیل احادیث میں ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

بیشک ہم نے تمہاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ۝۱۵

جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا

وَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝۱۶ وَلَا

اور بخشش مانگ اللہ سے بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور مت



تُجَادِلُ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا

جھگڑا ان کی طرف سے جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں اللہ کو پسند نہیں

يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ۝۱۰۸ تَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ

جو کوئی ہو دغا باز گنہگار ، شرماتے ہیں لوگوں سے

وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ

اور نہیں شرماتے اللہ سے اور وہ ان کے ساتھ ہے جبکہ مشورہ کرتے ہیں

مَا لَا يُرِضِي مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝۱۰۹

رات کو اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے ،

هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ جَدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَنْ

تو ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں ،

فَسَنْ يُجَادِلُ اللَّهُ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ

پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے دن یا کون

يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ۝۱۰۹ وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ

ہوگا ان کا کارساز ، اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا بُرا

نَفْسَهُ ثُمَّ لِيَسْتَغْفِرِ اللَّهُ بِجَدِّ اللَّهِ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۱۱۰

کرے پھر اللہ سے بخشوائے تو پادے اللہ کو بخشنے والا مہربان ،

وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُ عَلَى نَفْسِهِ وَكَانَ

اور جو کوئی کرے گناہ سو کرتا ہے اپنے ہی حق میں اور اللہ

اللَّهُ عَلَيْهِمُ أَحْكِمًا ۝۱۱۱ وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً أَوْ إِثْمًا

سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ، اور جو کوئی کرے خطا یا گناہ

ثُمَّ يَرْتَدَّ بِهِ بَرِيئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُسْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ۝۱۱۲

پھر ہمت لگا دے کسی بے گناہ پر اس نے اپنے سر دھرا طوفان اور گناہ صریح ،

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ

اور اگر نہ ہوتا تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر رہی ہو تھی انہیں ایک جماعت



مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا

کہ تجھ کو بہکا دیں اور بہکا نہیں سکتے مگر اپنے آپ کو اور تیرا

يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ

کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور اللہ نے اماری تجھ پر کتاب اور

الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ

حکمت اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا اور اللہ کا فضل

اللَّهُ عَلَيْكَ عَظِيمًا ﴿۱۱۳﴾

تجھ پر بہت بڑا ہے۔

## خلاصہ تفسیر

مشک جم نے آیت کے یاس یہ کتاب بھی (جس سے) واقع کے مطابق (حال معلوم ہوگا) تاکہ آپ (اس واقعہ میں) ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعہ سے) آپ کو (اصل حال) بتا دیا ہے (وہ وحی یہ ہے کہ واقع میں بشیر حویر ہے، اور قبیلہ بنو ابیرق جو اس کے حاتی ہیں کاذب ہیں) اور (جب اصل حال معلوم ہو گیا تو) آپ ان خائمنوں کی طرف داری کی بات نہ کیجئے (جیسا بنو ابیرق کی اصل خواہش یہی تھی، چنانچہ دوسرے رکوع میں آتا ہے: لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ مَكَرَآپ نے ایسا کیا تھا، خود اسی جملہ سے آپ کا اس پر عمل نہ کرنا بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ فضل الہی نے غلطی سے بچا لیا جس میں ہر غلطی کی نفی ہو گئی اور منع فرمانے سے لازم نہیں آتا کہ وہ فعل ماضی میں واقع ہو چکا ہو، بلکہ اصل فائدہ منع کا یہ ہے کہ آئندہ کے لئے حقیقت حال سے آگاہ کر کے اس کے کرنے سے روکتے ہیں، پس آپ کی حالت اور شی کے مجروح کا حاصل یہ ہوگا، کہ جیسے اب تک طرفداری نہیں کی آئندہ بھی نہ کیجئے، اور یہ انتظامات بھی مکمل نہی کو محصور رکھنے کے لئے ہیں، اور آیت میں سب کو خائن کہا حالانکہ خائن سب نہ تھے، اس لئے کہ جو لوگ خائن نہ تھے وہ بھی خائن کی اہانت کر رہے تھے اس لئے وہ خائن ٹھہرے، اور لوگوں کے کہنے سے حسن ظن کے طور پر آپ نے جو بنو ابیرق کو دیندار سمجھ لیا ہے، گو ایسا سمجھنا گناہ تو نہیں، لیکن چونکہ اس میں یہ احتمال تھا کہ آپ کے اتنا فرمادینے سے اہل حق اپنا حق چھوڑ دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت رفاعہ خاموش ہو کر بیٹھ رہے، لہذا یہ کام نامناسب ہوا، اس لئے اس سے، آپ استغفار



فرمائیے (کہ آپ کی شان عظیم ہے اتنا امر بھی آپ کے لئے قابلِ استغفار ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے (جیسا وہ لوگ آپ سے چاہتے تھے) جو کہ (لوگوں کی خیانت اور نقصان کر کے باعث بار و بال و ضرر کے درحقیقت) اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے (بلکہ اس کو مبغوض رکھتے ہیں) جو بڑا خیانت کرنا والا بڑا گناہ کرنا والا ہو جیسا کہ تھوڑے خیانت کرنے والے کو بھی محبوب نہیں رکھتے، لیکن چونکہ بشر کا بڑا خائن ہونا بتانا مقصود ہے، اس لئے یہ صیغہ مبالغہ لایا گیا) جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ (اپنی خیانت کو) آدمیوں سے تو (شرما کر) چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ (مثلاً ہر وقت کے) اس وقت (بھی) ان کے پاس ہے جب کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو کے متعلق تدبیریں کیا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے (علی) احاطہ میں لے لے ہوئے ہیں، اگرچہ بشر وغیرہ کی حمایت میں بعض اہل محلہ جمع ہو کر آسے تھے وہ سن لیں) تم ایسے ہو کہ تم نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کر لیں ہو (یہ بتلاؤ کہ خدا تعالیٰ کے رد و قیامت کے دن ان کی طرف سے کون جواب دہی کرے گا یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا یعنی نہ کوئی زبانی جواب دہی کر سکے گا نہ کوئی عملی درستی مقدمہ کی کر سکے گا) اور (یہ خائنیں اگر اب بھی توبہ موافق قاعدہ شرعیہ کے کر لیتے تو معافی ہو جاتی، کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) جو شخص کوئی (متعدی، بُرائی کرے یا صرف) اپنی جان کا ضرر کرے (یعنی ایسا گناہ نہ کرے جس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہو اور) پھر اللہ تعالیٰ سے (حسب قاعدہ شرعیہ) معافی چاہے (جس میں بندوں کے حقوق کو ادا کرنا یا ان سے معاف کرنا بھی داخل ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا اور (ضرر گناہوں کو اس کی کوشش کرنا چاہئے کیونکہ) جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات ہی کے لئے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (سب کے گناہوں کی ان کو خبر ہے) بڑے حکمت والے ہیں (مناسب سزا تجویز فرماتے ہیں) اور یہ تو خود گناہ کرنے کا انجام ہوا اور جو کہ دوسروں پر ہمت لگائے اس کا حال سنو کہ) جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ پھر (بجائے اس کے کہ خود ہی توبہ کر لینا چاہئے تھی) اس نے یہ کام کیا کہ اس (گناہ) کی ہمت کسی بے گناہ پر لگا دی سو اس نے تو بڑا بھاری ہمتان اور صریح گناہ اپنے (سہرے) اوپر لا دیا (جیسا بشر نے کیا کہ خود تو چوری کی اور ایک نیک بخت بزرگ آدمی لسیہ کے ذمہ چوری کی ہمت رکھ دی) اور اگر اس مقدمہ میں آپ پر (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہو (جو کہ ہمیشہ آپ پر رہتا ہے) تو ان (چالاک) لوگوں میں سے ایک گروہ نے



تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے ان کی رنگ آمیز باتوں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آئندہ بھی نہ ہوگا۔ چنانچہ فرماتے ہیں: اور وہ (کبھی آپ کو) غلطی میں نہیں ڈال سکتے، لیکن (اس ارادہ سے) اپنی جانوں کو (مبتلائے گناہ اور عذاب کے اہل بنا رہے ہیں) اور آپ کو ذرہ برابر (اس قسم کا) ضرر نہیں پہنچا سکتے اور آپ کو غلطی سے ضرر پہنچانا کب ممکن ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں (جس کے ایک حصہ میں اس قصہ کی اطلاع بھی دیدی) اور آپ کو وہ وہ مفید اور عالی باتیں بتلاتی ہیں جو آپ (پہلے سے) نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

## معارف و مسائل

**رابط آیات** | اوپر ظاہری کفار کے معاملات کے ضمن میں چند جگہ منافقین کا ذکر آیا ہے کہ کفر دونوں میں یکساں ہے، آگے بھی بعض منافقین کے ایک خاص قصہ کے متعلق مضمون مذکور ہوتا ہے (بیان افسران)

**آیات کا شان نزول** | مذکورہ سات آیات ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، لیکن عام تشریحی اسلوب کے مطابق جو ہدایات اس سلسلہ میں دی گئیں وہ مخصوص اس واقعہ کے ساتھ نہیں بلکہ تمام موجودہ اور آئندہ آنے والے مسلمانوں کے لئے عام اور بہت اصولی اور فردی مسائل پر مشتمل ہیں۔ پہلے واقعہ معلوم کیجئے، پھر اس سے متعلقہ ہدایات اور ان سے نکلنے والے مسائل پر غور کیجئے، واقعہ یہ ہوا کہ مدینہ میں ایک خاندان بنو ابی سرق کے نام سے معروف تھا، ان میں سے ایک شخص جس کا نام ترمذی اور حاکم کی روایت میں بشیر ذکر کیا گیا ہے اور بخاری اور ابن جریر کی روایت میں طعمہ نام بتلایا گیا ہے اس نے حضرت قتادہ بن نعانؓ کے چچا رفاعہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں نقب لگا کر چوری کر لی۔ ترمذی کی روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ شخص درحقیقت منافق تھا، مدینہ میں رہتے ہوئے بھی صحابہ کرامؓ کی توہین میں اشعار لکھ کر دوسروں کے ناموں سے ان کی اشاعت کیا کرتا تھا۔

اور چوری کی صورت یہ ہوئی کہ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان فقر و فاقہ کے ساتھ تنگی سے بسر اوقات کرتے تھے، اور ان کی عام خوراک جو کا آٹا تھا یا کھجوریں



یاگیہوں کا آٹما جو بہت کم میسر تھا اور مدینہ میں ملتا بھی نہ تھا، ملک شام سے جب آتا تو کچھ لوگ مہمانوں کے لئے یا کسی خاص ضرورت کے لئے خرید لیا کرتے تھے، حضرت رفاعہؓ نے اسی طرح کچھ گیہوں کا آٹما خرید کر ایک بوری میں اپنے لئے رکھ لیا، اسی میں کچھ اسلحہ وغیرہ بھی رکھ کر ایک چھوٹی کوٹھڑی میں محفوظ کر دیا، ابن ابی بریق، بشیر، یا طعمہ نے اس کو بھاپ لیا، تو نقب لگا کر یہ بوری نکال لی، حضرت رفاعہؓ نے جب صبح کو یہ ماحسرا دیکھا تو اپنے بھتیجے قتادہؓ کے پاس آئے اور واقعہ چوری کا ذکر کیا، سب نے مل کر محلہ میں تفتیش شروع کی، بعض لوگوں نے بتایا کہ آج رات ہم نے دیکھا کہ بنو ابی ریق کے گھر میں آگ روشن تھی ہمارا خیال ہے کہ وہی کھانا پکایا گیا ہے، بنو ابی ریق کو جب راز فاش ہونے کی خبر ملی تو خود آئے اور کہا کہ یہ کام لبید بن ہشل کا ہے، حضرت لبید کو سب جانتے تھے کہ مخلص مسلمان اور نیک بزرگ ہیں ان کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ تلوار کھینچ کر آئے اور کہا کہ چوری میرے سر لگاتے ہو اب میں تلوار اس وقت تک میان میں نہ رکھوں گا جب تک چوری کی حقیقت واضح نہ ہو جائے۔

بنو ابی ریق نے آہستہ سے کہا کہ آپ بے فکر رہیں، آپ کا نام کوئی نہیں لیتا، نہ آپ کا یہ کام ہو سکتا ہے، بغویٰ اور ابن جریر کی روایت میں اس جگہ یہ ہے کہ بنو ابی ریق نے چوری ایک یہودی کے نام لگائی اور ہوشیاری یہ کہ آٹے کی بوری کو تھوڑا سا پھاڑ دیا تھا جس سے آٹا گر تارٹا اور رفاعہؓ کے مکان سے یہودی مذکور کے مکان تک اس آٹے کے آثار پائے گئے شہرت ہونے کے بعد چوری کیا ہوا اسلحہ اور زبردیں بھی اسی یہودی کے پاس رکھوا دیں، اور تحقیق کے وقت اسی کے گھر سے برآمد ہوئیں، یہودی نے قسم کھائی کہ زبردیں مجھے ابن ابی ریق نے دی ہیں۔

ترمذی کی روایت اور بغویٰ کی روایت میں تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ بنو ابی ریق نے اوّل چوری کو لبید بن ہشل کے نام لگایا ہوا، پھر جب بات بنی نظر نہ آئی تو اس یہودی کے سر ڈالا ہوا، بہر حال اب معاملہ یہودی اور بنو ابی ریق کا بن گیا۔

ادھر حضرت قتادہؓ اور رفاعہؓ کو مختلف صورتوں سے یہ گمان غالب ہو گیا تھا کہ یہ کارروائی بنو ابی ریق کی ہے، حضرت قتادہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر چوری کا واقعہ اور سلسلہ تفتیش بنو ابی ریق پر گمان غالب کا ذکر کر دیا، بنو ابی ریق کو خبر ملی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت رفاعہؓ اور قتادہؓ کی شکایت کی، کہ بلا ثبوت شرعی چوری ہمارے نام لگائی ہے، حالانکہ مسروقہ مال یہودی کے گھر سے برآمد ہوا ہے، آپ اُن کو روکے کہ ہمارا نام نہ لگائیں یہودی پر دعویٰ کریں۔



ظاہری حالات و آثار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی اسی طرف رجحان ہو گیا کہ یہ کام یہودی کا ہے، بنو ابیرق پر الزام صحیح نہیں، یہاں تک کہ بغوی کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ہو گیا کہ یہودی پر چوری کی سزا جاری کر دی جائے اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔

ادھر جب حضرت قتادہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ آپ بغیر دلیل اور ثبوت کے ایک مسلمان گھرانے پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں، حضرت قتادہؓ اس معاملہ سے بہت رنجیدہ ہوئے، اور افسوس کیا کہ کاش میں اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات نہ کرتا، اگرچہ میرا مال بھی جاتا رہتا اسی طرح حضرت رفاعہؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ارشاد فرمایا تو انہوں نے بھی صبر کیا اور کہا: وَاللّٰهُ اَلْمُسْتَعَانُ۔

اس معاملہ پر کچھ وقت نہ گزرا تھا کہ قرآن کریم کا ایک پورا رکوع اس باغی میں نازل ہو گیا جس کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر واقعہ کی حقیقت منکشف کر دی گئی اور ایسے معاملات کے متعلق عام ہدایات دی گئیں۔

قرآن کریم نے بنو ابیرق کی چوری کھول دی، اور یہودی کو بری کر دیا، تو بنو ابیرق مجبور ہوئے اور مال مسروقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا، آپؐ نے رفاعہ رضی اللہ عنہ کو واپس دلایا، اور انہوں نے اب سب اسلحہ کو جیاد کے لئے وقف کر دیا، ادھر جب بنو ابیرق کی چوری کھل گئی تو بشیر بن ابیرق مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلا گیا اور شرکیں کے ساتھ مل گیا، اگر وہ پہلے سے منافق تھا تو اب کھلا کافر ہو گیا، اور اگر پہلے مسلمان تھا تو اب مرتد ہو گیا۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اللہ اور رسولؐ کی مخالفت کے وبال نے بشیر بن ابیرق کو مکہ میں بھی چین سے نہ رہنے دیا، جس عورت کے مکان پر جا کر ٹھہرا تھا، اس کو واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے نکال باہر کیا، اسی طرح پھرتے پھرتے آخر اس نے ایک اور شخص کے مکان میں نقب لگائی، تو دیوار اس کے اوپر گر گئی، اور وہیں دب کر مر گیا۔ یہاں تک تو واقعہ کی پوری تفصیل تھی، اب اس کے متعلق قرآنی ارشادات پر غور کیجئے:

پہلی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چوری کے واقعہ کی اصل حقیقت بتلا کر ارشاد فرمایا کہ ہم نے آپؐ پر قرآن اور وحی اسی لئے نازل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ



جو علم و معرفت آپ کو عطا فرمایا ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں، اور خائنوں کی بعضی بنو امیہ کی طرف داری نہ کریں، اور اگرچہ ظاہری حالات اور قرآن کی بناء پر چوری کے معاملہ میں یہودی کی طرف آپ کا رجحان کوئی گناہ نہ تھا، مگر تھا تو واقعہ کے خلاف، اس لئے دوسری آیت میں آپ کو استغفار کا حکم دیا گیا کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام بہت بلند ہے، ان سے اتنی بات بھی پسند نہیں۔

تیسری آیت (یعنی آیت ۱۰۷) میں پھر اس کی تاکید فرمائی کہ خیانت کرنے والوں کی طرف سے آپ کوئی جواب دہی نہ کریں، کیونکہ وہ اللہ کو پسند نہیں۔

چوتھی آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۸) میں ان خیانت کرنے والوں کے بُرے حال اور بیوقوفی کا بیان ہے، کہ یہ لوگ اپنے ہی جیسے آدمیوں سے تو شرماتے اور چوری کو چھپاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے، اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، خصوصاً اس واقعہ کو جب انھوں نے باہم مشورہ کر کے یہ رائے قائم کی کہ الزام یہودی پر لگاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رفاۃ اور فتاوہ کی شکایت کرو کہ بلاوجہ ہم پر الزام لگایا ہے، اور آپ سے اس کی درخواست کرو کہ آپ یہودی کے مقابلہ میں ہماری حمایت فرمائیے۔ پانچویں آیت (یعنی آیت نمبر ۱۰۹) میں بنو امیہ کی مدد کرنے والے حمایتیوں کو تنبیہ فرمائی گئی کہ دنیا میں تو تم نے ان کی حمایت کر لی، مگر معاملہ یہیں تو ختم نہیں ہو جاتا، قیامت میں جب حق سبحانہ و تعالیٰ کی عدالت میں معاملہ پیش ہو گا وہاں کون حمایت کرے گا، اس آیت میں ان کو ملامت بھی ہے اور آخرت کا خوف دلا کر اپنے فعل سے توبہ اور رجوع کی ترغیب بھی۔

چھٹی آیت (یعنی نمبر ۱۱۰) میں قرآن کریم کے عام اسلوب حکیمانہ کے مطابق مجرموں گنہگاروں کو ناامیدی سے بچانے کے لئے فرمایا گیا، کہ چھوٹا گناہ ہو یا بڑا، جب گنہگار اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو غفور و رحیم پاتا ہے، اس میں ان لوگوں کو جن سے یہ گناہ سرزد ہوا تھا اس کی ترغیب ہے کہ اب بھی باز آجائیں، اور دل سے توبہ کر لیں تو کچھ نہیں بگڑا، اللہ تعالیٰ سب معاف فرمائیں گے۔

ساتویں آیت (یعنی ۱۱۱) میں یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اگر یہ لوگ اب بھی تائب نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول یا مسلمانوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اس کا وبال خود اسی شخص پر ہے۔

آٹھویں آیت (یعنی ۱۱۲) میں ایک عام ضابطہ کی صورت ارشاد فرمایا کہ جو شخص



خود کوئی جرم کرے، اور پھر یہ جرم کسی بے قصور انسان کے ذمہ لگائے، (جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا) بڑی خودی اور الزام حضرت لبید یا یہودی پر لگا دیا، تو اس نے بہت بڑا ہستان اور صریح گناہ اپنے اوپر لا دیا۔

نویں آیت ربیع یعنی نمبر ۱۱۳ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت آپ کے ساتھ نہ ہوتی جس نے بذریعہ وحی آپ کو واقعہ کی حقیقت بتلا دی تو یہ لوگ آپ کو غلطی میں مبتلا کر دیتے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت آپ کے ساتھ ہے، اس لئے وہ ہرگز آپ کو غلطی میں نہیں ڈال سکے، بلکہ خود ہی مگر اسی میں مبتلا ہوتے ہیں، اور آپ کو یہ ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور دانشمندی کی باتیں نازل فرمائی ہیں جن کو آپ نہیں جانتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ اِنَّ اِسْ آیت سے پانچ مسائل ثابت ہوئے، ایک تو یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مسائل میں جن میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح وارد نہ ہو اپنی رائے سے اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا، اور ہمت کے فیصلوں میں آپ بہت سے فیصلے اپنے اجتہاد سے بھی فرماتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجتہاد رائے وہی معتبر ہے جو قرآنی اصول اور نصوص سے ماخوذ ہو، خالص رائے اور خیال معتبر نہیں، اور نہ اس کو شریعت میں اجتہاد کہا جاسکتا ہے۔

تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد دوسرے ائمہ مجتہدین کی طرح نہ تھا، جس میں غلطی اور خطا کا احتمال ہمیشہ باقی رہتا ہے، بلکہ جب آپ کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے فرماتے تو اگر اس میں کوئی غلطی ہو جاتی تو حق تعالیٰ اس پر آپ کو متنبہ فرما کر آپ کے فیصلہ کو صحیح اور حق کے مطابق کر دیتے تھے، اور جب آپ نے کوئی فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے خلاف کوئی چیز نہ آئی تو یہ علامت اس کی تھی کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کو پسند اور اس کے نزدیک صحیح ہے۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ قرآن سے سمجھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا سمجھایا ہوا ہوتا تھا، اس میں غلط فہمی کا امکان نہ تھا، بخلاف دوسرے علماء و مجتہدین کے کہ ان کا سمجھا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح منسوب نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا ہے، جیسا کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق



ہمّا آراء اللہ وارد ہے، اسی وجہ سے جب ایک شخص نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے یہ کہا  
فَاَحْكُمْ بَيْنَا اَرَاكَ اللّٰهُ تَوَّابًا نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے  
پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جھوٹے مقدمہ اور جھوٹے دعویٰ کی پیروی یا وکالت کرنا یا  
اس کی تائید و حمایت کرنا سب حرام ہے۔

**توبہ کی حقیقت** اور آیت نمبر ۱۱ یعنی وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ اِلٰهِ سے  
یہ معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق  
ہو یا حقوق اللہ سے، ہر قسم کا گناہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتا ہے، البتہ توبہ و استغفار  
کی حقیقت جائنا ضروری ہے، محض زبان سے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوبُ اِلَيْهِ کہنے کا نام  
توبہ و استغفار نہیں ہے، اسی لئے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص کسی گناہ میں مبتلا  
اس پر اس کو ندامت بھی نہیں، اور اس کو چھوڑا بھی نہیں، یا آئندہ کے لئے چھوڑنے کا  
عزم نہیں کیا، اور اس حالت میں زبان سے استغفار اللہ کہتا ہے تو یہ توبہ کے ساتھ  
مذاق کرنا ہے۔

خلاصہ یہ کہ توبہ کے لئے تین چیزیں ہونا ضروری ہیں، ایک گزشتہ گناہوں  
پر نادم ہونا، دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہو اس کو اسی وقت چھوڑ دینا، اور تیسرے  
آئندہ کے لئے گناہ سے بچنے کا پختہ ارادہ کرنا، البتہ جن گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے  
ہے ان کو اپنی سے معاف کرانا، یا حقوق ادا کرنا بھی توبہ کی شرط ہے۔

اپنے گناہ کا الزام دوسرے پر لگانا اور آیت نمبر ۱۲ یعنی وَمَنْ يَكْسِبْ خَطِيئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ  
دو گئے عذاب کا سبب ہے۔ **یَرْجِمُ بِهِ الْاِلٰهَ** سے معلوم ہوا کہ جو شخص گناہ خود کرے اور اس کا  
الزام دوسرے بے گناہ آدمی پر لگا دے، تو اس نے اپنے گناہ کو دُور گنا اور نہایت سخت  
کر دیا، اور عذاب شدید کا مستحق ہو گیا، ایک تو خود اصل گناہ کا عذاب، دوسرے افزاء  
اور بہتان کا شدید عذاب۔

**قرآن سنت کی حقیقت** آیت نمبر ۱۳ یعنی وَانْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ  
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ الْاِلٰهِ میں

کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی داخل فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حکمت  
جو نام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیمات کا، یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی  
نازل کی ہوئی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس کے الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، اسی  
لئے داخل قرآن نہیں، اور معانی اس کے اور قرآن کے دونوں اللہ ہی کی جانب سے ہیں



اس لئے دونوں پر عمل کرنا واجب ہے۔

اس سے اس کلام کی حقیقت معلوم ہو گئی جو بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں مثلاً (جو تلاوت کی جاتی ہے) اور غیر مثلاً (جو تلاوت نہیں کی جاتی) وحی متلو قرآن کا نام ہے جس کے معانی اور الفاظ دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، اور غیر متلو حدیث رسول کا نام ہے جن کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور معانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم | دوسرا مسئلہ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ الخ سے یہ ثابت ہوا کہ ساری مخلوقات سے زائد ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے برابر تمام کائنات کا علم محیط تھا، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں، بلکہ جتنا علم حق تعالیٰ عطا فرماتے وہ مل جاتا تھا ہاں اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم عطا ہوا وہ ساری مخلوقات کے علم سے زائد ہے۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ

کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہے صدقہ کرنے کو یا

مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ

نیک کام کو یا صلح کرانے کو لوگوں میں اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ

اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۱۴﴾

کی خوشی کے لئے تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور

يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُرْسَلِينَ قُلْ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ

چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس اختیار کی اور ڈالیں گے

جَهَنَّمَ طَوْسَاعَاتٍ نَّصِيرًا ﴿۱۱۵﴾

ہم اس کو دوئی میں اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا

خُلَاصَةُ تَفْسِيرِ

عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب و برکت) نہیں ہوتی، ہاں مگر جو لوگ



ایسے ہیں کہ (خیر، خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں) اور اس تعلیم و ترغیب کی تکمیل و انتظام کے لئے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں، یا خود ہی صدقہ وغیرہ کی دوسروں کو خفیہ ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بعض اوقات خفیہ ہی بہت مصلحت ہوتا ہے، ان کے مشوروں میں البتہ خیر یعنی ثواب اور برکت ہے، اور جو شخص یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے زندہ جاوید شہرت کی غرض سے، سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو شخص رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق کام ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ بولیا (جیسا بشیر مرتد ہو گیا حالانکہ اسلام کا حق ہونا اور نیز اس خاص واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا خود اس کی نظر میں حق ہونا معلوم تھا، پھر بھی اسے بدبختی نے گھیرا) تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ دہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بڑی جگہ ہے جانے کی۔

## معارف و مسائل

باہمی مشوروں اور ارشاد ہے لَا تَخْتَلَفُ فِي كُتَيْبَاتٍ تَجُوهِمُ یعنی لوگوں کے باہمی مشورے اور مجلسوں کے آداب تدبیریں جو آخرت کی فکر اور انجام پر غور سے آزاد ہو کر محض چند روزہ دنیوی اور وقتی منافع کے لئے ہوا کرتے ہیں ان میں کوئی خیر نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا إِلَّا مَنْ آمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یعنی ان مشوروں اور سرگوشیوں میں اگر خیر کی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کو صدقہ خیرات کی ترغیب دے، یا نیکی کا حکم کرے، یا لوگوں کے آپس میں صلح کرانے کا مشورہ دے، ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ انسان کا ہر کلام اس کے لئے مضر ہی ہے، بجز اس کے کہ کلام میں اللہ کا ذکر ہو یا امر بالمعروف یا نہی عن المنکر ہو۔

معروف کے معنی ہیں ہر وہ کام جو شریعت میں اچھا سمجھا جائے، اور جس کو اہل شرع پہچانتے ہوں، اور اس کے مقابل منکر ہے، یعنی ہر وہ کام جو شریعت میں ناپسندیدہ اور اہل شرع میں اوپرا اور اجنبی ہو۔

امر بالمعروف، ہر نیکی کے حکم اور ترغیب کو شامل ہے، جس میں منظورم کی امداد کرنا، حاجتمندوں کو قرض دینا، گم شدہ کو راستہ بتا دینا وغیرہ سب نیک کام داخل ہیں، اور صدقہ اور اصلاح بین الناس بھی اگرچہ اس میں داخل ہے، لیکن ان کو تخصیص



کے ساتھ علیحدہ اس لئے بیان کیا گیا کہ ان دونوں چیزوں کا نفع متحد ہی ہے، اور ان سے فتنے کی اجتماعی زندگی سدھرتی ہے۔

نیز یہ دونوں کام خدمت خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں، ایک جلب منفعت یعنی خلق اللہ کو نفع پہنچانا، دوسرے دفع مضرت یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا، صدقہ نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اور اصلاح بین الناس خلق اللہ کو مضرت اور نقصان سے بچانے کا اہم عنوان ہے، اس لئے جمہور علماء تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوٰۃ، صدقات واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی، اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے۔

**صلح کرانیکی فضیلت** | لوگوں کی باہمی رنجشیں دور کرنے اور ان کے آپس میں مصالحت و موافقت پیدا کرنے کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات نہایت اہم ہیں، آپ نے فرمایا:

”کیا میں تم کو ایسا کام نہ بتاؤں جس کا درجہ روزے، نماز، اور صدقہ میں سب سے افضل ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ضرور بتائیے، آپ نے فرمایا کہ وہ کام اصلاح ذات البین ہے، یعنی دو شخصوں کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو جائے تو اس کو دور کر کے آپس میں صلح کرانا اور فساد کو ختم کرنا۔“

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: **قَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ** ”یعنی لوگوں کے آپس میں جھگڑا فساد موند دینے والی چیز ہے“ پھر اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ یہ جھگڑا سر کو نہیں موندتا، بلکہ انسان کے دین کو موند ڈالتا ہے۔“

آیت کے آخر میں ایک اور اہم مضمون یہ ارشاد فرمایا کہ یہ نیکیاں صدقہ اور امر بالمعروف اور اصلاح بین الناس اسی وقت معتبر اور مقبول ہو سکتی ہیں جبکہ ان کو اخلاص کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے، اس میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو۔

**اجماع امت حجت ہے** | وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا قَبِلَ لَهُ الْهُدًى (آیت نمبر ۵۸) اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور

دخول جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے، ایک مخالفت رسولؐ، اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفت رسولؐ کفر اور وبال عظیم ہے، دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اُس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ اجماع امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن و سنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہے اسی طرح



امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے، اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے، جیسا کہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: **يَنْهَى اللَّهُ عَلَى الْجَمَاعَةِ مَنْ شَنَّ شَنْ فِي النَّارِ**۔ یعنی جماعت کے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے، اور جو شخص جماعت مسلمین سے علحدہ ہو گا وہ علحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

حضرت امام شافعیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا اجماع امت کے حجت ہونے کی دلیل قرآن مجید ہے؟ آپ نے قرآن سے دلیل معلوم کرنے کے لئے تین روز تک مسلسل تلاوت قرآن کو معمول بنایا، ہر روز دن میں تین مرتبہ اور رات میں تین مرتبہ پورا قرآن ختم کرتے تھے، بالآخر یہی مذکورہ آیت ذہن میں آئی، اور اس کو علامہ کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجت پر یہ دلیل کافی ہے۔

**إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ**

یشک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا

**لِمَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۱۶**

جسکو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا وہ بہک کر دور جا پڑا،

**إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنشَاءً وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا**

اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر عورتوں کو اور نہیں پکارتے مگر

**شَيْطَانًا مَرِيدًا ۝۱۷ لَعَنَهُ اللَّهُ وَقَالَ لَا تَخِذْنَ مِنْ**

شیطان سرکش کو جس پر لعنت کی اللہ نے اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لوں گا

**عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ۝۱۸ وَلَا ضِلَّتْ لَهُمْ وَلَا مِئِينًا لَهُمْ**

تیرے بندوں سے حصہ مفترکہ اور ان کو بہکاؤں گا اور ان کو امیدیں دلاؤں گا

**وَلَا مَرْئِيَهُمْ فَلْيُبَيِّئْنَ أَذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَا مَرْئِيَهُمْ**

اور ان کو سکھلاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے کان اور ان کو سکھلاؤں گا کہ

**فَلْيَغَيِّرْنَ خَلْقَ اللَّهِ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِّنْ**

بدلیں صورتیں بناتی ہوئی اللہ کی اور جو کوئی بناوے شیطان کو دوست اللہ کو

**دُونِ اللَّهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرًا مُّبِينًا ۝۱۹ يَعْلُ هُمْ وَ**

چھوڑ کر تو وہ پڑا صریح نقصان میں ان کو وعدہ دیتا ہے اور



يَمْنِيهِمْ وَمَا يَعِدُّهُمْ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ①۳۰

ان کو امیدیں دلاتا ہے اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان سو سب فریب ہے

أُولَٰئِكَ مَا وَاعَدَ جَهَنَّمَ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ①۳۱

ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ اور نہ پاویں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کی جگہ

## خلاصہ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزائے کر بھی) نہ بخشے گا کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ سزائے ابدی میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ جس کے لئے منظور ہوگا) (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا اب وہ سزائے دائمی بھی نہ رہے گی) اور (وجہ اس مشرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ (امحق ہے) بڑی دور کی مگر اسی میں جا پڑا وہ امر حق توحید ہو عقلاً بھی واجب ہے، اور کار ساز کی تعظیم اس کے حقوق میں سے ہے، پس مشرک نے حضرت صانع کار ساز کی اہانت کی، اس لئے ایسی سزا کا مستحق ہوگا، بخلاف دوسرے گناہوں کے کہ وہ مگر اہی تو ہے مگر توحید کے خلاف اور اس سے بعید نہیں، اس لئے قابلِ مغفرت قرار دیا گیا اور مشرک کی طرح دوسری قسم کے کفر بھی ناقابلِ معافی ہونے میں شریک ہیں، کیونکہ اس میں بھی انکار ہوتا ہے، صانع کی کسی بتلانی ہوئی بات کا پس وہ اس کی صفتِ صدق کا انکار کرتا ہے، اور بعض کا فر خود ذات باری تعالیٰ ہی کے منکر ہیں، بعض کسی صفت کے منکر ہیں، اور بعض صفت اور ذات دونوں کے منکر ہیں، اور ان میں سے جس کا بھی انکار ہو وہ توحید کا انکار اور اس سے بُعد ہے، پس کفر و مشرک دونوں قابلِ معافی نہیں ہیں، آگے مشرکین کی بیوقوفی ان کے مذہبی طریقے میں بیان کرتے ہیں کہ یہ (مشرک) لوگ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (ایک تو) صرف چند زانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور (ایک) صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ (خدا تعالیٰ کے) حکم سے باہر ہے (اور جبکہ اس بے حکمی کی وجہ سے) خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت (خاصہ) سے دور ڈال رکھا ہے، اور جس نے (جس وقت کہ رحمت خاصہ سے دور اور ملعون ہونے لگا) یوں کہا تھا (جس سے اس کی عداوت صاف ظاہر معلوم ہو رہی تھی) کہ میں (پوری کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ) ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقرر حصہ اطاعت کا



لوں گا اور (اس حصہ کی تفصیل یہ ہے کہ) میں ان کو (عقائد میں) گمراہ کروں گا اور میں ان کو (خیالات میں) ہوسیں دلاؤں گا (جس سے گناہ کی طرف میلان ہو اور ان کی مضرت نظر میں نہ رہے) اور میں ان کو (بُرائے اعمال کرنے کی) تعلیم دوں گا جس سے وہ (بتوں کے نام پر) چوپاؤں کے کانوں کو تراشا کریں گے (اور یہ اعمال کفر یہ میں سے ہے) اور میں ان کو (اور بھی) تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑ کریں گے (اور یہ اعمال فسقہ میں سے ہے جیسے ڈاڑھی منڈانا، بدن گدانا وغیرہ) اور جو شخص خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنا دیکھا (یعنی خدا تعالیٰ کی اطاعت نہ کرے اور شیطان کی اطاعت کرے) وہ (شخص) صریح نقصان (و زیان) میں واقع ہوگا (وہ زیان جہنم میں جانا ہے) شیطان ان لوگوں سے (عقائد کے متعلق جھوٹے) وعدے کیا کرتا ہے (کہ تم بے فکر رہو نہ کہیں حساب ہے نہ کتاب ہے) اور (خیالات میں) ان کو ہوسیں دلاتا ہے (کہ اس گناہ میں ایسی لذت ہے) اس حرام ذریعہ میں ایسی آمدنی ہے اور اعمالِ شیطانیہ کا وجود اور لغویت اور مضرت خود ظاہر ہے) اور شیطان اُن سے صرف جھوٹے (غریب آمیز) وعدے کرتا ہے (کیونکہ واقع میں حساب و کتاب حق ہے اور اس کی ہوسوں کا فریب ہونا تو بہت جلد ہی کھل جاتا ہے) ایسے لوگوں کا (جو کہ شیطان کی راہ پر چلتے ہیں) ٹھکانا جہنم ہے (اور وہ خسرانِ مبین یہی ہے) اور اس (جہنم) سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے (کہ وہاں جا کر پناہ لیں)

## معارف و مسائل

**رابطہ آیات** | اوپر ذکر جہاد میں گو سب مخالفین اسلام داخل ہیں، لیکن بیان احوال میں اب تک یہود اور منافقین کے احوال کا بیان ہوا تھا، اور مخالفین میں ایک جماعت بلکہ اوروں سے بڑی مشرکین کی تھی، آگے کچھ ان کے عقائد کی حالت اور طریقہ مذمت اور اس کی سزا کا ذکر ہے، اور اس مقام پر یہ اس لئے اور زیادہ مناسب ہو گیا کہ اوپر جس سارق کا قضیہ ذکر کیا گیا ہے اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ وہ سارق مرتد تھا، پس اس سے اس کی دائمی سزا کا حال معلوم ہو گیا (بیان القرآن)

پہلی آیت یعنی إِنَّ اللَّهَ لَا يُغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ، شروع میں سورہ نساء (آیت ۴۸) میں انہی الفاظ کے ساتھ آجی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں خاتمہ آیت پر وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا آیا ہے، اور یہاں وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا، وجہ فرق کی ائمہ تفسیر کی تصریحات کے



مطابق یہ ہے کہ پہلی آیت کے مخاطب براہ راست یہود اہل کتاب تھے، جن کو بذریعہ تورات توحید کا حق ہونا اور شرک کا باطل ہونا، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی برحق ہونا سب کچھ معلوم تھا، اس کے باوجود وہ شرک میں مبتلا ہو گئے تو گویا اپنے عمل سے انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ تورات کی یہی تعلیم ہے جو ہر اس راہ گزار اور بہتان ہے، اس لئے اس آیت کے آخر میں فَقَدْ افْتَرَىٰ اِثْمًا عَظِيْمًا ارشاد ہوا، اور دوسری آیت کے مخاطب براہ راست مشرکین مکہ تھے، جن کے پاس اس سے پہلے نہ کوئی کتاب تھی نہ پیغمبر مگر توحید کے عقلی دلائل بالکل واضح تھے، اور اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے پتھروں کو اپنا معبود بنا لینا ادنیٰ عقل والے کے لئے بھی لغو و باطل اور گمراہی تھا، اس لئے یہاں ارشاد ہوا فَقَدْ ضَلَّ سَبِيْلًا بَعِيْدًا

شرک اور کفر کی سزا | یہاں بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدر عمل ہونی چاہئے، مشرک کا دائمی ہونا اور کافر نے جو جرم کفر اور شرک کا کیا ہے، وہ محدود مدت عمر کے اندر کیا ہے تو اس کی سزا غیر محدود اور دائمی کیوں ہونی؟ جواب یہ ہے کفر و شرک کرنے والا چونکہ اس کو جرم ہی نہیں سمجھتا بلکہ نیکی سمجھتا ہے، اس لئے اس کا عزم و قصد یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے گا، اور جب مرتے دم تک وہ اسی پر قائم رہا، تو اپنے اختیار کی حد تک اس نے جرم دائمی کر لیا اس لئے سزا بھی دائمی ہوئی۔

ظلم کی تین قسمیں | ظلم کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشیں گے، دوسری قسم وہ ہے جس کی مغفرت ہو سکے گی، اور تیسری قسم وہ ہے کہ جس کا بدلہ اللہ تعالیٰ لئے بغیر نہ چھوڑیں گے۔

پہلی قسم کا ظلم شرک ہے، دوسری قسم کا ظلم حقوق اللہ میں کوتاہی ہے، اور تیسری قسم کا ظلم حقوق العباد کی خلاف ورزی ہے (ابن کثیر بحوالہ مسند بزار)

شرک کی حقیقت | اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کو عبادت یا محبت و تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر سمجھنا ہے، قرآن کریم نے مشرکین کے اس قول کو جو وہ جہنم میں پہنچ کر کہیں گے، نقل کیا ہے :

قَالُوْا اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ لُسُوْا بِكُمْ بِرَبِّ اَظْلَمِيْنَ ۝	یعنی قسم خدا کی ہم گھل گمراہی میں تھے جب کہ ہم نے تم کو اللہ رب اظلمین کے برابر قرار دیدیا تھا
---	--

ظاہر ہے کہ مشرکین کا بھی یہ عقیدہ تو نہ تھا کہ ہمارے گھڑے ہوئے پتھر اس جہان کے



خالق اور مالک ہیں، بلکہ انھوں نے دوسری غلط فہمیوں کی بناء پر ان کو عبادت میں یا محبتِ تعظیم میں اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دے رکھا تھا، یہی وہ شرک تھا جس نے ان کو جہنم میں پہنچا دیا، (فتح الملہم) معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفات خالق، رازق، قادر، مطلق، عالم الغیب والشہادۃ وغیرہ میں کسی مخلوق کو اللہ کے برابر سمجھنا شرک ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے اچھے ان کو ہم داخل کریں گے باغوں

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا وَعْدَ

میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی ہمیشہ وعدہ ہے

اللَّهِ حَقًّا وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ۝۱۲۶

اللہ کا سچا، اور اللہ سے زیادہ سچا کون نہ تمھاری

يَأْمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلُ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ

امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر جو کوئی بُرا کام کرے گا اس

بِهِ وَلَا يَجِدُ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝۱۲۷

کی سزا پادگیا اور نہ پادے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار اور

مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَهُوَ

جو کوئی کام کرے اچھے مرد ہو یا عورت اور وہ

مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ

ایمان رکھتا ہو سو وہ لوگ داخل ہوں گے جنت میں اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا

نَقِيرًا ۝۱۲۸ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ

تعلیٰ بھر، اور اس سے بہتر کس کا دین، جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم

لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَاتَّخَذَ

پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دینِ ابراہیم پر جو ایک ہی طرف کا تھا اور اللہ

اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ۝۱۲۹ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي

نے بنالیا ابراہیم کو خالص دوست اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور



الْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا ۝

زمین میں اور سب چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں

## خلاصہ تفسیر

اور جو لوگ ایمان لاتے اور (انہوں نے) اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کر لیں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے خدا تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے اور خدا تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں بلکہ مدارکار اطاعت پر ہے پس) جو شخص (اطاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی بُرا کام کرے گا (خواہ عقائد سے ہو یا اعمال سے) وہ اس کے عوض میں سزا دیا جاوے گا (اگر وہ برائی عقیدہ کفریہ تک ہے تو سزا داری اور یقینی اور اگر اس سے کم ہے تو سزا ہمیشہ کی نہیں) اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مددگار ملے گا، (کہ خدا کے عذاب سے اسے بچھڑالے) اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مؤمن ہو سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ ان کی کوئی نیکی ضائع کر دی جائے) اور (اوپر جو مؤمن کی قید لگائی گئی ہے اس کا مصداق ہر فرقہ نہیں بلکہ صرف وہ فرقہ جس کا دین خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے میں سب سے اچھا ہو، اور ایسا فرقہ صرف اہل اسلام ہی ہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں یہ صفات ہیں: مکمل اطاعت احسان، ملتِ ابراہیم کی پیروی اور) ایسے شخص (کے دین) سے زیادہ بہتر کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مکمل بھی ہو کہ دل سے فرمانبرداری اختیار کی ہو خالی مصلحت ظاہر داری نہ ہو، اور وہ ملتِ ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں اور ملتِ ابراہیم ضرور قابلِ اتباع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا تھا (تو ظاہر ہے کہ دوست کے طریقہ پر چلنے والا بھی محبوب و مقبول ہوگا، پس طریقہ اسلام مقبول ہوا پس اہل اسلام ہی مؤمن کے لقب کے مصداق ٹھہرے، اور دوسرے فرقوں نے ابراہیم کی پیروی کو چھوڑ دیا، کہ اسلام نہ لاتے، اس لئے صرف مسلمان ہی ایسے ثابت ہوئے کہ محض امانی یعنی تمناؤں پر ان کا سہارا نہیں، بلکہ اطاعت گزار ہیں، پس کام اپنی کا چلے گا، اور اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری



کرنا تو ضروری ہے، کیونکہ ان کی سلطنت و قدرت اور ان کا علم محیط دونوں تمام اور مکمل ہیں اور یہی امور مدار میں وجوب اطاعت کے چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یہ تو کمال سلطنت ہوا) اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو (اپنے علم میں) احاطہ فرماتے ہوئے ہیں (یہ کمال علمی ہوا)

## معارف و مسائل

مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان ایک مفاخرانہ گفتگو

قَسَّ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا آمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ ان آیات میں پہلے ایک مکالمہ اور گفتگو کا ذکر ہے، جو مسلمانوں اور اہل کتاب

کے درمیان ہوئی تھی، اور پھر اس مکالمہ پر محاکمہ کیا گیا ہے، فریقین کو صحیح راہ ہدایت بتلائی گئی، آخر میں اللہ کے نزدیک مقبول اور افضل و اعلیٰ ہونے کا ایک معیار بتلادیا گیا جس کو سامنے رکھا جائے تو کبھی انسان غلطی اور گمراہی کا شکار نہ ہو۔

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کچھ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان مفاخرت کی گفتگو ہونے لگی، اہل کتاب نے کہا کہ ہم تم سے افضل و اشرف ہیں، کیونکہ ہمارے نبیؐ تمہارے نبیؐ سے پہلے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے، مسلمانوں نے کہا کہ ہم تم سب سے افضل ہیں، اس لئے کہ ہمارے نبیؐ خاتم النبیین ہیں، اور ہماری کتاب آخری کتاب ہے، جس نے پہلی سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

قَسَّ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا آمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ الخ یعنی یہ تفاخر اور تعلق کسی کے لئے زیبا نہیں، اور محض خیالات اور تمناؤں اور دعویوں سے کوئی کسی پر افضل نہیں ہوتا، بلکہ مدار اعمال پر ہے، کسی کا نبی اور کتاب کتنی ہی افضل و اشرف ہو اگر وہ عمل غلط کرے گا تو اس کی ایسی سزا پائے گا کہ اس سے بچانے والا اس کو کوئی نہ ملے گا۔

یہ آیت جب نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ پر بہت شاق ہوئی، امام مسلم، ترمذی، نسائی اور امام احمد رحمہم اللہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ یعنی جو کوئی کچھ بُرائی کرے گا اس کی سزا دی جائے گی، تو ہم سخت رنج و غم اور فکر میں پڑ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اس آیت نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں، ذرا سی بُرائی بھی ہوگی تو اس کی سزا ملے گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فکر میں نہ پڑو، اپنی طاقت و قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو، کیونکہ (جس سزا کا یہاں ذکر ہے ضروری نہیں کہ



وہ جہنم ہی کی سزا ہو بلکہ تمہیں دنیا میں جو بھی کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آتی ہے یہ تمہارے گناہوں کا کفارہ اور بُرائی کی جزا ہوتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا لگ جائے تو وہ بھی کفارہ گناہ ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ مسلمان کو دنیا میں جو بھی کوئی غم یا تکلیف یا بیماری یا فکر لاحق ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے۔

جامع ترمذی اور تفسیر ابن جریر وغیرہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يَجْزِيْهِ ان کو سنائی تو ان پر یہ اثر ہوا جیسے سر ٹوٹ گئی ہو، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اثر دیکھ کر فرمایا، کیا بات ہے؟ تو صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی بُرائی نہیں کی، اور جب ہر بُرائی کی جزا ملنی ہے تو ہم میں سے کون بچے گا؟ آپؐ نے فرمایا، اے ابوبکر! آپ اور آپ کے مؤمن بھائی کوئی فکر نہ کریں، کیونکہ دنیا کی تکلیف کے ذریعہ آپ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ کیا آپ بیمار نہیں ہوتے؟ کیا آپ کو کوئی مصیبت اور غم نہیں پہنچتا؟ صدیق اکبرؓ نے عرض کیا، بے شک سب چیزیں پہنچتی ہیں، آپؐ نے فرمایا، بس یہی جزا ہے تمہارے سیئات کی۔

اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث میں ہے جس کو ابو داؤد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ بندہ کو جو بخار یا تکلیف پہنچتی ہے یا کانٹا لگتا ہے تو اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی شخص اپنی کوئی چیز ایک جیب میں تلاش کرے مگر دوسری جیب میں ملے، اتنی مشقت بھی اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت دی ہے، کہ محض دعووں اور تمناؤں میں نہ لگیں، بلکہ عمل کی فکر کریں، کیونکہ کامیابی صرف اس سے نہیں کہ تم فلاں نبی یا فلاں کتاب کے نام لینے والے ہو، بلکہ اصل فلاح اس میں ہے کہ اس پر صحیح ایمان اور اس کے مطابق اعمال صالحہ کے پابند رہو، ارشاد ہے:

وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْشَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ  
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ لِقَیْرًا یعنی جو مرد یا عورت نیک عمل کرے بشرطیکہ اس عمل کے ساتھ ایمان بھی ہو تو ضرور جنت میں جائے گا اور ان کے اعمال کا بدلہ پورا پورا ملے گا جس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی۔ اس میں اشارہ فرمایا کہ اہل کتاب یا دوسرے غیر مسلم اگر ان کے



اعمال نیک بھی ہوں تو چونکہ ان کا ایمان صحیح نہیں، اس لئے وہ عمل مقبول نہیں، اور مسلمانوں کا چونکہ ایمان بھی صحیح ہے اور عمل بھی نیک ہے، اس لئے وہ کامیاب اور دوسروں سے افضل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا ایک معیار چوتھی آیت میں افضلیت اور مقبولیت عند اللہ کا ایک معیار بتلایا گیا ہے، جس سے اس کا صحیح فیصلہ ہو سکتا ہے کہ کون مقبول ہے اور کون مردود، اس معیار کے دو حصے ہیں، ان میں سے ایک میں بھی خلل آئے تو ساری کوششیں اکارت اور ضائع ہو جاتی ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جہاں کہیں کوئی گمراہی یا غلط کاری ہے وہ انہی دو حصوں میں کسی ایک جز کے خلل سے پیدا ہوتی ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں موازنہ کریں یا خود مسلمانوں کے فرقوں، جماعتوں اور پارٹیوں میں مقابلہ کریں تو معلوم ہو گا کہ یہی دو نقطے ہیں جن میں سے کسی ایک سے ہٹ جانا انسان کو ذلت و ضلالت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

ارشاد فرمایا: وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا یعنی اس شخص سے بہتر کسی کا طریقہ نہیں ہو سکتا جس میں دو باتیں پائی جائیں، ایک اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ، یعنی اپنی ذات کو اللہ کے سپرد کر دے، دیکھاری یا دنیا سازی کے لئے نہیں بلکہ حلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے عمل کرے دوسرے وَهُوَ مُحْسِنٌ، یعنی وہ عمل بھی درست طریقہ پر کرے، امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ درست طریقہ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا عمل محض خود ساختہ طرز پر نہ ہو، بلکہ شریعت مطہرہ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں، ایک اخلاص اور دوسرے عمل کا درست یعنی مطابق شریعت و سنت ہونا، ان دو شرطوں میں سے پہلی شرط اخلاص کا تعلق انسان کے باطن یعنی قلب کے ہے، اور دوسری شرط یعنی موافقت شرع کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے، جب یہ دونوں شرطیں کسی شخص نے پوری کر لیں تو اس کا ظاہر و باطن درست ہو گیا، اور جب ان میں سے کوئی شرط مفقود ہوئی تو عمل فاسد ہو گیا، اخلاص نہ رہا تو عملی منافق ہو گیا، اور اتباع شریعت فوت ہو گیا، تو گمراہ ہو گیا۔

قوموں کی گمراہی کا سبب قوموں اور مذاہب کی تاریخ پر نظر ڈالتے تو معلوم ہو گا کہ جتنے بے راہ فرقے اور قومی دنیا میں ہیں کسی میں اخلاص نہیں، اور کسی میں عمل صحیح نہیں، یہی دو گروہ ہیں جن کا ذکر سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم



سے ہٹ جانے والوں کے سلسلہ میں مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ اور ضَالِّین کے لفظوں سے بیان کیا گیا ہے، مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ وہ لوگ ہیں جن میں اخلاص نہیں، اور ضَالِّین وہ جن کا عمل درست نہیں، پہلا گروہ شہوات کا شکار ہے اور دوسرا شبہات کا۔

پہلی شرط یعنی اخلاص کی ضرورت اور اس کے نہ ہونے کی صورت میں عمل کا بے کار ہونا تو عام طور پر سب سمجھتے ہیں، لیکن حسن عمل یعنی اتباع شریعت کی شرط پر بہت مسلمان بھی نہیں دھیان دیتے، یوں سمجھتے ہیں کہ نیک عمل کو جس طرح چاہو کر لو، حالانکہ قرآن و سنت نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ حسن عمل صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اتباع سنت پر موقوف ہے، اس سے کم کرنا بھی جرم ہے اور اس سے بڑھانا بھی جرم ہے، جس طرح ظہر کی چار کے بجائے تین رکعات پڑھنا جرم ہے، اسی طرح پانچ پڑھنا بھی ویسا ہی جبرم و گناہ ہے، کسی عبادت میں جو شرط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی ہو، اس میں اپنی طرف سے شرطوں کا اضافہ یا آپ کی بتلائی ہوئی نہایت سے مختلف صورت اختیار کرنا یہ سب ناجائز اور حسن عمل کے خلاف ہے، خواہ دیکھنے میں وہ کتنے ہی خوب صورت عمل نظر آئیں، بدعات اور محدثات جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گمراہی قرار دیا، اور ان سے بچنے کی تاکید فرمائی، وہ سب اسی قسم سے ہیں، جاہل آدمی اس کو پورے اخلاص کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور عبادت و ثواب جان کر کرتے ہیں، مگر شرع محمدی میں اس کا یہ عمل ضائع بلکہ موجب گناہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم نے بار بار حسن عمل یعنی اتباع سنت کی تاکید فرمائی، سورۃ ملک میں ہے: لِيَسْئَلُوْكُمْ عَنْكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا، یہاں پر اَحْسَنُ عَمَلًا فرمایا آ کثُرَ عَمَلًا نہیں فرمایا، یعنی کثرتِ عمل کا ذکر نہیں، بلکہ اچھا عمل کرنے کا ذکر ہے، اور اچھا عمل وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو۔

قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں اسی حسن عمل اور اتباع سنتِ مصطفویٰ کو ان الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰی لَهَا سَعٰیًا، یعنی وہ عمل ان لوگوں کا مقبول ہے جنہوں نے نیت بھی خالص آخرت کی رکھی ہو اور اس کے لئے سعی بھی کر رہے ہوں، اور جو سعی کر رہے ہیں وہ سعی مناسب بھی ہو، اور سعی مناسب وہی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے امت کو بتلائی، اس سے ہٹ کر خواہ سعی میں کمی کی جائے یا زیادتی، دونوں چیزیں سعی مناسب نہیں ہیں، اور



سعی مناسب دی ہے جس کا دوسرا نام حسن عمل ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔  
 خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی عمل کے مقبول ہونے کی دو شرطیں ہیں :  
 اختلاص اور حسن عمل، اور حسن عمل نام ہے اتباع سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اس لئے اختلاص  
 کے ساتھ حسن عمل کرنے والوں کا یہ بھی فسرص ہے کہ عمل کرنے سے پہلے یہ معلوم کریں کہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو کس طرح کیا ہے، اور اس کے متعلق کیا ہدایتیں دی ہیں، ہمارا  
 جو عمل سنت کے طریقہ سے ہٹے گا نامقبول ہوگا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات و خیرات  
 اور ذکر اللہ اور درود و سلام سب میں اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے اس عمل کو کس طرح انجام دیا، اور کس طرح کرنے کے لئے ارشاد فرمایا ہے، آخر آیت  
 میں اختلاص اور حسن عمل کی ایک مثال حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیش  
 کر کے ان کے اتباع کا حکم دیا گیا اور **وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا** فرمایا کہ اس کی طرف  
 اشارہ کر دیا کہ حضرت خلیل کے اس مقام بلند کا سبب یہی ہے کہ وہ مخلص بھی اعلیٰ درجے  
 کے تھے اور ان کا عمل بھی بشارتِ خداوندی صحیح اور درست تھا۔

**وَيَسْأَلُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلَىٰ**

اور تم مجھ سے رخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی، کہہ دیجئے کہ اللہ تم کو اجازت دیتا ہے ان کی اور وہ جو تم کو

**عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتِمَّى النِّسَاءِ الَّتِي لَا تُولَدْنَ لَهُنَّ**

سنایا جاتا ہے قرآن میں سو حکم ہے ان یتیم عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو ان کے لئے

**مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ**

مستدر کیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ اور حکم ہے ناتوان

**مِنَ الْوُلْدِ إِنْ وَأَنْ تَقْرُمُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا**

لڑکوں کا اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر اور جو کرو گے

**مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ۖ وَإِنْ امْرَأَةٌ خَافَتْ**

بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے اور اگر کوئی عورت ڈرے

**مِنْ بَعْلِهَا فَتُؤْذَنُ أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ**

اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی بھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کر لیں

**يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ**

آپس میں کسی طرح صلح اور صلح خوب چیز ہے اور دونوں کے سامنے



أَلَا نَفْسُ الشَّعْطِ وَإِنْ تَحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ

موجود ہے جس سے اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ کو تمھارے

بِمَا تَعْمَلُونَ خَيْرًا ۝ (۱۲۸) وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ

سب کاموں کی خبر ہے ، اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں

النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ فَتَدْرُواهَا

کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو

كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ

جیسے آدھ میں لٹکتی اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۱۲۹) وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ

بخشنے والا مہربان ہے ، اور اگر دونوں جدا ہو جاویں تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دے گا

سَعْيِهِ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ۝ (۱۳۰)

اپنی کوشش سے اور اللہ کوشش والا تدبیر والا ہے ۔

رَبِطَ آيَاتِ

شروع سورت میں قیموں اور عورتوں کے خاص احکام اور ان کے حقوق

ادا کرنے کا وجوب مذکور تھا، کیونکہ جاہلیت میں بعضے ان کو میراث ہی

نہ دیتے تھے، بعض جو مالی میراث میں یا اور کسی طور سے ان کو ملتا اس کو ناجائز طور پر کھا جاتے

بعضے ان سے نکاح کر کے ان کو مہر پورا نہ دیتے، اوپر ان سب کی ممانعت کی گئی تھی،

اس پر مختلف واقعات پیش آئے، بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ عورتیں اور بچے فی نفسہ قابل

میراث کے نہیں، کسی وقتی مصلحت سے یہ حکم چند لوگوں کے لئے ہو گیا ہے، امید ہے کہ

منسوخ ہو جائے گا، اور بعض اس کے منتظر رہے جب نسخ نہ ہوا تو یہ مشورہ ٹھہرا کہ خود

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہئے، اور حاضر ہو کر پوچھا، ابن جریر اور ابن المنذر

نے آیت کا سبب نزول اسی سوال کو نقل کیا ہے، اور اس کے بعد کی آیتوں میں عورتوں

سے متعلقہ چند اور مسائل بیان فرمادیئے گئے (بیان ہسٹران)

## خُلاصۃ تفسیر

اور لوگ آپ سے عورتوں کی میراث اور مہر کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں



آپے فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تم کو (وہی سابق) حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی (تم کو حکم دیتی ہیں) جو کہ اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں اور (اور قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں) کیونکہ قرآن کی تلاوت میں ان کی تلاوت بھی ظاہر ہے کہ ہوا ہی کرتی تھی) جو کہ ان یتیم عورتوں کے باب میں (نازل ہو چکی) ہیں جن کے ساتھ تمھارا یہ معاملہ ہے کہ وہ صاحب مال و صاحب جمال ہوئیں تو ان سے نکاح کرتے ہو، مگر ان کو جو (شرع سے) ان کا حق (میراث و ہرک) مسترد ہے نہیں دیتے ہو اور (اگر صاحب جمال نہ ہوئیں صرف صاحب مال ہوئیں تو) ان کے ساتھ (بوجہ خوش جمال نہ ہونے کے) نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو لیکن بوجہ صاحب مال ہونے کے اس خوف سے کہ یہ مال کہیں اور نہ چلا جائے اور کسی سے بھی نکاح نہیں کرنے دیتے) اور (جو آیات کہ) کمزور بچوں کے باب میں (ہیں) اور (جو آیات کہ) اس باب میں (ہیں) کہ یتیموں کی (تمام) کارگزاری (عام اس سے کہ ہر و میراث کے متعلق ہو یا اور کچھ ہو) انصاف کے ساتھ کرو (یہ مضمون جو ان آیات سابقہ کا پس وہ آیتیں اپنا مضمون اب بھی تمھارے ذمہ واجب کر رہی ہیں اور ان کا حکم بعینہ باقی ہے تم اپنی کے موافق عمل رکھو) اور جو نیک کام کرو گے (نساء و یتامی کے بارے میں یا اور امور میں بھی) سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (تم کو ان کی جزا خیر دیں گے اور جانتے تو ہیں غیر خیر کو بھی) لیکن یہاں ترغیب خیر کی مقصود ہے اس لئے تخصیص کی گئی) اور اگر کسی عورت کو (قرآن سے) اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی (اور کج ادائی) یا بے پرواہی (اور بے رخی) کا ہو سو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں (یعنی عورت اگر ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو پورے حقوق ادا کرنا نہیں چاہتا اور اس لئے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے مثلاً نان نفقہ معاف کر دے یا مقدار کم کر دے اور اپنی باری معاف کر دے تاکہ وہ چھوڑے نہیں اور شوہر کو بھی جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کر لے) اور (نزاع یا فراق سے تو) یہ صلح (ہی) بہتر ہے اور (ایسی صلح ہو جانا کچھ بعید نہیں کیونکہ) نفوس کو (طبعاً) حرص کے ساتھ اقتران (و اتصال) ہوتا ہے (جب اس کی حرص پوری ہو جاتی ہے راضی ہو جاتا ہے پس شوہر جب دیکھے گا کہ میری مالی اور جانی آزادی میں جس کی کہ طبعی حرص ہے کچھ خلل نہیں آتا اور مفت میں عورت ملتی ہے تو وہ غالباً نکاح میں رکھنے پر راضی ہو جائیگا اور عورت کی حرص نکاح میں رہنے پر خواہ کسی وجہ سے ہو ظاہر ہے کہ سبب اصلی ہے صلح کا



ہیں جانبین کی خاص خاص حرص نے اس صلح کی تکمیل کر دی، اور (اے مردو) اگر تم (خود عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ رکھو اور ان سے حقوق معاف کرانے کے خواہاں نہ ہو، اور ان کے ساتھ رکج ادا کی اور بے رخی کرنے سے، احتیاط رکھو تو (تم کو بڑا ثواب ملے کیونکہ) بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اور اعمال نیک پر ثواب دیا کرتے ہیں) اور (عاذنا) تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتیٰ کہ رغبتِ قلب میں بھی) گو (اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے (اور تم کتنی ہی اس میں کوشش کرو، لیکن چونکہ قلب کا میلان غیر اختیاری ہے، اس لئے اس پر قدرت نہیں، گوا اتفاقاً بلا اختیار کہیں برابری ہو ہی جائے تو اس کی نفی آیت میں مقصود نہیں، غرض جب اختیار میں نہیں تو تم اس کے مکلف نہیں، لیکن اس کے غیر اختیاری ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ظاہری حقوق بھی اختیاری نہ رہیں، بلکہ وہ تو اختیاری ہیں جب وہ اختیاری ہیں) تو (تم پر واجب ہے کہ) تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ (بالکل کا مطلب یہ کہ باطن سے بھی جس میں معذور تھے اور ظاہر سے بھی جس میں مختار ہو، یعنی حقوق شرعیہ میں ان سے نشوز نہ کرنا) نہ کرو (جس سے اس (مظلومہ) کو ایسا کر دو چلے کوئی (دھرنہ اُدھر) یعنی بیچ میں) ٹٹکی ہو (یعنی نہ تو اس کے حقوق ادا کئے جائیں کہ خاوند والی سمجھی جائے اور نہ اس کو طلاق دی جائے کہ بے خاوند والی کہی جائے، بلکہ رکھو تو اچھی طرح رکھو) اور (رکھنے کی صورت میں جو زمانہ ماضی میں کچھ ناگوار معاملات ان سے کئے گئے) اگر (ان معاملات کی فی الحال) اصلاح کرو اور (آئندہ زمانہ میں ایسے معاملات سے) احتیاط رکھو تو (وہ امور گزشتہ معاف کر دیئے جائیں گے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (چونکہ صلاح ذنوب متعلقہ بحقوق العباد کی ان عباد کے معاف کرنے سے ہوتی ہے، پس اصلاح میں یہ معافی بھی آگئی، تو اس کے وقوع کے بعد تو بہ شرعاً صحیح ہو گئی اس لئے مقبول ہو گئی) اور اگر دونوں میاں بیوی (میں کسی طرح بھی موافقت نہ ہوئی اور دونوں) جدا ہو جائیں (یعنی خلع یا طلاق ہو جائے) تو (کوئی ان میں سے خواہ مرد اگر اس کی زیادتی ہے یا عورت اگر اس کی کوتاہی ہے یوں نہ سمجھے کہ بد دن میرے اس دوسرے کا کام ہی نہ چلے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (قدرت) سے (دونوں میں سے) ہر ایک کو (دوسرے سے) بے احتیاج کر دے گا (یعنی ہر ایک کا مقدر کام بے دوسرے کے چل جائے گا) اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں (ہر ایک کے لئے مناسب سبیل نکال دیتے ہیں)



## معارف و مسائل

وَأِنْ أَمْرًا فَخَافَتْ مِنْ بَعُولِهَا (الی قولہ) وَإِسْعَا  
 حَکِیْمًا ۚ إِنَّ تَمِیْنُ آیتوں میں حق تعالیٰ شانہ نے ازدواجی  
 زندگی کے اس تلخ اور کٹھن پہلو کے متعلق ہدایات دی ہیں

جو اس طویل زندگی کے مختلف ادوار میں ہر جوڑے کو کبھی نہ کبھی پیش آ ہی جاتا ہے، وہ ہے  
 باہمی بخشش اور کشیدگی اور یہ ایسی چیز ہے کہ اس پر صحیح اصول کے ماتحت قابو پانے کی  
 کوشش نہ کی جائے، تو نہ صرف زوجین کے لئے دنیا جہنم بن جاتی ہے بلکہ بسا اوقات یہ  
 یہ گھریلو بخشش خاندانوں اور قبیلوں کی باہمی جنگ اور قتل و قتال تک نوبت پہنچا دیتی ہے  
 قرآن عزیز مرد و عورت دونوں کے تمام جذبات اور احساسات کو سامنے رکھ کر ہر فریق  
 کو ایک ایسا نظام زندگی بتلانے کے لئے آیا ہے جس پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ  
 انسان کا گھر دنیا ہی میں جنت بن جائے گا، گھریلو تلخیاں، نفرت و راحت میں تبدیل ہو جائیں گی  
 اور اگر ناگزیر حالات میں علیحدگی کی نوبت بھی آجائے تو وہ بھی خوشگوار طریقہ، خوش سلوکی  
 کے ساتھ ہو، قطع تعلق بھی ایسا ہو کہ عداوت و دشمنی اور ایذا رسانی کے جذبات پیچھے  
 نہ چھوڑے۔

آیت نمبر ۱۲۸ ایسے حالات سے متعلق ہے جس میں غیر خستہ کاری طور پر میاں بیوی  
 کے تعلقات کشیدہ ہو جائیں، ہر فریق اپنی جگہ معذور سمجھا جائے، اور باہمی تلخی کی وجہ  
 سے اس کا اندیشہ ہو جائے کہ باہمی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے گی، جیسے ایک بیوی سے  
 اس کے شوہر کا دل نہیں ملتا، اور نہ ملنے کے اسباب رفع کرنا عورت کے اختیار میں نہیں  
 مثلاً عورت بد صورت یا سن رسیدہ ہوڑھیا ہے، شوہر خوش رو ہے، تو ظاہر ہے کہ اس میں  
 نہ عورت کا کوئی قصور ہے اور نہ مرد ہی کچھ مجرم کہا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اس آیت کے شان نزول میں اسی طرح کے چند واقعات منظری و غیرہ میں  
 منقول ہیں، ایسے حالات میں مرد کے لئے تو ایک عام قانون قرآن کریم نے یہ بتلایا ہے کہ  
 قَامَسَا لَیْکُمْ وَفَاؤُتُمْ سِرْمَیْکُمْ بِالْإِحْسَانِ کہ اس عورت کو رکھنا ہو تو دستور کے  
 مطابق اس کے پورے حقوق ادا کر کے رکھو، اور اگر اس پر قدرت نہیں تو اس کو خوش سلوکی  
 سے آزاد کرو، اب اگر عورت بھی آزاد ہونے کے لئے تیار ہے تو معاملہ صاف ہے، کہ قطع تعلق  
 بھی خوشگوار انداز میں ہو جائے گا، لیکن اگر ایسے حالات میں عورت کسی وجہ سے آزادی نہیں



چاہتی، خواہ اپنی اولاد کے مفاد کی وجہ سے یا اس وجہ سے کہ اس کا کوئی دوسرا سہارا نہیں، تو یہاں ایک ہی راستہ ہے، کہ شوہر کو کسی چیز پر راضی کیا جائے، مثلاً عورت اپنے تمام یا بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑ دے، اور شوہر یہ خیال کرے کہ بہت سے حقوق کے بارے میں تو سبکدوشی ہوتی ہے، بیوی مفت میں ملتی ہے اس پر صلح ہو جائے۔

فترآن کریم کی اس آیت میں ایک تو اس طرح کی مصالحت کے متوقع ہونے کی طرف رہنمائی اس طرح فرمائی: وَ اَحْضَرَتْ اِلَّا نَفْسُ الشَّعْطِ، یعنی حرص تمام نفوس کے سامنے دھری رہتی ہے ایسی مصالحت میں عورت کو تو یہ حرص ہے کہ مجھے آزاد کر دیا تو اولاد برباد ہو جائے گی، یا میری زندگی دوسری جگہ تلخ ہوگی، اور شوہر کو یہ لالچ ہے کہ جب عورت نے اپنا کُل جہر یا بعض معاف کر دیا اور دوسرے حقوق کا بھی مطالبہ چھوڑ دیا، تو اب اس کو رکھنے میں میرے لئے کیا مشکل ہے، اس لئے مصالحت باہمی آسان ہو جائے گی، اس کے ساتھ ارشاد فرمایا:

وَ اِنْ اَمْرًا اُتِخَا فَمِنْ بَيْنِهِمَا نِسْوَةً اَوْ اِخْوًا صَافًا فَلَاجُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا، یعنی اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے لڑائی جھگڑے یا بے رخی کا خطرہ محسوس کرے تو دونوں میں سے کسی کو گناہ نہیں ہوگا، اگر آپس میں خاص شرائط پر صلح کر لیں، اور گناہ نہ ہونے کے عنوان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ اس معاملہ کی صورت بظاہر رشوت کی سی ہے، کہ شوہر کو مہر وغیرہ کی معافی کا لالچ دے کر ازدواجی زندگی کا تعلق باقی رکھا گیا ہے، لیکن فترآن کے اس ارشاد نے واضح کر دیا کہ یہ رشوت میں داخل نہیں بلکہ مصالحت میں داخل ہے، جس میں مندریقین اپنے کچھ کچھ کا مطالبہ چھوڑ کر کسی درمیانی صورت پر رضا مند ہو جایا کرتے ہیں، اور یہ جائز ہے۔

زوجین کے جھگڑے میں دوسروں کا تفسیر منظر میں ہے کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے اَنْ يَّصْلِحَا دَخْلٌ بِلا ضرورت مناسب نہیں | بَيْنَهُمَا صُلْحًا، فرمایا، یعنی "میاں بیوی دونوں آپس میں کسی صورت پر مصالحت کر لیں"، اس میں لفظ بَيْنَهُمَا سے اس طرف اشارہ نکلتا ہے کہ میاں بیوی کے معاملات میں بہتر یہ ہے کہ کوئی تیسرا دخیل نہ ہو، یہ دونوں خود ہی آپس میں کوئی بات طے کر لیں، کیونکہ تیسرے کے دخل سے بعض اوقات تو مصالحت ہی ناممکن ہو جاتی ہے اور ہو بھی جائے تو طرفین کے عیوب تیسرے آدمی کے سامنے بلا وجہ آتے ہیں جس سے بچنا دونوں کے لئے مصلحت ہے۔

مذکورہ آیت کے آخر میں فرمایا: وَ اِنْ تَحْسَبُوْا وَ تَقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا



تَعْمَلُونَ خَيْرًا ۖ یعنی ایسے حالات میں جبکہ بیوی سے تمہارا دل نہیں ملتا، اور اس وجہ سے تم اس کے حقوق ادا کرنا مشکل سمجھ کر آزاد کرنا چاہتے ہو تو گویا بطنہ میں تمہیں آزاد کر دینے کا اختیار بھی حاصل ہے، اور آیت کے ابتدائی جملہ کی رو سے عورت کے کچھ مطالبات چھوڑنے پر صلح کر لینا بھی جائز ہے، لیکن اگر حق تعالیٰ کے خوف کو سامنے رکھ کر احسان سے کام لو اور دل نہ ملنے کے باوجود اس کے تعلق کو بھی نبھاؤ اور اس کے سب حقوق بھی پورے کرو، تو تمہارا یہ حسن عمل اللہ تعالیٰ کے سامنے ہے، جس کا یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اس تحمل اور حسن عمل کا بدلہ ایسی نعمتوں اور حقوق سے دے گا جس کا تم کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے، اور شاید اسی وجہ سے یہاں صرف یہ بتلا کر چھوڑ دیا کہ تمہارا یہ حسن عمل ہمارے سامنے ہے، اس کا ذکر نہیں کیا کہ اس کا بدلہ کیا دیں گے؟ اشارہ اس طرف ہے کہ وہ بدلہ تمہارے وہم و خیال سے بھی زائد ہو گا۔

متعلقہ آیات کے مضمون کا خلاصہ یہ ہو گیا کہ شوہر جب یہ دیکھے کہ کسی وجہ سے اس کا دل اپنی بیوی سے نہیں ملتا اور اس کے حقوق پورے نہیں ہوتے تو جہاں تک بیوی کے اختیاری معاملات کا تعلق ہے ان کی تو اصلاح کی کوشش کرے، تنبیہ کے لئے عارضی طور پر بے رخی، زبانی تنبیہ اور بھجوری معمولی مار پیٹ بھی کرنا پڑے، تو کرے، جیسا کہ سورۃ نساء کی شروع کی آیات میں گزر چکا ہے، اور اگر ساری کوششوں کے باوجود اصلاح سے مایوس ہو جائے، یا معاملہ کوئی ایسا ہے جس کا درست کرنا عورت کے اختیار ہی میں نہیں، تو اب اس کو قانون شرع یہ حق دیتا ہے کہ خوش اسلوبی کے ساتھ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے طلاق دے کر آزاد کرے، لیکن اگر وہ اس کے تعلق کو اسی حالت میں نبھائے، اپنے حقوق کو نظر انداز کرے اور اس کے حقوق پورے پورے ادا کرے تو یہ اس کے لئے افضل و اعلیٰ اور موجب ثواب عظیم ہے، اس کے بالمقابل اگر معاملہ برعکس ہو کہ مرد حقوق واجبہ نہیں ادا کرتا، اس لئے عورت آزادی چاہتی ہے تو اس صورت میں اگر شوہر بھی آزاد کرنے پر راضی ہے تو معاملہ صاف ہے، عورت کو بھی یہ حق ملتا ہے کہ جب شوہر اداہ حقوق میں کوتاہی کی بنا پر اس کو آزاد کرنا چاہے تو عورت بھی اپنی آزادی اختیار کرے، اور اگر شوہر باختر خود آزاد کرنے پر آمادہ نہیں تو عورت کو حق پہنچتا ہے کہ اسلامی عدالت سے اپنی آزادی کا مطالبہ کر کے آزاد ہو جائے لیکن اگر وہ شوہر کی بے رخی اور کج روی پر صبر کر کے اپنے حقوق کا مطالبہ چھوڑ کر اس کو نبھائے، اور شوہر کے حقوق کو ادا کرے تو یہ اس کے لئے افضل و اعلیٰ اور موجب ثواب عظیم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک طرف اپنی تکلیف کو دور کرنے اور اپنا حق وصول کرنے کا



فریقین کو قانونی حق قرآن کریم نے دیدیا، دوسری طرف دونوں کو بلند اخلاقی اور اپنے حقوق کے ترک کرنے پر صبر کی تلقین فرما کر یہ ہدایت فرمادی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تعلق کو قطع کرنے سے بچنا چاہئے، اور چاہئے کہ جہاں سے کچھ کچھ حقوق ترک کر کے کسی خاص صورت پر صلح کر لیں۔

اس آیت کے شروع میں تو میاں بیوی کے باہمی اختلافات کے وقت صلح کا صرف جائز ہونا بتلایا گیا ہے، اور آخر آیت میں صلح نہ ہونے کی صورت میں بھی صبر و تحمل کے ساتھ تعلق نبھانے کی تلقین فرمائی گئی ہے، درمیان میں ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا ہے جس سے مصالحت کا پسندیدہ اور افضل و بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے، ارشاد ہے وَالصُّلْحُ خَيْرٌ یعنی باہم مصالحت کرنا بہتر ہے اور یہ جملہ ایسے عام عنوان سے بیان فرمایا جس میں زیر بحث میاں بیوی کے جھگڑے بھی داخل ہیں، اور دوسری قسم کے گھر بلوا اختلافات بھی اور تمام دنیا کے معاملات کے باہمی جھگڑے اور خصومات و مقدمات بھی، کیونکہ الفاظ قرآن عام ہیں کہ صلح بہتر ہے۔

خلاصہ مضمون یہ کہ طرفین سے اپنے اپنے پورے مطالبہ پر اڑے رہنے کے بجائے یہ بہتر ہے کہ طرفین اپنے کچھ مطالبات سے دستبردار ہو کر کسی درمیانی صورت پر رضامندی کے ساتھ مصالحت کر لیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”یعنی مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کی مصالحت جائز ہے بجز اس صلح کے جس میں کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو اور مسلمانوں کو اپنی مانی ہوئی شرطوں پر قائم رہنا چاہئے، بجز ان شرائط کے جن کے ذریعہ کسی حلال کو حرام قرار دیا گیا ہو۔“	كُلُّ صُلْحٍ جَائِزٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا صُلْحًا أَحْلَلَ حَرَامًا أَوْ حَرَّمَ حَلَالًا وَالْمُسْلِمُونَ عَلَى شُرُوطِهِمْ إِلَّا شَرْطًا حَرَّمَ حَلَالًا (رواہ الحاکم عن کثیر بن عبد اللہ، تفسیر مظہری)
--	--

مثلاً کسی عورت سے اس بات پر صلح کر لینا جائز نہیں کہ اس کے ساتھ اس کی بہن کو بھی نکاح میں رکھا جائے، کیونکہ دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا شرعاً حرام ہے یا اس پر صلح کرے کہ دوسری بیوی کے حقوق ادا نہ کرے گا، کیونکہ اس میں ایک حلال کو حرام ٹھہرانا ہے۔

اور روایت میں چونکہ عموم کے ساتھ ہر صلح کو جائز قرار دیا ہے اس عموم سے



امام اعظم رحمہ اللہ نے مسئلہ نکاح الاکھ صلح کی سب اقسام جائز ہیں، خواہ اقرار کے ساتھ ہو جیسے مدعا علیہ یہ اقرار کرے کہ مدعی کے دعوے کے مطابق میرے ذمہ اس کے ایک ہزار روپیہ واجب الادا ہیں، پھر مصالحت اس پر ہو جائے کہ مدعی اس میں سے کچھ رقم چھوڑ دے، یا اس رقم کے معاوضہ میں اس سے کوئی چیز لے لے یا مدعا علیہ دعوے کے بارے میں اقرار و انکار کچھ نہ کرے، اور کہ کہ حقیقت میں جو کچھ بھی ہو میں چاہتا ہوں کہ تم اس صورت پر صلح کر لو، یا مدعا علیہ دعوے سے قطعی انکار کرے، لیکن انکار کے باوجود جھگڑا قطع کرنے کے لئے کچھ دینے پر راضی ہو جائے اور اس پر صلح ہو جائے، یہ تینوں قسمیں صلح کی جائز ہیں، سکوت اور انکار کی صورت میں بعض فقہاء کا اختلاف بھی ہے۔

آخر میں ایک مسئلہ قابل ذکر ہے جس کا تعلق زوجین کی باہمی مصالحت سے ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے وہ یہ کہ اگر کسی عورت نے اپنے بعض حقوق کا مطالبہ ترک کر دینے پر صلح کر لی تو یہ صلح عورت کے اس حق کو تو قطعی طور پر ختم کر دے گی جو بوقت صلح شوہر کے ذمہ عائد ہو چکا ہے، جیسے دین مہر کہ وہ شوہر پر اس صلح سے پہلے واجب الادا ہو چکا ہے، لہذا جب وہ پورا مہر یا اس کا کوئی جز معاف کر دینے پر صلح کرے تو یہ مہر یا اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا اس کے بعد اس کو مطالبہ کا حق باقی نہ رہے گا، لیکن جو حقوق ایسے ہیں کہ بوقت صلح انکی ادائیگی شوہر پر واجب ہی نہ تھی، مثلاً آئندہ زمانہ کا ان نفقہ یا حق شب بانشی جس کا وجوب آئندہ کے زمانہ میں ہو گا، بالفعل اس کے ذمہ واجب الادا نہیں ہے، ان حقوق کے ترک پر اگر مصالحت کر لی گئی تو عورت کا حق مطالبہ ہمیشہ کے لئے ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ جب اس کا دل چاہے یہ کہہ سکتی ہے کہ آئندہ میں اپنا یہ حق چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس صورت میں شوہر کو سخت پیار ہو گا کہ اس کو آزاد کر دے (تفسیر مظہری وغیرہ)

آخری آیت یعنی وَإِنْ يَنْظُرْ قَائِلًا يَنْظُرْ اللَّهُ كَلَّا مِنْ سَعْيِهِ، میں فریقین کو تسلی دی گئی کہ اگر اصلاح و مصالحت کی سب کوششیں ناکام ہو کر انگ ہی ہونا پڑے تو اس سے بھی پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دوسرے سے مستغنی فرما دیں گے، عورت کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا اور محفل کا ذریعہ اور مرد کے لئے دوسری عورت مل جائے گی، اللہ تعالیٰ کی قدرت بڑی وسیع ہے، اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ان میں سے ہر ایک نکاح سے پہلی زندگی پر نظر ڈالے کہ ایک دوسرے کو پہچانتا بھی نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے جوڑا ملا دیا، آج بھی پھر ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

آخر آیت میں وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا، فرما کر اس بات کو اور بچہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ



کے یہاں بڑی وسعت ہے، اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے، ممکن ہے کہ اس علحدگی ہی میں حکمت و مصلحت ہو، جدائی کے بعد دونوں کو ایسے جوڑے مل جائیں کہ دونوں کی زندگی سدرہ جاک امور غیر اختیاریہ | ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور پائیدار بنالے کے لئے قرآن عظیم نے مذکور پر مواخذہ نہیں | آیات میں جو ہدایتیں و سریقین کو دی ہیں ان آیات میں ایک آیت یہ ہے: **وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا اَنْ تَعْلُوا بِلَنْ اِلَيْسَا**، جس میں فریقین کو ایک خاص ہدایت فرمائی، وہ یہ کہ ایک مرد کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں تو قرآن کریم نے سورۃ نساہ کے شروع میں اس کو یہ ہدایت دی کہ سب بیویوں میں عدل و مساوات قائم رکھنا اس کے ذمہ فرض ہے، اور جو خیال کرے کہ اس فرض کو میں ادا نہ کر سکوں گا تو اس کو چاہئے کہ ایک سے زائد بیبیاں نہ کرے، ارشاد ہے: **فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْلُوا فَاِحْذَرُوْا** یعنی اگر تم کو یہ خطرہ ہو کہ دو بیویوں میں مساوات نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے بیویوں میں عدل اور برابری کو نہایت تاکید کی حکم فرما دیا ہے، اور اس کی خلاف ورزی پر سخت وعید سنائی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات میں برابری اور عدل کا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور ساتھ ہی بارگاہ جل شانہ میں عرض کیا کرتے تھے:

”یعنی اے اللہ! یہ میری منصفانہ تقسیم اور مساوات اس چیز میں ہے جو میرے اختیار میں ہے، اس لئے جو چیز آپ کے اختیار میں ہے“

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِيْ فِيمَا  
اَمْلِكُ فَلَا تَلْمِزْنِيْ فِيمَا تَمْلِكُ  
وَلَا اَمْلِكُ

میں ہے میرے اختیار میں نہیں، یعنی قلبی میلان اور رجحان اس میں مجھ سے مواخذہ نہ فرمائیے۔“

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مگر قلبی میلان کو آپ نے بھی اپنے اختیار سے باہر قرار دیا، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا۔

سورۃ نساہ کی شروع کی آیت کے ظاہری الفاظ سے بیویوں میں مطلقاً مساوات و برابری کا فرض ہونا معلوم ہوتا تھا، جس میں قلبی میلان میں بھی مساوات کرنا داخل ہے، اور یہ معاملہ انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے سورۃ نساہ کی اس آیت میں حقیقت حال کی وضاحت فرمادی کہ جن چیزوں پر تمہیں قدرت نہیں ہے ان میں مساوات



فرض نہیں ہے، البتہ برابری اختیار میں ہوگی، مثلاً شب باشی، طرز معاشرت اور نفقہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اس عنوان سے بیان فرمایا جس سے ایک شریف انسان عمل کرنے پر مجبور ہو جائے، فرمایا:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَذَرُوهُنَّ كَالْمَعْلُوقَاتِ ۚ (یعنی تمہیں معلوم ہو کہ تم سب بیویوں میں اگر کوشش بھی کرو تو قلبی میلان کے بارہ میں مساوات نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں، تو پھر ایسا نہ کرو کہ پورے ہی ایک طرف ڈھل جاؤ، یعنی قلبی میلان تو اس طرف تھا ہی، اور اختیار معاملات میں بھی اسی کو ترجیح دینے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہو جائے کہ دوسری عورت لٹکی ہی رہ جائے یعنی شوہر اس کے حقوق بھی ادا نہ کرے، اور اس کو آزاد بھی نہ کرے۔

معلوم ہوا کہ اس آیت میں عدل برکسی کی قدرت نہ ہونے کا جو ذکر ہے وہ قلبی میلان کی برابری ہے جو انسان کے اختیار میں نہیں، اور اس آیت کے الفاظ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ میں خود اس مفہوم کا قرینہ موجود ہے، کیونکہ معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ اگرچہ قلبی میلان میں برابری تمہاری قدرت میں نہیں، مگر بالکل ایک ہی طرف کے نہ ہو رہو کہ اختیار میں معاملات میں بھی اس کو ترجیح دینے لگو۔

اس طرح یہ آیت سورۃ نساء کی پہلی آیت کی تشریح ہو گئی کہ اس کے ظاہری الفاظ سے قلبی میلان میں بھی مساوات کا فرض ہونا معلوم ہو رہا تھا، اس آیت نے کھول دیا کہ یہ بوجہ غیر اختیاری ہونے کے فرض نہیں، بلکہ فرض امور اختیار میں مساوات ہے۔

اس آیت سے تعدد ازدواج کے مذکورہ تفصیل سے ان لوگوں کی غلط فہمی بھی واضح ہو گئی، جو ان خلاف استدلال قطعاً غلط ہے دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ شروع سورۃ

نساء کی آیت نے یہ حکم دیا کہ اگر چند بیویوں میں مساوات نہ کر سکو، تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو، دوسرا نکاح نہ کرو، اور اس دوسری آیت نے یہ بتلا دیا کہ دو بیویوں میں مساوات ممکن ہی نہیں، اس لئے نتیجہ یہ نکل آیا کہ دو بیویوں کو نکاح میں رکھنا ہی جائز نہیں، اور عجب بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے خود ان دونوں آیتوں کے اندر اس غلط فہمی کے ازالہ کا سامان رکھ دیا ہے، دوسری آیت کا قرینہ ابھی گزر چکا ہے، کہ فَلَا تَمِيلُوا

كُلَّ الْمَيْلِ کے الفاظ ہیں، اور پہلی آیت میں یہ فرمایا فَإِنْ يَخَافُكُمْ فَلَا تَعْسِلُوهَا ۚ اس میں بطور شرط کے یہ فرمانا کہ اگر تمہیں خطرہ ہو یہ لفظ کھلا ہوا قرینہ اس کا ہے کہ دو بیویوں میں عدل و برابری ناممکن یا اختیار سے خارج نہیں، ورنہ اس طویل عبارت



کی اور پھر وہ بھی وہ آیتوں میں کوئی ضرورت ہی نہ تھی، جیسے حُرْمَتٌ عَلَیْکُمْ اُمَّهَاتُکُمْ وَبَنَاتُکُمْ  
والی آیت میں ان عورتوں کی تفصیل دی جن سے نکاح حرام ہے، اور وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ  
فرما کر دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت بتلائی گئی ہے، اسی طرح یہ بھی فرما دیا جاتا کہ ایک  
دقت میں ایک سے زائد بیویاں رکھنا حرام ہے، اور پھر اَنْ تَجْمَعُوْا اَکْثَرَ سَاتِحَاتٍ  
کی قید فضول ہو جاتی، اسی ایک ہی جملہ میں یوں سرِ بادیاجا، وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ اِمْرَاَتَيْنِ  
یعنی مطلقاً دو عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے، مگر قرآن کریم نے اس مختصر کلام کو  
پھیڑ کر نہ صرف ایک طویل عبارت خستیار کی، بلکہ دو آیتوں میں اس کی تفصیل بیان فرمائی،  
اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آیت وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ بھی ایک حیثیت سے اس کا  
جواز بتلا رہی ہے، کہ ایک سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا تو جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ  
وہ دونوں آپس میں بہنیں نہ ہوں۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَقَدْ وَصَّیْنَا

اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں اور ہم نے حکم دیا ہے

الَّذِیْنَ اَوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنْ تَقْرَءُوْا

پہلے کتاب والوں کو اور تم کو کہ پڑھو

اللّٰہُ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی

اللہ سے اور اگر نہ مانو گے تو اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے

الْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰهُ غَنِیًّا حَمِیْدًا ﴿۱۳۴﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

زمین میں اور اللہ ہے بے پردا و سب خوبیوں والا اور اللہ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَمَا فِی الْاَرْضِ وَکَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیْلًا ﴿۱۳۵﴾ اِنْ یَّشَآءْ یُّهْبِکُمْ

اور جو کچھ ہے زمین میں اور اللہ کافی ہے کارساز اگر چاہے تو تم کو دور کر دے

اٰیٰہَا النَّاسُ وَاٰیٰتٍ بِالْاٰخِرِیْنَ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا ﴿۱۳۶﴾

اے لوگو! اور اے آسمانوں کو اور اللہ کو ہے قدرت ہے

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا

جو کوئی چاہتا ہو ثواب دنیا کا سو اللہ کے یہاں ہے ثواب دنیا کا



## وَالْآخِرَةُ ۖ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۱۳۲﴾

اور آخرت کا اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے

**رابط آیات** عورتوں اور یتیموں کے احکام بیان کرنے کے بعد شرآنی اسلوب کے مطابق پھر ترغیب و ترہیب کا مضمون ارشاد فرمایا گیا۔

## خلاصہ تفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی ملک میں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (تو ایسے مالک کے احکام کا ماتنا بہت ہی ضروری ہے) اور (بجا آوری احکام کا خطاب خاص تم ہی کو نہیں ہوا بلکہ) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی تورات و انجیل) ملی تھی اور تم کو بھی (حکم دیا ہے) کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو جسکو تقویٰ کہتے ہیں جس میں تمام احکام کی موافقت داخل ہے، اسی لئے اس سورۃ کو تقویٰ سے شروع کر کے اس کی تفصیل میں مختلف احکام لائے ہیں، اور (یہ بھی ان کو اور تم کو سنایا گیا) اگر تم نہ شکر ہی کر دو گے (یعنی احکامِ الہیہ کی مخالفت کر دو گے) تو (خدا تعالیٰ کا کوئی ضرر نہیں) ہاں تمہارا ہی ضرر ہے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی (تو) ملک میں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (ایسے بڑے سلطان کا کیا ضرر ہوگا، البتہ ایسے بڑے سلطان کی مخالفت بلا شک مضرب ہے) اور اللہ تعالیٰ کسی کی اطاعت کے حاجت مند نہیں (اور) خود اپنی ذات میں محمود (و کامل الصفات) ہیں (پس کسی کی مخالفت سے ان کی صفات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا) اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک میں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور (جب وہ ایسے قادر و مختار ہیں تو اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے وہ) اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (پس ان کی کارسازی کے ہوتے ان کے فرمانبرداروں کو کون ضرر پہنچا سکتا ہے، پس کسی سے ڈرنا نہ چاہئے) اور اللہ تعالیٰ جو تم کو دین کے کام بخلائے ہیں تو تمہاری ہی سعادت کے لئے (و نہ وہ دوسروں سے بھی کام لے سکتے ہیں) یہ نہ کہ ان کی ایسی قدرت ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اے لوگو تم سب کو فنا کر دیتا اور دوسروں کو موجود کر دیتا (اور ان سے کام لے لیتا، جیسا دوسری آیت میں ہے **إِنْ تَوَلَّوْا نَسْتَبْدِلْ** (۱۳۸) اور اللہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں) پھر ایسا جو نہیں کیا تو ان کی عنایت ہے، اطاعتِ حکم کو غنیمت سمجھ کر سعادت حاصل کرو اور دیکھو دین کے کام کا اصلی ثمرہ آخرت میں ہے (دنیا میں نہ ملنے سے بدل نہ ہونا بلکہ) جو شخص (دین کے کام میں) دنیا کا معاوضہ



چاہتا ہو تو وہ بڑی غلطی میں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی ان کی قدرت میں) تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ (موجود) ہے (جب ادنیٰ اعلیٰ دونوں پر ان کی قدرت ہے، تو اعلیٰ ہی چیز کیوں نہ مانگی جائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے سنے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (سب کے اقوال اور درخواستوں کو دنیا کی ہولناکیوں کی سنتے ہیں، اور سب کی نیکیوں کو دیکھتے ہیں، پس طالبانِ آخرت کو ثواب دیں گے، اور طالبانِ دنیا کو آخرت میں محروم رکھیں گے) پس آخرت ہی کی نیت اور درخواست کرنا چاہیے، البتہ دنیا کی حاجت مستقل طور پر مانگنا مضائقہ نہیں، لیکن عبادت میں یہ قصد نہ کرے۔

## معارف و مسائل

**فَوَافِرٌ مِّمَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ**، یعنی اللہ کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات "اس جگہ ان الفاظ کو تین مرتبہ دہرایا گیا، اول سے کشاکش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، دوسرے سے بے نیازی اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پرواہ نہیں اگر تم منکر ہو، تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے کہ اگر تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو تو وہ تمہارے سب کام بنائے گا۔

تیسری آیت میں اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھالے، اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار پیدا کر دے، اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغناء اور بے نیازی خوب ظاہر ہو گئی، اور نافرمانوں کو پوری طرح تہدید اور تحذیف بھی ہو گئی۔

**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوْمِينَ بِالْإِقْطِ شُهُدَاءُ**

اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ

**لِللّٰهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوَالِدَ الَّذِينَ وَالَآ قَرَبِينَ إِن**

کی طرف اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا یا قرابت والوں کا اگر

**تَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللّٰهُ أُولَىٰ بِهِمَا فَمَا تَتَّبِعُوا أَهْوَىٰ أَنْ**

کوئی مالدار ہے یا محتاج، تو اللہ ان کا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف

**تَعْدِلُوا هَٰذَا وَإِنْ تَلَوْا أَوْ تَعْرَضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا**

کرنے میں اور اگر تم زبان نہ ملو گے یا بچا جاوے گا تو اللہ تمہارے سب کاموں



## تَعْمَلُونَ خَيْرًا ۱۳۵

ے واقف ہے ۔

## خلاصہ تفسیر

اسے ایمان والوں (تمام معاملات میں) ادا سے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اقرار یا شہادت کی فہمت آوے تو اللہ (کی خوشنودی) کے لئے (سچی) گواہی (اور اظہار) دینے والے رہو اگرچہ (وہ گواہی اور اظہار) اپنی ہی ذات کے خلاف ہو، (جسکو اقرار کہتے ہیں) یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو (اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچا جائے، تاکہ اس سے بے مرقتی نہ ہو، یا یہ کہ یہ غریب ہے اس کا کیسے نقصان کر دیں، تم گواہی دینے میں کسی کی امیری غریبی یا نفع و نقصان کو نہ دیکھو، کیونکہ وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی) اگر امیر ہے تو اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے (اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہی کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں، پھر جب باوجود قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے خواہ اس سے وقتی طور پر کچھ نقصان بھی پہنچ جائے تو تم ضعیف تعلق کے باوجود اپنی شہادت میں ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو) سو تم (اس شہادت میں) خواہش نفس کا اتباع مت کرنا، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم کج بیانی کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا پہلو تہی کرو گے (یعنی شہادت کو ظالمو گے) تو (یاد رکھنا) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں

## معارف و مسائل

دنیا میں انبیاء علیہم السلام اور سورۃ نساہ کی اس آیت میں تمام مسلمانوں کو عدل و انصاف پر آسمانی کتابیں بھیجنے کا اصل مقصد قیام عدل اور سچی گواہی دینے کی ہدایت کی گئی ہے، اور جو چیزیں قیام عدل یا سچی گواہی میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں ان کو نہایت بلیغ انداز میں دور کیا گیا ہے، اسی مضمون کی ایک آیت سورۃ مائدہ میں بھی آنے والی ہے، دونوں کا مضمون بلکہ الفاظ بھی تقریباً مشترک ہیں، اور سورۃ حدید کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجے گا اور پھر ان کے



بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجے رہنے کا، اور ان کے ساتھ بہت سی کتابیں اور صحیفے نازل فرمانے کا اہم مقصد ہی تھا، کہ دنیا میں انصاف اور اس کے ذریعہ امن و امان قائم ہو، ہر فرد انسانی اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں انصاف کو اپنا شعار بنالے، اور جو سرکش لوگ وعظ و نصیحت کے ذریعہ عدل و انصاف پر نہ آئیں، اپنی سرکشی پر اڑے رہیں، ان کو قانونی سیاست اور تحریر و سزا کے ذریعہ انصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

سورۃ حدید کی پچیسویں آیت میں اس حقیقت کو اس طرح واضح فرمایا ہے:

”یعنی ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسولؐ  
نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ  
کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں  
انصاف پر اور ہم نے اتارا لوہا اس میں  
بڑا رعب ہے اور اس سے لوگوں کے  
کام چلتے ہیں“

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ  
وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ  
وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ  
بِالْقِسْطِ وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ  
فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ  
لِلنَّاسِ

اس سے معلوم ہوا کہ بعثت انبیاءؑ اور تنزیل کتب سماویہ کا سارا نظام انصاف ہی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے، رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لئے عمل میں آیا ہے، اور آخر میں لوہا اتارنے کا ذکر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ سب لوگوں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کافی نہ ہوگی، بلکہ کچھ شریر لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو لوہے کی زنجیروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مرعوب کر کے انصاف پر قائم کیا جائے گا۔

عدل و انصاف پر قائم رہنا | سورۃ حدید کی آیت مذکورہ اور سورۃ نساء کی اس آیت میں اسی  
صرف حکومت کا فریضہ نہیں، | طرح سورۃ مائدہ کی آیت کُوْنُوا قَوِّمِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءُ بِالْقِسْطِ  
بلکہ انسان اس کا مکلف ہے | وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ اَلَّا تَعْدِلُوْا اِنْ عَدِلْتُمْ لَوْ اَنَّكُمْ  
اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (آیت ۸) سے واضح طور پر یہ ہدایت دی گئی ہے  
کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان  
اس کا مکلف و مخاطب ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو انصاف پر قائم رکھنے  
کے لئے کوشش کرے، ہاں انصاف کا صرف ایک درجہ حکومت اور حکام کے ساتھ مخصوص ہے  
وہ یہ کہ شریر اور سرکش انسان جب انصاف کے خلاف آڑ جائیں، نہ خود انصاف پر قائم



ہیں نہ دوسروں کو عدل و انصاف کرنے دیں، تو حاکمانہ تعزیر اور سزا کی ضرورت ہے، یہ اقامتِ عدل و انصاف ظاہر ہے کہ حکومت ہی کر سکتی ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔

آج کی دنیا میں جاہل عوام کو چھوڑیے نکمے پڑھے تعلیم یافتہ حضرات بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انصاف کرنا صرف حکومت و عدالت کا فریضہ ہے، عوام اس کے ذمہ دار نہیں ہیں، اور یہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس نے ہر ملک ہر سلطنت میں حکومت اور عوام کو رد و متضاد فریق بنا دیا ہے، راعی اور رعیت کے درمیان خلاف و اختلاف کی وسیع خلیج حائل کر دی ہے، ہر ملک کے عوام اپنی حکومت سے عدل و انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن خود کسی انصاف پر قائم رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اسی کا نتیجہ ہے جو دنیا آنکھوں سے دیکھ رہی ہے، کہ قانون معطل ہے، جبرائیل کی روزانہ نزول ترقی ہے، آج ہر ملک میں قانون سازی کے لئے اسمبلیاں قائم ہیں، ان پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوتا ہے، ان کے نمائندے منتخب کرنے کے لئے الیکشن میں خدا کی پوری زمین ہل جاتی ہے، اور پھر یہ پورے ملک کا دل و دماغ ملک کی ضروریات اور لوگوں کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ قانون بناتے ہیں، اور پھر ان کے لئے شائع کرتے ہیں، اسے عامہ معلوم کرنے کے بعد یہ قانون قابلِ تنفیذ سمجھا جاتا ہے پھر اس کے نفاذ کے لئے حکومت کی لاتعداد مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ہزاروں بلکہ لاکھوں شعبے ہوتے ہیں، اور ہر شعبہ میں ملک کے بڑے بڑے آزمودہ کار لوگوں کی مختصر بروئے کار آتی ہیں، لیکن چلی ہوئی رسوم کی دنیا سے ذرا نظر کو اونچا کر کے دیکھا جائے، اور جن لوگوں کو خواہ مخواہ تہذیب اور شائستگی کا ٹھیکہ دار مان لیا گیا ہے تھوڑی دیر کے لئے ان کی کورانہ تقلید سے نکل کر حقیقت کا جائزہ لیا جائے تو ہر شخص بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گا کہ

نگاہِ خلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے

ہری نظروں میں پھیکا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے

اب سے تین سال پہلے ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۸ء تک کا ہی موازنہ کریں، اعداد و شمار

محفوظ ہیں وہ گواہی دیں گے کہ جوں جوں قانون سازی بڑھی، قانون میں عوام کی مرضی کی نمائندگی بڑھی اور تنفیذ قانون کے لئے مشینری بڑھی، ایک پولیس کے بجائے مختلف اقسام کی پولیس بروئے کار آئی اتنے ہی روز بروز جرائم بڑھے، اور لوگ انصاف سے دور ہوتے چلے گئے، اور اسی رفتار سے دنیا کی بد امنی بڑھتی چلی گئی۔



ان عالم کی ضمانت صرف عقیدہ کوئی مرد رشید نہیں جو آنکھ کھول کر دیکھے، اور چلتی ہوئی رسموں آخرت اور خوفِ خدا کے ساتھ کی جکر بندی کو توڑ کر ذرا رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو سوچے سمجھے، اور اس حقیقت پر غور کرے کہ دنیا کا امن و سکون بڑے تعزیرات سے نہ کبھی حاصل ہوا نہ آئندہ ہوگا، عالم کے امن و امان کی ضمانت صرف عقیدہ آخرت اور خوفِ خدا کے ساتھ ہے جس کے ذریعہ سارے فرائضِ راعی اور رعیت اور عوام اور حکومت میں مشترک ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص اپنی ذمہ داری کو محسوس کرنے لگتا ہے، قانون کے احترام و حفاظت کے لئے عوام یہ کہہ کر آزاد نہیں ہو جاتے کہ یہ کام حکام کا ہے، قرآن مجید کی مذکورہ آیتیں بسلسلہ قیامِ عدل و انصاف اسی انقلابی عقیدہ کی تلقین پر ختم کی گئی ہیں۔

سورۃ نساء کی آیت کے ختم پر اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا، کا ارشاد ہوا، اور سورۃ مائدہ کی آیت کے آخر میں اِذْ لَقَوْاْ قَوْمًا كُفَرًا يَّسْتَفْتِيكَ فِي الْمَقَاتِلِ اِنَّ اللّٰهَ يَكُونُ لَكُمْ حَكِيْمًا، اور سورۃ حدید کی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا، اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ،

ان تینوں آیتوں میں حکام اور عوام دونوں کو عدل و انصاف پر قائم رہنے اور قائم رکھنے کی ہدایات دینے کے بعد خواتیمِ آیات میں سب کی نظریں اس حقیقت کی طرف پھیر دی گئی ہیں جو انسان کی زندگی اور اس کے خیالات اور جذبات میں انقلابِ عظیم پیدا کرنے والی ہے، یعنی خدا تعالیٰ کی قوت و سلطنت اس کے سامنے حاضری اور حساب و کتاب اور جزاء و سزا کا تصور یہی وہ چیز تھی جس نے اب سے سو برس پہلے کی ناخواند دنیا کو آج کی نسبت بہت زیادہ امن و سکون بخشا ہوا تھا، اور یہی وہ چیز ہے جس کے نظر انداز کر دینے کی وجہ سے آج کی ترقی یافتہ آسمانوں سے باتیں کرنے والی، سیارے اڑانے والی دنیا امن و چین سے محروم ہے۔

روشن خیال دنیا سُن لے کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقیوں سے وہ آسمان کی طرف چڑھ سکتے ہیں، سیاروں پر جا سکتے ہیں، سمندر میں جا سکتے ہیں، لیکن امن و امان اور سکونِ اطمینان جو ان سارے سامانوں اور سارے کارخانوں کا اصل مقصد ہے وہ نہ ان کو کسی سیارے میں ہاتھ آئے گا، نہ کسی نئی سے نئی ایجاد میں، وہ ملے گا تو پیغمبرِ عربی روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور ان کی تعلیمات میں، خدا تعالیٰ کو ماننے اور آخرت کے حساب پر عقیدہ رکھنے میں، اَلَا بِیْنِکُمۡ وَبَیْنَہُمۡ اِلَّا حُجُبٌ مِّنۡ سَاۡجِدٍ، سائنس کے حیرت انگیز انکشافات روز بروز خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی بے مثال صنعتِ کاری کو اور زیادہ روشن کرتے جاتے ہیں



جن کے سامنے ہر انسانی ترقی اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کر کے رہ جاتی ہے، مگر یہ  
”چہ سو و چوں دل و انا و چشم بینا نیست“

قرآن حکیم نے ایک طرف تو دنیا کے سامنے نظام کا منشاء ہی قیام عدل و انصاف  
بتلایا، دوسری طرف اس کا ایک بے مثال انتظام ایسا عجیب و غریب فرمایا کہ اگر اس کے  
پورے نظام کو اپنایا جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو یہی خوشخوار و بدکار دنیا ایک ایسے  
صالح معاشرے میں تبدیل ہو جائے جو آخرت کی جنت سے پہلے نقد جنت ہو، اور ارشاد  
”وَلَا يَمُنُّ خَلْفَ مَقَامٍ رَبِّهِ جَنَّتِينَ“ جسکی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ خدا سے ڈرنے  
والوں کو دو جنتیں ملیں گی، ایک آخرت میں دوسری نقد دنیا ہی میں، اس کا ظہور مشاہدہ  
میں آجائے، اور یہ کوئی صرف فرضی خیال یا خیالی حکیم نہیں، اس پیغام کے لانے والے  
مہترس رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو عملی صورت میں لا کر چھوڑا ہے، اور ان کے  
بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے متبع سنت سلاطین نے جب بھی اس پر عمل کیا تو  
شیر اور بکری کے ایک گھاٹ پر بانی پینے کی فرضی مثال ایک حقیقت بن کر لوگوں کے مشاہدہ  
میں آگئی، غریب و امیر، مزدور و سرمایہ دار کا تفرقہ یکسر مٹ گیا، قانون کا احترام ہر فرد  
اپنے گھروں کے بند کمروں میں، رات کی تاریکیوں میں کرنے لگا، یہ کوئی افسانہ نہیں، تاریخی  
حقائق ہیں، جن کا اعتراف غیروں نے بھی کیا، اور ہر صاف غیر مسلم بھی اس کے ماننے پر  
مجبور ہوا۔

مضمون آیت کے بعد آیت کی تفسیر تفصیلاً دیکھئے:

مذکورہ آیت میں ”كُونُوا قَسَطًا بِمَا لَيْسَ بِكُمْ“ فرمایا گیا، قسط بجمہر القاف کے معنی  
ہیں عدل و انصاف، اور عدل و انصاف کی حقیقت یہ ہے کہ ہر صاحب حق کا حق پورا ادا  
کیا جائے، اس کے عموم میں اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی داخل ہیں، اور سب قسم کے انسانی  
حقوق بھی، اس لئے قیام بالیقسط کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے  
اور یہ بھی داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکا جائے، مظلوم کی حمایت کی جائے، اور یہ بھی  
داخل ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنے اور مظلوم کا حق دلوانے کے لئے شہادت کی ضرورت  
پیش آئے تو شہادت سے گریز نہ کیا جائے، اور یہ بھی داخل ہے کہ شہادت میں حق اور  
حقیقت کا اظہار کیا جائے، خواہ وہ کسی کے موافق پڑے یا مخالف، یہ بھی داخل ہے کہ  
جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت اور انتظام ہے، جب دو فریق کا کوئی مقدمہ ان کے  
سامنے پیش ہو تو فریقین کے ساتھ برابری کا معاملہ کریں، کسی ایک طرف کسی طرح کا



میلان نہ ہونے دیں، گواہوں کے بیانات غور سے سنیں، معاملہ کی تحقیق میں اپنی پوری کوشش خرچ کریں، پھر فیصلہ میں پورے پورے عدل و انصاف کا معاملہ رکھیں۔

عدل و انصاف کے قیام میں | سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ کی دونوں آیتیں اگرچہ مختلف سورتوں کی ہیں لیکن رکاوٹ بننے والے اسباب | مضمون و دوقول کا تقریباً قدر مشترک ہے، فرق اتنا ہے کہ عدل و انصاف

کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والی عادت و چیزیں ہوا کرتی ہیں، ایک کسی کی محبت و قرابت یا دوستی و تعلق جس کا تقاضا شاہد کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ شہادت اُن کے موافق دی جائے تاکہ یہ نقصان سے محفوظ رہیں یا ان کو نفع پہنچے اور فیصلہ کرنے والے قاضی یا جج کے دل میں اس تعلق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ ان کے حق میں دے، دوسری چیز کسی کی عداوت و دشمنی ہے، جو شاہد کو اس کے خلاف شہادت پر آمادہ کر سکتی ہے، اور قاضی اور جج کو اس کے خلاف فیصلہ دینے کی بات ہو سکتی ہے، غرض محبت و عداوت دو ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو عدل و انصاف کی راہ سے ہٹا کر ظلم و جور میں مبتلا کر سکتی ہیں، سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ کی دونوں آیتوں میں انہی دونوں رکاوٹوں کو دور کیا گیا ہے، سورۃ نساء کی آیت میں قرابت و تعلق کی رکاوٹ دور کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، ارشاد ہے: وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهِمْ وَنُسُلِهِمْ، یعنی اگرچہ تمہاری شہادت اپنے ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں ہی کے خلاف پڑے تو بھی حق بات کہنے اور سچی شہادت دینے میں اس تعلق کا لحاظ نہ کرو۔

اور سورۃ مائدہ کی آیت میں عداوت اور دشمنی کی رکاوٹ کو دور کیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ یعنی کسی قوم کا بغض و عداوت بھی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہونا چاہئے کہ راہِ عدل کو چھو کر ان کے خلاف گواہی یا فیصلہ دینے لگو۔

دونوں آیتوں کے عنوان و تعبیر میں بھی تھوڑا فرق ہے، سورۃ نساء کی آیت میں قَوْمِيْنَ بِالْقِسْطِ شہدائے اللہ فرمایا گیا، اور سورۃ مائدہ کی آیت میں قَوْمِيْنَ بِالْحَقِّ شہدائے اللہ ارشاد ہوا، یعنی پہلی آیت میں دو چیزوں کی ہدایت ہے، ایک قیامِ قسط اور دوسری شہادتِ اللہ، اور دوسری آیت میں بھی دو ہی چیزیں مامور بہ ہیں، مسگر عنوان بدل کر قیامِ اللہ اور شہادتِ بالقسط۔

اکثر حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اس تغیرِ عنوان سے یہ معلوم ہوا کہ یہ دونوں چیزیں دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، کہیں قیامِ قسط اور شہادتِ اللہ سے تعبیر کر دیا گیا، کہیں قیامِ اللہ اور شہادتِ بالقسط کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا، ان دونوں



آیتوں کے طرز بیان میں یہ بات خاص طور پر قابلِ نظر ہے کہ كُوْنُوْا قَوَّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ یا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ کا طویل جملہ اختیار فرمایا گیا، حالانکہ عدل و انصاف کا حکم صرف ایک لفظ الْقِسْطُ کے ذریعہ بھی دیا جاسکتا تھا، اس طویل جملہ کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ اتفاقی طور پر کسی معاملہ میں عدل و انصاف کر دینے سے ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی، کیونکہ کسی نہ کسی معاملہ میں انصاف ہو جانا تو ایک ایسا طبعی امر ہے کہ ہر بُرے سے بُرے اور ظالم سے ظالم حاکم پر بھی صادق ہے، کہ اس سے بھی کسی معاملہ میں تو انصاف ہو ہی جاتا ہے، اس جملہ میں لفظ كُوْنُوْا استعمال فرما کر یہ بتلایا کہ عدل و انصاف پر ہمیشہ ہر وقت ہر حال اور ہر دوست دشمن کے لئے قائم رہنا ضروری ہے۔

پھر ان دونوں آیتوں میں پوری دنیا کو عدل و انصاف پر قائم کرنے اور قائم کرانے کے لئے جو زیریں اصول اختیار کئے گئے ہیں وہ بھی قرآن عظیم ہی کی خصوصیات میں کہیں۔ ان میں سے ایک اہم چیز تو یہ ہے کہ حکام اور عوام سب کو خدا تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ اور روزِ جزاء کے حساب سے ڈرا کر اس کے لئے تیار کیا گیا ہے کہ عوام خود بھی قانون کا احترام کریں، اور حکام جو تنفیذِ قانون کے ذمہ دار ہیں وہ بھی تنفیذِ قانون میں خدا و آخرت کو سامنے رکھ کر خلقِ خدا کے خادم بنیں، قانون کو خدا مستِ خلق اور اصلاحِ عالم کا ذریعہ بنائیں، لوگوں کی پریشانیوں میں اضافہ اور مظلوم کو دفترِ گردی کے چکر میں پھنسا کر مزید ظلم و بظلم کا سبب نہ بنائیں، قانون کو اپنی ذلیل خواہشات یا چند ملکوں میں فروخت نہ کریں، قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ یا قَوَّامِيْنَ لِلْاَعْمَالِ فرما کر حکام و عوام دونوں کو بللہیت اور اخلاص عمل کی دعوت دی گئی ہے۔

دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ عدل و انصاف کے قیام کی ذمہ داری پورے افرادِ انسانی پر ڈال دی گئی ہے، سورہ نسا اور مائدہ میں تو اس کا مخاطب يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شرما کر پوری امتِ مسلمہ کو بنادیا گیا ہے، اور سورہ حدید میں لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ فرما کر اس فریضہ کو تمام افرادِ انسانی پر عائد کر دیا گیا ہے، سورہ نسا کی آیت میں وَتَوَكَّلْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ فرما کر اس طرف ہدایت فرمادی کہ انصاف کا مطالبہ صرف دوسروں ہی سے نہ ہوا، بلکہ اپنے نفس سے بھی ہونا چاہیے، اپنے نفس کے خلاف کوئی بیان یا اظہار کرنا پڑے تو بھی حق و انصاف کے خلاف کچھ نہ بولے، اگرچہ اس کا نقصان اس کی ذات ہی پر پڑتا ہو، کیونکہ یہ نقصان حقیر و قلیل اور عارضی ہے، اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچالی گئی تو قیامت کا شدید عذاب اپنی جان کے لئے خرید لیا۔



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي

اے ایمان والو! یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو

نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ

نازل کی ہے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے اور جو کوئی

يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَكُوتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

یقین نہ کرے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ۝۱۳۷ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا

وہ بہک کر دور جا پڑا جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہوئے

ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ نَزَّادُوا كُفْرًا تَمَرِكُنَ اللَّهُ

پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر بڑھتے رہے کفر میں تو اللہ ان کو ہرگز

لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا يَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا ۝۱۳۸

بخشنے والا نہیں اور نہ دکھلاوے ان کو راہ۔

رابطہ آیات | اوپر زیادہ حصہ احکام فرعیہ کا مذکور اور ایمان و کفر کے مباحث کہیں کہیں معاملہ

مع المخالفین کے ضمن میں آگئے ہیں، آگے یہ مباحث قرعے تفصیل سے مذکور ہوتے ہیں، اور

ختم سورت کے بالکل قریب تک چلے گئے ہیں، ترتیب بیان میں اول اس کا بیان ہے کہ شریعت

میں ایمان معتبر کیا ہے، پھر کفار کے مختلف فرقوں کی مذمت عقائد میں بھی اور بعض اعمال میں بھی

## خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! (یعنی جو مجھلا ایمان لاکر مؤمنین کے زمرہ میں داخل ہو چکے ہیں) تم عقائد

ضروریہ کی تفصیل سن لو کہ، اعتقاد رکھو اللہ کی (ذات و صفات کے) ساتھ اور اس کے رسول

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت) کے ساتھ اور اس کتاب (کے حق ہونے) کے ساتھ جو اس نے

(یعنی اللہ تعالیٰ نے) اپنے رسول (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی اور ان کتابوں

(کے حق ہونے) کے ساتھ (بھی) جو کہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) پہلے (اور انبیوں پر)

نازل ہو چکی ہیں (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتب سابقہ پر ایمان لانے میں ملا کہ اور

باقی انبیاء علیہم السلام اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا بھی داخل ہو گیا) اور جو شخص اللہ کی ذات



یا صفات) کا انکار کرے اور (اسی طرح جو) اس کے فرشتوں کا انکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کی کتابوں کا (جس میں قرآن بھی آگیا) انکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کے رسولوں کا (جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں) انکار کرے) اور (اسی طرح جو) روز قیامت کا انکار کرے) تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دُور جا پڑا، بلاشبہ جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے (اور اس بار بھی اسلام پر قائم نہ رہے ورنہ پہلا ارتداد و مٹا ہو جاتا بلکہ) پھر کافر ہو گئے، پھر (مسلمان ہی نہ ہوئے ورنہ پھر بھی ایمان مقبول ہو جاتا بلکہ) کفر میں بڑھتے چلے گئے (یعنی کفر پر دم مرگ تک ثابت اور دائم ہے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ اُن کو (منزل مقصود یعنی بہشت کا) راستہ دکھائیں گے، (کیونکہ مغفرت اور جنت کے لئے موت تک مؤمن رہنا شرط ہے)

## معارف و مسائل

**فوائد مہمہ** | (قوله تعالى) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا أَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةٌ أَنْ يَأْتِيَ الْبُيُوتَ بِهَذَا الْآيَةِ الْكُبْرَىٰ (۱۳۱) اور بعضی فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اول ایمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے، پھر توبہ کر کے مؤمن ہوئے، پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے (روح المعانی)

(قوله تعالى) لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيُخْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِي بِهَٰمُ سَبِيلًا، مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ ان کے بار بار کفر کی طرف توشنے سے ان کی توفیق حق ہی سلب ہو جائیگی اور آئندہ توبہ کرنے اور ایمان لانے کا موقع ہی نصیب نہ ہوگا، ورنہ جو قاعدہ قرآن و سنت کی نصوص قطعیہ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ کیسا ہی کافر یا مرتد ہو اگر سچی توبہ کرے تو بچھلا سنا، معاف ہو جاتا ہے، یہ لوگ بھی توبہ کر لیں تو معافی کا قانون کھلا ہوا ہے۔

بَشِيرِ السُّفْقَيْنِ بَأَنَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ (۱۳۱) الَّذِينَ

خوش خبری سنائے منافقوں کو کہ ان کے واسطے ہے عذاب دردناک وہ جو

يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ط

بناتے ہیں کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر

أَيَّبَتُّغُونَ عِنْدَ هُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۝ (۱۳۲)

کیا ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس عزت سعوت تو اللہ ہی کے واسطے ہے ساری



وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتَ اللَّهِ

اور حکم امارچکا تم پر قرآن میں کہ جب سنا اللہ کی آیتوں پر

يُكْفِرُ بِهَا وَيُسْتَهْزِأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا

انکار ہوتے اور ہنس جاتے تو نہ بیٹھو ان کے ساتھ یہاں تک کہ مشغول ہوں

فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ إِنَّكُمْ إِذًا مِثْلُهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ

کسی دوسری بات میں نہیں تو تم بھی انہی جیسے ہو گئے اللہ اکٹھا کرے گا

الْمُتَفِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ۝۱۳۱

منافقوں کو اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ وہ منافق جو

يَتَرَ بَصُورًا بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فِتْنَةٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ

تھاری تاک میں ہیں پھر اگر تم کو فتنہ ملے اللہ کی طرف سے تو کہیں کیا ہم نہ تھے

نَكُنْ مَّعَكُمْ ۚ وَإِنْ كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ

تھارے ساتھ اور اگر نصیب ہو کافروں کو تو کہیں کیا ہم لے

نَسْخُوذُ عَلَيْكُمْ وَنَنْصَعُكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۚ قَالُوا

گھیر نہ لیا تھا تم کو اور بچا دیا تم کو مسلمانوں سے سو اللہ

يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ

فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو

عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ۝۱۳۲

مسلمانوں پر غلبہ -

## خلاصہ تفسیر

منافقین کو خوش خبری سننا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے و آخرت میں بڑی دردناک سزا (تجویر کی گئی) جن کی یہ حالت ہے کہ (عقائد تو اہل ایمان کے نہ رکھتے تھے مگر وضع بھی اہل ایمان کی نہ رکھ سکے چنانچہ) کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا ان کے پاس (جا کر) عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں سو (خوب سمجھ لو کہ) عزت تو ساری خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہے (وہ جس کو



چاہیں دیں، پس اگر خدا تعالیٰ ان کو یا جن سے جا جا کر دوستی کرتے ہیں ان کو عزت نہ دیں تو کہاں سے معزز بن جاویں گے، اور اسے مسلمانوں کو بھونچنا منافقین کی طرح کفار کے ساتھ خصوصیت مت رکھنا خاص کر جس وقت وہ کفر باہت کا تذکرہ کرتے ہوں چنانچہ اس سورۃ مدنیہ کے قبل بھی اللہ تعالیٰ بھلائے پاس یہ فرمان (سورۃ انفار آیت ۱۰۱) میں جو لکھا ہے ایچ چکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کسی مجمع میں احکام الہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہو اسنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں (اور یہ مضمون اس آیت کا حاصل ہے) **وَإِذَا زَأَمْتِ الَّذِينَ يَخْتَضِعُونَ لِحُكْمِهِ اسْتِهْزَاهُ** کرنے والے مکہ میں مشرکین تھے اور مدینہ میں یہود تو عیسائیہ اور منافقین صرف غباء و ضعفاء مسلمین کے رد ہوا، پس جس طرح وہاں مشرکین کی مجالست ایسے وقت میں ممنوع تھی یہاں یہود اور منافقین کی مجالست سے بھی اور یہ ممانعت ہم اس لئے کرتے ہیں کہ اس حالت میں تم بھی (گناہ میں) اپنی جیسے ہو جاؤ گے، دھودوں کی نوعیت میں فرق ہو کہ ایک گناہ کفر کا ہے دوسرا فسق کا، اور اس ممانعت مجالست میں کفار اور منافقین سب برابر ہیں، کیونکہ علت اس کی خوض فی الکفر یعنی کفر کی باتوں کا تذکرہ اور اس خوض کا ملشا کفر ہے، اور اس میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ سزائے کفر یعنی دوزخ کا ایندھن ہونے میں بھی دونوں برابر ہوں گے، کیونکہ **يُقْبِلْنَا اللَّهُ تَعَالَىٰ مَنَافِقُونَ كُفْرًا** کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے (اور وہ منافقین) ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر (اور آرزو مند) رہتے ہیں پھر ان کے اس انتظار کے بعد اگر تمھاری فتح منجانب اللہ ہو گئی تو (تم سے آکر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمھارے ساتھ (جہاد میں شریک) نہ تھے (کیونکہ نام و نمود کو تو مسلمانوں میں گھسے ہی رہتے تھے، مطلب یہ کہ ہم کو بھی غنیمت کا حصہ دو) اور اگر کافروں کو (غلبہ کا) کچھ حصہ مل گیا، (یعنی وہ اتفاق سے غالب آئے) تو ان سے کچھ باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے (مگر ہم نے قصداً تمھارے غالب کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد نہ کی اور ایسی تدبیر کی کہ لڑائی بگڑ گئی) اور کیا ہم نے (جب تم مغلوب ہونے لگے تھے) تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا اس طرح کہ ان کی مدد نہ کی، اور تدبیر سے لڑائی بگاڑ دی، مطلب یہ کہ ہمارا احسان مانو اور جو کچھ تمھارے ہاتھ آیا ہے ہم کو بھی کچھ حصہ دلو، غرض دونوں طرف سے ہاتھ مارتے ہیں، سو دنیا میں گواہاں اسلام کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تمھارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرما دیں گے اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے بلکہ کفار مجرم شرار پاکر دوزخ میں جاویں گے، اور







عزت کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس کو چاہتا ہے کچھ حصہ عزت عطا فرمادیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے چونکہ اس کے نزدیک محبوب اور مقبول ہیں، اس لئے ان کو عزت و غلبہ دیا جاتا ہے، کفار و مشرکین کو خود ہی عزت نصیب نہیں، ان کے تعلق سے کسی دوسرے کو کیا عزت مل سکتی ہے، اس لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا

مَنْ اَعَزَّ بِالْعَبِيدِ اَذَلَّ  
اللہ

”یعنی جو شخص مخلوقات اور بندوں کے ذریعے  
عزت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل

کر دیتے ہیں“

(جصاص)

مستدرک حاکم میں ہے کہ حضرت فاروق اعظم نے ملک شام کے عامل (گورنر) سے فرمایا: كُنْتُمْ اَقْلَ النَّاسِ وَاَذَلَّ النَّاسِ فَأَعَزَّكُمْ اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ مَهْمَا تَطْلُبُوْا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ يُدْلِكُمْ اللّٰهُ (مستدرک ص ۳۴) یعنی (اے ابو عبیدہ) تم تعداد میں سب سے کم اور سب سے زیادہ کمزور تھے، تم کو محض اسلام کی وجہ سے عزت و شوکت ملی ہے، تو خوب سمجھ لو اگر تم اسلام کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے عزت حاصل کرنا چاہو گے تو خدا تعالیٰ تم کو ذلیل کر دے گا۔

ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا کہ مراد آیت مذکورہ سے یہ ہے کہ کفار و فجار سے دوستی کر کے عزت طلب نہ کرو، ہاں مسلمانوں کے ذریعے عزت و قوت طلب کی جائے تو اس کی ممانعت نہیں، کیونکہ سورۃ منافقون کی آیت نے اس کو واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مؤمنین کو عزت بخشی ہے (جصاص، ص ۳۵۲، ج ۲)

یہاں عزت سے مراد اگر ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والی آخرت کی عزت ہے تب تو دنیا میں اس کا مخصوص ہونا اللہ تعالیٰ کے رسول اور مؤمنین کے ساتھ واضح ہے، کیوں کہ آخرت کی عزت کسی کافر و مشرک کو قطعاً حاصل نہیں ہو سکتی، اور اگر مراد دنیا کی عزت لی جا تو عبوری دور اور اتفاقی حوادث کو چھوڑ کر انجام کے اعتبار سے یہ عزت و غلبہ بالآخر اسلام اور مسلمانوں ہی کا حق ہے، جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان ہے، دنیا نے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا، اور پھر آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امامت و قیادت میں مسلمان صحیح اسلام پر قائم ہو جائیں گے تو پھر غلبہ اپنی کا ہوگا، درمیانی اور عبوری دور میں مسلمانوں کے ضعف ایمان اور ابتلا، معاصی کی وجہ سے ان کا کمزور نظر آنا اس کے منافی نہیں۔

آیت قَدْ نَزَّلَ عَلَيْنَا فِي الْمِكْتَبِ الْخَمِيسِ قرآن مجید کی ایک اور آیت کا جو سورۃ انعام میں قبل از ہجرت مکرّمہ میں نازل ہو چکی تھی حوالہ دے کر یہ بتلایا گیا ہے کہ ہم نے تو اصلاح



انسانی کے لئے پہلے ہی حکم بھیجا تھا کہ کفار و فجار کی مجلس میں بھی مت بیٹھو، اور تعجب ہے کہ یہ غافل لوگ اس سے بھی آگے بڑھ گئے، کہ ان سے دوستی کرنے لگے، اور ان کو عزت و قوت کا مالک سمجھنے لگے۔

سورۃ نسا کی متذکرہ آیت اور سورۃ النعام کی وہ آیت جس کا حوالہ سورۃ نسا میں دیا گیا ہے دونوں کا مفہوم مشترک یہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار یا اُن پر تہزاء کر رہے ہوں تو جب تک وہ اس بہودہ شغل میں لگے رہیں، ان کی مجلس میں بیٹھنا اور شرکت کرنا بھی حرام ہے، پھر سورۃ النعام کی آیت کے الفاظ میں کچھ تعمیم اور مزید تفصیل ہے، کیونکہ اس کے الفاظ یہ ہیں:

یعنی جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو جھگڑتے  
ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کش  
کر دیاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی  
ادب بات میں، اور اگر بھلا دے تم کو شیطان  
تو مت بیٹھو یا آجانے کے بعد ظالموں کے  
ساتھ۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ  
فِي الْأَيْتِ فَاعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى  
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا  
يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ  
بَعْدَ الذِّكْرِ مَعَ الْقَوْمِ  
الظَّالِمِينَ۔

اس میں آیاتِ الہیہ میں جھگڑا کرنا مذکور ہے، جس میں کفر و استہزاء بھی داخل ہے، اور آیت کی تحریف معنوی یعنی آیاتِ قرآنی کے ایسے معانی نکالنا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی تفسیر کے خلاف یا اجماع امت کے خلاف ہوں یہ بھی اسی میں داخل ہیں، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بروایت ضحاک منقول ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن کی تفسیر غلط یا اس میں تحریف کرنے والے یا بدعات نکالنے والے ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں: دَخَلَ فِي هَذِهِ الْأَيَةِ كُلُّ مُخْذِلٍ فِي الدِّينِ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ (منظری، ص ۲۶۳ ج ۲)

تفسیر بالرائے کرنیوالے کی | اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص قرآن کریم کے درس یا تفسیر میں مجلس میں شرکت جائز نہیں | تفسیر سلف صالحین کا پابند نہیں، بلکہ ان کے خلاف معانی بیان کرتا ہے اس کے درس و تفسیر میں شرکت بنص قرآن ناجائز اور بجائے ثواب کے گناہ ہے، تفسیر بحر حقیق میں ابو حیانؒ نے فرمایا کہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ جس بات کا زبان سے کہنا گناہ ہو اس کا کانوں سے باختیار خود سنتا بھی گناہ ہے۔

اور اس پر یہ شعر نقل کیا ہے



وَسَمِعَتْ حَسَنٌ عَنْ سَمَاعٍ الْقَلْبِيِّ  
كَصَوْنِ اللِّسَانِ عَنِ النُّطْقِ بِهِ

”یعنی اپنے کانوں کو بری بات سننے سے بچاؤ، جس طرح زبان کو بری بات کہنے سے بچاتے ہو“

دوسری بات سورۃ انعام کی آیت میں یہ زیادہ ہے کہ اگر کسی وقت بھولے یا بے خبری سے کوئی آدمی ایسی مجلس میں شریک ہو گیا، پھر خیال آیا تو اسی وقت اس مجلس سے علحدہ ہو جانا چاہئے، خیال ہو جانے کے بعد ظالم لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھے۔

سورۃ نساہ اور سورۃ انعام کی دونوں آیتوں میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب تک وہ لوگ اس بیہودہ گفتگو میں مشغول رہیں، اس وقت تک ان کی مجلس میں بیٹھنا حرام ہے۔ اس مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب وہ اس گفتگو کو ختم کر کے کوئی اور بات شروع کر دیں تو اس وقت ان کے ساتھ مجالست اور شرکت جائز ہے یا نہیں؟ قرآن کریم نے اس کو صراحت سے بیان نہیں فرمایا، اسی لئے علماء کا اس میں اختلاف ہے، بعض نے فرمایا کہ ممانعت کی علت آیات الہیہ کی توہین اور تحریف تھی، جب وہ ختم ہو گئی تو ممانعت بھی ختم ہو گئی، اسی لئے دوسری باتیں شروع ہو جانے کے بعد ان کی مجلس میں بیٹھنا گناہ نہیں اور بعض نے فرمایا کہ ایسے کفار و فجار اور ظالم لوگوں کی صحبت و مجالست بعد میں بھی درست نہیں، حضرت حسن بصریؒ کا یہی ارشاد ہے، انھوں نے سورۃ انعام کے اس جملہ سے استدلال فرمایا ہے: فَلَا تَقْعُدُوا مَعَ الْكَافِرِينَ الْغَالِبِينَ، یعنی یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھیں، اور ظاہر ہے کہ ظالم اس گفتگو کو ختم کر دینے کے بعد بھی ظالم ہیں اسی لئے اس کی صحبت و مجالست سے بعد میں بھی احتراز لازم ہے۔ (جصاص)

اور تفسیر مظہری میں قاضی صاحب رحمہ اللہ نے دونوں میں تطبیق اس طرح فرمائی ہے کہ جب کفر و ہتھزار اور تحریف قرآن کی گفتگو بند ہو کر کوئی دوسری بات شروع ہو جائے تو اس وقت بھی ایسے لوگوں کی مجلس میں شرکت بلا ضرورت تو حرام ہے، اور اگر کوئی ضرورت شرعی یا طبعی داعی ہو تو جائز ہے۔

بروں کی صحبت | امام ابو بکر جصاصؒ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس مجلس میں کوئی گناہ ہو رہا ہو تو مسلمان پر نہیں عن المنکر کے ضابطہ سے تنہائی بھلی سے یہ لازم ہے کہ اگر اس کو روکنے کی قدرت ہو تو قوت کے ساتھ روک دے، اور یہ قدرت نہیں ہے تو کم از کم اس گناہ سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرے جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس



مجلس سے اٹھ جائے، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے ایک مرتبہ چند لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کیا کہ وہ شراب پی رہے تھے، ان میں سے ایک شخص کے بارے میں ثابت ہوا کہ وہ روزہ رکھے ہوئے ہے، اس نے شراب نہیں پی، لیکن ان کی مجلس میں شریک تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اس کو بھی سزا دی کہ وہ ان کی مجلس میں بیٹھا ہوا کیوں تھا۔ (بحر محیط، صفحہ ۵، ۳۷ جلد ۳)

تفسیر ابن کثیر میں اس جگہ یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یعنی جو شخص اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ ایسے دسترخوان یا کھانے کی میز پر بھی نہ بیٹھے جہاں شراب کا درہلچا ہو“

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ فَلَا يَجْلِسُ عَلَى مَائِدَةٍ  
يُدَارُ عَلَيْهَا الْخَمْرُ  
(ابن کثیر، صفحہ ۵۶۷ ج ۱)

مذکورہ بحث میں مجلس سے اٹھ جانے کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کے لئے یہ شرط ہے کہ شرعی حیثیت سے اس مجلس کے چھوڑ دینے میں کوئی گناہ لازم نہ آتا ہو، مثلاً مسجد میں جماعت کی شرکت ضروری امر ہے، اگر وہاں کوئی خلافِ شرع کام ہونے لگے تو جماعت اس کی وجہ سے ترک نہ کرے بلکہ صرف قلبی ناراضگی پر اکتفا کرے، اسی طرح کوئی اور ضروری مجلس جسکی ضرورت شریعت سے ثابت ہے، اگر وہاں کچھ لوگ کوئی خلافِ شرع کام کرنے لگیں تو دوسروں کے گناہ کی وجہ سے اس مجلس کو چھوڑ کر خود گناہ کا ارتکاب کرنا معقول اور درست نہیں، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اگر ہم لوگوں کے گناہ کی وجہ سے اپنے ضروری کام ترک کر دیا کریں، تو ہم فساد و فحار کے لئے سنت و شریعت کے مٹانے کا راستہ ہموار کر دیں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اہل باطل کے ساتھ مجالست کی چند صورتیں ہیں:

اول ان کے کفریات پر رضا کے ساتھ، یہ کفر ہے، دوم اظہارِ کفریات کے وقت کراہیت کے ساتھ یہ بلا عذر فسق ہے، سوم کسی ضرورتِ دنیوی کے واسطے مباح ہے، چہارم تبلیغِ احکام کے لئے عبادت ہے، پنجم اضطراب اور بے اختیاری کے ساتھ، اس میں محذور ہے۔

کفر پر راضی ہونا کفر ہے | آخر آیت میں ارشاد فرمایا: اِنْ كُنْتُمْ اِذَا مَثَلْتُمْ، یعنی اگر تم ایسی مجلس میں لطیف خاطر شریک رہے جس میں آیاتِ الہیہ کا انکار یا استہزاء یا تحریف ہو رہی ہو



تو تم بھی اُن کے گناہ کے شریک ہو کر اپنی جیسے ہو گئے، مراد یہ ہے کہ خدا نخواستہ تمہارے جذبات و خیالات بھی ایسے ہیں کہ تم ان کے کفریات کو پسند کرتے اور اس پر راضی ہوتے، تو حقیقہً تم بھی کافر ہو، کیونکہ کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہے، اور اگر یہ بات نہیں تو ان کی مثل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جس طرح وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور دین کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں تم اپنی اس شرکت کے ذریعہ ان کی امداد کر کے معاذ اللہ ان کی مثل ہو گئے۔

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَهُمْ خَادِرُونَ وَإِذَا قَامُوا

البتہ منافق دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا اور جب کھڑے ہوں

إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ

نماز کو تو کھڑے ہوں ہائے جی سے لوگوں کے دکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو

اللَّهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ مَذْبُذِبِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ

مگر تھوڑا سا، ادھر میں جتنے ہیں دونوں کے بیچ نہ اُن کی طرف

وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۖ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَكُنْ تَجِدْ لَهُ سَبِيلًا ۝

اور نہ ان کی طرف اور جس کو گمراہ کرے اللہ تو ہرگز نہ پائے گا تو ان کے واسطے کہیں راہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ

اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو

دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ

محبوڑ کر کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا

سُلْطَانًا مُّبِينًا ۝

الزام صریح

## خُلاصۂ تفسیر

بلاشبہ منافق لوگ (اظہار ایمان میں) چال بازی کرتے ہیں اللہ سے رگوان کی چسپال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور رگوان کا اعتقاد اللہ کے ساتھ چال بازی کرنے کا نہ ہو، مگر ان کی یہ کارروائی مشابہ اس کے ہے کہ جیسا یہی اعتقاد ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا



ان کو دینے والے ہیں، اور چونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں، اور اس لئے نماز کو فرض نہ سمجھیں نہ اس میں ثواب کا اعتقاد رکھیں، اس لئے جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، (کیونکہ نشاط اعتقاد اور امید سے پیدا ہوتا ہے) صرف آدمیوں کو (اپنا نمازی ہونا) دکھلاتے ہیں (تاکہ مسلمان سمجھیں) اور (چونکہ محض نماز کا نام ہی کرنا ہے اس لئے اس نماز میں) اللہ تعالیٰ کا ذکر (زبانی) بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر (یعنی محض صورت نماز کی بنا لیتے ہیں جس میں نماز کا نام ہو جاوے، اور عجب نہیں کہ اٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو، کیونکہ چہر کی ضرورت تو بعض نمازوں میں امام کو ہوتی ہے، امامت تو ان کو کہاں نصیب ہوتی، مقتدی ہونے کی حالت میں اگر کوئی بالکل نہ پڑھے فقط لب ہلاتا ہے تو کسی کو کیا خبر ہو تو ایسے بد اعتقادوں سے کیا بعید ہے کہ زبانی بھی نہ ملتی ہو) معلق ہوئے ہیں دونوں کے (یعنی کفار و مؤمنین کے) درمیان میں نہ (پورے) اور نہ (پورے) اور (کیونکہ ظاہر میں مؤمن تو کفار سے الگ اور باطن میں کافر تو مؤمنین سے الگ) اور جس کو خدا تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (جیسا کہ ان کی عادت ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں) ایسے شخص کے (مومن ہونے کے) لئے کوئی سبیل (یعنی راہ) نہ پائے گی مطلب یہ کہ ان منافقین کے راہ پر آنے کی امید مت رکھو، اس میں منافقین کی تشبیح ہے اور مؤمنین کی تسلی کہ ان کی شرارتوں سے بچ نہ کریں) اے ایمان والو! تم مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو (خواہ منافق ہوں خواہ مجاہد ہوں) دوست مت بناؤ (جیسا منافقین کا شیوہ ہے کیونکہ تم کو ان کی حالت کفر و عداوت کی معلوم ہو چکی) کیا تم (ان سے دوستی کر کے) یوں چاہتے ہو کہ اپنے اوپر (یعنی اپنے مجرم و مستحق عذاب ہونے پر) اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم کر لو (حجت صریح یہی ہے کہ ہم نے جب منع کر دیا تھا پھر کیوں کیا)

## معارف و مسائل

مسئلہ: (قولہ تعالیٰ) قَامُوا کَسَالًا، جس کسل کی یہاں مذمت ہے وہ اعتقاد کی کسل ہے، اور جو باوجود اعتقاد صحیح کے کسل ہو وہ اس سے حاج ہے، پھر اگر کسی عذر سے ہو جیسے مرض و تعب و غلبہ نوم تو قابل ملامت بھی نہیں، اور اگر بلا عذر ہو تو قابل ملامت ہے۔  
(بیان القرآن)

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرَجَاتِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ

یشک منافق ہیں سب سے نیچے درجے میں دوزخ کے اور ہرگز



تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا

نہ پائے گا تو ان کے پاس کوئی مددگار مگر جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کی اور مضبوط پکڑا

بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ط

اللہ کو اور خالص کبھوار ہوئے اللہ کے سوا وہ ہیں ایمان والوں کے ساتھ ،

وَسَوْفَ يُؤْتِي اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝۱۲۶ مَا يَفْعَلُ

اور جلد سے گا اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب ، کیا کرے گا

اللَّهُ بِعَدْلٍ عَظِيمٍ ۝۱۲۷ إِن شَكَرْتُمْ وَأَمِنْتُمْ ط وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا

اللہ تم کو عذاب کر کے اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو اور اللہ شکر دان ہے

عَلِيمًا ۝۱۲۸

سب کچھ جاننے والا

## خُلاصۂ تفسیر

بلاشبہ منافقین و دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے اور رائے مخاطب

تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا جو ان کو اس سزا سے بچائے (لیکن ان میں سے) جو لوگ (نفاق سے) توبہ کر لیں اور (مسلمانوں کے ساتھ جو ان کے ایذا رساں معاملات تھے ان کی) اصلاح

کر لیں (یعنی پھر ایسی باتیں نہ کریں) اور (کفار سے جو بغرض ان کی پناہ میں رہنے کے دوستی

کرتے ہیں اس کو چھوڑ کر) اللہ تعالیٰ پر وثوق (اور توکل) رکھیں اور (ریاء کو چھوڑ کر) اپنے دین

(کے اعمال) کو خالص اللہ ہی کی رضا کے لئے کیا کریں (غرض اپنے عقائد کی، معاملات کی،

احتملاق باطنی کی، اعمال کی، سب کی درستی کر لیں) تو یہ (تابع) لوگ (ان) مؤمنین کے ساتھ

(درجات جنت میں) ہوں گے، (جو کہ پہلے سے کامل ایمان رکھتے ہیں) اور (ان) مؤمنین کو اللہ

تعالیٰ (آخرت میں) اجر عظیم عطا فرمائیں گے (پس جب یہ مؤمنین کے ساتھ ہوں گے تو ان

کو بھی اجر عظیم ملے گا، اور اے منافقو! اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم (ان کی

نعمتوں کی جو تم پر ہیں) سپاس گزاری کرو اور (اس سپاس گزاری کا طریقہ ہمارا پسندیدہ یہ

ہے کہ تم) ایمان لے آؤ (یعنی خدا تعالیٰ کا کوئی کام اٹھا نہیں پڑا جو تم کو سزا دینے سے جل جہا

صرف تمہارا کفر جو اس شد درجہ کا کفر ان نعمت ہے سبب تمہاری سزا کا اگر اس کو چھوڑ دو



تو پھر رحمت ہی رحمت ہے، اور اللہ تعالیٰ (تو خدمت کی) بڑی قدر کرنے والے (اور خدمتگذاری کے خلوص وغیرہ کو) خوب جاننے والے ہیں (پس جو شخص اطاعت و اخلاص سے لے لے اس کو بہت کچھ دیتے ہیں)

## معارف و مسائل

(قرآن تعالیٰ) اَخْلَصُوا دِيْنَهُمْ، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی عمل مقبول ہے جو ریاء سے پاک ہو، اور محض اسی کی ذات کے لئے ہو، کیونکہ مخلص کے معنی فقہاء نے یہ بیان کئے ہیں:

”یعنی مخلص وہ آدمی ہے جو عمل محض اللہ ہی کے لئے کرے، اور اس بات کو وہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کے عمل کی تعریف کریں“

الَّذِي يَعْمَلُ لِلَّهِ لَا يُحِبُّ  
أَنْ يَحْمَدَهُ النَّاسُ عَلَيْهِ  
(بحوالہ مظہری)

بسم اللہ الرحمن الرحیم



لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ

اللہ کو پسند نہیں کیں بُری بات کا ظاہر کرنا،

إِلَّا مَنْ ظَلَمَ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ﴿۱۳۸﴾

مگر جس پر ظلم ہو ہو، اور اللہ ہر شے والا جاننے والا، اگر تم کھول کر کرو کوئی بھلائی

أَوْ تَخْفَوْهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴿۱۳۹﴾

یا اس کو چھپاؤ یا معاف کرو، بُرائی کو تو اللہ بھی معاف کرتا والا بڑی قدرت والا ہے

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ

جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ

يُفْرِقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ مِنْ بَعْضٍ وَ

فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور

نَكْفُرُ مِنْ بَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَلِكَ

نہیں مانتے بعضوں کو اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں ایک

سَبِيلًا ﴿۱۴۰﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا

راہ، ایسے لوگ وہی ہیں اصل کافر اور ہم نے تیار کر رکھا ہے

لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿۱۴۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ

کافروں کے واسطے عذاب کا عذاب اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر

وَلَمْ يُفْرِقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ

اور جہان کیا ان میں سے کسی کو ان کو جہاد دے گا ان کے

أَجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۴۲﴾

ثواب اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

## خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ بُری بات زبان پر لانے کو (کسی کے لئے) پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے  
 کہ اپنے مظلوم کی نسبت کچھ حکایت شکایت کرنے لگے تو وہ گناہ نہیں، اور اللہ تعالیٰ (مظلوم



کی بات، خوب سنتے ہیں (اور ظالم کے ظلم کی حالت) خوب جانتے ہیں (اس میں اشارہ ہے کہ مظلوم کو بھی خلاف واقعہ کہنے کی اجازت نہیں، اور ہر چند کہ ایسی شکایت جائز تو ہے لیکن) اگر نیک کام عملاتیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو (جس میں معاف کرنا بھی آگیا) یا بالخصوص (کسی کی) برائی کو معاف کر دو تو زیادہ افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں، (باوجودیکہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح انتقام لے سکتے ہیں، مگر پھر بھی اکثر معاف ہی کر دیتے ہیں، پس اگر تم ایسا کرو تو اذل تو تخلق باحسان اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا اتباع ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرنے کی امید ہوگی) جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا ان کے عقیدہ اور قول سے جو آگے آتا ہے صاف طور لازم آتا ہے) اور (کفر کرتے ہیں) اس کے رسولوں کے ساتھ (یعنی بعض کے ساتھ تو صراحتاً، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام و حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے، اور کل کے ساتھ لزوماً جیسا آگے آتا ہے) اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں (باعث بار ایمان لانے کے) فسوق رکھیں اور (اپنے اس عقیدہ کو زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں (اس قول اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کفر لازم آگیا، اور سب رسولوں کے ساتھ بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور ہر رسول نے سب رسول کو رسول کہا ہے، جب بعض کا انکار ہوا تو اللہ تعالیٰ کی اور بقیہ رسولوں کی تکذیب ہو گئی، جو کہ ضد ہے تصدیق اور ایمان کی) اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں (کہ نہ سب پر ایمان رہے جیسے مسلمان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ سب کا انکار رہے جیسا کہ مشرکین کرتے تھے سو) ایسے لوگ بقسینا کافر ہیں (کیونکہ کفر بالبعض بھی کفر ہے، اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں، جب ایمان بالجمع نہ ہوا تو کفر ہی ہوا) اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے، (وہی ان کے لئے بھی ہوگی) اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی، اور ان میں سے کسی میں ایمان لانے کے اعتبار سے، فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کا ثواب دیں گے اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں (اس لئے ایمان لانے سے پہلے جتنے گناہ ہو چکے ہیں سب بخش دیں گے اور چونکہ وہ) بڑے رحمت والے ہیں (اس لئے ایمان کی برکت سے ان کے حسنات کو مضاعف کر کے خوب ثواب دیں گے)







قادر مطلق ہیں جسکو جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں، اس کے باوجود بہت معاف کرنے والے ہیں، تو انکا جسکو قدرت و اختیار بھی کچھ نہیں، وہ اگر انتقام لینا بھی چاہے تو بہت ممکن ہے کہ اس پر قدرت ہی نہ ہو، اس لئے اس کو تو عفو و درگزر اور بھی زیادہ مناسب ہے۔

یہ بے رفع ظلم اور اصلاح معاشرہ کا فترانی اصول اور مرتبہ نہ انداز کہ ایک طرف برابر کے انتقام کا حق دے کر عدل و انصاف کا بہترین قانون بنادیا، دوسری طرف مظلوم کو اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دے کر عفو و درگزر پر آمادہ کیا، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہے جس کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

فَاِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (۳۳: ۴۱) یعنی جس شخص کے

اور ہمتھائے درمیان دشمنی تھی اس طرز عمل سے وہ ہمتھارا مخلص و دوست بن جائے گا۔

عدالتی فیصلہ اور ظلم کا انتقام لے لینے سے ظلم کی روک تھام ضرور ہو جاتی ہے، لیکن فریقین کے دلوں میں وہ ایک دیر پا اثر چھوڑ جاتے ہیں جو آئندہ پھر باہمی جھگڑوں کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور یہ حسن ذاتی درس جو قرآن کریم نے دیا اس کے نتیجہ میں گہری اور پرانی عداوتیں دوستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

تیسری اور چوتھی اور پانچویں آیات میں فتران حکیم نے یہ کھلا ہوا فیصلہ دیا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو مانے مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ لائے، یا بعض رسولوں کو مانے اور بعض کو نہ مانے وہ اللہ کے نزدیک مؤمن نہیں، بلکہ کھلا کافر ہے جس کی نجات آخرت کی کوئی راہ نہیں۔

بلاک اء نجات ہے کسی مخالف فتران حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی کچھ ردی کو پوری طرح کھول دیا ہے، جو دوسرے اہل مذہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقائد کو بطور نوتہ اور مہمہ کے پیش کرنا چاہتے ہیں اور فتران و سنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پاسکتا ہے، حالانکہ یہ لوگ سب رسولوں کے یا کم از کم بعض رسولوں کے منکر ہیں، جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اعلان کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل و انصاف اور ہمدردی و خیر خواہی اور احسان و رواداری کے معاملہ میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن احسان و



سلوک اپنے حقوق اور اپنی ملکیت میں ہوا کرتے ہیں، مذہبی اصول و عقائد ہماری ملکیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کر سکیں، اسلام جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنی سرحدات کی حفاظت میں نہایت محتاط اور سخت بھی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی و خیر خواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رسوم کفر سے پوری طرح اعلان برأت بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے، اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح حفاظت بھی کرتا ہے، وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں قرآن و سنت میں موجود ہیں۔

اگر اسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب و ملت میں نجات ہو سکتی ہے تو اس کو مذہب اسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس کے لئے سر دھڑکی بازی لگا دینا اصولاً غلط اور خلاف عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول معاذ اللہ بیکار اور فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے۔ اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

اس آیت میں چونکہ ایمانیات کی پوری تفصیل دینے کے بجائے صرف ایمان باللہ و ایوم الآخر پر اکتفا کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھوئے مطالعے سے سمجھنا چاہتے ہیں اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھنا نجات کے لئے کافی ہے، رسول پر ایمان شرط نجات نہیں، اور یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، ورنہ محض خدا کے اقرار اور توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے، قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے:

فَإِنْ آمَنُوا بِمَا آمَنُ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي



يَتَّقَاقِ فَتَكْفِيكَهُمْ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۱۲۴:۲) ”یعنی ان کا ایمان اس وقت معتبر ہو گا جبکہ وہ عام مسلمانوں کی طرح ایمان خستیار کریں، جس میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول لازم ہے، ورنہ پھر سمجھ لو کہ وہی لوگ تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان کے لئے کافی ہے، اور وہ بہت سننے والا جاننے والا ہے۔“

اور پیش نظر آیات میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بتلادیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی ایک رسول کا بھی منکر ہو وہ کھلا کافر ہے، اور اس کے لئے عذاب جہنم ہے، ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، اس کے بغیر اس کو ایمان باللہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

آخری آیت میں پھر ایجابی طور پر بیان فرما دیا گیا ہے کہ نجات آخرت انہی لوگوں کا حصہ ہو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے سب رسولوں پر بھی ایمان رکھیں، اسی لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

إِنَّ الْقُرْآنَ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ  
بَعْضًا

”یعنی قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر و تشریح کرتا ہے۔“

خود قرآنی تفسیر کے خلاف کوئی تفسیر کرنا کسی کے لئے جائز نہیں۔

يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ

”تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہل کتاب کہ تو ان پر اتار دے کئی کتاب آسمان سے

فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَىٰ أَكْبَرًا مِنْ ذَلِكَ فَقَالُوا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً

سو مانگ چکے ہیں موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑی چیز اور کہا ہم کو دکھلا دے اللہ کو بالکل سامنے

فَاخَذَتْهُمْ الصُّعْقَةُ بِظُلْمِهِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ

سو بڑی ان پر بجلی ان کے گناہ کے باعث پھر بنالیا بچھڑے کو بہت کچھ نشانیاں

بَعْدَ مَا جَاءَهُمْ الْبَيِّنَاتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذَلِكَ وَإِنَّا مُوسَىٰ

بچھڑنے کے بعد پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا اور دیا ہم نے موسیٰؑ کو

سُلْطٰنًا مُّبِينًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّورَ بِمِيثَاقِهِمْ وَ

غلبہ صریح، اور ہم نے اٹھایا ان پر پہاڑ قرار لینے کے واسطے اور

قُلْنَا لَهُمْ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوا

اور ہم نے کہا داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور ہم نے کہا کہ زیادتی مت کرو







یہ قوم ہی ایسی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو سستائی ہی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے بڑی سے بڑی حرکت بھی کر گزرتی ہے، ان کے آباء و اجداد نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی زیادہ بڑی بات کا مطالبہ کیا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کھلم کھلا دکھلایا جائے، ان کی اس گستاخی پر آسمان سے بجلی آئی اور ان کو ہلاک کر دیا، پھر توحید اور خدا کے واحد شریک کے برائین و مینات کو اچھی طرح سمجھنے بوجھنے کے بعد بھی خالق حقیقی کے بجائے بھڑے کو معبود بنا بیٹھے تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود ہم نے عفو و درگزر سے کام لیا، ورنہ تو موقع اس کا تھا کہ ان کا قلع قمع کیا جاتا۔ اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے غلبہ عطا کیا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ ان لوگوں نے تورات کی شریعت کو ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا تو ہم نے پہاڑ، طور اٹھا کر ان پر معلق کر دیا کہ شریعت کو ماننا ہی ہو گا، ورنہ پہاڑ کے نیچے کھل دیے جاؤ گے۔ ہم نے ان سے یہ بھی کہا کہ جب شہر ایلیا کے دروازہ میں داخل ہو تو نہایت عاجزی سے اطاعت خداوندی کے جذبہ سے سرشار سر جھکائے ہوئے داخل ہو، یہ بھی ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ ہفتہ کے روز چیلیوں کا شکار نہ کھیلو، یہ ہمارا حکم ہے اس سے رد گردانی نہ کرو اور اس طرح ہم نے ان سے مضبوط عہد لے لیا تھا، لیکن ہوائیوں کے انھوں نے ایک ایک کر کے احکام کی خلاف ورزی کی، اور ہمارے عہد کو توڑ ڈالا تو ہم نے دنیا میں بھی ان کو ذلیل کر دیا، اور آخرت میں بھی ان کو بدترین سزا بھگتنی ہوگی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكَفَرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمْ

ان کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر

الْأَنْبِيَاءِ بِغَيْرِ حَتٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللَّهُ

پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر کہ ہمارے دل پر غلاف ہے سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے

عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝۱۵۵ وَبَكُفْرِهِمْ

ہر کردی ان کے دل پر کفر کے سبب سو ایمان نہیں لاتے مگر کم، اور ان کے کفر پر

وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ هَتَّانَا عِظِيمًا ۝۱۵۶ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا

اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر اور ان کے کہنے پر

قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ

کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول اللہ کا اور انھوں نے نہ اس کو مارا



وَمَا صَلَّوْهُ وَلَٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا

اور نہ سولی پر چڑھا یا لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے اور جو لوگ اس میں مختلف باتیں کرتے

فِيهِ لَفِيَ شَكٌّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ

ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں کچھ نہیں ان کو اس کی خبر صرف اٹکل پر چل رہے ہیں

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۖ بَلْ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا

اور اس کو قتل نہیں کیا بیشک بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف اور اللہ ہے زبردست

حَكِيمًا ۝ وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ

حکمت والا اور جتنے فرتے ہیں اہل کتاب کے سو عیسٰی پر یقین لاویں گے اس کی

مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝

موت پہلے اور قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ -

**رَبِطُ آيَاتٍ** | ماقبل کی آیات میں بھی یہودی شرارتوں کا ذکر تھا، اور ان شرارتوں کی وجہ سے

ان پر لعن، طعن اور سزا کا بیان ہوا تھا، ان آیات میں بھی یہود کے بعض جرائم کی تفصیل

مذکور ہے، اس کے ضمن میں حضرت عیسیٰ کے متعلق ان کے باطل خیال کی تردید کی گئی ہے،

اور یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم و ستم سے

بچا کر زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے، یہ لوگ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل

کر دیا ہے اور ان کو سولی دی ہے، یہ سراسر جھوٹا دعویٰ ہے، جس شخص کو انھوں نے قتل کیا

تھا وہ عیسیٰ علیہ السلام نہیں تھے، بلکہ ان کے ہم شکل ایک دوسرا شخص تھا، جس کو قتل کر کے

یہ لوگ یوں سمجھنے لگے کہ ہم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر دیا۔

## خُلاصۂ تفسیر

موسم نے ان کی حرکتوں کی وجہ سے (مزائے لعنت و غضب و ذلت و مسخ وغیرہ)

میں مبتلا کیا (یعنی) ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور ان کے کفر و انکار کی وجہ سے احکامِ الہیہ

کے ساتھ اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء (علیہم السلام) کو (جو ان کے نزدیک بھی)

ناحق (تھا) اور ان کے اس عقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں

مختلف مذہب یعنی اسلام کا اثر نہیں ہوتا تو مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ اس پر



دو فرماتے ہیں کہ یہ مضبوطی اور پختگی نہیں ہے، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے (کہ حق بات کی ان میں تاثیر نہیں ہوتی) سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل، (اور قدرے قلیل ایمان مقبول نہیں پس کافر ہی ٹھہرے) اور (ہم نے ان کو سزائے لعنت وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مستلک کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے اور (تفصیل اس کی یہ ہے کہ) حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے (جس سے تکذیب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی لازم آتی ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے ان کی برائت ظاہر فرما چکے ہیں) اور (نیز بطور تقاضا کے) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے قتل کر دیا یہ کہنا خود دلیل ہے عداوت کی، اور عداوت انبیاء کے ساتھ کفر ہے، نیز اس میں دعویٰ ہے قتل کا، اور قتل نبی بھی کفر ہے، اور دعویٰ کفر کا بھی کفر ہے) حالانکہ (علاوہ کفر ہونے کے خود ان کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کیونکہ) انھوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا، لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہو گیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں (مستلک) ہیں ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (موجود) نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے اور انھوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھا لیا (اور ایک اور شخص کو ان کا ہم شکل بنادیا اور وہ مصلوب و مقتول ہوا، اور یہی سبب ہوا یہود کے اشتباہ کا اور اس اشتباہ نے اہل کتاب میں اختلاف پیدا کیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی قدرت والے) حکمت والے ہیں کہ اپنی قدرت و حکمت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچا لیا اور اٹھا لیا، اور یہود کو جو جہ تشبیہ کے پتہ بھی نہ لگا) اور یہود کو اپنا کذب و بطلان انکار نبوت عیسویہ میں بہت جلد دنیا ہی میں ظاہر ہو جائے گا، کیونکہ وقت نزول آیت سے لے کر کسی زمانہ میں (کوئی شخص اہل کتاب (یعنی یہود میں) سے (بانی) نہ رہے گا، مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) کی اپنے مرنے سے (دوراں) پہلے رجب کہ عالم برزخ نظر آئے لگتا ہے، نہ تصدیق کرنے کا (گو اس وقت کی تصدیق نافع نہیں، مگر ظہور بطلان کے لئے تو کافی ہے تو اس سے اگر اب ہی ایمان لے آویں تو نافع ہو جائے) اور (جب عالم دنیا اور عالم برزخ دونوں ختم ہو چکیں گے) یعنی قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان (انکار کے انکار) پر گواہی دیں گے۔



## معارف و مسائل

سورۃ آل عمران کی آیت **فَعِثْنِي اِنِّي مُتَوَقِّفٌكَ وَرَافِعُكَ اِلٰى اِلٰهِ (۵۵:۳)** میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمن یہود کے عوام کو ناکام بنانے اور عیسیٰ علیہ السلام کو انکی دستبرد سے بچانے کے سلسلہ میں پانچ وعدے فرمائے تھے جن کی تفصیل اور مکمل تشریح و تفسیر سورۃ آل عمران کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے، ان وعدوں میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ یہود کو آپ کے قتل پر قدرت نہیں دی جائے گی، بلکہ آپ کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف اٹھالیں گے، اس آیت میں یہود کی شرارتوں اور جھوٹے دعووں کے بیان میں اُس وعدۃ الہیہ کی تکمیل اور یہود کے مغالطہ کا مفصل بیان اور یہود کے اس قول کی مکمل تردید ہے کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا ہے۔

ان آیات میں واضح کیا گیا کہ **وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ**، یعنی ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا، بلکہ صورت حال یہ پیش آئی کہ معاملہ ان کے لئے مشتبہ کر دیا گیا۔

**یہود کو اشتباہ** | **وَلَا يَكُنْ شَكٌّ لَّهُمْ** کی تفسیر میں امام تفسیر حضرت قضا کا رحمۃ اللہ علیہ کس طرح پیش آیا؟ فرماتے ہیں کہ قصہ یوں پیش آیا کہ جب یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کا ارادہ کیا تو آپ کے حواری ایک جگہ جمع ہو گئے، حضرت مسیح علیہ السلام بھی ان کے پاس تشریف لے آئے، ابلیس نے یہود کے اس دستہ کو جو عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کیلئے تیار کھڑا تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دیا، اور چار ہزار آدمیوں نے مکان کا محاصرہ کر لیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریین سے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس کے لئے آمادہ ہے کہ باہر نکلے اور اس کو قتل کر دیا جائے، اور پھر جنت میں میرے ساتھ ہو، ان میں سے ایک آدمی نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اپنے اس کو اپنا کمرۂ عامہ عطا کیا، پھر اس پر آپ کی مشابہت ڈال دی گئی، اور جب وہ باہر نکل آیا تو یہود اُسے پکڑ کر لے گئے، اور سولی پر چڑھا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا گیا (قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ یہودیوں نے ایک شخص طیطلاؤس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے واسطے بھیجا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو مکان میں نہ ملے، اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اٹھا لیا تھا، اور یہ شخص جب گھر سے نکلا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہتھکل بنا دیا سمجھا تھا، یہودیہ سمجھے کہ یہی عیسیٰ علیہ السلام ہے، اور اس اپنے ہی آدمی کو لپکا کر قتل کر دیا (منظری)



ان میں سے جو بھی صورت حال پیش آئی ہو سب کی گنجائش ہے، قرآن کریم نے کسی خاص صورت کو متعین نہیں فرمایا، اس لئے حقیقت حال کا صحیح علم تو اللہ ہی کو ہے، البتہ قرآن کریم نے اس جملے اور دوسری تفسیری روایات سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نہ بدست مغالطہ ہو گیا تھا، حقیقی واقعہ ان سے پوشیدہ رہا، اور اپنے اپنے گمان و قیاس کے مطابق انھوں نے طرح طرح کے دعوے کئے، اور ان کے آپس ہی میں اختلافات پیدا ہو گئے، اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهَا يُقِينُنَا أَنْ كُنَّا قَاتِلِينَ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (سورۃ نساء ۱۰۷)

لوگوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کر کے طرح طرح کے دعوے کئے ہیں یہ سب شک اور امکل کی باتیں ہیں، صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو یقیناً قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔

بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کو تنبیہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم تو اپنے ہی آدمی کو قتل کر دیا ہے، اس لئے کہ یہ مقتول چہرے میں تو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے مشابہ ہے، لیکن باقی جسم میں ان کی طرح نہیں، اور یہ کہ اگر یہ مقتول مسیح (علیہ السلام) ہیں تو ہمارا آدمی کہاں ہے اور اگر یہ ہمارا آدمی ہے تو مسیح (علیہ السلام) کہاں ہیں؟

وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا، اللہ جل شانہ زبردست قدرت و غلبہ والا ہے، یہود لاکھ دفعہ قتل کے منصوبے بناتے لیکن جب اللہ نے حضرت عیسیٰ کی حفاظت کا ذمہ لیا تو اس کی قدرت و غلبہ کے سامنے ان کے منصوبوں کی حیثیت کیا ہے، وہ قدرت والا ہے، صرف مادہ کے پرستار انسان اگر رفع عیسیٰ (علیہ السلام) کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے تو یہ ان کی اپنی کمزوری ہے، وہ حکمت والا ہے، اس کا ہر فعل حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

آخر میں اسی مضمون کے تتمہ کے لئے فرمایا کہ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ، یہ لوگ اس وقت اگرچہ بعض وحسد کی وجہ سے حقیقت کی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق باطل خیالات رکھتے ہیں، نیز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بھی انکار کر رہے ہیں، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جبکہ انکی آنکھیں کھل جائیں گی اور اس وقت انھیں یقین ہو جائے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہمارا خیال تھا وہ سب جال تھا۔



اس آیت کی ایک تفسیر تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں گزری ہے کہ مؤتیہ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع کی جائے، اور آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ یہ یہود اپنی موت سے چند لمحے پیشتر جب عالم برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اگرچہ اس وقت کا ایمان ان کے حق میں نافع نہیں ہوگا، جس طرح کہ فرعون کو اس کے اس ایمان نے فائدہ نہیں دیا تھا جو وہ غرق ہونے کے وقت لایا تھا۔

دوسری تفسیر جسکو صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے، اور حدیث صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، یہ ہے کہ مؤتیہ کی ضمیر حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگرچہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے، یہود تو انہیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انہیں الہیاذ باللہ مفسری اور کاذب قرار دیتے ہیں، اور نصاریٰ اگرچہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر بعض تو ان میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ یہود ہی کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے، اور بعض اعتقاد کے غلو میں اس حد تک آگے بیکل گئے کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ قرآن کریم کی اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اس زمین پر پھر نازل ہونگے تو یہ سب اہل کتاب ان پر صحیح ایمان لے آئیں گے، نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے قتل کر دیئے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے اس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا، اور اس زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت منقول ہے:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بنکر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے، صلیب کے ٹوڑ ڈالیں گے، اور اس وقت عباد صرف پروردگار عالم کی ہوگی۔“

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى  
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ  
لَيَنْزِلَنَّ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا  
فَلَيَقْتُلَنَّ الدَّجَالَ وَلَيَقْتُلَنَّ  
الْخَنزِيرَ وَلَيَكْسِرَنَّ الصَّلِيبَ  
وَلَيَكُونَنَّ السَّجْدَةُ وَاحِدَةً لِلَّهِ  
رَبِّ الْعَالَمِينَ  
ثُمَّ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ قَرَأُوا



آیت بھی پڑھ لو جس میں اسی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ ان پران کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا، آپ نے فرمایا عیسیٰ (علیہ السلام)

اِنْ شِئْتُمْ وَاِنْ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، قَالَ اَبُو هُرَيْرَةَ قَبْلَ مَوْتِ عِيسَى، يُعَيِّدُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (قرطبی)

کی موت سے پہلے، اور تین بار ان الفاظ کو ذکر ہرایا ۱۱

آیت مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل بہتہ صحابی حضرت ابو ہریرہؓ سے بروایت صحیحہ ثابت ہے، جس میں قبل موتہ سے مراد قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قرار دیا ہے، جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کے متعلق ہے۔

اس تفسیر کی بنا پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کے نزول سے اللہ جل شانہ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اس زمین پر ہی ان کی وفات ہوگی۔

اس کی تائید سورہ زخرف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: **وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمُوتُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ** (۲۴: ۶۱) یعنی عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں پس تم قیامت کے آنے میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو، مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے یہاں پر لکھا ہے کہ **اِنَّہٗ** کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک علامت ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے، کہ وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے، اور ان کا آنا قیامت کی علامتوں میں سے ہوگا۔

اس آیت میں ایک دوسری قرأت **لَعَلَّمٌ** بھی منقول ہے، اس سے یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں، کیونکہ **عَلَّمَ** بفتح اللام کے معنی علامت کے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تفسیر بھی اسی کی مؤید ہے: **عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ، قَالَ خُرُوجُ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ** — حضرت ابن عباسؓ سے **وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ** کے بارے میں منقول ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔ (ابن کثیر)

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ قبل موتہ کے ساتھ جب حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث



صحیح کے ساتھ تفسیر کو شامل کیا جائے تو اس سے واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ ہونا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہو کر یہود پر مکمل غلبہ پانا ثابت ہو جاتا ہے، اسی طرح آیت **وَإِنَّهُ لَعِلْمُ السَّاعَةِ** سے بھی حسب تفسیر ابن عباسؓ یہ مضمون یقینی ہو جاتا ہے۔

امام تفسیر ابن کثیرؒ نے آیت **وَإِنَّهُ لَعِلْمُ السَّاعَةِ** کی تفسیر میں لکھا ہے:

<p>رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپؐ نے قیامت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں نازل ہونے کی خبر دی ہے</p>	<p>وَقَدْ تَوَاتَرَتْ الْأَحَادِيثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ أَخْبَرَ بِانْزُولِ عِيسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَمَةِ إِمَامًا عَادِلًا (ابن کثیر)</p>
---	--

ان روایات متواترہ کو ہمارے اُستاد و حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے جمع فرمایا جن کی تعداد تئیس سے زیادہ ہے، حضرت استاذ کے حکم پر احقر نے اس مجموعے کو بزبان عربی مرتب کیا، حضرت نے اس کا نام التصريح بما تواتر فی نزول المسيح تجویز فرمایا، جو اسی زمانے میں شائع ہو چکا تھا، حال میں حلب شام کے ایک بڑے عالم علامہ عبد الفتاح ابو غدہ نے مزید شرح و حواشی کا اضافہ کر کے بیروت میں اعلیٰ کتابت کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ آخر زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا یہ مضمون آیات مذکورہ سے بھی واضح ہو چکا ہے، اور عقیدہ قطعی اور اجماعی ہے جس کا منکر کافر ہے اس کی پوری تفصیل سورۃ آل عمران میں گذر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے، اس میں ان شبہات کا بھی جواب مذکور ہے جو اس زمانے کے بعض ملحدین کی طرف سے اس عقیدہ کو مشکوک بنانے کے لئے پیش کئے گئے ہیں، واللہ ولی الہدایہ۔

**فَيُظْلِمُونَ الَّذِينَ هَادُوا وَاحْرَمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتِ احْلَتْ**

یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر یہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال

**لَهُمْ وَبَصَدُّهُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ كَثِيرًا ۖ (۱۶۰) وَأَخَذْنَاهُمْ**

تھیں اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے بہت اور اس وجہ سے کہ سود

**الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلَاهُمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ**

لینے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق

**وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ۖ (۱۶۱)**

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کی واسطے جو ان میں ہیں عذاب دردناک







## معارف و مسائل

شرعیات محمدیہ میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، لیکن وہ کسی جسمانی یا روحانی ضرر کی وجہ سے حرام کر دی گئیں، بخلاف یہود کے کہ ان پر جو طہیات حرام کر دی گئی تھیں ان میں کوئی جسمانی یا روحانی ضرر نہیں تھا، بلکہ ان کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر حرام کر دی گئی تھیں۔

لٰكِنَ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ

لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں اور ایمان والے سو مانتے ہیں اُنکو

بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيمِينَ

جو نازل ہوا تجھ پر اور جو نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آفریں ہے نماز پر قائم

الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

اپنے والوں کو اور جو دینے والے ہیں زکوٰۃ کے اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت

الْآخِرَةِ أُولَٰئِكَ سَنُعْطِيهِمْ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٦٣﴾

کے دن پر سو ایسوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب ۔

۲۲  
ع  
۲

**رابط آیات** | اوپر کی آیات میں اُن یہود کا ذکر تھا جو اپنے کفر پر قائم تھے، اور مذکورہ بالا منکرات میں مبتلا تھے، آگے ان حضرات کا بیان ہے جو اہل کتاب تھے، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور وہ صفات جو اُن کی کتابوں میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں آپ میں پوری پوری دیکھیں تو ایمان لے آئے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام داسید و ثعلبہ رضی اللہ عنہم، ان آیات میں اپنی حضرات کی تعریف و توصیف مذکور ہے۔

## خلاصہ تفسیر

لیکن ان (یہود) میں جو لوگ علم (دین) میں پختہ یعنی اس کے موافق عمل کرنے پر مضبوط ہیں (اور اس آمادگی نے ان پر حق کو واضح اور قبول حق کو سہل کر دیا جو آگے صلاً و فرعاً مذکور ہے) اور جو (ان میں) ایمان لے گئے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھی گئی اور اس کتاب پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے (نبیوں)



کے پاس) بھیجی گئی (جیسے توریت و انجیل) اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں، اور جو (ان میں) زکوٰۃ دینے والے ہیں اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں (سو) ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثواب عظیم عطا فرما دیں گے۔

## معارف و مسائل

آیت میں جن حضرات کے لئے اجر کامل کا وعدہ ہے وہ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے ہے، اور جہاں تک نفس نجات کا تعلق ہے وہ عقائد ضروریہ کی تصحیح پر موقوف ہے، بشرطیکہ خاتمہ بالا ایمان کی سعادت نصیب ہو۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف جیسے وحی بھیجی نوح پر اور اُن نبیوں پر جو

بَعْدَهُ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ

ان کے بعد ہونے والے وحی بھیجی ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر

وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ

اور اس کی اولاد پر اور عیسیٰ پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر

وَاتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ

اور ہم نے دے دی داؤد کو زبور اور بھیجے لیے رسول کہ جن کا احوال ہم نے سنایا تجھ کو

مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ

اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال ہمیں سنایا تجھ کو اور باتیں کہیں اللہ نے

مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۚ رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ

موسى سے بول کر بھیجے پیغمبر خوش خبری اور ڈر سنانے والے تاکہ باقی نہ رہے

لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا

لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد اور اللہ زبردست ہے

حَكِيمًا ۚ لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ

حکمت والا لیکن اللہ شاہد ہے اس پر جو تجھ پر نازل کیا کہ یہ نازل کیا ہے



بِعِلْمِهِ وَالْمَلٰئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا ۝۱۶۶

اپنے علم کے ساتھ اور فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کافی ہے حق ظاہر کرنے والا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَاصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا

جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے وہ بہک کر دور

ضَلٰلًا بُعِیْدًا ۝۱۶۷ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ

جا پڑے جو لوگ کافر ہوئے اور حق دبا رکھا ہرگز اللہ بخشتے والا

لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدٰیهُمْ طَرِیْقًا ۝۱۶۸ اِلَّا طَرِیْقَ جَهَنَّمَ

نہیں ان کو اور نہ دکھلاوے گا ان کو سیدھی راہ مگر راہ دوزخ کی

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا وَكَانَ ذٰلِكَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرًا ۝۱۶۹

رہا کریں اس میں ہمیشہ اور یہ اللہ پر آسان ہے۔

**رابط آیات | یَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ** سے یہودیوں کا ایک احمقانہ سوال نقل کر کے تفصیل سے اس کا الزامی جواب دیا گیا، یہاں ایک دوسرے عنوان سے اسی سوال کو طے کیا جا رہا ہے، کہ تم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے یہ شرط لگاتے ہو کہ آپ آسمان سے لکھی ہوئی کتاب لا کر دکھلائیں، تو بتلاؤ کہ یہ جلیل بہتہ را نبیاء جن کا ذکر ان آیات میں ہے ان کو تم بھی تسلیم کرتے ہو، اور ان کے حق میں تم اس طرح کے مطالبات نہیں کرتے، تو جس دلیل سے تم نے ان حضرات کو نبی تسلیم کیا ہے، یعنی معجزات سے، تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی معجزات ہیں، لہذا ان پر بھی ایمان لے آؤ، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارا یہ مطالبہ طلب حق کے لئے نہیں، بلکہ عناد پر مبنی ہے۔

آگے بعثت انبیاء کی حکمت بھی بیان کر دی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتلا دیا گیا کہ یہ لوگ اگر آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تو اپنا انتخاب نام خراب کرتے ہیں، آپ کی نبوت پر تو خدا بھی گواہ ہے، اور خدا کے فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

## خلاصہ تفسیر

ہم نے دیکھ آپ کو انوکھا رسول نہیں بنایا جو ایسی داری تباہی فرمائش کرتے ہیں بلکہ



آپ کے پاس (بھی ایسی ہی) وحی بھیجی ہے جیسی (حضرت) نوح (علیہ السلام) کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس (بھیجی تھی) اور (ان میں سے بعضوں کے نام بھی بتلا دیتے ہیں کہ) ہم نے (حضرات) ابراہیم اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں) اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے پاس وحی بھیجی تھی اور (اسی طرح) ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، چنانچہ ان (کو کتاب) زبور دی تھی، اور (ان کے علاوہ) اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (بھی) صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل (سورۃ النعام وغیرہ مکی سورتوں میں) ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (صاحب وحی بنایا) جن کا حال (ابھی تک) ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی صاحب وحی بنایا، چنانچہ ان (سے اللہ تعالیٰ نے خاص خاص طور پر کلام فرمایا) اور ان سب کو (ایمان پر) خوش خبری (نجات کی) دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے (آنے کے) بعد کوئی عذر (ظاہر بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی اشیاء کا حسن و قبح عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا، پھر ہماری کیا خطا) اور (یوں) اللہ تعالیٰ پورے زور (اور اختیار) والے ہیں کہ بلا ارسالِ رسل بھی مژادیتے تو بوجہ اس کے کہ مالکِ حقیقی ہونے میں منفرد ہیں ظلم نہ ہوتا اور درحقیقت عذر کا حق کسی کو نہ تھا لیکن چونکہ بڑے حکمت والے (بھی) ہیں اس لئے حکمت ہی ارسال کو مقتضی ہوئی، تاکہ ظاہری عذر بھی نہ رہے، یہ بیان حکمت درمیان میں تبعاً آگیا تھا، آگے اثباتِ نبوتِ محمدیہ کر کے جواب کی تکمیل فرماتے ہیں کہ گودہ اپنے اس شبہ کے رفع ہونے پر بھی نبوت کو تسلیم نہ کریں، لیکن (واقع میں تو ثابت ہے اور اس کے ثبوت پر دلیل صحیح قائم ہے، چنانچہ) اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور بھیجا بھی (کس طرح) اپنے علی کمال کے ساتھ (جس سے وہ کتاب معجزہ عظیمہ ہو گئی جو کہ نبوت کی دلیل قاطع ہے، ایسی کتاب معجز کے ذریعہ سے آپ کی نبوت کی شہادت دے رہے ہیں) یعنی دلیل قائم کر رہے ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ کتاب معجز نازل فرمائی اور اعجازِ دلیلِ نبوت ہے، پس دلیل سے تو واقع میں نبوت ثابت ہے، رہا کسی کا ماننا نہ ماننا تو اول تو اس کا خیال ہی کیا، اور (اگر طبعاً اس کو جی ہی چاہتا ہو تو ان سے (افضل مخلوق یعنی) فرشتے (آپ کی نبوت کی) تصدیق کر رہے ہیں، اور مؤمنین کی تصدیق مشاہد ہی تھی، پس اگر چند جمحاء نے نہ ماننا نہ سہی، اور (اصل بات



تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت (یعنی اقامت دلیل فی الواقع) کافی ہے (کسی کی تصدیق و تسلیم کی آپ کو حاجت ہی نہیں) جو لوگ (ان حج قاطع کے بعد بھی) منکر ہیں اور (طرح یہ کہ) اوروں کو بھی (خدا فی دین سے مانع ہوتے ہیں) (حق ہے) بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں (یہ تو دنیا میں ان کے مذہب کا حاصل ہے، اور اس کا ثمرہ آخرت میں آگے سنو کہ) بلاشبہ جو لوگ (حق کے) منکر ہیں اور (حق سے مانع بن کر) دوسروں کا بھی نقصان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوائے جہنم کی راہ کے اور کوئی راہ (یعنی جنت کی راہ) دکھلائیں گے اس طرح یہ کہ اس (جہنم) میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کریں گے، اور اللہ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات (کچھ سامان نہیں کرنا پڑتا)

## معارف و مسائل

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ اِس سے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے، اور انبیاء سابقین پر جیسے وحی الہی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی، تو جس نے اُن کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے، اور جس نے اس کا انکار کیا گویا اُن سب کا منکر ہو گیا، اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدم کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی، گویا اول حالت محض ابتدائی تعلیم کی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے، اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے، چنانچہ انبیاءؑ اولو العزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام ہی سے شروع ہوا، اور وحی الہی سے سر تابی کرنے والوں پر بھی اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔

خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام سے پہلے حکیم الہی اور انبیاءؑ کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی، اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکیم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا، تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا، اول حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان



آیا اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ انبیاء کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے، تو آپ کی وحی کو حضرت نوح اور ان سے پھیلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دینے میں اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذابِ عظیم کا مستحق ہوگا۔ (فوائد علامہ عثمانی)

حضرت نوح علیہ السلام کی ذات خود ایک معجزہ تھی، ساڑھے نو سو سال کی عمر آپ کو عطا کی گئی تھی، آپ کا کوئی دانت نہیں گرا تھا، نہ آپ کا کوئی بال سفید ہوا، آپ کی جسمانی طاقت میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اور پوری عمر قوم کی ایذا رسانی کو صبر کے ساتھ سہتے رہے۔ (منظری)

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ہیں انھیں بالاجمال ذکر کر کے ان میں سے جو اولوالعزم اور جلیل القدر انبیاء ہیں ان کا بطور خاص بھی ذکر کر دیا گیا، جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ سب انبیاء ہیں اور انبیاء کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی ہے، کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے، کبھی اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنے رسول سے بات کرتے ہیں غرض جس طریقہ سے بھی وحی آجائے اس پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، لہذا یہود کا یہ کہنا کہ توراہ کی طرح کبھی ہوئی کتاب نازل ہو تب مانیں گے ورنہ نہیں خالص حماقت اور کفر ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے ہیں جن میں سے تین سو تیرا اصحاب شریعت رسول تھے (قرطبی)

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ، اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوش خبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ ہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر کی مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے، سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور پیغمبروں نے راہِ حق بتلائی، تو اب دینِ حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جاسکتا، وحی الہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے روبرو کوئی حجت نہیں چل سکتی، بلکہ سب جہنیں قطع ہو جاتی ہیں، اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت آپؐ



پاس آگئی، آپ نے ان سے فرمایا، بخدا تم یقیناً جانتے ہو کہ میں خدا کا برحق رسول ہوں۔ انہوں نے اس کا انکار کر دیا تو اس پر یہ آیت نازل ہو گئی: لَکِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ۔ جس میں بتلایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب معجز کے ذریعہ سے جو اس کے علی کمال کا منظر ہے آپ کی نبوت پر گواہ ہے، اس نے یہ جان کر کتاب نازل کر دی ہے کہ آپ اس کے اہل ہیں، اور فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں، اور علیم وخبیر ذات کی شہادت کے بعد پھر کس دلیل کی حاجت باقی رہ جاتی ہے۔

قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ منکر ہیں، اور توریت میں جو آپ کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو چھپاتے ہیں اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کر کے ان کو بھی دین حق سے باز رکھتے ہیں، سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہوگی نہ ہدایت، جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے، اور مگر اسی آپ کی مخالفت کا نام ہے۔ اس سے یہودیوں کے سب خیالات کی تغلیط کر دی گئی

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ

اے لوگو! تمہارے پاس رسول آچکا ٹھیک بات لے کر تمہارے رب کی

فَاَمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ وَاِنْ تَكْفُرُوا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

سماں لو تاکہ بھلا ہو تمہارا اور اگر نہ مانو گے تو اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ④۰

اور زمین میں اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا۔

**رابط آیات** یہودیوں کے اعتراضات کا جواب اور نبوت محمدیہ علی صاحبہا السلام کے اثبات کے بعد اب تمام جہان کے انسانوں کو خطاب فرماتے ہیں، کہ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آؤ۔

## خلاصہ تفسیر

اے تمام جہان کے (لوگو تمہارے پاس یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) سچی بات (یعنی سچا دعویٰ، سچی دلیل) لے کر تمہارے پروردگار (جلّ شانہ) کی طرف سے تشریف لائے ہیں سو مقتضی اثبات دعویٰ بالدلیل (صحیح کا یہ ہے کہ) تم (ان پر اور جو جو یہ فرما دیں سب پر)



یقین رکھو جو پہلے سے یقین لاتے ہوئے ہیں وہ اس پر قائم رہیں، اور جو نہیں لاتے اب اختیار کر لیں) یہ تمھارے لئے بہتر ہوگا، (کیونکہ نجات ہوگی) اور اگر تم منکر ہو گئے تو (تمھارا ہی نقصان ہے، خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) خدا تعالیٰ کی (تو) ملک ہے یہ سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں (موجود) ہے (تو ایسے بڑے عظیم الشان مالک) قادر کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہو، مگر اپنی خیر مثالوں اور اللہ تعالیٰ (سب کے ایمان و کفر کی) پوری اطلاع رکھتے ہیں (اور دنیا میں جو پوری سزا نہیں دیتے تو اس لئے کہ) کامل حکمت والے (بھی) ہیں (وہ حکمت اس کو مقتضی ہے)۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا

اے کتاب والو مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو اللہ تعالیٰ کی شان میں

الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ

مگر یہی بات بیشک مسیح جو ہے عیسیٰ مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلام

أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ فَآمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ قُلْ وَلَا

ہے جسکو ڈالا مریم کی طرف اور روح ہے اس کے ہاں کی سوا مالو اللہ کو اور اس کے رسولوں کو اور نہ

تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ط انْتَهُوا خَيْرَ الْكُفَرِ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَهُ وَاحِدٌ ط

کہو کہ خدا تین ہیں اس بات کو چھوڑو بہتر ہوگا تمھارے واسطے بیشک اللہ معبود ہے اکیلا

سُبْحَنَهُ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي

اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ

الْأَرْضِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٤١﴾

زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ کا رساز۔

رَبِّطِ آيَاتِ | تا قبل کی آیات میں یہود کو خطاب تھا اور انہی کی گمراہیوں کی تفصیل ذکر کی گئی

اس آیت میں نصاریٰ کو خطاب ہے، اور ان کی بد اعتقادی اور خدا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کے متعلق ان کے باطل خیالات کی تردید کی گئی ہے۔

وقف لا نزاع



## خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب (یعنی انجیل والو تم اپنے دین کے بارہ) میں (عقیدہ حقہ کی) حد سے مت نکلو اور خدا تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو (کہ نعوذ باللہ وہ صاحب ولادہ جیسا بعض کہتے تھے الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ یا وہ مجبورۃ الہ کا ایک بیٹا ہے جیسا بعض کہتے تھے إِنَّ اللَّهَ ثَلَاثٌ ثَلَاثَةٌ اور بقیہ) واجباً ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے اور ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جیسا آیت آمدرہ میں وَلَا تَمْلِكُ لَهُ السَّمْعُ بَوْنُ کے بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے، اور بعض حضرت مریم علیہا السلام کو جیسا اِسْتَحْيُوْنِي وَارْحَمْنِي سے معلوم ہوتا ہے، یا وہ عین مسیح ہے جیسا بعض کہتے تھے إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ، غرض یہ سب عقیدے باطل ہیں) مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ (پیدائش) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے (حضرت) مریم تک (حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) پہنچایا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دارحیث) ہیں کہ اس جان کو حضرت مریم کے جسم میں بواسطہ نفخ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے پہنچا دیا تھا، باقی نہ وہ ابن اللہ ہیں، نہ تین میں کے ایک ہیں، جیسا عقائد مذکورہ میں لازم آتا ہے) سو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ اور وہ موقوف ہے توحید پر پس توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ (خدا) تین ہیں (مقصود منع کرنا ہے شرک سے اور وہ سب اقوال مذکورہ میں مشرک ہے) اس (شرک سے) باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا (اور توحید کے قائل ہو جاؤ کیونکہ) معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے (اور) وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں سب اسکی ملک ہیں (اور ان کا منزہ اور مالک علی الاطلاق ہونا دلیل ہو توحید کی) اور (ایک دلیل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کا رسا ساز ہونے میں کافی ہیں اور ان کے سوا سب کار سازی میں ناکافی و محتاج الی غیر اور ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتے ہیں، اور یہ کفایت صفات کمال سے ہے، اور صفات کمال کو لازم الوہیت سے ہے جب وہ غیر اللہ میں منتفی ہے پس الوہیت میں بھی منفی ہے، لہذا توحید ثابت ہے۔

## معارف و مسائل

وَكَلِمَتُهُ، اس لفظ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا کلمہ ہیں، مفسرین نے اس کے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔



(۱) اہم عنقریب فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کار فرما ہوتے ہیں، ایک عامل نطفہ ہے، اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمہ کن فرماتا جس کے بعد وہ بچہ وجود میں آجاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں چونکہ پہلا عامل منتفی ہے، اس لئے دوسرے عامل کی طرف نسبت کر کے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مادی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف کلمہ "کن" سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اَلْقَہَا اِلٰی مَرْثَمٍ کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کلمہ حضرت مریم علیہا السلام تک پہنچا دیا جس کے نتیجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عمل میں آگئی۔

(۲) بعض نے فرمایا کہ کَلِمَۃُ اللّٰہِ، بشارۃ اللہ کے معنی میں ہے، اور مراد اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اللہ جل شانہ نے فرشتوں کے ذریعہ حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ کی جو بشارت دی تھی اس میں کلمہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اِذْ قَالَتِ السَّلَیْمَکَ یَمْزِیْمُ اِنْ اِلّٰہَ یُبَشِّرُ لَی یَکَلِمَہُ

(۳) بعض نے فرمایا کَلِمَۃُ آیت اور نشانی کے معنی میں ہے، جیسا کہ دوسری جگہ یہ لفظ آیت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، وَصَدَقَتْ بِکَلِمَتِ رَبِّہَا وَرُوْحٌ مِّنْہُ۔ اس لفظ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اور دوسرے یہ کہ اللہ جل شانہ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے اس نسبت کا کیا مطلب ہے؟ اس سلسلہ میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہیں :-

(۱) بعض نے فرمایا، عرف کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی شے کی طہارت اور پاکیزگی کو بیان کرتا ہوتا ہے تو مبا لغہ کے لئے اس پر رُوح کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں چونکہ کسی باپ کے نطفہ کا دخل نہیں تھا، اور وہ صرف اللہ جل شانہ کے ارادے اور کلمہ کن کا نتیجہ تھے، اس لئے اپنی طہارت و نظافت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے، اسی وجہ سے عرف کے محاورہ کے مطابق ان کو روح کہا گیا، اور اللہ کی طرف نسبت اُن کی تعظیم و تشریف کے لئے ہے، جس طرح مساجد کی تعظیم کے لئے اُن کی نسبت اللہ کی طرف کر دی جاتی ہے، مساجد اللہ، یا کعبہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے بیت اللہ کہا جاتا ہے، یا کسی اطاعت شعار بندہ کی نسبت اللہ کی طرف کر کے عبد اللہ کہا جاتا ہے، چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے اَسْرٰی

بِعَبْدٍ -



(۲) بعض حضرات نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے مردہ دلوں میں روحانی حیات ڈال کر پھر زندہ کر دیں، چونکہ وہ روحانی حیات کا سبب تھے جس طرح روح جسمانی حیات کا سبب ہو ا کرتی ہے، اس لئے اس اعتبار سے انکو روح کہا گیا، جیسا کہ خود قرآن کریم کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحَنَا مِنْ أَمْرِنَا، کیونکہ قرآن کریم بھی روحانی حیات بخشا ہے۔

(۳) بعض نے فرمایا کہ روح کا استعمال راز کے معنی میں ہوتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی عجیب و غریب پیدائش کی وجہ سے چونکہ اللہ جل شانہ کی ایک نشانی اور راز تھے، اس لئے انھیں روح اللہ کہا گیا۔

(۴) بعض نے کہا کہ یہاں مضاف محذوف ہے، اور اصل عبارت یوں تھی ذُو رُوحٍ مِّنْهُ اور چونکہ ذی روح ہونے میں سب حیوان برابر ہیں، اس لئے عیسیٰ علیہ السلام کا امتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا کہ ان کی نسبت اللہ جل شانہ نے اپنی طرف کر دی۔

(۵) ایک قول یہ بھی ہے کہ روح، نفخ (پھونک) کے معنی میں ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم کے گریبان میں اللہ کے حکم سے پھونک دیا تھا، اور اسی سے حمل قرار پایا گیا، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور معجزہ کے صرف نفخ سے پیدا ہو گئے تھے اس لئے آپ کو روح اللہ کہا گیا، قرآن کریم کی دوسری آیت تَنْفَخُنَا فِيْهَا مِنْ رُّوحِنَا سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی متعدد احتمالات بیان کئے گئے ہیں، بہر حال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا ایک جز ہیں، اور یہی روح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی شکل میں ظاہر ہو گئی ہے۔

لطیفہ علامہ آلوسیؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک نصرانی طبیب نے حضرت علی بن الحسین واقدی سے مناظرہ کیا، اور ان سے کہا کہ تمہاری کتاب میں ایسا لفظ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کا جز ہیں، اور دلیل میں یہ آیت پڑھ دی، جس میں "رُوحٌ مِّنْهُ" کے الفاظ ہیں۔

علامہ واقدی نے ان کے جواب میں ایک دوسری آیت پڑھ دی وَتَسْتَخِرُكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اسی اللہ سے ہے، اور مَنّہ کے ذریعہ سے سب چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کر دی گئی ہے، اور فرمایا کہ رُوحٌ مِّنْهُ کا اگر مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ



اللہ کا جسروہیں، تو اس آیت کا مطلب پھر یہ ہوگا کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ بھی اللہ کا جسروہے؟ یہ جواب سنکر نصرانی طبیب لاجواب ہوا اور مسلمان ہو گیا۔

وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ - نزولِ قرآن کے وقت نصاریٰ جن بڑے بڑے فرقوں میں تقسیم تھے، تثلیث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جدا جدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عین خدا ہیں، اور خدا ہی بشکل مسیح دنیا میں اُتر آیا ہے، دوسرے فرقہ کا کہنا یہ تھا کہ مسیح ابن اللہ ہے اور تیسرا فرقہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وحدتِ کاراز تین میں پوشیدہ ہے، باپ، بیٹا، مریم، اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے، دوسرا گروہ حضرت مریم کی جگہ روح القدس کو اقنوم ثالث کہتا تھا، غرض یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کو ثالث ثلاثہ تسلیم کرتے تھے اس لئے قرآن کریم میں تینوں کو جدا جدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی، اور نصاریٰ پر یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ حق ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ مسیح (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کے سچے رسول ہیں، اس سے زیادہ کچھ کہا جانا ہر سب باطل اور لغو ہے، خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ الہیاذ باللہ وہ شعبز با اور مفتری تھے، یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، کہ وہ خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں، یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآن کریم نے بے شمار آیات میں ایک طرف تو نصاریٰ اور یہود کی گمراہی کو واضح کیا، اور دوسری طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ رفیع اور عند اللہ ان کے مقامِ اعلیٰ کو واضح فرمایا ہے، تاکہ افراط و تفریط کے کج راہوں میں سے حق کا معتدل راستہ نمایا ہو جائے عیسائی عقائد اور ان کے مختلف پہلوؤں پر اور اس کے بالمقابل اسلام کی حقانیت پر اگر تفصیلی معلومات حاصل کرنا ہوں تو حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کیرانوی کی مشہور عالم کتاب ”اظہار الحق کا مطالعہ کریں، جس کا عربی سے ترجمہ مع شرح و تحقیق حال میں دارالعلوم کراچی نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا، یعنی آسمان اور زمین میں اوپر سے نیچے تک جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی ملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کہتے ہیں اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہو سکتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کار سازی کے لئے وہی کافی اور بس ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلاتے ہیں اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو سکتی ہے؟

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور

لے بائبل سے قرآن تک (ناشر)



اُس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کی حاجت جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں کسی کو خدا کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

دین میں غلو حرام ہے | (قرآن تعالیٰ) لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ، اس آیت میں اہل کتاب کو غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا، غلو کے لفظی معنی حد سے بیکل جانے کے ہیں، اور امام جصاص نے احکام لہترآن میں فرمایا:

أَغْلُو فِي الدِّينِ هُوَ مُجَاوِزَةٌ  
حَدِّ الْحَقِّ فِيهِ  
یعنی دین کے بائے میں غلو یہ ہے کہ دین میں  
جس چیز کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس سے آگے  
بیکل جائے

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں کو اس حکم کا مخاطب اس لئے بنایا گیا کہ غلو فی الدین ان دونوں میں مشترک ہے، اور یہ دونوں فرقے غلو فی الدین ہی کے شکار ہیں، کیونکہ نصاریٰ نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے اور ان کی تعظیم میں غلو کیا، اُن کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا بنا دیا، اور یہود نے ان کے نہ ماننے اور رد کرنے میں غلو کیا کہ ان کو رسول بھی نہ مانا، بلکہ معاذ اللہ ان کی والدہ ماجدہ مریم بھول پر تہمت لگائی اور ان کے نسب پر عیب لگایا۔

چونکہ غلو فی الدین کے سبب یہود و نصاریٰ کی گمراہی اور تباہی مشاہدہ میں آچکی تھی، اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس معاملہ میں پوری احتیاط کی تاکید فرمائی، مسند احمد میں حضرت فاروق اعظمؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تَطُرُوْنِي كَمَا أَطَرَتِ  
النَّصَارَىٰ عِيسَىٰ بْنِ مَرْيَمَ  
فَانَّمَا أَنَا عَبْدٌ فَقُولُوا عَبْدُ  
وَرَسُولُ اللَّهِ  
میرنی بدح و شمار میں ایسا مبالغہ نہ کرو  
جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے معاملہ میں  
کیا ہے، خوب سمجھ لو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں  
اس لئے تم مجھے اللہ کا اور رسول کہا کرو

(اس روایت کو بخاری اور ابن مدینی نے بھی روایت کیا ہے اور صحیح السند قرار دیا ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور بشر ہونے میں سب کے ساتھ شریک ہوں، میرا سب بڑا درجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس سے آگے بڑھنا کہ خدا تعالیٰ کی صفات میں مجھے شریک قرار دیدیہ غلو ہے، تم نصاریٰ کی طرح کہیں اس غلو میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اور یہود و نصاریٰ کا یہ غلو فی الدین صرف انبیاء ہی کی حد تک نہیں رہا، بلکہ انھوں نے جب یہ عاد ہی ڈال لی تو انبیاء علیہم السلام کے حواریین اور متبعین اور ان کے نائبین کے مقابلہ میں بھی یہی



برتاؤ خستیا کر لیا، رسول کو تو خدا بنا دیا تھا، رسول کے متبعین کو معصوم کا درجہ دیدیا، پھر یہ بھی تنقید و تحقیق نہ کی کہ یہ لوگ حقیقتہً انبیاء کے متبع اور ان کی تعلیم پر صحیح طور سے قائم بھی ہیں یا محض وراثت عالم یا شیخ سمجھے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں ان کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئی جو خود بھی گمراہ تھے اور ان کی گمراہی کو اور بڑھاتے تھے، دین اور تدبیر ہی کی راہ سے ان کا دین برباد ہو گیا، قرآن حکیم نے ان لوگوں کی اس حالت کا بیان اس آیت میں فرمایا ہے: اِتَّخَذُوا  
اَحْبَابًا لَهُمْ وَرُءُفًا لَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ، یعنی ان لوگوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی معبود کا درجہ دیدیا، اس طرح رسول کو تو خدا بنایا ہی تھا، اتباع رسول کے نام پر پچھلے مذہبی پیشواؤں کی بھی پرستش شروع کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے، اسی لئے ہمارے آقا و مولا حضرت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس دبا و عظیم سے بچانے کے لئے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

حدیث میں ہے کہ حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمی جمرات کے لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو فرمایا کہ آپ کے واسطے کنکریاں جمع کر لائیں، انھوں نے متوسط قسم کی کنکریاں پیش کر دیں، آپ نے ان کو بہت پسند فرما کر دو مرتبہ فرمایا: بِمِثْلِهِنَّ  
بِمِثْلِهِنَّ، یعنی ایسی ہی متوسط کنکریوں سے جمرات پر رمی کرنا چاہئے، پھر فرمایا:

<p>”یعنی غلو فی الدین سے بچنے رہو کیونکہ تم سے پہلی امتیں غلو فی الدین ہی کی وجہ سے ہلاک و برباد ہوئیں“</p>	<p>اَيُّكُمْ وَالْغُلُوُّ فِي الدِّينِ فَاَنَّا هَلَكْنَا مِمَّنْ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي دِيْنِهِمْ</p>
---	--

اس حدیث سے چند اہم مسائل معلوم ہوتے:

**فوائد چہمہ** | اول یہ کہ حج میں جو کنکریاں جمرات پر پھینکی جاتی ہیں، ان کی حد مسنون یہ ہے کہ وہ متوسط ہوں، نہ بہت چھوٹی ہوں نہ بہت بڑی، بڑے بڑے پتھر اٹھا کر پھینکنا غلو فی الدین میں داخل ہے۔

دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہر چیز کی حد شرعی وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے متعین فرمادی، اس سے تجاوز کرنا غلو ہے۔

تیسرے یہ واضح ہو گیا کہ غلو فی الدین کی تعریف یہ ہے کہ کسی کام میں اس کی حد مسنون سے تجاوز کیا جائے۔



حُبِّ دُنْیَا کی حُدُود

ضرورت سے زیادہ دنیا کے مال و دولت اور عیش و عشرت کی طمع اسلام میں مذہوم ہے، اور اس کے ترک کرنے کی ہدایتیں بھی قرآن میں بکثرت

وارد ہیں، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں طبع دنیا اور حُب دنیا سے منع فرمایا وہیں اپنے قول و عمل سے اس کی حدود بھی متعین فرمادی ہیں کہ نکاح کرنے کو اپنی سنت قرار دیا، اور اس کی ترغیب دی، اولاد پیدا کرنے کے فوائد اور درجات بتلائے، اہل و عیال کے ساتھ حُسن معاشرت اور ان کے حقوق کی ادائیگی کو فرض قرار دیا، اپنی اور ان کی ضروریات کے لئے کسب معاش کو فریضۃً بعد الفریضۃ فرمایا، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت اور مزدوری کی لوگوں کو تاکید فرمائی، اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی نظام کی ترویج کو فریضۃ نبوت قرار دے کر اپنے عمل سے پورے جزیرۃ العرب میں ایک نظامِ مملکت قائم فرمایا، اور خلفائے راشدینؓ نے اس کو دنیا کے مشرق و مغرب میں پھیلا دیا، جس سے معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت ان چیزوں کا اشتغال نہ حُب دنیا میں شمار ہے نہ حرص و طمع میں۔

یہود و نصاریٰ نے اس حقیقت کو نہ سمجھا، اور رہبانیت میں مبتلا ہو گئے، قرآن حکیم نے

ان کی اس کج روی کو ان الفاظ میں رد فرمایا: رَحْمَانِيَّةٌ اِبْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَا عَلَیْهِمْ اِلَّا اَتْبَاعًا رِّضْوَانِ اللّٰهِ  
فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا، یعنی ان لوگوں نے اپنی طرف سے رہبانیت کے یعنی ترکِ دنیا کے  
طریقے اختیار کر لئے جو ہم نے ان کے ذمہ نہ لگائے تھے، پھر جو چیزیں خود عائد کر لی تھیں ان کو  
پورا بھی نہ کر سکے۔

سُنّت اور بدعت کی حُدُود

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادات، معاملات اور معاشرت سب ہی چیزوں میں اپنے قول و عمل سے عہدال

کی حدود و مقترر فرمادی ہیں اور ان سے پیچھے رہنا کوتاہی اور آگے بڑھنا گمراہی ہے، اسی لئے آپ نے بدعات اور محدثات کو بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے، ارشاد فرمایا:

کُلُّ يَدٍ عَلَيْهِ صَلَاةٌ وَكُلُّ  
صَلَاةٍ فِي النَّارِ

”یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی  
کا انجام جہنم ہے“

”یعنی ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی  
کا انجام جہنم ہے۔“

بدعت اسی چیز کو کہا جاتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں صراحۃً یا اشارۃً موجود نہ ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سترہ نے لکھا ہے کہ اسلام میں بدعت کو اس لئے سخت جرم قرار دیا کہ وہ تحریفِ دین کا راستہ ہے، پچھلی امتوں میں یہی ہوا کہ انھوں نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تعلیمات پر اپنی طرف سے اضافے کر لئے اور ہر آنے والی نسل ان میں



اضافے کرتی رہی یہاں تک کہ یہ پتہ نہ رہا کہ اصل دین کیا تھا، اور لوگوں کے اضافے کیا ہیں۔  
 شاہ صاحب نے اپنی کتاب حجۃ اللہ الباقیہ کے اندر یہ بیان فرمایا ہے کہ تحریف دین کے  
 دنیا میں کیا کیا اسباب پیش آئے ہیں، اور شریعت اسلام نے ان سب کے رد و اذوں پر  
 کس طرح پہرہ بٹھایا ہے، کہ کسی سوراخ سے یہ وہاں اس اُمت میں نہ پھیلے۔  
 علماء و مشائخ کی تعظیم و اتباع میں راہ اعتدال

ان اسباب میں سے دین کے بارے میں تعین و تشدد یعنی غلو فی الدین کو بڑا  
 سبب قرار دیا، مگر افسوس ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قدر  
 اہتمام اور شریعت کی اتنی پابندیوں کے باوجود آج اُمت مسلمہ اسی غلو کی بُری طرح شکار ہے،  
 دین کے سارے ہی شعبوں میں اس کے آثار نمایاں ہیں، ان میں سے بالخصوص جو چیز ملت کے  
 لئے ہلک اور انتہائی مضر ثابت ہو رہی ہے وہ دینی مقتدا و پیشواؤں کا معاملہ ہے، مسلمانوں  
 کی ایک جماعت تو اس پر گئی ہے کہ مقتدا و پیشوا، علماء و عرفاء کوئی چیز نہیں، کتاب اللہ  
 ہمارے لئے کافی ہے، جیسے وہ اللہ کی کتاب سمجھتے ہیں، ہم بھی سمجھ سکتے ہیں، ہُمْ دِیْجَالٌ وَ نَحْنُ  
 رِیْجَالٌ، یعنی وہ بھی آدمی ہیں، ہم بھی آدمی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہوسناک جو نہ عربی زبان سے  
 واقف ہے نہ قرآن کے حقائق و معارف سے، نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان و تفسیر سے  
 محض قرآن کا ترجمہ دیکھ کر اپنے کو قرآن کا عالم کہنے لگا، قرآن کریم کی جو تفسیر و تشریح خود  
 رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے بلا واسطہ شاگرد یعنی صحابہ کرام سے منقول ہے اس سے  
 قطع نظر جو بات ذہن میں آگئی اس کو قرآن کے سرخوہ ریا، حالانکہ اگر صرف کتاب بغیر معلم  
 کے کافی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت تھی کہ کتاب کے نسخے لکھے لکھائے لوگوں کو پہنچا دیتے،  
 رسول کو معلم بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ تھی، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بات صرف  
 کتاب اللہ سے ساتھ مخصوص نہیں، کسی بھی علم و فن کی کتاب کا محض ترجمہ دیکھ کر بھی کوئی  
 شخص اس فن کا عالم نہیں بن سکتا، ڈاکٹری، یا طب یونانی کی کتابوں کا ترجمہ دیکھ کر آج تک  
 کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بنا، انجینیئری کی کتابیں دیکھ کر کوئی انجینیئر نہیں بنا، کپڑا سینے یا کھانا پکانے  
 کی کتابیں دیکھ کر کوئی درزی یا بادچی نہیں بنا، بلکہ ان سب چیزوں میں تعلیم و تعلم اور معلم  
 کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، مگر افسوس کہ قرآن و سنت ہی کو ایسا سرسری سمجھ لیا گیا  
 ہے کہ اس کے لئے کسی معلم کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، چنانچہ ایک بہت بڑی تعلیم یافتہ  
 لوگوں کی جماعت تو اس طرف غلو میں پہنچی کہ صرف قرآن کے مطالعہ کو کافی سمجھ بیٹھے، علماء  
 سلف کی تفسیروں اور تعبیروں کو اور ان کے اقتدا و اتباع کو سرے سے نظر انداز کر دیا۔  
 دوسری طرف ایک بھاری جماعت مسلمانوں کی اس غلو میں مبتلا ہو گئی کہ اندھا دھند



جس کو چاہا اپنا مقتدار اور پیشوا بنالیا، پھر ان کی اندھی تقلید شروع کر دی، نہ یہ معلوم کہ جس کو ہم مقتدار اور پیشوا بنایا ہے یہ علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے معیار پر صحیح بھی اترتا ہے یا نہیں؟ اور نہ پھر اس طرف کوئی دھیان کیا کہ جو تعلیم یہ دے رہا ہے وہ قرآن و سنت کے مخالف تو نہیں؟ شریعت اسلام نے غلو سے بچا کر ان دونوں کے درمیان طسریقہ کا یہ بتلایا کہ کتاب اللہ کو رجال اللہ سے سمجھو اور رجال اللہ کو کتاب اللہ سے پہچانو، یعنی قرآن و سنت کی مشہور تعلیمات کے ذریعہ پہلے ان لوگوں کو پہچانو جو کتاب و سنت کے علوم میں مشغول ہیں، اور ان کی زندگی کتاب و سنت کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے، پھر کتاب و سنت کے ہر لمحے ہوئے مسئلہ میں ان کی تفسیر و تشریح کو اپنی رائے سے مقدم سمجھو، اور ان کا اتباع کرو۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ

مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ فرشتوں کو

الْمُقَرَّبُونَ وَمَنْ يَسْتَنْكِفَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ

جو مقرب ہیں اور جسکو عار آوے اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے

فَيَحْشُرْهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا ﴿١٤٦﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

سودہ جمع کر لگیا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا، پھر جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے انھوں

الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ

اچھے تو ان کو پورا دے گا اُن کا ثواب اور زیادہ دے گا اپنے فضل سے

وَأَمَّا الَّذِينَ اسْتَنْكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيَعَذِّبُهُمْ عَذَابًا

اور جنھوں نے عار کی اور تکبر کیا سو ان کو عذاب دے گا عذاب

أَلِيمًا وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٤٧﴾

دردناک اور نہ پاویں گے اپنے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار

## خلاصہ تفسیر

انصاری خواہ مخواہ حضرت مسیح علیہ السلام کو آلہ یا جزو آلہ بنا رہے ہیں، خود حضرت مسیح کی یہ کیفیت ہے کہ سکونتِ ارض کی حالت میں تو ان کا اقرارِ عبدیت جو کہ مبطل الوہیت



ہے مشہور اور سب کو معلوم ہی ہے، لیکن اب بھی سکونت سمار کی حالت میں کہ سکونت ارض سے ارفع اور مظنۃ تعالیٰ کا ہے، یا قیامت تک وہ جس حالت میں ہوں ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے اس حالت میں بھی، ہرگز خدا کا بندہ بننے سے عار (اور انکار) نہیں کریں گے اور نہ مقرب فرشتے (کبھی عار کریں گے، جن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں، جن کو اکہ کا ایک جزو مانتے ہیں خود ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے) اور (وہ عار کریں کیسے اس عار کرنے کا ایسا بُرا انجام ہے کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اس کا انجام سن لو، خدا تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس (یعنی حساب کے موقع پر) جمع کریں گے پھر جو لوگ (دنیا میں) ایمان لائے ہوں گے اور انھوں نے اچھے کام کئے ہوں گے (یعنی عبادت رہے ہوں گے، کیونکہ حاصل عبادت کا یہی ایمان اور اعمال ہیں) تو ان کو تو ان کا پورا ثواب (بھی) دیں گے (چونکہ ایمان اور اعمال پر منصوص ہے) اور (اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں گے، (جس کی تفصیل منصوص نہیں) اور جن لوگوں نے (عبادت بننے سے) عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پاویں گے

## معارف و مسائل

اللہ کا بندہ ہونا اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے | لَنْ يَسْتَحِفَّ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ اَلْح یعنی مسیح کو اللہ کا بندہ ہونے میں کوئی عار نہیں اور نہ ہی اللہ کے مقرب فرشتوں کو عار ہے، اس لئے کہ اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے، حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ معتربین سے اس نعمت کی قدر و قیمت پوچھتے ان کو اس سے کیسے ننگ اور عار آسکتا ہے، البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے، جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا، اور مشرکین فرشتوں کو بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے، سوان کے لئے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے (فوائد عثمانی)

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا

اِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا ﴿۱۷﴾ فَاٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصِمُوْا

تم پر روشنی واضح سو جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط



بِهِ فَسَيُجْزِيهِمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ

پکڑا تو ان کو داخل کرے گا اپنی رحمت میں اور فضل میں اور پہنچائے گا ان کو

إِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا<sup>ط</sup> (۱۷۵)

اپنی طرف سیدھے راستہ پر

## خلاصہ تفسیر

اے (تمام) لوگو یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک (کافی) دلیل آچکی ہے (وہ ذات مبارک ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی) اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے (وہ قرآن مجید ہے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ تم کو بتلایا جائے وہ سب حق ہے جن میں مضامین مذکورہ بھی داخل ہیں) سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے (جس کے لئے توحید و تنزیہ کا اعتقاد لازم ہے) اور انھوں نے اللہ کے دین کو (یعنی اسلام کو) مضبوط پکڑا (جس کے لئے رسول اور قرآن کی تصدیق لازم ہے) سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں (یعنی جنت میں) داخل کریں گے اور اپنے فضل میں (لئے نیلے) یعنی دخول جنت کے علاوہ اور بھی نعمائے عظمیٰ دیں گے جن میں دیدار الہی بھی داخل ہے) اور اپنے تک (پہنچنے کا) ان کو سیدھا راستہ بتلا دیں گے (یعنی دنیا میں ان کو طریق رضا پر قائم و ثابت رکھیں گے، اور اسی سے تبارک ایمان و اعمال صالحہ کی حالت معلوم ہو گئی کہ ان کو یہ ثمرات نہ ملیں گے)۔

## معارف و مسائل

بُرْهَان سے کیا مراد ہے؟ (قولہ تعالیٰ) قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ، بُرْهَان کے لفظی معنی

دلیل کے ہیں، اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے (روح)

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو لفظ بُرْهَان سے اس لئے تعبیر فرمایا کہ آپؐ کی ذات مبارک اور آپؐ کے اخلاق کریمانہ، آپؐ کے معجزات اور آپؐ پر کتاب کا نزول، یہ سب چیزیں آپؐ کی نبوت اور آپؐ کی رسالت کے کھلے کھلے دلائل ہیں، جن کو دیکھنے کے بعد کسی اور دلیل کی حتمی حاجت باقی نہیں رہتی، تو یوں سمجھنا چاہئے کہ آپؐ کی ذات خود ہی ایک مجسم دلیل ہے۔



اور نور سے مراد قرآن مجید ہے (روح) جیسا کہ سورۃ مائدہ کی اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے  
 قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (۵: ۱۵) "یعنی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن  
 چیز آئی ہے، اور وہ ایک کتاب واضح یعنی قرآن ہے" (بیان القرآن) اس آیت میں جن کو  
 نور کہا گیا ہے اُسے اسی کو کتاب مبین کہا گیا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عطف تو تغائر کو چاہتا  
 ہی، لہذا نور اور کتاب ایک چیز نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ تغائر عنوان کا کافی ہے، اگرچہ مصداق  
 اور معنوں ایک ہی ہے (روح)

اور اگر نور سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہو، اور کتاب سے مراد قرآن مجید  
 ہو تو یہ بھی صحیح ہے (روح) لیکن اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا نور محض ہونا ثابت  
 نہیں ہوتا جو بشریت اور جسمانیت کے منافی ہو۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۖ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے سو کہہ دے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا اگر کوئی مرد مر گیا اور

لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِيهَا

اس کے بیٹا نہیں اور اس کے ایک بہن ہے تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑا اور وہ بھائی وارث

إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا وَلَدٌ فَإِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الشُّلُّانِ

ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کے بیٹا پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو پہنچے دو تہائی

مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِجَالًا وَنِسَاءً فَلِلَّذَكَرِ مِثْلُ

اس مال کا جو چھوڑا اور اگر کسی شخص ہوں اسی رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو ایک مرد کا حصہ ہے

حِظٍّ إِلَّا ثُنْيَيْنِ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا ۚ وَاللَّهُ

برابر دو عورتوں کے بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۱۷۶

ہر چیز سے واقف ہے

رَبِطَ آيَاتٍ | شروع سورت کے ذرا بعد میراث کے احکام مذکور تھے، پھر وہاں سے تقریباً

ایک پارہ کے بعد دوسرے احکام کے ساتھ حکم میراث کی طرف پھر عود ہوا تھا، اب ختم سورت  
 پر پھر عود ہے اسی کی طرف شاید تین جگہ اس کے متفرق کر دینے میں حکمت یہ ہو کہ اسلام سے پہلے  
 میراث کے باب میں بہت ظلم تھا، پس سورت کے اول میں، وسط میں، آخر میں اس کے ذکر



فرمانے سے مخاطبین کو اہتمام بلیغ اس باب میں مفہوم ہوگا، جس سے وہ بھی زیادہ اہتمام کریں۔

## خلاصہ تفسیر

لوگ آپ سے (میراث کلالہ کے باب میں یعنی جس کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت کرتے ہیں آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے (وہ یہ ہے کہ) اگر کوئی شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو (یعنی نہ مذکر نہ مؤنث اور نہ ماں باپ ہوں) اور اس کے ایک (یعنی یا عسلاتی) بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی بعد حقوق متقدمہ اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو اس کو دیا جائیگا) ورنہ پھر اسی پر رد ہو جائے گا) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہوگا، اگر (وہ بہن مر جائے اور) اس کے اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں) اور اگر (ایسی) بہنیں دو (یا زیادہ) ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے (اور ایک تہائی عصبہ کو ورنہ بطور رد کے اپنی کو مل جائے گا) اور اگر (ایسی میت کے جس کے نہ اولاد ہے نہ والدین خواہ وہ میت مذکر ہو یا مؤنث) وارث چند (یعنی ایک سے زیادہ ایسے ہی) بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو (ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دو برابر بہن کو اکہر لیکن عینی بھائی سے علائی بھائی بہن سب ساقط ہو جاتے ہیں) اور عینی بہن سے کبھی وہ ساقط ہو جاتے ہیں کبھی حصہ گھٹ جاتا ہے، جس کی تفصیل کتب فرائض میں ہے، اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم (ناواقفی سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو تذکیر و احسان ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں، (پس احکام کی مصلحتوں سے بھی مطلع ہیں اور احکام میں ان کی رعایت کی جاتی ہے، یہ حکمت کا بیان ہے)۔

## معارف و مسائل

فوائد مہمہ (۱) قولہ تعالیٰ یَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلَالَةِ اس جگہ کلالہ کے حکم اور اس کے سبب نزول بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم

لے یہ خلاصہ تفسیر بیان القرآن سے ماخوذ ہے، اور وہاں یہ عبارت اسی طرح ہے، مگر راجح قول کی بنا پر کلالہ ہونے کیلئے یہ ضروری نہیں ہے کہ میت کی ماں اسکی دفات کے وقت زندہ نہ ہو، بلکہ اگر ماں زندہ ہو تو بھی میت کلالہ ہو سکتا ہے، چنانچہ سورۃ نسا کی آیت ۱۱ کی تفسیر میں جو صفحہ ۳۲ پر اسی جلد میں گذری ہے، "ماں" کا لفظ موجود نہیں ہے، لہذا راجح قول کی بنا پر یہ لفظ یہاں بھی نہ ہونا چاہئے۔ یہاں یہ لفظ لکھنے میں بظاہر بیان القرآن میں تسامح ہوا ہے۔ لہذا اعتماد اس تفسیر پر کیا جائے جو سورۃ نسا کی آیت ۱۱ کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے۔ محمد تقی عثمانی عفی عنہ ۱۳۲۴ھ/۳/۲۹



ہوئیں، اول یہ کہ جیسا پہلے دِانْ تَكْفُرْ وَاَقَانْ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا حال ذکر فرمایا تھا، ایسے ہی ارشاد فَاَمَّا الْکٰفِرِیْنَ

۱۲ اَمْنُوْا بِاللّٰہِ وَاَعْتَصِمُوْا بِہِ الْخ کے بعد اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمثیل ذکر فرمایا، تاکہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور بُرائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت اور بھلائی خوب سمجھ میں آجائے۔

(۲) اسی کے ذیل میں دوسری بات یہ بھی ظاہر ہو گئی کہ اہل کتاب نے تو یہ غضب کیا کہ ذاتِ اقدس سبحانہ و تعالیٰ کے لئے شریک اور اولاد جیسے شنیع امر کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الہی کا خم ٹھونک کر خلاوت کیا، اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہے کہ اصولِ ایمان اور عبادات تو درکنار معاملاتِ جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے محتس اور منتظر رہتے ہیں، اور ہر امر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتے ہیں، اپنی عقل اور خواہش کو حاکم نہیں سمجھتے، اگر ایک دفعہ میں تشفی نہ ہوئی تو مکرر حاضر خدمت ہو کر دریافت کرتے ہیں یہ سب ہمیں تفادیت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت سید المرسلینؐ بھی بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے اگر کسی امر میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے، جب وحی آتی تب حکم فرماتے، نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں تھی جو بوقتِ حاجت اور حسبِ موقع متفرق نازل ہونے میں ہے، کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اس صورت میں سوال کر سکتا ہے، اور بذریعہ وحی متلو اس کو جواب مل سکتا ہے، جیسا کہ اس موقع میں اور قرآن مجید کے بہت سے مواقع میں موجود ہے، اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافت ذکر خداوندی و عزتِ خطابِ حق و جلّ ایسے فخرِ عظیم پر مشتمل ہے جو کسی اُمت کو نصیب نہیں ہوا، وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے، اور اختلاف کے موقع میں جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق وحی نازل ہو گئی قیامت تک ان کی خوبی اور نیک نام باقی رہے گا، سو کلام کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ فرمادیا (فوائد عثمانی)

تَمَّتْ سُوْرَةُ النِّسَاءِ وَبِیْہِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَاٰخِرًا

جلد دوم تمام شد